[illegible] — ریڈ ہاؤس — چک جیون روڈ — گیا

شرح خریداری

سال بھر کے لئے	۱۲ روپئے
دو سال کے لئے	۲۲ روپئے
تین سال کے لئے	۳۰ روپئے

فی کاپی

ایک روپیہ

آہنگ (۲)

فروری ۱۹۷۲ء

شمارہ

۲۰

کتابت:

قمر نظامی

سرورق:

ایم - وصی

مطبع:

ہند لیتھو پریس میکلوڈ گنج گیا

ہیراگھر، گیا

فون: ۶۶۲

رہائش: ۰۳

مرتبین

کلام حیدری پرکاش فکری

مزامیر

نظمیں

غزلیں

افسانے

مضامین

تبصرہ

مزامیر

بہار کے شاعر و ادیب دوست گورنر شری دیوا کانت بروا نے جب کلیم الدین احمد صاحب کے دولت کدے پر منعقد چھوٹے سے مشاعرے میں اردو اکاڈمی کے قیام کا اعلان کیا تو بہار کے اردو حلقے میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ شری دیوا کانت بروا کے تہذیبی اور ثقافتی تحریکات اور انجمنوں سے خصوصی لگاؤ کا چرچا ہر جگہ ہوتا ہے۔ اردو اکاڈمی کے قیام نے اُن کا وقار ادبی حلقوں میں اور بھی اونچا کر دیا۔

لیکن جہاں اردو اکاڈمی کے قیام پر مسرتوں کا اظہار کیا گیا وہیں بے اطمینانی اور شکوک و شبہات بھی دیکھنے میں آئے۔ ہم ان شکوک و شبہات کو اہمیت نہ دیتے مگر جب کل گیارہ افراد پر مشتمل اس کمیٹی کا اعلان ہوا تو ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ جناب قاضی عبدالودود، جناب کلیم الدین احمد اور جناب جمیل مظہری جیسے دیو قامت دانشوروں کے ساتھ ساتھ صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی، صدر شعبہ اردو فلاں یونیورسٹی وغیرہ وغیرہ بھی نظر آئے۔ ایسا لگا کہ افراد کی صلاحیت اور اہمیت کو نگاہ میں رکھنے کی بجائے یونیورسٹیوں کے صدر شعبہ اردو ہونے ہی کو واحد طرۂ امتیاز سمجھ لیا گیا۔

کچھ ایسے بھی نام نظر آئے جن کے آگے پیچھے ڈگریوں کی فوج ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ ان میں سے کئی صحیح املا لکھنے پر بھی قادر نہیں ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ خوشامد سفارش اور پیروی کے کارآمد ہتھیار استعمال کرتے ہیں [illegible] بہت ہے، ادبی کام نہ کرتے ہیں نہ کر سکتے ہیں۔ [illegible] کے ہاتھ نہ پہنچا تو کس کے پاس ہوگا؟

اردو اکاڈمی کی سب سے بڑی پیدائشی بدقسمتی یہ ہوگی کہ اسے [illegible]

کر دیا گیا ہے جس کے پاس اگر کچھ ذہانت ہے بھی تو وہ افسریت کی نذر ہو چکی ہے۔

ابھی ریاست کے صدر مقام پٹنہ کی حالت یہ بتائی جاتی ہے کہ اردو اکادمی کا قیام گویا ایک گولڈ کی کانسی ہے۔ اور ہر اردو کا ایم اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی اپنا اپنا لوٹا لے کر دوڑ پڑا ہے!

اردو اکادمی ابھی اپنے تمام نقوش واضح بھی نہیں کر سکی ہے مگر پٹنہ یونیورسٹی اور پٹنہ کالج کے شعبۂ اردو کے سابقہ پی۔ ایچ۔ ڈی کا سٹر گرائی لے کر دوڑ رہے ہیں۔ جن کے پاس اور کوئی دوسرا ذریعۂ عزت نہ ہو وہ اکادمی کی ممبری کے لئے جان اور ایمان کی بازی نہ لگائیں تو کیا کریں؟

اکادمی کے مقاصد میں اچھی کتابوں کی اشاعت کا کام بھی ہے۔ اچھی کتابوں کے انتخاب کا معاملہ کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود اور جمیل مظہری جیسے لوگوں کے ہاتھ میں اگر رہا تو انتخاب پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے لیکن اگر ہر ممبر کے ہاتھ اور پنسل میں اپنی "تالیف" (کیونکہ شاید ہی کسی میں تصنیف کی صلاحیت ہے) رہی تو اردو اکادمی کا خدا حافظ ہے۔

اشاعت کا کام ایک ایسا کام ہے جس کے لئے تربیت اور تجربہ دونوں ضروری ہیں۔ اردو اکادمی کے ممبروں میں ایسا ایک نام بھی نہیں ہے جو اس کام کا تجربہ یا تربیت رکھتا ہو۔

اکادمی رسالہ بھی شائع کرے گی ــــــ رسالہ تو بہار سرکار کا محکمۂ تعلقات عامہ بھی نکالتا ہے "بہار کی خبریں" جس پر اچھا خاصہ خرچ بھی آتا ہے مگر یہ کیسا رسالہ ہے؟ اگر اکادمی کو ایسا ہی رسالہ نکالنا ہو تو ہمیں کچھ نہیں کہنا لیکن اگر سچ مچ ایسا رسالہ نکالنا ہے جو جدید زمانے کا رسالہ ہو اور اکادمی کے وقار کو اونچا کر سکے اس کے لئے اچھی تنخواہ پر ایک تجربہ کار ادیب کا مامور کیا جانا ضروری ہے۔ کیا اس سلسلے میں سہیل عظیم آبادی کا نام کسی تعارف کا محتاج ہے؟ مگر ان کی شخصیت سے کسی دوڑ دھوپ، خوشامد اور پیروی کی توقع نہیں کی جا سکتی جس پر شاید افسران ان کو توجہ نہ کر سکے۔ اس لئے ہم براہِ راست شری دیو اکانت بروا کی توجہ چاہتے ہیں جن کے پاس شاعر کا دل اور تخلیق کار کی نگاہ ہے ــــــ اردو اکادمی کے لئے ایک ایسے سکریٹری کی ضرورت بھی ہے جو اپنا پورا وقت دے جس کی ہندوستان کی ادبی دنیا میں منفرد اور مستقل جگہ ہو، اس کام کے لئے کسی یونیورسٹی یا کالج کے شعبۂ اردو کے صدر کی ضرورت نہیں ہے جس کے لئے سکریٹری ہونا باعثِ افتخار ہو یا جس کے لئے مزید آمدنی ہی سب سے اہم ہو۔ اردو اکادمی کو ایسا سکریٹری ملنا چاہئے جو بذاتِ خود اکادمی کے لئے باعثِ افتخار ہو۔ ابھی نوزائیدہ اکادمی کو جوان بازوؤں کا سہارا چاہئے، بوڑھے ہاتھوں میں اس طفلِ شیر خوار کا مستقبل ہرگز نہیں دیا جانا چاہئے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس اکادمی کو افسریت کے ہاتھوں فائل کی زینت نہیں بننے دیا جائے۔ اسے کھلی فضا میں عوام کے اندر کام کرنے کا موقع دیا جانا چاہئے۔

ہم جناب شری دیو اکانت بروا سے درخواست کرتے ہیں کہ اکادمی کے دیگر ممبروں کی نامزدگی کے وقت بہار کے مختلف حصوں میں پھیلے اور بکھرے ہوئے ادیبوں اور عملی طور پر مفید دانشوروں کو سمیٹ لیں۔ اسے نہ کالج کے لکچروں کا کافی ہاؤس بننے دیں اور نہ بوڑھوں کا نرسنگ ہوم۔

● ●

ہزار داستان کا ایک ورق

خلیل مامون

ہم وفادارانِ شہرِ آرزو و محصورِ آب
روزنِ شب سے نکلتی تیز تلواروں کو اپنی پیٹھ دے کر
بیضۂ افلاک کے پھٹنے تلک بیٹھے رہیں گے

وہ وصیا سیال ہر اک گھر کی چوکھٹ پر اُتر کر
کھڑکیوں، دروازوں پر اشراق کی بارش کرے گا
اونگھتے مُردوں کے کانوں میں سرگوشی سی ہوگی

"اپنی اپنی عورتوں، بچوں کی پیشانی پر اپنے
سانس کی حرکت کا اور گرمی کا اعادہ کرو!
شام تک کل کے محافظ کے سروں پر
آسمانی آگ نازل ہو چکی ہوگی،
عقیقی سنگ دیواروں کے، اُن کو
با ادب تحسین دے کر سر جھکاتے جا رہے ہوں گے"
یہ سب کچھ، سچ ہے لیکن ———
آج کی شب اور ہے
اور تمہاری عورتوں، بچوں
بہت سے اور لوگوں کو ابھی
آرام کرنا ہے۔

ہم وفادارانِ شہرِ آرزو و محصورِ آب
روزنِ شب سے نکلتی تیز تلواروں کو اپنی پیٹھ دے کر
بیضۂ افلاک کے پھٹنے تلک بیٹھے رہیں گے

کہ ابھی تو اخضری معصوم پتّوں پر لرزتے
شبنمی قطرات
کالے جنگلوں کے شب گزیدہ راستوں پر
سبز مائل نیلگوں روغنی رہوتے رہیں گے
فصلِ آئندہ کے شہروں کی ہوس بوتے رہیں گے
ریگِ آوارہ پہ صرصر، کہکشاں لکھتی رہے گی
روزنِ شب کی فصیلوں کے سروں پر
آج کی مانند کل بھی
بلّیاں روتی رہیں گی
اور ابھی تو دُور کہر آلودہ کہساروں کی اونچی چوٹیوں
کی سرد راتوں میں بنفشہ جل رہا ہے
اور مہاجر زائرین اطراف گردش کر رہے ہیں

●●

قدروں کے زوال کا [illegible]

نظام صدیقی

ہر دور اپنے وجود کی معنی آگیں آزادی کا اعلان کرنا چاہتا ہے لایعنی آزادی کا ہرگز نہیں، جو تہذیبی شتر گربگی کے مصداق ہے۔ اس ناقابل تسخیر اعلانیہ کا ایک نمایاں پہلو اپنے کو گذشتہ ادوار سے مختلف اور ممیز ثابت کرنا ہے۔ فکر وفن کے مختلف شعبوں میں نئے اسالیب کے طلوع ہونے کا یہ فطری سبب ہے۔ پچھلے ادیبوں مفکروں اور شاعروں سے کافی حد تک مختلف ہوئے بغیر نئی درخشاں ذہانتیں اپنے لئے بساط ادب پر کوئی خاص جگہ بنانے میں سخت دشواری محسوس کرتی ہیں۔ ہمارے اس پرآشوب کسمپرسی دور میں یہ رجحان اور بھی شدید ہو گیا ہے۔ اس میلان کی کارفرمائی یورپ میں دس سال قبل اپنے عروج پر تھی۔ اب فضا قطعاً معتدل ہو رہی ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں جدیدیت کے خام اور جدیدیت زدگی یا باختگی کے عام تصور کے باعث کچی مگر ہونہار ذہانتوں کی چنگاریاں مکمل شعلہ نہیں بن پا رہی ہیں اور وقت کی ذراسی گردش کے بغیر بھی قطعاً مستعجل ثابت ہو رہی ہیں۔

علی العموم ادب میں "جدید" تین معنوں میں بار پا رہا ہے۔ ایک معنی محض تاریخی تصور کا حامل ہے جس کی رو سے جدید ایک مخصوص عصر سے وابستہ ہے۔ تاریخ ہند میں سہولت کے لئے جدید دور کا آغاز عموماً اٹھارہویں صدی کے نصف آخر سے مانا جاتا ہے۔ جب ملک کے جنوبی، مغربی اور مشرقی حصوں میں ایک طرف برطانوی حکومت قائم ہو گئی تھی دوسری طرف کلکتہ، بمبئی اور مدراس کی یونیورسٹیاں وجود میں آئی تھیں۔ خصوصی طور پر ہندوستانی نشاۃ الثانیہ کا نقطہ ارتکاز ۱۸۵۷ء ہی ہے۔ جس کے بعد سے واضح طور پر جدید ہندوستان کے نئے خطوط رونما ہونے لگے۔ [illegible] طور پر پندرھویں صدی سے نشاۃ الثانیہ کا [illegible] ہوا تھا لیکن اس کے حقیقی خدوخال درحقیقت [illegible] وصنعت کے ارتقاء کے ساتھ ہی نمایاں [illegible]۔

اس تاریخی تصور کے حامل معنی کا ایک [illegible] پہلو بھی ہے جیسا کہ اس لفظ کے معنی سے [illegible] جدیدیت کا تعلق براہ راست "حال" سے ہے اور چونکہ [illegible] ہے۔ لہٰذا جدیدیت کا پیمانہ آسانی سے [illegible] ہر دور میں بدلتا رہتا ہے۔ [illegible] یہاں ماضی سے قدرے مختلف یا "نئے [illegible]" کے معنوں میں مقصود ہوتا ہے۔ اس معنی میں جدید [illegible] حال سے ہی متعلق نہیں رہ جاتا۔ پرانے [illegible] جدید دور سے ہو گئے [illegible] آج زمانے [illegible] قدیم ہو گئے۔ [illegible] کا دور آج قدیم [illegible] کا جدید تھا۔ یعنی جدید وہ [illegible] آج کا قدیم ہو اور آج کا جدید [illegible] اپنے یہاں ہی تاریخ کا جو [illegible] کش مکش آگیں ادوار [illegible] گردش [illegible] [illegible] جدیدیت [illegible] اب تقریباً جدیدیت [illegible] [illegible]

[illegible] شان [illegible]
[illegible] کی [illegible]
[illegible] سے اسیر
[illegible] اعادہ [illegible] بہار کی طرف
[illegible] جدیدیت ہے۔
[illegible] اور ذہنی ترقی پسندی کی
[illegible] زندگی کے بہتر اور پُر
[illegible] کی فطری ترتیب جس کے بغیر
[illegible] تہذیب [illegible] سانیوں میں متواتر
[illegible] ترقی یافتہ ہوتے چلا جانا ناقابلِ یقین
[illegible] کی منزل کی جستجو کر دیوانے کا خواب
[illegible] معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا [illegible] فلسفیانہ تصور کا حامل ہے۔ جس کی رو سے
جدید ایک خاص زاویۂ [illegible] ہے جو قرونِ وسطیٰ کے فکری نظام سے
یکسر مختلف ایک نئے فلسفۂ حیات کا مظہر ہے۔ اگرچہ پہلا یعنی تاریخی
تصور بھی اس میں [illegible] ہے۔ درحقیقت جدیدیت کے تصور کی ریڑھ
کی ہڈی یہ تاریخی شعور ہے [illegible] نظر ازمنۂ وسطیٰ اور [illegible] سے اس لئے
مختلف ہو [illegible] شعور کی شدید کارفرمائی ہے۔ یہ اپنے
[illegible] اور سیاق [illegible] حد درجہ بیدار اور
[illegible] نظریۂ زندگی ماحولی
اثرات سے [illegible] اتنا زیادہ بیدار مغز
تھا [illegible] تھا۔ تاریخی شعور
[illegible] تھا۔ فلسفیانہ سیاق
[illegible] کی تشکیل مختلف عناصر
[illegible] اپنے دور اور
[illegible] اور بیدار تاسیاتی
[illegible] کی رہین
[illegible] تھی۔

جس میں زمان و مکان زندگی کے اندر ہی سموئے ہوئے تھے لیکن انسان کو ملحوظ رہے اس کا قطعاً واضح شعور نہیں تھا۔ بے پایاں عملیت کی افراط و تفریط کے سبب شاید اس کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی تھی ٹھیک جیسے ہماری شخصیت میں فطرت کے عناصر ہوتے ہیں لیکن ہم ان کے وجود کی بابت مکمل طور پر آگاہ نہیں ہیں جدید انسان کا تو صحیح معنوں میں جنم ہی اس وقت ہوا جب وہ اپنے ملک، تاریخ، اور نواح کی بابت مکمل طور پر ہوشمند ہوا۔ اس نئی ہوش مندی اور ذہنی بیداری کے نتیجہ میں جدید نظریۂ زندگی میں سماجی شعور اور ابتدائی دَور میں قومی شعور کی از خود ہی شمولیت ہوگئی تھی۔ نتیجتاً بے قید تخیل اور بے مقصد اور فراریت کو رُومانیت پسندی کا طلسم آہستہ آہستہ ٹوٹتا گیا۔ انسانی نقطۂ نگاہ زیادہ عملی اور حقیقت کا متلاشی ہوتا گیا۔ سطحی اور بچکانہ جذباتیت کی جگہ قوتِ تمیز کا تسلط بڑھ گیا اور سائنس اور ٹکنالوجی کے موجودہ غالب اثرات کے سبب عمومی نقطۂ نظر تدریجی طور پر عقلی (سائنسی) ہوتا گیا۔ اس طرح غیر معمولی برق آسا قوتِ تمیز سے مملو سائنسی نقطۂ نظر جدیدیت کا دوسرا اہم عنصر ہے جو حد درجہ بے لاگ اور ناقابلِ تسخیر طور پر، خوفناک احساسِ گم کردہ راہی اور بے دست و پائی، خوش عقیدگی اور جہالت، لاتعداد ذہنی بھول بھلیوں اور انگنت اوہام کے کھنڈر اور گرتی ہوئی چھتوں اور لڑکھڑاتے ہوئے سہاروں اور از کار رفتہ فکری اور فنی خار و خس کو خاکستر کر کے ملبہ پر نئے تصور کی تعمیر کی جرأت عارفانہ عطا کرتی ہے۔ وہ اساسی طور پر اعلیٰ بنیادی انسانی اقدار، عالی ظرفی اور سیر دلی عزم کے روح کی منکر نہیں ہوتی بلکہ صرف بدلتے رہتے ہوئے سیاق میں ان کے اوپری فرسودہ اور از کار رفتہ کینچل کو نوچ کر نذرِ آتش کر دینے کی خواستگار ہوتی ہے تاکہ وہ سکہ بند تصورات کے پروردگاروں کے لئے ٹسٹ کا آئینہ بن جائے۔

جدید زاویۂ نگاہ میں (LATEST) یا تازگی اور نئے پن کے لئے ہمک اور لگن فطری ہے۔ درحقیقت جدید اور موجِ نو" کے

معنوی روابط بھی ہیں۔ جیسی خون آشام صورت حال کارفرما ہے وہی محض ٹھیک ہے یا ویسی ہی حالت جوں کی توں ہمیشہ برقرار رہے۔ اس سخت جمود آفریں زندگی کش جذبہ کی پُرشور مخالفت کے مکروہ سایہ میں ہی جدید شعور کا ارتقا ہوتا ہے۔ مگر روایت کی غیر عارفانہ مخالفت اس میں قطعاً کارفرما نہیں ہوتی۔ جدیدیت روایت کو آنکھ موند کر رد کرنے کا نام نہیں۔ اگلوں کی نامیاتی اور متحرک زندہ صلاحیتوں اور جوہروں کو بروئے کار لانے سے جینے اور سوچنے کے بعض نئے انداز اور گوشے دریافت ہوسکتے ہیں۔ جدیدیت بذات خود جدید نہیں بلکہ اپنی روایت کے حوالے سے جدید ہے یعنی نئے لوگوں کا خیال ہی اس لئے آتا ہے کہ پرانے لوگ بھی تھے۔ مجھ میں صرف میں ہی نہیں بلکہ میرے آبا و اجداد بھی اسی طرح سمائے ہوئے ہیں ٹھیک جیسے میں اپنی آنے والی نسلوں کے رگ و ریشہ میں سرایت رہوں گا۔ اس تعلق سے تاریخی شعور جدیدیت کا تضاد پیش کرنے کے بجائے مستقبل کے اسالیب حیات کا باعث ہوتا ہے۔ البتہ وہ روایت کو یکسر جامد اور غیر متحرک کائی زدہ حقیقت ماننے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس کے برخلاف جدید زاویۂ نگاہ روایت کو ایک متحرک اور نامیاتی حقیقت تسلیم کرتا ہے جو متواتر آگے کی جانب بڑھتی ہی رہتی ہے اور جس میں تبدیلی ناگزیر ہے۔ روایت کا یہ نامیاتی تسلسل اٹل اصول زندگی ہے۔ روایت کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ نئی زندگی لے کر جدیدیت کے لباس میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے (مفصل بحث کے لئے میرا آرٹیکل "جدیدیت اور روایت" ملاحظہ فرمائیے) لہٰذا فرسودہ اور بے روح قدامت زدگی کی تنسیخ، ترمیم، تہذیب اور از سر نو اقدار کی تعیُّن کی شدید خواہش اور اس کے مختلف نئے امکانات اور شکلوں کے ارتقا کی بے پناہ آرزومندی، نئے اور انوکھے پن کی تلاش میں والہانہ انہماک اور شیفتگی اس کی فطری روش ہی نہیں بلکہ مزاج ہے جو ذرا سی غیر ذمہ داری اور سستی شہرت کی ہوس اور سہل انگاری کے باعث اکثر نراج میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جدت جس ذہنی توازن اور سلامت روی، دوراندیشی اور ہوش مندی کی داعی ہے۔ اس کے دونوں جانب [illegible] فرسودگی اور لغویت [illegible] تخیل [illegible] آگے [illegible] فرسودگی کے اندھے کنویں میں ہمیشہ کیلئے دفن ہو جانا ہے [illegible] [ASCENTION] کے اس تخلیقی مرحلہ کو سر کرنا کچھ کم نہیں۔ تاہم تخلیقی ارتقا اور زندگی کے [illegible] کے سلسلے پر فوقیت کی غیر ضروری روایت پرستی، قدامت زدگی اور [illegible] پیشگی کے خلاف سرکشی اور نئے تازہ تجربات اور زندہ احساسات کی بابت یہ ناقابل تسخیر عزم ایک خوش گوار مستقبل کی نوید ہے۔

یہ جدیدیت کا اصطلاحی تصور ہے جس کی معنویت اور دور رسی وقتی حصاروں میں مقید نہیں ہے۔ بلکہ زمانی جبر سے ماورا ہے۔ اس ضمن میں جدید ایک خاص معنی ایک خاص تصور ایک خاص عقیدہ ــــ یعنی محولا بالا اوصاف کا مظہر ہے یہ پر وقت کی بے رحم زندگی کش گرفت نہیں ہے۔ مثلاً ازمنہ وسطیٰ کے رومی فلسفیوں کے برخلاف ارسطو زیادہ جدید ہے۔ شنکراچاریہ کے برخلاف بُدھ کا فلسفہ زیادہ جدید ہے۔ روش صدیقی، اعجاز صدیقی اور نشور واحدی اور دوسرے بہت سارے اسی قبیل کے شاعر کے برخلاف غالب زیادہ جدید ہے۔ ہندی میں سورداس کے برخلاف کبیر زیادہ جدید ہے۔ اگرچہ یہ معنی زمانہ حاضر سے قطعاً غیر متعلق نہیں ہے۔ لیکن زمانہ حاضر کا یکسر دُم چھلا بھی نہیں ہے۔ زمانۂ حاضر کا زندہ ہر مفکر، شاعر، ادیب اور دانش ور جدید نہیں ہوتا۔ جدید دَور کے بیشتر شاعر و ادیب کی نظر قطعاً جدید نہیں۔ (اس میں بیشتر جدیدیت باختگی کے پیشوا زعمائے ادب بھی شامل ہیں جن کے پیچھے تخلیقی ذہانتوں سے عاری اندھی بہری اور گونگی روحوں کا ریوڑ شب و روز گردش کناں آہستہ آہستہ سولہویں پاتال میں دھنس رہا ہے۔) داغ اور نوح کے "سفینۂ ادب" کے کچھوں ہار لوگ اب بھی موجود ہیں جن کی حیثیت آثار قدیمہ سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ عصری تقاضوں سے

[illegible] سے [illegible] جاذ [illegible] کے لئے بند
[illegible] کے سامنے [illegible] ترقی پسند
[illegible] تصورات اور [illegible] نعروں کا
[illegible] نظر آتا ہے [illegible] فیض اور کیفی کے
[illegible] محسوس کرتے تھے۔ آج کے نئے
[illegible] کا ان کیا کہاں ریگ کے مانند ذرہ ذرہ
[illegible] وقت کی ایک ہی گردش کے ساتھ [illegible] کا شکار
ہوگئے۔ [illegible] مسعود اختر جمال، سجاد ظہیر، نیاز حیدر
[illegible] باقر جیسے بہت سارے لوگوں کی حالت سخت عبرتناک
ہے۔ اس طرح تصوراتی معنوں میں "جدید" معاصر سے قطعاً
مختلف اور مخصوص کردار کا حامل ہوتا ہے جو بیک وقت اپنے
پیش رو دور کے تاریخی اقدار کا وارث اور اپنے دور کے تقاضوں
سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے آنے والے دور کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اس
لئے کسی بھی دور کی تحدید و تعیین کے لئے کوئی دو ٹوک جغرافیائی لکیر
نہیں کھینچی جاسکتی۔ نتیجتاً ہر اس ادبی کاوش کو جدید نہیں کہا جاسکتا
جس کی تخلیق مذکورہ صدی میں ہوئی ہو۔ جدت دراصل جدید طرز
فکر، طرز احساس اور انسان کے جذباتی اور فکری وجود کا وہ رویہ
ہے جو [illegible] تناظر سے وابستہ ہونے کے باوجود بہت حد تک
آزاد ہے۔

لیکن آج کے [illegible] تناظر سیاق میں جدیدیت کا ایک
محدود معنی محض عصریت اور جدید کا معاصر بھی اُبھر کر سامنے آیا
ہے۔ اس حوالے میں جدیدیت سے مراد زمانہ حاضر کی آگہی یا
عصری شعور ہے۔ یہاں نظر زمانۂ حاضر پر ہی مرکوز رہتی ہے۔ آج
کے مخصوص صورت حال کا حقیقی ادراک ہی جدیدیت کی اساس
ہے۔ [illegible] زندگی کی سب سے غالب اور موثر حقیقت دوسری
جنگ عظیم کی ہولناکیوں اور ہلاکت آفرینیوں کے سیاق میں سائنس
اور ٹکنالوجی کا ارتقاء ہے جو نہایت سُرعت سے تیز گام ہے۔ اس
[illegible] واضح ہیں۔ [illegible] کی شکست و ریخت
ہوگئی ہے۔ زمان و مکان کی دشواریوں کا سدباب ہو رہا
ہے۔ بڑی طاقتوں کی کشمکش نے نہایت مہیب شکل اختیار کرلی ہے
دو باہم مخالف نظام فکر کے نمائندے آج اتنے زیادہ اضافی
اسلحات سے مسلح ہیں کہ ذرا سے عدم توازن کے باعث کسی بھی
لمحہ عالم انسانی کا مکمل طور پر صفایا ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں
تسخیر خلا کے بڑھتے ہوئے امکانات کے سبب زندگی اور کائنات
کی لامحدود وسعت اور انسان کی کم ادراکی کا احساس شدت سے
بڑھ رہا ہے اور انسانی عظمت کی بابت شکوک فزوں تر ہو رہے ہیں۔
وقت کی ہلاکت آفرینیوں اور تباہ کاریوں کے تناظر میں انسانی زندگی
کی بے حیثیتی، لاحاصلی، بے وقعتی اور بے مقصدی کا احساس
بڑھ رہا ہے۔ حیاتیاتی سطح پر حیاتیات کے تازہ انکشافات
اور شعور اور تحت شعور میں تحلیل نفسی کے تحقیقی نتائج کے اثر
سے داخلی زندگی کے تجربات کی صورت ہی یکسر بدل گئی ہے۔
شعور کی رو کی توثیق کے ساتھ جذباتی اور فکری تصورات کا
پرانا شیرازہ ہی منتشر ہوگیا جس کا ایک صریحی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک
طرف پرانی ریاضیاتی منطق کی تنسیخ ہوئی۔ اور دوسری طرف حیاتی
تجربات کے آزاد وجود کی تردید۔ آدرش ٹوٹنے لگے ہیں اور
قدروں کے زوال کے تصور کی مزید تقویت ہونے لگی ہے۔ یہ
خیال اُبھرنے لگا ہے کہ زندگی کے ناقابل تقسیم بہاؤ میں ماضی تو
یکسر غرق ہو چکا ہے اور مستقبل ابھی غیر مرئی ہے۔ صداقت اگر
کہیں ہے تو وہ محض موجودہ لمحہ کا سیدھا کھرا منہ در منہ جیتا
ہوا تجربہ ہے۔ انسان لمحہ میں ہی جیتا ہے کیونکہ اُس کا تجربہ لمحہ
میں ہی مقید ہے۔ تجربہ ہی زندگی کی واحد صداقت ہے اور
تجربہ کا نہ ماضی ہوتا ہے اور نہ مستقبل۔ اس کا تو صرف حال ہی
ہوتا ہے۔ اس طرح ایک نوعیت کے "لمحہ پرستی" کے مسلک
کی نئے انداز میں تشکیل ہوئی ہے۔ مسیحی اور خدا پرست مفکر [illegible]
گارد اور عظیم فن کار گبریل مارشل نے عقیدت کیشی اور فضل ربی
کے وسیلے سے اور ملحد مفکر ہائیڈگر اور فن کار سارتر نے الحاد اور
[illegible] کا واضح آیا

بے اعتقادی کے ذریعے سے اس "لمحاتی" تصور زندگی کی بنیاد پر اپنے اپنے طور سے وجودیت کی تاسیس کی ہے۔ انسانی وجود ہی واحد صداقت ہے۔ لیکن اپنے فطری روپ میں یہ وجود ایک "دائمی ابتلا" ہے۔ وجود اور اس کے اسرار کا تجربہ "دائمی بوجھ" کے روپ میں ہی انسان کو ہوتا ہے۔ اس لئے آج کا انسان متواتر مشوش ہے اور مسلسل تشویش اور جانکاہی کی یہ کربناک کیفیت جدیدیت کی ایک مابہ الامتیاز علامت ہے۔ زندگی کا شعور آج حد درجہ پے چیدہ اور گنجلک ہو گیا ہے۔ کہن آلود فرسودہ روایتی فلسفۂ زندگی میں مسلم فکر اور جذبے کے علیحدہ علیحدہ شیرازوں کا جو کردار تھا۔ وہ اب فنا ہو گیا ہے اور قوت ارادی اور تمیز کے مطابق ان کی شیرازہ بندی کے مساعد حالات بھی بہت حد تک مفقود ہو گئے ہیں جس کے سبب زندگی کے آب و رنگ قطعاً اڑ گئے ہیں اور اس کے رس کے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔ اب تو صرف پے چیدہ اور خشک احساسات کا دم گھوٹنے والا منتشر اور لمحہ بہ لمحہ سکڑتا ہوا چکرا دینے والا جال باقی رہ گیا ہے۔ اس لئے عصری شعور یک لخت خشک، تلخ، پراگندہ اور قطعاً غیر راحت آگیں ہے وہ کسی نہ کسی نہج سے خوف، تنہائی، کیفیتِ انتشار اور اس ذہنی کرب کا اظہار کرتی ہے۔ جو جدید صنعتی اور میکانکی تہذیب کی لائی ہوئی مادی خوش حالی، ذہنی کھوکھلے پن، روحانی افلاس اور احساس بے چارگی کا عطیہ ہے۔ زندگی کا حسن (اگر اس پرانے فرسودہ لفظ کو استعمال کرنے کے ہی خواستگار ہوں تو) اسی پے چیدگی، روکھے پن، پراگندگی، کھردرا پن اور کرب و ابتلا کے عرفان و آگہی میں پوشیدہ ہے جو تجسس، سنجیدگی اور فریب شکستگی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے زہرناک طنز کو مدغم کر کے ایک جانگسل تیزابیت کو جنم دیتی ہے۔ سماجی سطح پر اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ رشتے ٹوٹنے لگے ہیں۔ انسان اپنے کو گرد و پیش سے کٹا ہوا محسوس کرنے لگا ہے اور معاشرہ میں اس کی اپنی معنویت اور اہمیت کا یقین تقریباً فنا ہو چکا ہے۔ اسے شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک تن تنہا ماندہ درماندہ بے وطن مخلوق ہے۔ اس روز افزوں احساس نے اس کی عصری تنہائی کے مسئلہ کو جنم دیا ہے۔ اس کے گرد و پیش کی آبادی جتنی بڑھتی جاتی ہے۔ اس کی روحانی تنہائی میں اتنا ہی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

زندگی ایک ہجوم گذراں ہے لیکن
آدمی اپنی جگہ عالم صد تنہائی

پیکر ہی تک نہیں محدود دبا سارا وجود
کتنا بھاری ہے یہ تنہائی کا پتھر دیکھو
نصر قریشی

معاشرہ کے ساتھ اس کے سارے روابط درہم برہم ہو گئے ہیں اور ابلاغ کے وسائل تقریباً خالی ہو چکے ہیں۔ اس طرح روحانی، اخلاقی اور سماجی اقدار کے زوال کے نتیجہ میں جدید دور کے نمائندہ جس فلسفۂ حیات کا ارتقا ہوا ہے۔ اس کو درون بیں مفکرین نے وجودیت اور برون بیں دانشوروں نے "قنوطی سائنسی انسانیت دوستی" سے موسوم کیا ہے۔ علی العموم اس فلسفۂ حیات کو ہی جدیدیت کا طغرۂ امتیاز تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی صریحی ناکامیابی یہی ہے کہ وہ انسان کے تخلیقی رجحانات پر پورا زور نہیں دے سکی۔ اس نے انسانی کمزوری کو تو سمجھا ہے لیکن انسانی طاقت کو نہیں سمجھا۔ اس ذہنی رویہ اور بے اہمیتی کے مغالطے FALLACY OF INSIGNIFICANCE کے باعث موجودہ ادب احساس شکست، احساسِ مصیبت اور احساس لاحاصل کا نوحہ خواں بن گیا ہے۔ ہمارے ملک کے جیتے جاگتے مسائل کے سیاق و سباق میں اس سے زیادہ مناسب اور برمحل تو کولن ولسن کی "نئی وجودیت" یا "مظہری وجودیت" ہے PHENOMENOLOGICAL EXISTENTALISM جس نے وجودیت کے یک رخے پن اور نقائص کو دور کرنے کی بہتر سعی کی ہے۔ اس مظہری وجودیت کا پہلا قدم قرار دیتے

حیثیت منطقی اثباتیت، وجودیت اور ہر اس تحریک کی مخالفت کرتی ہے جو انسان کے ارادہ اور تحت الشعوری قوت عمل (یعنی اندرونی محرکات) کو نظر انداز کر کے انسان کی بے اہمیتی کے احساس کو فروغ دیتی ہو اور تخلیقی کوشش کی ضرورت کی طرف سے توجہ کو منحرف کرتی ہے۔ ایک فلسفہ کی حیثیت سے وجودیت کا منصب یہ ہے کہ وہ انسانی ارادہ کی عظمت، فرد کی اہمیت اور حد درجہ نیوروٹک اور کنڈیشنڈ انسان کی بھی آزادی پر اصرار کرے اور اس امر پر خصوصی طور پر توجہ مرکوز کرے کہ آدمی کے طرز عمل کے بارے میں کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔

ولسن کا خیال ہے کہ اس مغالطہ کا مقابلہ فرسودہ مذہبی اور تہذیبی تصورات کو ایک نئی وجودیت سے بدلنے کی ارادی کوشش ہی سے ہو سکتا ہے۔ نئی وجودیت کیرکے گورد، ہائیڈگر، سارتر اور کامیو جیسے مفکرین کے بے بہا کارناموں سے پورے طور پر استفادہ ضرور کرے گی۔ لیکن اس کا بنیادی فرض ان مفکرین کی حدبندیوں (LIMITATION) سے آگے جانا ہے۔ نئی وجودیت ایک قسم کی متصوفانہ (MYSTICAL) بغاوت ہوگی جس کی بنیاد اس غیر منطقی محرک کے اعتراف پر ہوگی جو انسان کی شعوری عقل کی تہ میں ہے۔ ادیب اور شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کے اندرونی جنگل گھر کے شور و شغب کو قابل سماعت بنانے کی کوشش کرے نئی وجودیت کا مطمح نظر وہی ہے جو اصلی آدمی اور مائل بہ داخلیت ہجرت برائے زندگی کے قائل پورے آدمی کا مقصود ہے جو اپنے ذہنی اور روحانی زخم کو چھپا کر کے سماجی جد و جہد سے دوبارہ رشتہ جوڑنے کے لئے کمربستہ ہے جس کا بنیادی مسئلہ اپنے باطن کی طرف مڑنے اور پھر خارج کی طرف لوٹنے کا مسئلہ ہے۔ باطن کی طرف مڑنے کا مقصد اپنی آزادی کو دریافت کرنا ہے۔ باطن سے یہ رجوع فراریت سے قطعاً مختلف چیز ہے۔ ایسا اصلی اور پورا آدمی ہمیشہ اپنی آزادی اور فردیت کے احساس کے سہارے زندگی بسر کرتا ہے۔ دنیا سے اس کی وابستگی (COMMITTMENT) کو اس کی داخلیت سے غذا پہونچتی ہے اور اس کی داخلیت کو سماج کی طرف آنے سے تقویت ملتی ہے۔

ایسا آدمی پوری زندگی کو مقدس مانتا ہے کیونکہ اسی زندگی کی آزادی کے اظہار کی جد و جہد میں سب کچھ شامل ہے۔ گویا مرکزی طور پر نئی وجودیت کا مطمح نظر زندگی کی اہم تحریکات (IMPULSES) اور مقصد سے از سر نو رشتہ استوار کرنا ہے یا بالفاظ دیگر حقیقت سے دوبارہ مربوط ہو جانے کا قوی اور محرک احساس ہے۔ سارتر اور کامیو کی "وجودیت" انسان کی "دہری فطرت" کا بھرپور اور مکمل جائزہ نہیں لیتی۔ اگرچہ وجودیت کا مرکزی خیال آدمی کا رتبہ ہے۔ آدمی خدا ہے یا کیڑا؟ کائنات میں انسان کی PARADOXICAL حیثیت کے احساس (یعنی یہ احساس کہ وہ حیوان اور خدا کے درمیان معلق ہے) کے برخلاف بیشتر اس نقطۂ نظر کا حامل ہے کہ آدمی کیڑا ہے۔ پاسکال کے انسانی عظمت اور دکھ GREATNESS AND MISERY OF MAN کے پس منظر میں وہ صرف دکھ سے کھل کھیلتا ہے۔ یہ وجودیت انسانی نفسیات اور انسانی صورت حال کے تجزیہ کے طور پر جاری رہی ہے۔ لیکن یہ تجزیہ، تحلیل (SYNTHESIS) کے نقطہ تک پہونچنے سے پہلے ہی ٹھٹک کر یکدم توڑ دیتا ہے۔

ولسن چاہتا تھا کہ وجودیت ایک منفی فلسفہ کے بجائے ایک مثبت فلسفہ بنے۔ ولسن کی "نئی وجودیت" یا "مظہری وجودیت" وجودیت کی مثبت شکل ہے۔ سارتر اور کامیو نے وجودیت کو ایک بند گلی میں پہونچا دیا تھا۔ ولسن نے اس بند گلی سے نکال کر آگے بڑھنے کا راستہ سجھا دیا ہے۔ اس نے اس نئی وجودیت میں ایسے فکری عناصر شامل کر لئے ہیں۔ جن کی وجہ سے وجودیت کی بہت ساری کمیاں دور ہو گئی ہیں۔ نتیجتاً وہ نہ صرف ایک مثبت فلسفہ بن گئی ہے بلکہ بیسویں صدی کے سب سے بڑے تہذیبی مرض (جسے انسان کا ذہنی، روحانی اور نفسیاتی مرض بھی کہہ سکتے ہیں) کے مقاومت کے لئے ایک موثر اور کارگر وسیلہ بھی ہے۔ نئی وجودیت ایک ایسا فلسفہ ہے جس کے پاس انسان کے رتبے، خدا، زندگی کائنات، مثالی انسانیت سے انسان کے رشتے کی کوئی واضح امیج

تصورات موجود ہیں ۔ بہت سے لوگوں کو وجودی فلسفہ میں ایک عجیب و غریب قول محال نظر آئے گا ۔ اس فلسفہ کے اصول تو یہ کہتے ہیں کہ یہ فلسفہ انسانی کمزوری اور انسانی حماقت کے بجائے انسانی طاقت انسانی مقصد اور انسانی اختیار پر زور ڈالنے کا خواستگار ہے لیکن ہر وہ مبتدی جو بے جا شمسی جاہلانہ نخوت کے ساتھ وجودیت کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے مثلاً سارتر اور کامیو سے تعلیم کی شروعات کرنا چاہتا ہے ۔ دیکھتا یہ ہے کہ بیشتر توجہ یہ ثابت کرنے پر صرف ہو رہی ہے کہ آدمی خود کو جتنا آزاد تصور کرتا ہے ، اس سے کم آزاد ہے اور یہ کہ دنیا حوصلہ شکن حد تک بدصورت اور مکروہ جگہ ہے ۔ اگر پرانا سارتر ، بکیلے ، کوسلر اور کامیو اور ان کی اندھی اور بے مغز تقلید میں یک لخت فکری اور تخلیقی صلاحیت سے عاری کم نظر اور کم عقل مقلدین اپنے اس دعویٰ پر اصرار کریں کہ وہ جدید دنیا کے حقائق پیش کر رہے ہیں اور ان حقائق کے پیش نظر رجائیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے تو اس کے جواب میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ عذر اسی وقت تک ممکن ہے ۔ جب تک کوئی شخص وجودیت کے بعض مقدمات سے اچھی طرح واقف نہ ہو ۔ وجودیت کے بعض مقدمات کو صفائی کے ساتھ بیان کرتے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حقائق تو ان چیزوں کے نام ہیں جن کا انتخاب آدمی اس لئے کرتا ہے کہ وہ خود کو ان سے آگاہ کر سکے ۔ اپنے ماحول پر انسان کی قدرت ، فوری حقائق سے باہر نکلنے کی قوت سے عبارت ہے اور یہی قوت دنیا سے اس کے رشتہ کی بنیاد ہے ۔ اگر سارتر بکیلے اور کامیو بین قومی حقائق تک اپنے آپ کو پھیلانے کا فیصلہ (وجودیت کی اصطلاح میں انتخاب) کرتے ہیں تو یہ ان کا اپنا معاملہ ہے ۔ لیکن اگر وہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ حقائق صرف اتنے ہی ہیں تو وہ صورت حال کی غلط نمائندگی کر رہے ہیں ان کا یہ اصرار حقائق کی کائنات میں فن کار کے احساس نظم (SENSE OF ORDER) کے مسلوب کرنے کے مترادف ہے ۔

مغرب کے دوسرے منفی مفکروں اور ان سے متاثر ہونے والے یہاں کے بھی نام نہاد مفکرین جدیدیت کی اسی طرح ایک طویل صبر آزما کرب ناک ذہنی اور تجرباتی عمل سے گزرے بغیر مفکر بنے ہیں جو سارتر اور کامیو وغیرہ کا مقدر تھا ۔ وہ ذہنی کرب ناک عمل تو اپنے اوپر سے اُتارنا دور رہا ۔ وہ اس علم جس کے نتیجہ میں یہ افکار ظہور میں آئے ۔ ان نام نہاد دانش وروں کی دسترس سے ہمیشہ باہر ہی رہے ہیں لیکن ان کی فیشن کے طور پر زبردستی اوڑھی ہوئی ذہنی کیفیت اور غیر منہضم تفسیروں کے مطابق بیشتر آج اپنے یہاں کی یجہاتی ، سڑی گلی تے آور جدیدیت کا یہی روپ کارفرما ہے یا یوں کہیں کہ آج کے سیاق میں جدیدیت کے صحیح معنی صرف یہی یا تقریباً اس سے ملتے جلتے ہیں ۔

محولا بالا سیاق میں دو تین سوالات بے اختیار ہی ذہن میں عود کر آتے ہیں ۔ کیا جدیدیت کا یہی محض ایک رسوائے زمانہ عبرت ناک روپ ہے جس میں ہر سو تاریکی ، تلخی ، بے دست و پائی ، الم پذیری اور حرماں نصیبی کی کارفرمائی ہے ۔ اس کی ساری کوشش تاریکی اور گندگی اور کلبیت اور مایوسی کو دوراں کا عیاں بنانے کی ہے جہاں اکثر روشنی اور حلاوت اور ولولہ اور رجائیت ناکام ہو چکی ہے بقول حنیف جعفری ؎

شعر و ادب سے جنس تلک ہم کو جعفری
اچھی ہر ایک طرح کی بے راہروی لگے

یا انسانی حالات کی خرابی سے قطعاً مایوس ہو کر شمس الرحمٰن فاروقی معنی تبسم اور دوسرے مجہول فکری تناسخی گردشوں کے تیل چلے پھرتے کاربن پیپر کے مانند کھٹ سے آسمان کی طرف منہ کر کے اُگلنا چاہتے ہیں کہ اب کچھ کرنا ممکن نہیں ہے ۔ ایشور کی ہتیا ہو چکی ہے نیا شاعر قطعاً بے سہارا ہے ۔ " نیا شاعر نشہ آور خوابوں کے سرور ، خدا باپ ، یا قوم پرستی یا خوش اعتقادی کے FATHER IMAGE کی محفوظ چھت کے سائے سے محروم ہے ۔ " حالانکہ اب بھی کچھ کرنا ممکن ہے اور

[illegible] نئی شاعری ایک امتحان
[illegible] شاعر کے پاس صرف دو چیزیں ہیں ۔
[illegible] کی ہر صورت شخصیت اور شخصیت
کے [illegible] حساس ہونے اور رائے زنی کرنے کا
[illegible] ۔ یہ رائے زنی کسی ہیئت عالم، کسی خارجی دباؤ، کسی
[illegible] کے مفاد و منفعت یا عناد و مخاصمت کے لئے نہیں
بلکہ [illegible] شخصیت اور خارجی دنیا کے ٹکراؤ کے نتیجہ میں اچھلنے
والی چنگاریوں سے اٹھتا ہے ۔ نیا شاعر، شاعری کو صرف شاعری
سمجھتا ہے ———— اگر یہ فن برائے فن ہے تو ہو
[illegible] ہے تو ہو ۔ لیکن نیا شاعر خود کو ہر طرح UNCOMM-
ITTED ۔ سمجھتا ہے ، نئی شاعری کے محتوں کی اس
اکہری عبارت کی بے راہروی سے قطع نظر کیا فنکار کی قدر و
قیمت محض رائے زنی ، آتش باری ، انتشار پسندی ، نراج
[illegible] ، بے سمتی ، بے دست و پائی اور خالص شاعری کے
حقوق میں پوشیدہ ہے یا روزمرہ زندگی کی ناخوشگوار کشمکش میں
اپنے احساسِ نظم (SENSE OF ORDER) اور
انسانی روح کی قوت کے اظہار اور اثبات میں ہے ۔ کچی اور
پست یک رخی ذہانت کے فن کار کے برخلاف بالغ فن کار تو
زندگی کو ابتری (CHAOS) اور نظم کے درمیان ایک جنگ
کے طور پر دیکھتا ہے ۔ یہ احساس نظم کا تصور ہی ہے جو زندگی
کی پیچیدگیوں اور دشواریوں پر فتح کا تصور ہے جو انسان کے
اندر توانائی اور مقصد کا احساس پیدا کرتا ہے اور انسانی تمدن
[illegible] میں بھٹکنے کے بجائے اور آگے بڑھنے میں مدد دیتا ہے ۔ مقصد
[illegible] تصور ہے وہ مینہ اور میسر کی زندگی تو ہو سکتی ہے لیکن
[illegible] جس کی زرخیزی نئے زندگی آگیں امکانات کی مانند
[illegible] کیا زندگی کے انتشار کی مصوری ہی کافی ہے یا فنکار
[illegible] فن کو زندگی کے انتشار کے ریگستان
[illegible] نخلستان کی تخلیق کے لئے

استعمال کرے ؟ بغاوت برائے بغاوت کوئی معنی بھی رکھتی ہے
آیا بغاوت کی کوئی سمت بھی چاہیئے ؟ صحیح اور صحت مند بغاوت
بے اطمینانی ، گھٹن اور بے دست و پائی کے اظہار کا نام نہیں
ہے ۔ اسی طرح ول سنکر نے رومانیوں کا یہ نظریہ بھی کہاں
تک جائز ہے ۔ کیا تاریخ جدید معاشرہ اور تمدن ایک زبردست
غلطی ہے ، کیا اس وقت ہماری حالت واقعتاً بہتر ہو جائے گی
جب ان " بے سہارے کھنڈروں اور ویرانوں " پر پھر سے
میدانوں اور دریاؤں کا تصرف ہو جائے ۔ سوال اٹھتا ہے کہ
تمدن ، انسانی روح کے اظہار کے لئے وجود میں آیا تھا یا کہ
اس کا گلا گھونٹنے کے لئے ۔ اگر وہ ان زندہ درگاہ معصوم روحانی
محرومیوں " الجھی ہوئی اور بکھری " روحوں کا گلا گھونٹ رہا
ہے تو یہ ایک تاریخی حادثہ ممکن ہے ہو نہ کہ ناگزیر حالت ۔ کیا
آج کے تمام بیدار مغز ناقد جدید عصری شعور کی اسی طرح غیر جانبدار
کلیت زدہ یاس آگیں تفاسیر کرتے ہیں ۔ اگر یہی تعریف مناسب
ہے تو جدیدیت کہاں تک مناسب ہے ؟ کیا جدیدیت کو
بذاتِ خود " قدر " مانا جا سکتا ہے وغیرہم ؟

شیشہ کی الماری کے ان شیروں کی رومانی دہاڑ
سے قطع نظر جدیدیت کے مفہوم کے صحیح ادراک کے لئے محولا بالا
باتوں پر سلسلہ وار غور و فکر کی زحمت قبول کرنا مناسب ہوگا

کیا جدیدیت کا محض یہی ایک روپ ہے ۔ اس کا جواب
دینے سے قبل ایک اور سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ جدیدیت
کے محرک اور فیصلہ کن خلاق عناصر کیا ہیں ؟ اس دوسرے سوال کا
جواب یہ ہے کہ جدید یا کسی بھی دور کا اپنا مخصوص رنگ و روپ
یا بناؤ بگاڑ درحقیقت اس دور کے ایسے واقعات کے ذریعہ
ہوتا ہے جن کا اثر زیادہ سے زیادہ گہرا اور وسیع ہوتا ہے ۔
موجودہ دور کے اہم محرکات ہیں ۔ خارجی زندگی میں سائنس کے
تازہ ترین انکشافات ، ایٹمی طاقت کی تحقیقات ، خلائی
فتح مندیاں اور داخلی زندگی میں تحت شعور اور لاشعور کا انکشاف

ان نئی ریشہ گریوں نے موجودہ زندگی اور اس کے ذہن و شعور کو متاثر کیا ہے۔ اس میں چوں و چرا کی قطعاً گنجائش نہیں۔ دانش وروں کا طبقہ جس کا اہم جزو فن کار ہے۔ اپنے نازک احساسات کے ذریعہ ان کے نازک اثرات کو براہ راست قبول کر رہا ہے اور عوام پر ان کے مادی اثرات تقریباً بالواسطہ طور پر مرتب ہو رہے ہیں۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا ان کا اثر صرف بدحواسی، الم پذیری اور کرب ناکی کا ہی پروردگار ہے یا ہو سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایٹمی طاقت کے استعمال سے اقتدار کے تصادم اور ٹکراؤ میں جو ایک نیا تباہ کن ڈائمنشن سامنے آیا ہے۔ اس میں ساری دنیا کی تاراجی کے امکانات پوشیدہ ہیں اور وقتاً فوقتاً رونما ہونے والے سیاسی زلزلے ذکی الحس افراد کے دل میں یہ خوف بھی پیدا کر سکتے ہیں کہ خطرہ شاید کافی نزدیک ہی کہیں منڈلا رہا ہے۔ لیکن یہ اس واقعہ کا ایک پہلو ہے اور بہت حد تک مسخ شدہ پہلو ہے۔ ان تمام اختراعات و انکشافات کا استعمال انسان کے فلاح و بہبود، سعادت افروزی، بہجت اندوزی اور زندگی کی زیادہ سے زیادہ کثیر الابعاد معنویت اور برکت کے لئے بھی تو ہو سکتا ہے۔ درحقیقت یہ منفی تصور کس قدر نامناسب، تاریک اندیش اور مذموم ہے کہ آج کے سائنس دانوں کی غیر معمولی ذہانتیں صرف عالمی استعمار اور تاراجی کا ہی اختراع کر رہی ہیں۔ یقیناً خطرہ کا وسوسہ غلط نہیں ہے۔ لیکن وسوسہ کا مقصد متنبہ کرنا ہے نہ کہ حواس باختگی اور ذہنی طور پر بے دست و پائی اور نراج کی فضا کو یہاں سے وہاں تک پورے ملک میں مسلط کرنا ہے اور انسانی ارادے، تحت شعوری قوت عمل، زندگی کی بشارت اور قوت شفا سے یقین اٹھا کر قوت رجولیت سے محروم ایک ایسے انسان نما چوپایہ میں تبدیل کر دینا ہے کہ جس کی ہیئت کذائی کو دیکھ کر کراہت ہونے لگے۔ اس تہذیبی خطرہ سے ہوشیار ہو کر آج کے تمام بیدار مغز مفکرین اور دانشور انسانی زندگی کے مستحسن پہلو کا تصور بھی تو کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ لیکن نیا سر بگریباں فیشن زدہ مفکر یہ کہتا ہے کہ جدید عصری شعور یہ نہیں ہے۔ یہ تو پرانا نظریہ ہے جو اشیاء کو حقیقی شکل میں نہ دیکھ کر اس کے [illegible] تصور کرنے میں ہی یقین کرتا ہے۔ ہمارے خیال سے یہ ایک قطعاً ناروا تصور ہے ایک نوع کی ذہنی عصبیت ہے۔ آج کی حقیقت محض زوال اور انحطاط پر دال ہے۔ یہ ایک سہمی ہوئی بداندیشی اور دم توڑتی ہوئی ذہنی گھٹن اور جلن ہے۔ زوال اور انحطاط کی کیفیت بھی ایک گھورتی ہوئی سچائی ہو سکتی ہے۔ اس بات کو آج بہت سارے باریک بین اور ذکی الحس فن کار بڑی شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن یہ پوری سچائی نہیں۔ اس کا ایک رخ ایک رو ایک پہلو ہے۔ سائنس کا قانون بھی وسیع الامکان دور رس تنظیم اور ہمہ گیر ارتقا کا متلاشی ہے۔ زوال اور انتشار کا ہرگز نہیں۔ ایٹم کے تجربات کا مقصد بھی حتی الامکان زندگی کی ترقی اور تنظیم ہی ہے۔ روحانیات کے شعبہ میں طاقت کا جو لطیف سے لطیف تر تصور کیا گیا تھا۔ آج کے سائنسی تجربات انھیں کی مادی تعبیریں ہیں۔ اسی طرح داخلی زندگی میں تحت شعور کے انکشاف کے نتیجہ میں مسلسل شعور کی رو کی توثیق سے ہمارے اخلاقی اور حسی اقدار میں یقینی طور پر ہی ترمیم ہوا ہے۔ حیاتیاتی میلانات اور جبلی عوامل کی اہمیت فزوں ہوئی اور میکانکی اوپر سے مسلط غیر لچک دار قوت تمیز اور تعقل کا جبر کم ہوا ہے۔ لیکن اس کے سبب شعور کو نئی اندرونی روشنی اور گرمی نہیں ملی۔ صرف تاریکی، تلخی کرب ناکی اور غیر آسودگی کی افزائش نہیں ہوئی ہے۔ یہ تصور بھی یک رخے پن اور انتہا پسندی کا چیختا ہوا ثبوت ہے۔

فرائیڈ نے حسی بہجت اندوزی کے نظریہ کو ہی تمام حیاتیاتی زندگی کی بنیاد مانا ہے اور ینگ کا نظریہ تو موجودہ دور میں احوال حیات کا سب سے مستند بیان ہے۔

ایسی حالت میں جدیدیت کو ایک محیط نومیدی اور الم پذیری کے چاروں کھونٹ میں باندھ دینا عصری صداقت نہیں ہو سکتی۔ وہ صداقت کی مسخ شدہ شکل یا زیادہ سے زیادہ صداقت کا محض ٹیڑھا اور اوندھا پرچھاواں ہو سکتا ہے اور بفرض

[illegible] مثال کے لئے، ان بھی لیا جائے کہ آج جدیدیت کی
غالب علامت یہی ہے تو اس طرح کی جدیدیت کیا مستحسن ہے ؟
یہ ٹھیک ہے کہ کچھ خاص غیر معمولی حساس اور شاید اعصاب
زدہ لکھنے والوں کو اس طور سے حقیقت کا ادراک ہوا ہے اور ان
کے اپنے احساس و تجربہ کی شدت کے سبب یہ شعور متعدی طور سے
نئی نسل کے دوسرے بہت سارے ہم مشرب شاعروں میں سرایت
کر گیا ہے۔ اس نوعیت کی ظلمت شعار حقیقت شناسی اور
حقیقت افروزی کا سچا احساس اور کامیاب اظہار بھی فن ہو سکتا
ہے۔ اس سے ہم انکار نہیں کرتے۔ لیکن فن کی بنیاد یہاں احساس
کی سچائی اور اظہار کی کامیابی ہی ہے۔ نام نہاد سطحی حقائق کا ادراک
یا فیشن زدہ "جدیدیت" فن کی بنیاد نہیں ہے۔ کہنے کا مقصد
یہ ہے کہ عصری آگہی کو جدیدیت کی علامت ماننا تو مناسب ہے
لیکن کلبیت اور یاسیت زدگی کو ہی عصری آگہی کی اول و آخر
پہچان مان لینا قطعاً مناسب نہیں ہے۔ ہمیشہ کے مانند آج
بھی ناامیدی اور تاریکی کو چیر کر ظاہر ہونے والی امید کی روشنی
ہی زندگی کی کھلی اور ہزاروں زبان سے چیخنے والی علامت
ہے۔ حقیقت کے شعور و ادراک کی کوئی ایسی بھنک اور
کٹر صب ظلمت پسند تعریف جو زندگی کی ہی سرے سے تنسیخ کرے
یکسر باطل ہی مانی جائے گی۔ علاوہ ازیں ادراک حقیقت
کو شعوری عمل نہ مان کر ایک فطری یا لواسطہ عمل ماننا ہی مناسب
ہے۔ پہلی حالت میں شعور غالب ہو جاتا ہے اور احساس مغلوب
فکر (عمرانیات وغیرہ) کے دائرہ میں تو شعور و تجزیہ کی اولیت
ٹھیک ہے۔ لیکن زندگی کے عوامل میں اور اس سے زیادہ تخلیقی
امور میں شعور کی فوقیت سد راہ ہی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا جدیدیت کو قدر
کے روپ میں تسلیم کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ جدیدیت اسلوب محض ہے
اسلوب یا طور کے روپ میں اس کا اثر مسلم ہے۔ لیکن اسلوب سے
زیادہ اس کی اہمیت نہیں ہے۔

ادب کے ضمن میں بھی جدیدیت اسی قدر اہم اور موثر و
کارگر ہے جس قدر اس کی حیثیت زندگی کے سیاق میں مسلم ہے۔
جینا حال میں ہی ہوتا ہے۔ ماضی یا مستقبل میں نہیں۔
لیکن انسان حال میں ماضی کے اثرات اور مستقبل کے تصور کے ساتھ
ہی جیتا ہے۔ لہٰذا ماضی سے کٹا ہوا اور مستقبل سے یکسر روگرداں
جدیدیت کا عقیدہ (مغالطہ کہنا زیادہ مناسب ہے) فریب
نظر ہے۔ علی العموم تخیل پرست لوگ اور علی الخصوص فکر و فن
کے سیاح دوسروں کے بمقابلہ زیادہ خواب خیال پسند ہوتے ہیں۔
اپنی مخصوص نفسیاتی مجبوریوں اور دائروں کے سبب اکثر اوقات
وہ حال کی بہ نسبت ماضی اور مستقبل میں ہی زیادہ جینے کی خواہش اور
کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ماضی اور مستقبل کو بھی حال میں جئے بغیر ان
کی تخلیق میں روح کا نفوذ نہیں ہوتا جس طرح زندگی کے لئے حال
کا بھوگنا اور جھیلنا ضروری ہے اسی طرح ادب کے لئے بھی حال
کا سچا احساس و تجربہ ناگزیر ہے۔ لیکن جس طرح زندگی کی کیفیت
ماضی اور استقبال کے اندرونی تواتر سے ٹوٹ کر ممکن نہیں اسی
طرح تخلیق فن بھی ماضی کے اثرات اور مستقبل کے خواب کے بنا
ممکن نہیں ہو سکتی۔ یعنی حال کا مکمل شعور و ادراک حسین اور نادر
عناصر سے یکسر خالی نہیں ہوتا۔

"جدید" کے مفہوم کو نہایت وسیع اور متحرک روپ میں
ہی تسلیم کرنا چاہئے۔ عصری آگہی، روایت کی ترمیم، زندگی کی
بے پایاں آرزومندی، اپنے نواح کے وسیلے سے تحقق ذات
ہمہ گیر ارتقا کی شدید خواہش وغیرہ ہی اس کی سچی علامتیں ہیں۔
زوال یا انحطاط زدگی یا یاسیت اور کلبیت پسندی وغیرہ تک
ہی آج کی یا کسی بھی دور کی جدیدیت کو محدود کر دینا سالم
عصری آگہی کی غماز نہیں ہے جو زندگی کی ہی علامت نہیں ہے۔
وہ جدیدیت کی علامت کیسے ہو سکتی ہے ؟

جدیدیت کا شعور زندگی کے مانند تخلیق ادب کے اسلوب
و طور کا ہی حصہ ہے اور یہ شعور جتنا گہرا اور شدید ہوگا اتنا ہی
موثر اور کارگر ہوگا اور شاید مفید مطلب بھی۔ تاہم یہ اسلوب

محض ہی رہے گا اور اسی حیثیت سے اس کی اہمیت بھی برقرار رہے گی ۔ صحیح معنوں میں یہ قدر کی حیثیت نہیں اختیار کر سکتی ۔ یعنی اس کی بنیاد پر ہی کلی طور پر ادب کی حیثیت اور وصف کی قدر و قیمت کا فیصلہ کرنا مناسب نہیں ہے ۔ حقیقی اور زندہ احساس کا کامیاب اظہار ہی ادب کا بنیادی عنصر ہے اور احساس کی شدت اور اظہار کی کامیابی کی بنیاد پر ہی ادبی اوصاف کا تعین مراتب کیا جا سکتا ہے ۔ احساس کے تعین مراتب کی پہلی کسوٹی اس کا انسانی وصف ہے اور انسانی وصف کے فیصلہ کن عناصر حُسن اور خیر ہیں ۔ اُس کی سطحیں مختلف ہو سکتی ہیں ۔ اُدھر اظہار کی قدر و قیمت کے تعین کی کھری کسوٹی ابلاغ ہے ۔ نیا شاعر و ادیب شاید اپنی بے بضاعتی کے باعث اسی متوازن اور مکمل نظر اور احساس نظم سے بغاوت کر رہا ہے ۔

لیکن عالمی ادب اور قومی سیاق کے بنیادی مسائل پر گہری نظر رکھنے والوں کی اپنی مجبوری ہے کہ وہ اس سے زیادہ سچی اور کھری کسوٹی کا تصور نہیں کر سکتے ۔ یہاں پھر ایک اہم سوال اٹھتا ہے کہ اس نام نہاد بغاوت کی نہج کیا ہے ؟ کہیں یہ خالی خولی مختلف رد اعمال کے اندر ایک نئے کھوکھلے مریضانہ رد عمل کا سلسلہ تو نہیں دراز کر رہا ہے جو تہذیبی انحطاطی کیفیت کی مزید تقویت کر رہا ہے ۔ تہذیبی انحطاط بذات خود کیا ہے ! اس کا عندیہ کیا ہو سکتا ہے ؟ تہذیبی انحطاط سے مراد اگر تہذیبی قدروں کا زوال ہے تو تہذیب تو سیدھے ان لطیف ترین عناصر کے مرکب کا نام ہے جن سے انسانی شعور کی تہذیب و تکمیل ہوتی ہے ۔ بنیادی طور پر ان عناصر کی کارفرمائی حُسن، خیر اور صداقت کے تثلیث میں مکمل طور پر ہو جاتی ہے ۔ صرف صداقت فلسفہ کا موضوع ہے ۔ صرف خیر اخلاقیات کا اور فن میں تو اساسی طور پر حسن کی ہی اہمیت ہوتی ہے ۔ لیکن تہذیب میں ان تینوں کا امتزاج رہتا ہے ۔

لہٰذا تہذیبی قدروں سے مراد ان عناصر سے ہے جو نہ صرف صداقت کی تلاش دیانت میں معاون ہوتے ہیں بلکہ زندگی کو ہر جہت فلاح و بہبود اور ہمہ گیر ارتقا میں معاونت کرتے ہیں اور جمالیاتی شعور کو زیادہ بیدار، زیادہ منوّر اور زیادہ [illegible] بناتے ہیں ۔ انحطاط کا مطلب ہی یکسر نفی اور عدم قبولیت کی وہ جوشش زہر بار تخریب ہے جو معنوی طور پر ایک طرف صداقت، خیر اور حُسن کے عقیدہ اور دوسری طرف خیر و شر، جھوٹ اور صداقت اور حسن اور غیر حسن کے فیصلہ کن عناصر یا معیاروں کے سرے سے انکار کے درپے ہوتی ہے ۔ اس سیاق میں اوپر کے سوالوں سے منسلک تین اور نازک سوالات فطرتاً سر اٹھاتے ہیں ۔

(۱) عصری شعر و ادب میں اس ناگہانی بلا کی کہاں تک کارفرمائی ہے ؟

(۲) اس کے وجوہات اور مقاصد کیا ہیں ؟

(۳) اس نوعیت کے ادبی مشمولات کی قدر و قیمت کیا ہے ؟

فی زمانہ اردو ادب کی تخلیقی کاوشوں میں تہذیبی قدروں کا زوال کہاں تک ملتا ہے ۔ موجودہ دور کے قلم کاروں کو واضح طور پر سہولت کے لئے دو طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ ایک طبقہ ان فن کاروں کا ہے جو اپنے مخصوص شعبہ میں ایک معتبر مقام بنا چکے ہیں ۔ ان کی حیثیت بہت حد تک مسلم ہو گئی ہے اور جن کا زاویۂ نظر بھی ایک خاص نہج کا حامل ہے جس سے سر مو انحراف کے وہ قائل نہیں ہیں ۔ ان میں سے بھی بیشتر میں مزید سرتابی اور اولوالعزمی کا اب فقدان ہے ۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی میں گھن لگ گیا ہے اور ان کا سر جھولتے ہوئے اپنے ہی قدموں کے چھوڑے ہوئے نشانوں کی جبہ سائی کر رہا ہے ۔ وہ اپنی خالقانہ عظمت کو فراموش کر کے ان مٹتے ہوئے آثار کو ہی زاد راہ کے طور پر سجود سمجھ بیٹھے ہیں ۔ اس جرگہ کے ادیب، شاعر اور افسانہ نگار یا ناقد تقریباً زندگی کے وسیع الامکان تا بیاتی مثبت اقدار میں عقیدہ رکھتے ہیں ۔ ان کے پاس ایمان و ایقان کی دولت بیدار بھی ہے ۔ ان میں سے

[illegible] تلاش، دیوانگی اور عرفان سے ملتی جلتی ہوئی [illegible] ہوگئی ہے۔ اس طبقے کی اکثریت کے مانند ایمان کی [illegible] ہیں جو اپنی گردن سے لٹکائے ہوئے وہ اپنی ذہنی [illegible] کا خوشنما لاک نہیں بنے ہوئے ہیں جن کی کچھ خیالوں کی بھیک اور سچ تو آج انھیں ہی پلٹ کر زندہ درگور کر دینے کے درپے ہیں۔ ان محدود سے چند لوگوں کے خلوص پر شک نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے اپنے فن تیکنیک کے مخصوص تجربات کے تحت زندگی کے عقیدے اور نظریے مختلف ہوسکتے ہیں۔ مثلاً کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، فراق، سردار جعفری اور اختر الایمان کے عقیدے بھی مختلف ہیں۔ لیکن دونوں گروپ کے فن کاروں کو زندگی کے نامیاتی امکانات سے قطعاً انکار نہیں بلکہ اس سے لگاؤ ہے۔ اب اس لگاؤ کی نوعیت مختلف ہوسکتی ہے۔ اس کی سطحیں بدل سکتی ہیں۔ لیکن یہ لگاؤ شدید ہے۔ لہٰذا اس طبقہ کے ادیبوں میں تو تہذیبی قدروں کے انحطاط کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ یہ ادیب اور شاعر موجودہ زندگی کے انحطاطی عناصر سے تغافل کناں یا روگرداں نہیں ہیں اور نہ وہ قطعاً مایوسیوں کی زہرناکیوں کا شکار ہو کر سر بگریباں مراقبے کے عالم میں چلے گئے ہیں۔ دوسری شق کے پیش رو شاعر میراجی، ن۔ م۔ راشد اور ان کے فیشن ایبل ہم مشرب جو شروع میں انتہا پسندی اور بوالعجبی کا علامیہ بن گئے تھے۔ ان کی تخلیقیں بھی ہمیشہ [illegible] نہیں رہیں اور نہ انھوں نے "گو بر پا تھے" اور گھورے کے گوشے بنے رہنے پر اکتفا کیا۔ بعد میں ان کے یہاں بھی [illegible] بناؤ اور نکھار میں انبساط کے عناصر غیر جذباتی اور اشاراتی طور پر وافر ملتے ہیں۔ صرف ان کا اپروچ مختلف ہے۔ زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کے مختلف طریق کار ہوسکتے ہیں ان کی غیر جذباتیت اور اشاریت اول الذکر طبقہ کی اکثریت کے [illegible] سے اکثر زیادہ موثر اور کار گر ہے۔ فراق، سردار جعفری اور فیض ایک طرف اختر الایمان منیب الرحمٰن، خورشید الاسلام وغیرہ دوسری طرف اور کرشن مرحوم منٹو، راجندر سنگھ بیدی، قرۃ العین حیدر، عصمت، عزیز احمد، احمد عباس اور بلونت سنگھ وغیرہ کو موجودہ دور کی ناہمواریوں اور بے عنوانیوں کا عرفان ہے۔ لیکن یہ نہ تو ان ناہمواریوں کو آج کی زندگی کا مکمل روپ مانتے ہیں اور نہ انھیں زندگی کی کلی حقیقت ـــــ یہ انحطاطی احوال و کوائف کی تفسیر و تعبیر اپنے حدود کے ساتھ پوری ذہنی یکسوئی اور خلوص سے کرتے ہیں۔ لیکن اُسے زندگی کا خراج ہی مانتے ہیں۔ مزاج نہیں۔ اُن کے ذریعہ انحطاط کے تجزیہ میں انسلاک کی کیفیت لازمی طور پر کارفرما رہتی ہے یعنی یہ امر کہ موجودہ انحطاط آج کا بدترین المناک سانحہ ضرور ہے لیکن وہ زندگی کا دائمی مظہر نہیں ہے

دوسرا طبقہ نئے سخن کاروں کا ہے جو اپنے پیشرو قلمکاروں کی تخلیقات کو آج کا نمائندہ تسلیم نہیں کرتا۔ اس کا خیال ہے کہ یہ گئے گزرے زمانہ کی مٹتی سی آوازیں ہیں جو روایت زدگی کی اسیر ہونے کے سبب موجودہ دور کے حقائق کی آگہی کی امین نہیں ہیں۔ ان نئے فن کاروں میں تہذیبی اقدار کے انحطاط کی تیکھی تصویر کشی کی شدید خواہش کارفرما ہے۔ ان کے یہاں اقدار کی شکست و ریخت پر خارا شگاف طنز کے دستیاب ہوتے ہیں لیکن جیسے جیسے یہ شاعر و ادیب خود بھی معتبر مقام حاصل کرتے جاتے ہیں۔ ان کی حیثیت بھی تسلیم کی جانے لگتی ہے۔ تو ان کی تخلیقی کاوشوں میں بھی تہذیبی اقدار کی بابت براہ راست یا بالواسطہ طور پر وابستگی عود کر آتی ہے۔ نئے لکھنے والوں کی پہلی نسل کے وزیر آغا، سلیم احمد، محبوب خزاں، باقر مہدی، وحید اختر، قاضی سلیم، بلراج کومل عمیق حنفی، حسن نعیم، شاذ تمکنت، عزیز قیسی، خلیل الرحمٰن اعظمی بشیر بدر، ندا فاضلی اور بشیر نواز ادھر افسانہ نگاروں میں عبداللہ حسین، جمیلہ ہاشمی، انتظار حسین، انور سجاد، غیاث احمد گدی، جوگندر پال، کلام حیدری اور [illegible]

[illegible] کی نئی شاعری ـــــ محمد احسن فاروقی

شعور ہے۔ باقر مہدی جیسے سرکش شاعر و نقاد کی ساری ادبی کاوشوں میں یہ شعلہ آسا خارا شگاف آگہی و بے باکی کی منہ زور تیز لہر رواں دواں ہے۔ لیکن یہ فن کار بھی انحطاط و زوال کا احساس و تجربہ خواہ کتنے ہی شدید روپ میں کیوں نہ کریں۔ اُسے زندگی کی دائمی حقیقت نہیں مانتے۔ ان کی غیر معمولی پختہ کار منتخب تخلیقات میں انحطاط اور انتشار کے کرب میں پوشیدہ انسلاک او تنظیم کی آرزو کم سے کم بالواسطہ طور پر ضرور کار فرما ہے جیسے جیسے ان کی نظر میں وسعت آتی جاتی ہے ویسے ویسے ان کی زندگی کے اقدار میں بھی ایک ذو معنی ٹھہراؤ اور وسیع الامکان پائیداری آتی جاتی ہے۔ زندہ متحرک اور نامیاتی روایت کی مخالفت کم اور نراج کو بعینہٖ نراج تسلیم کرانے کا اصرار کم ہوتا جاتا ہے۔ انحطاط یا نراج کی کارفرمائی دراصل مختلف کردار اور بصیرت کے ساتھ کچھ بے حد نئے جان دار شاعروں اور ادیبوں کے یہاں محتاط طور پر اور کچھ کے یہاں قدرے غیر محتاط طور پر ہوئی ہے۔ شہریار، ظہیر صدیقی، پرکاش فکری، شکیب جلالی، عبید اللہ علیم، ظفر اقبال، ساقی فاروقی افتخار جالب، اطہر نفیس، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، بمل کرشن اشک، کمار پاشی، عادل منصوری، زیب غوری، محمد علوی، مخمور سعیدی، سلطان اختر، شاہد احمد شعیب، فضیل جعفری نصر قریشی، زبیر رضوی، مدحت الاختر، شمیم حنفی، علیم اللہ حالی لطف الرحمٰن، قمر اقبال، ممتاز راشد، صہبا وحید، محمود ایاز مصحف اقبال توصیفی، شہاب جعفری، انتخاب سید، حمید الماس، کامل اختر، حمدون عثمانی، فضل تابش، عتیق اللہ، وہاب دانش، صادق وغیرہ بحیثیت شاعر، سریندر پرکاش، محمد عمر میمن، بلراج مین را، احمد ہمیش، وہاب اشرفی، احمد یوسف شفیع جاوید، اقبال متین، محسن شمسی، الیاس احمد گدی، ظفر اد گانوی، اختر یوسف اور اکرام باگ وغیرہ جو چند نام مجھے روا روی میں مثال کے لئے بے اختیار یاد آرہے ہیں۔ اس ضمن میں قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے کئی لایعنیت اور لغویت کے

فلسفہ (یا فیشن) کو غیر معمولی مبالغہ آمیز اصرار کے ساتھ قبول کرنے کے لئے بے چین ہیں تاکہ وہ اپنی جگہ سے ترالی اور تمام تر منفرد کو دوسروں سے متاثر کر سکیں۔ حالانکہ ایسی کوششیں کانٹے سے رس نچوڑنے کے مترادف ہیں۔ جس میں اپنی ہی انگلیوں کے زخمی ہونے کے خطرات ہیں۔ ان کے متوازی شمس الرحمٰن فاروقی اور مغنی تبسم جیسی زبردستی شاعر بن بیٹھنے والی شہرت کی استسقائے پریشان روحوں کا ایک گلہ ہے جن کا نام گنوانا وقت ضائع کرنا ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک شاعرہ ناہید ثانی کی شاعری بیک وقت "نور جہاں" اور "جہانگیر" بننے کے شب و روز کے خیالی پلاؤ اور خود زدگی کے باعث "مخنث" ہو گئی ہے۔ جس میں شمس الرحمٰن فاروقی اور فضیل جعفری کے سوا کسی اور کو بھلا کیا دل چسپی ہو سکتی ہے جن کا نعرہ ہے۔

شعر و ادب سے جس تلک ہم کو جعفری
اچھی ہر ایک طرح کی بے راہروی لگے

آج کے ادب میں تہذیبی انحطاط کے لئے یہ کشش کیوں ہے

اس کے اسباب کو موجودہ دور کے سنگین اور سفاک احوال و کوائف میں ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ اس کے بارے میں اوپر تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ لیکن یہاں تین جملوں میں اس کا اعادہ کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

(۱) گزشتہ جنگ عظیم کی ہولناکیوں کے سیاق میں طبعیات کی غیر معمولی ترقی کے باعث استعمار آمیز اسلحہ اور مواد کی فراہمی اور اس سے عالمی تاراجی کا خطرہ

(۲) خلائی مہمات کی روز افزوں کامرانی کے نتیجہ میں زندگی کے پھیلاؤ اور انسان کی مسلمہ عظمت کی مشکوک حالت۔

(۳) حیاتیات اور نفسیات کی تازہ ترین تحقیقات کے سبب از کار رفتہ کہن آلود علم منطق اور قوت تمیز کی ایک طرف اور اخلاقی اور حیاتی اقدار کی دوسری طرف بیخ کنی۔

ان سخت حالات کے سبب سے موجودہ زندگی میں ایک

[illegible] کی کرب ناک اور عملی نفوذ کر گئی ہے۔ انجام کار ایک [illegible] زندگی کش غیر رجائی فلسفۂ حیات اُبھر کر سامنے آیا ہے جس کا [illegible] تجزیہ اور مذکرہ کر چکا ہوں۔ اس ذہنی رد کی دآمد ہندوستان میں مختلف زیر زمیں مقاصد سے نہایت منظم طور پر دس پندرہ سالوں سے ہو رہی ہے جس کی اثر اندازی میں ملک کی روز افزوں [illegible] ہوئی سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالت نے اور مدد کی ہے۔

(۳) اس طرح کی نگارشات کی قدر و قیمت کیا ہے؟

جس ادب میں تہذیبی اقدار کے زوال کا نعرہ ہی اہم ہے یا جو اعلیٰ و برتر زندگی کی اساسی قدروں کی تنسیخ پر ہی مصر ہے اس کی کیا قیمت ہے؟ درحقیقت تہذیبی اقدار کے انحطاط کا شعور اور شعر و ادب میں اُس کا اظہار بذات خود بُرا نہیں ہے موجودہ زندگی میں جو ناہمواری، کرب اور سیماب پائی کار فرما ہے۔ اس کا شدید احساس فن کار کے غیر معمولی بیدار عصری آگہی کا ثبوت ہے جو فن اور فن کار دونوں کے لئے مستحسن ہے۔ لیکن انحطاط کا شعور اور احساس ایک بات ہے۔ لیکن اسی کو پوری سچائی مان کر زندگی کے نامیاتی اعلیٰ اقدار کی تنسیخ یکسر دوسری بات ہے۔ مرض کی تشخیص اور علاج تو مناسب ہی ہے۔ لیکن مرض کی تکلیفوں کی تاب نہ لاکر اسے جسم کا عین فطری تقاضا مان لینا یا صحت پانے کے جذبہ کو ہی سرے سے اکھاڑ پھینکنا تو ٹھیک نہیں ہے۔ موجودہ زندگی میں کار فرما انحطاط کی بابت ہوشمندانہ قوت تمیز سے مملو زاویۂ نظر بھی ہے۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ قوت تمیز کا تو وجود ہی آج ریزہ ریزہ ہو گیا ہے۔ اس لئے تمیز کی دُہائی دینے سے کیا فائدہ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ صحیح یا غلط میں تو اب بھی یہی مانتا ہوں کہ میری قوت تمیز پاش پاش نہیں ہوئی اور [illegible] یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ خدانخواستہ کوئی اس [illegible] سانحہ اُن کو پیش آیا ہے۔

پھر بھی فلسفۂ تنقید کا ایک نقطہ ایسا ہے جس سے انکار کرنا میرے لئے دشوار بات ہے اور وہ یہ ہے کہ اخلاقی اقدار کا احترام کرتے ہوئے بھی فن اپنے خالص روپ میں اُن سے بہت حد تک آزاد ہے یا یوں کہئے کہ ان سے بالا ہے۔ لہٰذا اگر آج کا کوئی فن کار مختلف وجوہات کے سبب زندگی کی بابت اپنا ایمان کھو چکا ہے اور وہ اپنی بے اعتقادی اور حرماں نصیبی کا اظہار پوری سچائی سے کرنے پر قادر ہے یعنی اگر اس کے احساس میں شدت اور اظہار میں اُسے ترسیل کرنے کی بھرپور صلاحیت ہے تو میں صرف اخلاقیات کی بنا پر اس کی قدر و قیمت کا منکر نہیں ہو سکتا۔ انحطاط یا بے اعتقادی کا سچا شعور بذات خود ایک شدید کرب و درد کا احساس ہے اگر اس کے بھوگنے والے میں اتنا فنی دم خم ہے کہ وہ اس کا تخلیقی استعمال کر سکتا ہے تو اس کی تخلیق کی فنی قدر و قیمت کو تسلیم کرنے کے لئے میں مجبور ہوں۔ جگہ کی کمی کے سبب مجبوراً مثالیں فراہم کرنے سے قاصر ہوں۔

عصری ادب میں مذکورہ انحطاط کے اثرات کئی شکلوں میں ہویدا ہیں۔ ایک دم نئے ادیبوں کا بھی ایک طبقہ ایسا ہے جسے اس دہشت ناک "ابتلا" کا شدید احساس ہے۔ لیکن وہ اسے ایک غیر مستقل مزاجی کیفیت مان کر مستقل اقدار کے ہی استحکام میں دلی یقین رکھتا ہے۔ دوسرا طبقہ اُس کو حقیقت کے روپ میں تو تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن اُسے ایک دم باطل بھی نہیں قرار دیتا۔ وہ موجودہ خطرہ سے نپٹنے کے لئے روایتی اقدار میں ترمیم کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ یہ دونوں طبقے ایسے ادیبوں کے ہیں جن کا دل و دماغ عقیدہ اور ایمان کی دولت بیدار سے منور ہے۔ ان کے علاوہ ہمارے بہت سارے نومولود شاعر اور افسانہ نگار ایسے ہیں جن کا عقیدہ اور کردار اتنا راسخ نہیں ہے۔ وہ ایمان کی دولت بیدار سے محروم ہیں، وہ موجودہ انحطاط کے سامنے یک لخت بے دست و پا ہو گئے ہیں اُسے للکارنا، نپٹنا تو دور رہا۔ اس کے وجود کو خاطر میں نہ لانے

اوراس کے حل کا یقین یا صبر و حوصلہ کا بھی ان میں قطعاً فقدان ہے۔ وہ اسے آج کی زندگی کی ناگزیر حقیقت مانتے ہیں اور رستگاری کا راستہ نہ پاکر یا تو مسلسل جانکاہ فکری یا روحانی کرب میں بری طرح مبتلا ہیں، یا کرب ابتلا کی حدوں کو بھی پار کر ان کا شعور مفلوج ہو گیا ہے اور زندگی کی بابت ایک طرح کی لایعنیت کا جذبہ ان میں نفوذ کر گیا ہے۔ ان میں اول الذکر کی نگارشات بے پایاں تلخی اور کرب سے مملو ہیں اور دوسرے میں تیزاب آگیں طنز کی افراط و تفریط ہے۔ ان کے علاوہ کچھ ادبی بانک ایسے ہیں جو انحطاط کا سلگتا ہوا احساس تو شاید ہی رکھتے ہیں۔ لیکن جدید فکر و تحریر کے ٹریڈ مارک کے طور پر فرد کے عدم تحفظیت اور عدم تکمیلیت کی نوحہ خوانی، نظریات، کلیات اور مفروضوں کے کھوکھلے دعوؤں پر سینہ کوبی' اور بے تعلقی، عدم جذباتیت، تجرد اور اکڑوں داخلیت پرستی اور چیزوں کو اپنے واسطے سے دیکھنے کی لن ترانی، اپنے آپ سے گھل کھیلتی ننگی بچی تنہائی اور بھیڑ کے اوڑھے ہوئے احساس، زبان کے المیہ کے کنسرے راگ، لفظوں کی اندھی بہری اور گونگی مفلوج بے بضاعتی کی لنگڑاتی تان، وجود کے خیالی عرفان، شہری زندگی کی سُنی سنائی پیچیدگیوں اور الجھنوں اور ذات کو مختلف خانوں اور واہموں میں تکا بوٹی کرتی ہوئی تقسیم کے زنگ آلود دائروں میں وہ اپنے پیٹ اور پیٹھ کے آگے پیچھے دیکھے بغیر ٹوٹی سوئی والے قطب نما کے مرثیہ خواں محصور ہیں ان خود ساختہ چھوٹے باڑوں کے قیدی شاعر و ادیب (MYOPIC VISION) کے قتیل ہیں ان کے اندر (COSMIC VISION) کا دم خم ہی باقی نہ رہا وہ سستی شہرت کے لئے اس مصنوعی خودشکنی اور فیشن زدہ بے دست و پائی کو اپنی جگ سے نرالی انفرادیت کے اعلان کے مترادف سمجھتے ہیں (اور جگ ہنسائی کو اپنا مہتم بالشان کارنامہ) حالانکہ ایسی ناقابل التفات اور ہیچ رو کوششیں اور کارنامے شعر و ادب کی کوکھ میں لوپ لگانے کے مترادف ہیں۔ اس کج روی کا سیدھا مقصد غیر فطری وسائل کے ذریعہ جدیدیت کے نام پر اپنی طرف صرف توجہ مرکوز کرنا ہے جو ادب کا تو ہرگز مقصد نہیں ہو سکتا البتہ معصوم خانوں کے ہو سکتے ہیں یہ خود رحمی کا حربہ ہو تو شاید کارگر ہو سکتا ہے جو زندگی اور ادب دونوں میں بڑی ہی افسوسناک اور عبرتناک بات ہے۔

ایک باعقیدہ فن کار اپنے ایمان کی طاقت اور حرارت کے بل پر براہ راست یا بالواسطہ طور سے زندگی کے نامیاتی اقدار کی تعظیم و تکریم کر کے نہایت فطری طور پر اپنی معنویت اور اہمیت کو ثابت کرتا ہے۔ یہ فلسکار علت و معلول کے منطقی رشتہ اختلاط اور اختلاف کے طریق کار سے مختلف وسیع لا امکانی نتائج اخذ کرتے ہیں جن کے اپنے امکانات ہوتے ہیں۔ لیکن عقیدہ اور ایمان اور خواب خیال سے محروم فن کار کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ دینا نسبتاً دشوار ہے جو انحطاط کو آج کی ناگزیر حقیقت مان کر گھٹنے توڑ بیٹھا ہے۔ آج کے چند ذکی الحس فن کار ایسے ہیں جنھیں اپنے داخلی اور خارجی احوال کے سبب موجودہ منڈلانے والے خطرہ کا شدید احساس ہے۔ لیکن ساتھ ہی مطلوبہ ذہنی جرأت اور روحانی تب و تاب کی محرومی کے باعث اس پر قابو پانے کا کوئی طریقہ بھی نہیں سوجھتا۔ ایسی تخلیقات بھی اکثر اپنی شدید شعلہ آسا حیت کے سبب ذہن پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان کی تلخی، خالی پن اور کرب ناکی ذہن میں ایک سُونا پن بھر دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ محسوس ہونا بھی فطری ہے کہ اس طرح کی ذہنی کیفیت شاید صحت مند نہیں مانی جا سکتی۔ اس سے انسانی شعور اور روح کی سخت توہین اور تکسیر ہوتی ہے جس کے سبب اس سے اُبلنے والی طاقتوں کا زوال ہوتا ہے جو یقینی طور پر ادب کا مطمح نظر نہیں ہو سکتا۔ ایسے ادب کے بارے میں کیا کہا جائے۔

اس ضمن میں بھی ہمارے دو ٹوک اور بے لاگ جواب یہ ہے کہ اس طرح کا ادب بھی ہر نوعیت کی قدر و قیمت سے عاری نہیں ہوتا ہے۔ اس سے انسانی احساس [illegible]

ابھار دیتی ہے ساتھ ہی اس کی صلاحیت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ اس نوعیت کے ادب میں جو درد و کرب ہے (درحقیقت وہ زندگی ہی کی ایک شکل ہے) وہ اس حقیقت کا مظہر ہے کہ انحطاط زندگی کا محض نیا ج ہے مزاج نہیں ہے۔ جس طرح دکھ کے فلسفے میں نروان کی شدید ترین آرزو مخفی ہے۔ انحطاط کے اس درد میں بھی وسیع الامکان تنظیم کی سربستہ خواہش کارفرما ہے۔ جس طرح گوتم بدھ کی روح کی فنائیت اور خود انکاری تخلیقی شکل اختیار کر کے انسانی روح کے ترفع کا سبب بن گئی بعینہ عدم اعتقاد اور بے یقینی کے حقیقی کرب سے معمور یہ ادب انسانی احساس پر سان رکھ کر زندگی کے ایقان کو مزید توانائی بخشتا ہے جو انسانی احساس سے متحرک ہے۔ وہ انسانی شعور کو بے وقار نہیں کر سکتا۔ درحقیقت اس طرح کے ادب کی قدر و قیمت کو متعین کرنے کی کسوٹی ہی یہ ہے کہ وہ انسانی احساس کو تیز کر کے شعور حیات کو کہاں تک منور کرتا ہے۔ بے اعتقادی اور بے یقینی بھی تخلیقی بن کر زندگی کے ایمان کو راسخ تر کرتی ہے کیونکہ تخلیق تو کسی بھی شکل میں ملک الموت نہیں ہو سکتی۔ وہاں تو انکار سے بھی اقرار کی صورت ہی مترشح ہوتی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ موجودہ تہذیبی انحطاط سے پیدا عدم اعتقاد اور بے یقینی کا جذبہ بھی تخلیقی ہو جانے پر ہزار بھیس بدل کر زندگی کی نامیاتی قدروں کے بابت پوشیدہ آرزومندی کا خلاق ہوتا ہے۔ اس نوعیت کے ادب کی وقعت کا یہی راز ہے۔ اس کی ادبیت کی بنیاد بھی اقدار کی تنسیخ نہیں بلکہ اس تنسیخ سے پیدا کرب اور اس کے ذریعہ ظہور پذیر مضمر عقیدہ ہی ہے۔ ایک باعقیدہ فن کار جذباتی طریق کار سے اقدار حیات کی توضیح کرتا ہے اور نام نہاد عقیدہ اور ایمان سے محروم فن کار غیر جذباتی طریق کار سے ایسا کرتا ہے نام نہاد کا لفظ یہاں استعمال اس لئے کیا کہ یہ بھی نظریاتی طور پر عقیدہ اور ایمان سے منکر ہوتا ہے یا اپنے کو ایسا مانتا ہے۔ لیکن عملی طور پر بھی بالآخر منکر نہیں رہ جاتا۔ کیونکہ جو تخلیقی عوامل میں منہمک ہے وہ عقیدت اور ایمان سے کیسے محروم رہ سکتا ہے۔ البتہ اس کا روپ مختلف ہو سکتا ہے۔ یہ بڑا ہی اہم اور تامل آگیں پہلو ہے۔

ادب کی معنویت اور اہمیت زندگی کے کسی ایک بنیادی ترعقیدہ میں نہیں ہے۔ ادب کی معنویت تو زندگی کے احساس اور عرفان میں ہے۔ زندگی کے احساس کا معنوی عرش ہی قدر ہے جو اپنی عمومیت میں تجریدی کردار کا حامل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اقدار کی تنسیخ یا انحطاط زندگی کے احساس کی تنسیخ یا انحطاط کا مترادف ہے جو علی العموم ممکن نہیں ہے۔

المختصر اس مسئلہ کے بارے میں میرے معتقدات مندرجہ ذیل ہیں۔

انحطاط زندگی کا نراج ہے مزاج نہیں۔ اگرچہ بنیادی طور پر مذکورہ فطری مزاج ہی حقیقت ہے۔ لیکن نراج کے چیلنج ہوئے وجود کے مسئلہ سے بھی تغافل کا رویہ نہیں اختیار کیا جا سکتا۔ اگر اس کے حل کی جستجو نہیں کی گئی تو وہ ہم کو ہی بالآخر حل کر سکتا ہے۔

زندگی کے ارتقا میں انحطاط اور انسلاک یا انتشار اور تنظیم کا سلسلہ متواتر چلتا رہتا ہے۔

موجودہ حالات میں متعدد وجوہات سے انحطاطی عناصر نسبتاً کچھ زیادہ عیاں ہو رہے ہیں۔ ہمارے دانش وروں کو خصوصی طور پر فن کار کو جو اور بھی زیادہ حساس ہوتا ہے، فطری طور پر اس انحطاطی کیفیت کا شدت سے احساس ہے اور وہ اپنے ادب میں اس کا برملا اظہار بھی کر رہا ہے۔ لیکن آج کے تمام فن کاروں کا نظریہ یکساں نہیں ہے۔ عقیدہ اور ایمان سے سرشار فن کار ہزار دشواریوں کے باوجود اپنی متجسسانہ صلاحیت اور خلوص کے سبب اس ناگہاں انحطاط میں پوشیدہ زندگی کے تخلیقی اقدار کی تلاش و بازیافت میں کوشاں ہوتا ہے اور بے عقیدگی کے عذاب میں مبتلا فن کار انحطاط اور انتشار کو

(بقیہ صفحہ ۵۵ پر)

گہری نیند سے پہلے

علیم اللہ حالی

کوئی آہٹ ____؟ "نہیں"

کوئی دستک ____؟ "نہیں"

"کون ہے جو بہت دیر سے بند کمرے

کے باہر کھڑا ہے منتظر ہے؟"

"نہیں تو ____ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے"

"تو آخر یہ ہنگامہ کیسا ہے؟ یہ شور کا

قلزمِ بیکراں کس کو آواز دیتا ہے

کس کو بلاتا ہے؟؟"

"____ لیکن یہاں شور و شر کا

نشاں بھی نہیں ہے"

"تو پھر تم بتاؤ کہ تم کون ہو

جو مری ساری باتوں سے واقف ہو

میرے سوالوں کے

سارے جوابات دے ڈالتے ہو؟؟"

مگر یہ صدا

جانے کس خامشی کے

گھنے جنگلوں میں

فنا ہو گئی ____

●●

ایک نظم

ساجدہ زیدی

آؤ کچھ دیر لپکتے ہوئے شعلوں پہ چلیں
آگ سے کھیلیں،
یہ سب کاغذی پیراہنِ ہستی پھونکیں
ہر نظر برق بنے
ہر نفس کھولتے لاوے کا دھواں'
آگہی جتنی سمیٹی ہے کتب خانوں سے
اس کے بوسیدہ ورق
تجربہ گاہ کی بھٹی میں جلیں
برف ذہنوں کی پگھل جائے
تو الفاظ کے انگاروں کی بوچھار کریں
لب و لہجے میں جو یہ مخملیں کیفیت ہے
ٹاٹ کے اس پہ لگا کر پیوند'
دل کو دیوانہ کہیں
زیست کو دیوانے کا خواب

آؤ یہ کھیل بھی کر دیکھیں'
کہ یہ مہلتِ دو چار نفس
رائیگاں ہو تو ______ مگر
آگ کی لپٹوں میں ہو
ایام کی دلدل میں نہ ہو

●●

سواریاں

یوسف ناظم

سواری کیا ہوتی ہے یہ تو سبھی جانتے ہیں لیکن شہروں میں سواری اس چیز کو کہتے ہیں جو آدمی کو مل نہ سکے ۔ یوں سواری بیٹھنے کی چیز ہوتی ہے اور مفید ہونے کے علاوہ دل بہلانے کے بھی کام آتی ہے ۔ گذرتی ہوئی مال گاڑی کے ڈبے گنے جائیں تو بڑا لطف آتا ہے ۔ سواری کے ذریعے آدمی بلا وجہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آجا سکتا ہے ضرورت کے وقت سواری میسر آجائے تو سمجھنا چاہئیے کہ انتظامات میں کہیں کوئی نقص ہے ۔ سواری پر بیٹھنے کو سواری کسنا بھی کہا جاتا ہے مثلاً گھوڑے پر سواری کسی جاتی ہے لیکن سواری کسنے کا سوال ہاتھی پر پیدا نہیں ہوتا ۔ کیونکہ ہاتھی مرنے پر بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے (یہ سوا لاکھ اُس زمانے کے سوا لاکھ ہیں جب ایک روپیہ میں ایک من گیہوں ملا کرتے تھے)

کسی اڑیل ٹٹو پر سواری کسنے کو شہ سوار کا نام دیا جاتا ہے ۔ پہلے زمانے میں شہ سوار اڑیل ٹٹوؤں پر چڑھ کر جنگ پر جایا کرتے تھے اور اس سے پہلے کہ دشمن انہیں زمین پر گرائے خود ان کا ٹٹو اِن کے نیچے سے نکل جاتا اور یہ زمین بوس ہو جاتے ۔ اس زمانے میں جنگ کے وقت ایک شاعر کا بھی ساتھ ہونا ضروری ہوا کرتا تھا ۔ جب بھی کوئی شہ سوار زمین بوس ہوتا شاعر اس کے گرنے کی داد یوں دیتا ؎

گرتے ہیں شہ سوار ہی میدانِ جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

لیکن چند ہمدرد قسم کے لوگوں سے شہ سواروں کی یہ حالت نہیں دیکھی گئی اور رفتہ رفتہ جنگ لڑنے کے طریقے بدل دیئے گئے ۔ جو گھوڑے پہلے جنگ پر بھیجے جاتے تھے اب ریس کورس بھیجے جانے لگے ہیں ۔ ان گھوڑوں کو جب پتہ چل جاتا ہے کہ بکثرت لوگوں نے اِن پر بے حساب روپیہ لگا دیا ہے تو یہ گھوڑے عین وقت پر مچل [illegible] جاتے ہیں اور ہمیشہ ساتویں نمبر پر آنے والا منحوس گھوڑا تصویر میں اپنی گردن [illegible] اول آجاتا ہے اور ریس کورس کی ہری گھاس پر صفِ ماتم بچھ جاتی [illegible] اِن گھوڑوں پر سواری کسنے والوں کا سرکاری نام جاکی ہے ۔ [illegible] کے سوار اور آج کے جاکی کا نمایاں فرق یہ ہے کہ شہ سوار [illegible] پر ہمیشہ اس طرح تن کر بیٹھتا تھا گویا گھوڑے سے اس کا [illegible] تعلق نہیں صرف زین سے تعلق ہے ۔ لیکن جاکی گھوڑے کی گردن پر لیٹ کر اس کے بڑے بڑے کانوں سے پورا فائدہ اٹھاتا ہے اور اس سے سرگوشی کرتا ہے ۔ سرگوشی کرنے کلاس سے بہتر اشائل اور کہیں [illegible] ۔ جاکی اور گھوڑے میں جو ہم آہنگی پائی جاتی ہے وہ شہ سوار اور گھوڑے میں مفقود تھی ۔

گھوڑا جنگ کے علاوہ عاشقی میں بھی استعمال کیا جاتا تھا ۔ عام طور پر شہزادے اور راج کمار کسی گھوڑے پر سوار ہو کر جنگلی جانوروں کے شکار کے بہانے جنگل کی طرف نکل جاتے ۔ ان کے ساتھ [illegible] ہوتے ۔ لیکن یہ سب ادب اور قاعدے کی حدود میں رہتے اور شاہزادے کے نزدیک نہیں آتے تھے ۔ [illegible] شہزادے (جیسی بھی صورت ہو) تھوڑی دیر بعد [illegible] اپنے خادموں سے الگ ہو کر جنگل میں [illegible] پنگھٹ پر جا نکلتے ۔ پنگھٹ پر [illegible] ایک سے ایک لڑکیاں [illegible] رہ جانے والی لڑکی کا [illegible] راج کمار یا شہزادہ [illegible]

[illegible] لڑکی جس کی پوری راج دھانی میں بس ایک ہی [illegible] سے پانی مانگتا۔ لڑکی دانتوں میں اپنا آنچل دبا لیتی [illegible] (وقفہ) ۔ گھوڑے کی ہنہناہٹ سن کر راج [illegible] کے خادم فوراً آموجود ہوتے۔ چھ ہفتے بعد لڑکی محل کی زینت بن جاتی۔ ان خطرناک واقعات کی وجہ سے اب گھوڑے کی سواری تقریباً مسدود ہو گئی ہے۔ پنگھٹ بھی اٹھا دئے گئے ہیں۔

بدقسمتی سے سواری اس مخلوق کو بھی کہتے ہیں جو کسی سواری پر سوار ہو۔ مثلاً کسی رکشا میں سے سات آٹھ کی تعداد میں جو مخلوق برآمد ہوتی ہے۔ اُسے بھی سواری ہی کہا جاتا ہے۔ یہ سب مربع، مستطیل، استوانہ نما اور گول مٹول سواریاں کس طرح ایک رکشا میں سما جاتی ہیں۔ اس تیکنیک کو کوئی اور مخلوق اپنا نہیں سکتی۔ جو چیز پردے میں کی جائے اس کی نقل ممکن نہیں۔ پہلے زمانے میں ان سواریوں کو ادھر سے اُدھر منتقل کرنے کے لئے ڈولی نام کی ایک سواری مستعمل [illegible] تھی جسے کہار اُٹھایا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد ان کہاروں کی قسمت نے جواب دے دیا۔ اور گودیوں پر وزنی سے وزنی سامان لادنے میں اپنی عافیت سمجھی۔ گزرے ہوئے زمانے کی سواریوں میں سب سے خوب صورت سواری یہی ڈولی تھی۔ اس زمانے میں بعض لڑکیاں تو صرف ڈولی میں بیٹھنے کی خاطر کم عمری ہی میں شادی کے لئے راضی ہو جایا کرتی تھیں۔

بڑے شہروں میں ایک نہایت خوفناک قسم کی سواریاں رائج ہیں۔ لوکل ریلیں، ڈبل ڈیکر بسیں اور ٹوٹی پھوٹی ٹیکسی گاڑیاں۔ ایک بڑے شہر کے کسی چھوٹے سے بس اسٹاپ کی آبادی ایک گاؤں کی آبادی سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ بس اسٹاپ پر اتنی کم آبادی اس لئے نظر آتی ہے کہ ہر شخص لوکل ٹرین سے سفر کرنے کا خواہش مند پایا جاتا ہے۔ اس [illegible] سے کٹتی ہیں۔ بڑے شہر میں ٹرین کے ڈبے کے اندر بیٹھے ہوئے اور ٹرین کے ڈبے کے باہر لٹکے ہوئے آدمیوں کی تعداد برابر ہوتی ہے۔ اگر لٹکنے والوں کی تعداد بڑھ جائے [illegible] ٹرین کی چھت پر چڑھ جاتے ہیں یا ٹرین کے دو ڈبوں کے بیچ میں ایک پاؤں ایک طرف اور دوسرا پاؤں دوسری طرف رکھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کھڑکی کی سلاخوں پر بھی کھڑے رہ کر سفر کرنا دستوری طور پر منع نہیں ہے۔ اس پر بھی اگر کچھ لوگ سفر کرنے سے رہ جائیں تو وہ ٹرین کے نیچے آجاتے ہیں۔ بعض لوگوں کو بسوں کے نیچے آنا پسند ہوتا ہے اور بعض لوگ صرف ٹرک کو پسند کرتے ہیں۔ ٹرک اس گاڑی کو کہتے ہیں جس میں بیس ٹن سامان لادنے کی اجازت ہو تو ایک سو بیس ٹن سامان لادا جائے اور جس کی رفتار ستر میل فی گھنٹہ سے کم نہ ہو۔

بس میں سفر کرنے والوں کو اپنا ٹکٹ خریدنے کے علاوہ ایک فرض یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر ان کے بازو کی سیٹ پر کوئی لڑکی بیٹھی ہو تو وقفے وقفے سے اپنی کہنی اس کی کمر سے اس طرح ٹکرا دیں جیسے یہ واقعہ بس کے ہچکولے کھانے کی وجہ سے ہوا ہو۔ بس کی سیٹ کا ریگزین پھاڑ کر اس میں سے گودا نکالنا بھی اچھا شغل مانا گیا ہے۔

بڑے شہروں میں تیسرے قسم کی سواری جو وہاں کے لوگوں کی قسمت میں لکھی ہوتی ہے اسے ٹیکسی کہا جاتا ہے۔ ٹیکسی اس سواری کو کہتے ہیں جس کا کرایہ بارش کے زمانے میں ٹیکسی کی قیمت سے کچھ ہی کم ہو۔ بارش اگر موسلا دھار ہو تو کرایہ قیمت سے آگے نکل جاتا ہے۔ ٹیکسی میں سفر کرنے والا جتنا خوش قسمت ہوگا، کرایہ اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ ٹیکسی حاصل کرنے کا ایک سسٹم ہوتا ہے اور اس سسٹم پر عمل کئے بغیر ٹیکسی نصیب نہیں ہو سکتی۔

بڑے شہروں میں ٹیکسی تک بلاواسطہ رسائی کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ اس کے لئے ٹیکسی پکڑنے والے لڑکے کی سفارش حاصل کرنی پڑتی ہے۔ ہوشیار لوگ ہمیشہ پہلے ایک ایسا لڑکا حاصل کرتے ہیں اور پھر ٹیکسی۔

ٹیکسی میں بیٹھ جانے کے بعد سفر کرنے والے شخص کو اس سمت میں سفر کرنا پڑتا ہے جس سمت میں ٹیکسی ڈرائیور جانا چاہے۔ اگر مسافر اس سمت میں جانے سے انکار کر دے تو ٹیکسی ڈرائیور [illegible]

وہ ٹیکسی بند کر رہا ہے مسافر کو اُتار دیتا ہے اور پھر دن بھر ٹیکسی چلاتا رہتا ہے۔ قانون ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ بعض نیک اور ایماندار مسافر گھنٹوں ٹیکسی کو اِدھر اُدھر دوڑاتے ہیں اور پھر کسی بڑی بلڈنگ کے سامنے اتر کر دو منٹ میں واپس آنے کی خوش خبری سنا کر ہمیشہ کے لئے روپوش ہو جاتے ہیں۔

بعض شہروں میں ٹیکسی کے علاوہ آٹو رکشا بھی رائج ہیں۔ آٹو رکشا میں بیٹھ کر سفر کرنے سے آدمی کو ثقلِ سماعت کا بیش قیمت تحفہ حاصل ہوتا ہے۔ آٹو رکشا میں سفر کرنے کے عادی لوگ آگے چل کر خود بھی چیخ کر بات کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کیونکہ جب تک خود ان کی آواز ان کے کانوں میں نہیں آتی انھیں یقین ہی نہیں آتا کہ وہ بول رہے ہیں۔ جب بھی اونچی آواز سے بولنے والا کوئی شخص آپ کو مل جائے سمجھ جائیے کہ وہ اس شہر سے آرہا ہے جہاں عوام کو تباہ و تاراج کرنے کے لئے آٹو رکشاؤں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ آٹو رکشا میں سفر کرنے سے معدہ بھی فوری طور پر عمل کرنے لگتا ہے۔ اور آٹو رکشا سے اُترنے کے بعد آدمی سب سے پہلے غسل خانے کا رُخ کرتا ہے۔ آٹو رکشا میں اگر دو آدمی ایک ساتھ نہ بیٹھیں تو مسائل کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ اکیلا آدمی ہر پانچ منٹ کے بعد اُچھل کر ایک کونے سے دوسرے کونے میں چلا جاتا ہے۔ آٹو رکشا اصل میں ہنی مون کی سواری ہے۔ ذہین اور کفایت شعار جوڑے جو ہنی مون کے لئے اور کہیں نہیں جا سکتے مہینوں آٹو رکشا میں سفر کرتے رہتے ہیں۔ آٹو رکشا میں سے آدمی اگر بخیر و عافیت باہر آ جائے تو اسے اس کا کرایہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔ قانون یہی ہے۔

بعض شہروں میں سڑکیں، نشیب و فراز کے مطابق بنائی گئی ہیں۔ ان شہروں میں سائیکل رکشائیں بھی چلائی جاتی ہیں۔ (جو لوگ یہ رکشائیں چلاتے ہیں وہ بھی آدمی ہی ہوا کرتے) سائیکل رکشا میں بیٹھ کر آدمی سر بزانو ہو جاتا ہے اور اگر اس کی ٹانگیں قدرت کی بے ضرورت فیاضی کی وجہ سے غیر معمولی لمبی ہوں تو اس کے گھٹنے رکشا کی چھت سے لگ جاتے ہیں اور گردن ان گھٹنوں کے درمیان گھڑی کے پنڈولم کی طرح جھولنے لگتی ہے۔ مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ اس طرح سفر کرنے کا بھی کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

چند شہروں میں عوام الناس کو زیر کرنے کے لئے تانگے رائج کئے گئے۔ اِن تانگوں میں جو جانور جوتا جاتا ہے تانگے کے مالک اسے گھوڑا کہتے ہیں، لیکن گھوڑا ہوتا نہیں ہے (برائے نام بھی آخر دنیا میں کئی چیزیں موجود ہیں) بعض شہروں کے تانگے بڑی فراخ دلی اور محنت سے بنائے جاتے ہیں۔ ان میں بیٹھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ زمین پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ تانگے زمین سے صرف چھ انچ اونچے ہوتے ہیں۔ ان تانگوں میں اگر آپ اپنا اٹیچی کیس رکھ دیں تو پھر اپنے بیٹھنے کے لئے دوسرا تانگہ بلانا پڑتا ہے۔ یا خود بیٹھ جائیں تو اٹیچی کیس ریلوے کے کلوک روم میں غیر محفوظ رکھنا پڑتا ہے۔ ان تانگوں کی رفتار خاصی تیز ہوتی ہے اور اکثر اوقات یہ تانگے پیدل چلنے والوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ اِن تانگوں کا کرایہ ہمیشہ لوگوں کے بیچ بچاؤ کے بعد ادا کیا جاتا ہے تانگے میں بیٹھ جانے کے بعد تانگے والا پہلے آپ کو گھوڑے کے چارے کی دکان پر لے جاتا ہے۔ چارے کی قیمت آپ کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ اسے بھائی چارہ کہتے ہیں۔ بڑے شہروں سے تانگے اب عمر رفتہ کی طرح غائب ہو گئے ہیں۔ ان کے ساتھ بھائی چارہ بھی۔

ایک اور فرحت بخش سواری جواب بھی چند بڑے شہروں میں پائی جاتی ہے بگھی ہے۔ اسے فٹن کے علاوہ وکٹوریہ بھی کہا جاتا ہے۔ وکٹوریہ اس لئے کہ اس سواری میں کوئین وکٹوریہ جیسی شاندار اور غیر معمولی دبدبے والی خاتون سوار ہو کر شاپنگ اور پکنک کے لئے جایا کرتی تھیں اور لوگ سڑک کے دونوں طرف کھڑے رہ کر شوق سے اُن گھوڑوں کو دیکھا کرتے جو اس وکٹوریہ میں لگے ہوتے تھے۔ کوئین وکٹوریہ کی بگھی میں جوتے جانے والے گھوڑوں کی تعداد

[illegible] گھوڑے جوتے ہوتے اسی غرض کے لئے منگوا [illegible] کے لئے جو بگھیاں کرایہ پر چلائی جاتی ہیں وہ [illegible] سے زیادہ دو ہارس پاور کی ہوتی ہیں۔ دو گھوڑے والی بگھی میں سوچ سمجھ کر بیٹھنا چاہئے۔ کیونکہ اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ گھوڑوں میں اختلاف رائے پیدا ہو جاتا ہے۔ اور کوچوان کے پاس اس مسئلے کا حل بس ایک ہی ہوتا ہے کہ وہ کرایہ وصول کر کے سواری کو جہاں گھوڑے رک جائیں وہاں اتار دے۔ بگھی ہیں جہاں تک ہو سکے اصل گھوڑے جوتے جاتے ہیں۔ بگھی میں سب سے زیادہ آرام وہ جگہ کوچوان کی ہوتی ہے اس لئے اگر بگھی یونہی بیکار کھڑی بھی رہے تو کوچوان اپنی جگہ نہیں چھوڑتا۔ مسافروں کے لئے اس میں دو نشستیں ہوتی ہیں آمنے سامنے، سامنے والی سیٹ دیکھنے ہی میں حقیر نظر آتی ہے۔ اصلی اور اہم نشست پیچھے والی سیٹ ہوتی ہے اور اس پر چھت بھی ہوا کرتی ہے۔ اس چھت کا فائدہ صرف پیچھے کی نشست پر بیٹھنے والے اٹھا سکتے ہیں کیونکہ کرایہ بھی وہی ادا کرتے ہیں۔ وکٹوریہ میں بریک نہیں ہوتے اس لئے کوچوان اسے بہت تیز بھگاتے ہیں۔ اس میں ہارن بھی نہیں ہوتا۔ ہارن کی اس لئے ضرورت نہیں پڑتی کہ کوچوان اور مسافر دونوں مل کر چلاتے ہیں تو بیچ سڑک پر کھڑے رہ کر اخبار پڑھنے والے پر سے بہت جلتے ہیں۔ جو لوگ وکٹوریہ میں سامان ساتھ لے کر سفر کرتے ہیں ان کا سامان آسانی سے راستہ میں گر جاتا ہے۔ سامان کی قیمت کرائے میں سے وضع نہیں کی جا سکتی وکٹوریہ میں سے چھوٹے بچے بھی آسانی سے گر سکتے ہیں۔ ٹیکسی میں یہ سہولت حاصل نہیں ہوتی۔ کوچوان کے منہ میں ایک بیڑی کے علاوہ اس کے ہاتھ میں ایک ہنٹر بھی ہوتا ہے جو گھوڑے سے زیادہ راستہ چلنے والوں پر پڑا کرتا ہے۔ اگر کسی جگہ وقت پر نہ پہنچنا ہو تو اس غرض کو پورا کرنے کے لئے وکٹوریہ کی مدد حاصل کرنی چاہئے۔ وکٹوریہ میں سفر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ فاصلہ نہیں کٹتا صرف وقت کٹتا ہے۔

ملک سواریوں میں سب سے زیادہ مقبول سواری اسکوٹر ہے۔ خانہ جنگی کے بعد اس سواری پر بیٹھ کر تیزی سے جدھر بھی اس کا رخ ہو نکل جانا چاہئے۔ واپسی کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ ●●

جوابی امور کے لئے ڈاک کے مناسب ٹکٹ ارسال کریں۔

تحت الثریٰ

شاہدہ زیدی

نیچے اُتروں
ابھی کچھ دور
مگر آہ اندھیرا ہے بہت
نہ زمیں زیرِ قدم
اور نہ روزن کوئی
زینہ ، نہ چٹان
جس کو ہاتھوں سے ٹٹولوں
تو کوئی سمت ملے ....
مگر اتروں
ابھی کچھ اور
کہ شاید کہیں ٹک جائیں قدم
ایسی دھرتی پہ جہاں
نیم تاریک سے ساحل کے قریب
مرتعش موج پہ بیباک کرن رقص کناں
اور شاید کوئی

ریلا بھی چلا آئے سمندر کے خزانے لے کر
ساحلِ خشک پہ پھیلے ہوں
سب سیپیاں ، مونگے ، موتی
چن کے دامن میں بھروں
لفظ کے چپّو لے کر
رمز و آہنگ کی کشتی میں چلوں
کون سی سمت ______ ؟
مگر
کس کو معلوم ہے منزل ہے کہاں
ٹوٹتی جاگتی موجوں پہ مگر
آسماں عکس فگن تو ہو
لرزتے تو ہوں
میرے خدوخال
....

بلیک آؤٹ

[illegible]

بامِ افکار پہ چھایا ہے حوادث کا غبار
جم گئے وقت کی دہلیز پہ پگھلے لمحات
روزنِ شام و سحر میں نہیں کوئی بھی کرن
روشنی درد کے صحرا میں سیہ پوش ہوئی
چھپ گئے پتّوں کی آغوش میں سہمے طائر
کوئی آواز کا گھنگھرو بھی نہیں بجتا کہیں
کسی دروازے پہ دستک کی صدائیں بھی نہیں
جیسے آسیب زدہ وقت کا ماحول ہوا
کوئی پتہ کہیں کھڑکا تو دھڑک اٹھتا ہے دل
کوئی آہٹ کہیں جاگی تو سہم جاتی ہے
رات جیسے کسی ناگن کی طرح ڈستی ہے
جیسے ڈائن کسی بچے کا جگر کھاتی ہے

اُف یہ پُر ہول خموشی، یہ طلسمی ماحول
ننگی شاخوں سے ابابیلیں لپٹتی بھی نہیں
جھاڑیوں میں کوئی پھنکار نہ سہمی ہوئی چیخ
زندگی چپ کے سمندر میں بہی جاتی ہے
کرب کا ایک وسیع صحرا ہے تا حدِ نظر
صبح بے نور، تو آسیب زدہ راتیں ہیں
دن کے بازار میں ہنگامے بھی خاموش ہوئے
شام بیوہ کی طرح بین کرے ہے خود پر
وقت کا زخمی پرندہ بھی اماں مانگے ہے
پیاسے صحرا میں سرابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
کس طرف جائیں لئے کاسۂ دریوزہ گری
بحرِ ذخار، عقب میں بڑھا آتا ہے غنیم
یدِ بیضا، نہ عصا، خود کو بچائیں کیسے؟
آگ کے دریا میں ہم لوگ نہائیں کیسے؟

●●

ایک جھوٹی کہانی

غیاث احمد گدی

مار مار کر حلیہ بگاڑ دیا، اینٹ، پتھر، لاٹھی ڈنڈا، جو جس کے ہاتھ آیا اسی سے مرمت شروع کر دی، رگیدتے رگیدتے شہر سے دُور ندی تک لے آئے۔ لاکھ سمجھایا، منتیں کیں، میاں ندی چڑھی ہوئی ہے، بہاؤ بہت تیز ہے اور تم لوگ دیکھ ہی رہے ہو کہ بچارہ کمزور آدمی ہوں، تیرنا آتا نہیں آگے کیسے جاؤں، ندی میں بہ گیا تو....

مگر لوگ نہیں مانے، پتھروں کی بوچھار جاری رہی، مرتا کیا نہیں کرتا، دل پر پتھر رکھ کر آنکھیں بند کیں اور خدا پر بھروسہ کر کے ندی میں کود گیا۔ مگر لوگ تھے کہ بدستور زور زور سے پتھر پھینکتے رہے جانے کہاں سے قوت آ گئی تھی کہ جیسے تیسے ندی پار کر لی۔ جان بچی لاکھوں پائے، اب جو دیکھا تو ادھر اُدھر ویرانہ تھا، اور ندی کے اس پار شہر والوں کے قد چھوٹے چھوٹے بونے بونے دکھائی دے رہے تھے۔ خدا کا شکر ادا کیا پیشانی سے ٹپکنے والے پسینے کو پوچھا، مگر یہ کیا، یہ تو لہو تھا، باپ رے .... اتنا خون بہا دیا ظالموں نے۔

لاکھ پوچھا، بھئی بتا دو، خطا کیا تھی، کہانی ہی تو لکھتا ہوں، کسی کی ماں بہن کو تو نہیں .... تڑاخ سے ایک جوتا منہ پر پڑا، زبان سنبھال کر بول حرامی پلے ....

پھر کیا غلطی ہوئی، میرا مقصد کوئی گالی دینے کا تھوڑے ہی تھا پوچھ رہا تھا کہ بھائی لوگ ناراض کیوں ہو گئے سب کے سب ؟ کہانی ہی تو لکھتا ہوں .....

جواب ملا کہ صاحب کہانی لکھتے ہو تو سو تو ٹھیک ہے لیکن جھوٹی کہانی کیوں لکھ دی ؟

میں نے کہا، میاں جھوٹی کہانیوں کے دن تو گئے، وہ سبز باغ تو ہونے دکھاتے تھے۔ اب تو وہ سالے سب کے سارے افیون کے دھندے میں لگے ہوئے ہیں۔

لوگوں نے جواب دیا کہ تم بھی وہی کرو، یعنی افیون کا دھندہ کرو۔ اگر نہیں کر سکتے تو خاموشی سے جھوٹی جھوٹی کہانیاں لکھتے چلے جاؤ، کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ بلکہ لوگ آرام سے رکھیں گے، کہ تھکے ماندے کو مزہ دیتے ہو، ایسی کہانیاں سنتے سنتے لوگ سو جاتے ہیں، وہ اچھی ہوئی تا کہ یہ ....

مجھ سے غلطی صرف اتنی ہو گئی کہ صاف صاف کہہ دیا کہ میاں مزہ تو رنڈیاں دیتی ہیں اور رسالے بھی دے رہے ہیں، میرے پاس مزہ کہاں؛

بس اتنی سی بات تھی کہ شور مچا دیا۔ مارو مارو سالے کو بہن چو...... د.. بہت بولتا ہے، گا .... میں ڈنڈا کر دو۔

ایسا کیا تو نہیں، لیکن کچھ اس سے کم بھی نہیں کیا بھائیوں نے۔

چنانچہ ندی پار کر کے، لہولہان چہرے کو پوچھا، سر کے زخم پر کنواری مٹی ڈالی، دھوپ میں کپڑے سکھائے ابھی اطمینان کا سانس لینے بھی نہ پایا تھا کہ بھوک نے ستانا شروع کر دیا۔ چاروں طرف دیکھتا ہوں نہ آدم نہ آدم زاد... مگر نہیں بہت دور ایک پیڑ کے نیچے کوئی۔ ہاں ہاں کوئی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔

بس پیٹ کی بھوک ختم .... کوئی اور بھوک لگی، لپکا..... ویرانہ میں عورت، یا الٰہی تو بڑا کارساز ہے، اکیلے ہی ہو گی، ایک لمحہ میں فیصلہ کیا۔ جاؤں گا اور اس کے قدموں پر سر رکھ دوں گا اور کہوں گا، جلدی سے کر لے شادی، دونوں ہو جائیں ایک، (پھر ایک سے انیک) اس طرح دونوں بھوک مٹ جایا کرے گی۔

عورت تھا کہ یہ چھلاوہ خدایا ...... ؟ رب کا شکر ادا کیا اور میں نے ......

تیز تیز لپکا، پتہ نہیں پیروں میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی، جیسے جیسے قریب ہوتا گیا دل کی دھڑکن تیز ہوتی گئی۔ اف توہ، کتنے لمبے لمبے بال ہیں۔ ارے باپ، بالوں کو شانہ پر بکھیرے شاید دھوپ میں سکھا رہی ہے ......

قریب پہنچ کر جیسے کہنی پر ہاتھ رکھا، فرش پر لڑھک گئی۔ جیسے عورت نہ ہو کٹھری ہو، اور زور سے دونوں ہاتھ کی تالی بجا کر چلائی اوئی اللہ، ارے تم کون مردوے ہو، میں گر گئی، مجھ کو گرا دیا نے!

توبہ توبہ ...... میں چونک کر الگ ہو گیا، گلابی ساڑی بلاؤز میں ملبوس یہ عورت نہیں تھی، مرد بھی نہیں تھا۔ (پتہ نہیں بھائی تھا کہ تھی کہوں) بس دونوں کا آدھا آدھا حصہ تھا، اوپر سے مرد تھی، ہلکی مونچھوں والا، اور نیچے سے ......

میں بے اختیار کہہ اٹھا، توبہ توبہ ...... تم تو وہ ہو، جس کو کچھ ہوتا ہی نہیں ....

یہ سنتے ہی جھٹ بدن کو لوچ دیا، "میں واری جاؤں، ارے کس بھڑوے نے کہہ دیا ہے کہ کچھ نہیں ہوتا۔" پھر کمر کو لچک دی زور سے تالی بجائی اور ساڑی اور اندر کا سایہ دونوں اٹھا دیا، یہ لو دیکھو کیا نہیں ہے اس میں ......

چھی چھی ...... میں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں، ادھر وہ خوش اترانے لگا، گویا بس ہو گیا۔ ....

اب میں اس کم بخت کو کیا بتاؤں کہ جس کو تو وہ سمجھ کر ناز کر رہا / کر رہی ہے ....

لیکن میں نے یہ سب کچھ نہیں کہا، خواہ مخواہ کی بات بڑھانے سے کیا فائدہ، اس ویرانے میں ایک ہم جنس تو ہے، ہم جنس نہ سہی بے جنس ہی سہی، جس سے دوستی کر کے بات چیت کی جا سکتی ہے۔

میں نے پوچھا "یہاں کیسے؟"

چمک کر کمر کو بل دیا، جس کے باعث اس کا سارا بدن لوچ کھا گیا۔ اسے بہت دنوں سے، برس ہا برس سے، جب موئے فرنگی آ بیٹھے، وہ جو ہمارے بادشاہ سلامت تھے نا ....

ارے ہائے میں تو ان کا نام بھی بھول گئی، وہی بہادر شاہ کے حرم میں ہمارا کنیزوں کے بیچ، انھیں خواجہ سرا کہتے تھے نا، وہی تھا میں۔ ایک دن ایک بہت ہی خوب صورت کنیز اسم بہ گل رخ کو آنکھ مار دی تھی کیلے میں، بس اللہ جانتا ہے۔ اس نے اپنے یار صمد خاں کو کہہ دیا۔ بہت حسین تھی ظالم، دن بھر آرے چلاتی رہتی تھی کلیجے پر، دوں رپ روں رپ۔ اس نے رک کر پھر تالی بجائی آنکھیں نچائیں، پھدک کر پتھر پر بیٹھ گئی / گیا، اجی تم بھی بیٹھو نا اجی کیا کھڑے شاہ کے مرید ہو ......

میں بیٹھ گیا تو بولی، اب کچھ بولو، اجی کیا چپ شاہ کا روزہ رکھ لیا ہے۔؟

چنانچہ میں نے ذرا اس کے قریب، اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر پوچھا، گل رخ ..... گل رخ راضی ہو جاتی تو کیا کر لیتے۔؟

بس اس پر وہ ہیجڑا جو شرمایا ہے کہ ساڑھی اٹھا کر جھٹ منہ کو ڈھک لیا، ہائے ہائے کیسا مذاق کرتے ہو جی، میں واری جاؤں، ذرا لاج نہیں آتی تمہیں۔

اس کے بعد کی بات بتاؤ یار،

ہے ہے مجھے یار کہہ دیا، پھر لاج نہ آئی تمہیں۔

وہ تو آتی جاتی ہے، یار نہ کہوں تو کیا کہوں، تم ہی کہو نام تو تم بتاتے نہیں، خالی لچکتے ہو۔ اب تم کوئی مرد ہوتے تو کہتا کیا کمان کی طرح، کیا چیتے کی طرح لچکتے ہو، اور اگر لڑکی ہوتے ہو کہتا، کیا شاخ گل کی طرح، بید مجنوں کی طرح لچکتی ہو۔!

ہاں سو تو ہے، میں مر جاؤں، نہ میں ادھر کی ہوں نہ ادھر کی،

پھر صمد خاں نے مجھے پکڑا ننگی تلوار لے کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا، اور چیخ کر کہا، کیوں رے نکھٹو، کیا تو گل رخ سے محبت

کرتی ہے،

میں نے پہلے اس کے طرزِ تخاطب کی اصلاح کی پھر کہا، جو گل رخ سے محبت کرتا ہے اور وہ بدنصیبی سے پکڑا جائے تو اس سے یوں نہیں پوچھتے کہ کیا تو گل رخ سے محبت کرتی ہے، بلکہ یوں کہا جاتا ہے کیا تو گل رخ سے محبت کرتا ہے۔ ؟

اس پردہ موا پہلے تو کھلکھلا کر ہنسا۔ اسی کی ہنسی دیکھ کر جب میں بھی ہنسا تو یہ بڑی بڑی آنکھیں نکال لیں حرامی نے، اور تلوار کو میرے سینے پر .... ہائے اللہ ادھر نہ دیکھئے، اس نے اپنے سینے پر جو خیر سے چٹیل میدان جیسا تھا اُچھل ڈالتے ہوئے کہا، ہاں تو میرے سینے پر تلوار کی نوک بھڑا دی۔ اجی ...... اجی کیا کہوں، میرے سینے کی ننھی ننھی میگنیوں پر جب تلوار کی نوک چبھی تو میں مارے شرم کے ایک طرح سے لڑھک گئی۔

پھر اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کیا اور گرج کر کہا نخرے نہ دکھا ہیجڑے کی اولاد۔

اجی مجھے تو غصہ ہی آ گیا۔ مجھے کہہ لو جی ہیجڑا، میرے باپ کو نہ کہو، وہ ہیجڑا ہوتے تو میں بندہ کہاں سے ٹپکتا ... . اور میں نے گرج کر کہا۔ جی کہ سچی بات ہے، میں گل رخ سے محبت کرتا ہوں اور جب تک زندہ رہوں گا کرتا رہوں گا۔ چاہے تو میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔

میرا یہ جواب سن کر وہ موا سکتے میں آگیا، پھر بڑی دیر بعد بولا، تو سچ سچ بتا، کیا تجھے واقعی مرنے کا ڈر نہیں۔

نہیں، میں نے جواب دیا۔ پھر اس نے تلوار میان میں رکھ لی، اور کہا ٹھیک ہے، میں گل رخ کو تمہارے سپرد کر دوں گا۔ تو تو بڑے حوصلہ والی ہے۔

چنانچہ وہ میرا دوست بن گیا، اس روز خوب اچھے اچھے کھانے کھلائے، انگور کی خوب شراب پلائی اور جب میں نشے میں دھت ہو گیا تو چپکے سے شہر کے بدمعاش لونڈوں کے حوالے کر دیا اور اب سنو، ادھر میں نے جب یہ حالت دیکھی کہ بہت سے لونڈے رال ٹپکاتے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ اور سب کے سب حرامی عجیب عجیب نگاہوں سے مجھے گھور رہے ہیں اور ان کے منہ سے رال ہے کہ بہی چلی جا رہی ہے تو میں بھاگا، بگٹٹ بھاگا اب تماشا دیکھو کہ میں آگے آگے "ہائے میں مر گیا، ہائے میں مر گیا" کہتا بھاگا جا رہا ہوں اور پیچھے بیس پچیس لونڈے مجھے رگیدتے چلے آ رہے ہیں، بھاگتے بھاگتے سامنے ندی دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ پلٹ کر دیکھا تو موئے ویسے ہی دوڑے چلے آ رہے ہیں، ہائے خدایا، اب کیا کروں، کہاں جاؤں، کدھر مروں .... پھر میں نے جھپاک سے ندی میں چھلانگ لگا دی۔

ذرا دیر خاموشی رہی، پتھر پر بیٹھا وہ کسمساتا رہا۔ اس سے نچلا بیٹھا ہی نہیں جا رہا تھا، کبھی شانے اُچکاتا، ہاتھ جھٹکتا انگلیاں توڑتا، کبھی ایک طرف کو لڑھک لڑھک جاتا، جیسے آدمی نہ ہو گٹھری ہو .... پھر وہ چہک کر بولا۔

میں تو بتا چکا، اب تم بولو، "تم یہاں کیسے؟"

میں کیا بتاؤں طلنچہ جان، میرا بھی معاملہ تم سے ملتا جلتا ہے تم خواجہ سرا تھے تو میں کہانی کار .....

وہ کیا ہوتا ہے، نئی چیز معلوم پڑتی ہے۔

کوئی نئی چیز نہیں۔ تم میں اور مجھ میں ذرا سا ہی فرق ہے۔ تم خواجہ سرا تھے اور بجائے کنیزوں کی حفاظت کرنے کے کہ کوئی انھیں اُڑا کر نہ لے جائے۔ خود اُڑا لے جانے کا پروگرام بنا بیٹھے۔ ادھر میں جھوٹ کی حفاظت کرنے کے لئے رکھا گیا تھا، تاکہ ایسی کہانیاں لکھوں کہ سچ پہ پردہ پڑا رہے، تاکہ جھوٹ کی حفاظت ہو۔ لیکن لکھ دی ایسی کہانی ......

وہ کیسے ذرا ٹھیک سے بتاؤ نا جانی ..... جیسے میں نے سنائی ایک ایک بات۔

ایسے ہی تفصیل سے سننا چاہتی ہو تو لو میں تمہیں اور پھیلا کر سناتا ہوں، میرا بھی معاملہ تمہارے والا جیسا ہے۔ میں راج محل میں ملازم تھا کہ اچھے اچھے کھانے دیکھوں مگر کھاؤں نہیں اور کمال یہ کہ

[illegible] سکوں کہ اسے میں پیاری پیاری کہانیاں لکھوں محل [illegible] لڑکی کو گہری نیند میں سوتے دیکھوں لیکن خود نہ سوؤں تاکہ اپنی [illegible] نیند کی پوری کیفیت لا سکوں ۔ زور زور سے ہنستے سنو [illegible] خود نہ ہنسو ، خوب صورت عورتوں کو دیکھوں مگر اس سے [illegible] نہ کروں ۔

چنانچہ روز روز کے جھوٹ سے میں عاجز آ گیا ۔

" جھوٹ " طلیحہ جان ٹھوڑی پہ انگلی رکھ کر بولی ، میں [illegible] واری جاؤں ، اس میں جھوٹ کو کہاں سے پکڑ لائے ۔

ہائے طلیحہ جان نہیں سمجھی ۔ ارے اچھی غذا کھائے بغیر ، گہری نیند سوئے بغیر اور خوب صورت عورتوں سے پیار کئے بغیر کوئی کس طرح اس کے بارے میں کہانیاں لکھ سکتا ہے ۔

چنانچہ ایک دن میں چپکے سے راج محل سے بھاگ نکلا ، رات بہت اندھیری تھی اور مجھے راستے کا بھی علم نہیں تھا ۔ اس لئے آنکھیں بند کئے چپ چاپ چلتا رہا ، چلتا رہا ، حتی کہ صبح ہوگئی ، پو پھٹی ، اُجالے کا دودھ یا دودھ کا اُجالا چاروں اور پھیل گیا تو میں نے دیکھا ایک پیڑ کے نیچے ایک نہایت نوخیز ، گائے کے کچے دودھ کی سی اور کالے بالوں والی گوالن جانگوں پر مٹکا رکھے چھر چھر دودھ دُوہ رہی ہے ، دودھ کی اُجلی اُجلی موٹی موٹی دھار مٹکے میں چاندی کے سلاخوں کی طرح گر رہی ہے ، واہ واہ کیا بات تھی ، کیا سماں تھا [illegible] ابھی ابھی صبح ہوئی ہے اور ، اور نئی نئی سی گوالن گائے دُوہ رہی ہے کہ اور اس کے بالوں کی ایک لٹ گال کو چھوتی ہوئی دودھ کے مٹکے میں جھکی ناگن کی طرح دودھ پی رہی ہے اور گوالن ہے کہ اسے کچھ خبر ہی نہیں ۔

چنانچہ میں گوالن کے قریب جا کر فرش پہ پھسکڑا مار کر چپ چاپ [illegible] بولا ، ارے رے رے سب دودھ پئے جا رہی ہے [illegible] دوہتے دوہتے یک لخت اس کے ہاتھ رک گئے ، پلٹ کر میری طرف دیکھا ، پھر مٹکے میں جھانک کر دیکھا تعجب سے پھر میری طرف [illegible] " کون دودھ پئے جا رہی ہے پردیسی ... ؟ "

" سارا دودھ یہ ناگن پئے جا رہی ہے اور تجھے پتہ نہیں ۔ "

میں نے انگلی کے اشارے سے بتایا ۔

" ناگن ! " اس نے پھر مٹکے کی طرف دیکھا ، تجھے کہاں ناگن دیکھ رہی ہے پردیسی ، مجھے تو نہیں دیکھتی ۔

اور یہ کیا ہے ، یہ ناگن ہی تو ہے ، میں نے اس کی لٹ کو چھو کر کہا ۔ گوالن کھلکھلا کر ہنسی اور بولی واہ مسافر تم بھی عجیب ہو تمہیں تو بالوں کی لٹ ناگن نظر آتی ہے ۔ اگر سچ مچ کی ناگن مل گئی تو کیا سمجھو گے ۔

بالوں کی لٹ ، اور یہ سمجھ کر فوراً اسے چوم لوں گا ، یوں میں نے گوالن کی لٹ کو جھٹ سے چوم لیا ۔

وہ شرما گئی ۔ چھی تم بڑے وہ دیکھتے ہو جی ۔

میں نے کہا ، ارے تجھے کیا دیکھے گا گوالن ، تجھے تو اپنا آپ بھی نہیں دیکھ رہا ہوگا ۔ تجھے تو میں بھی نہیں دیکھ رہا ۔

وہ مسکرائی ، جھوٹ نہ بولو پردیسی ، تم تو دیکھ رہے ہو مجھے ۔

میں خاک دیکھ رہا ہوں تجھے ، میں دیکھتا تو تجھے یہ بھی دیکھتا کہ میں نے زندگی میں کبھی دودھ نہیں پیا ، یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کی لذت کیسی ہوتی ہے ۔

" جھوٹ نہ بولو پردیسی اور ماں کا دودھ جو پیا ہوگا ۔ "

ارے کہاں ماں کا دودھ ، باپ نے ماں کو اتنی مہلت ہی نہ دی کہ ... .

" ہش " گوالن شرما گئی ۔ " مجھے غصہ آ جائے گا تو ... بس ۔ "

گوالن ادا سے بولی ۔

" غصہ بھی کر لینا گوالن ، پہلے اپنی گائے کا دودھ تو پلا ۔ "

اتنی دیر میں گوالن دودھ دوہ چکی تھی ۔ اس نے مٹکا ایک طرف رکھتے ہوئے ، افسردہ لہجے میں بولی ۔ " پلا تو دیتی پر کیا کروں آج کل گائے دودھ کم دے رہی ہے ۔ ابھی ابھی بچہ دیا ہے ، جوان گائے ہے ، کھانے کو بھی خوب دیتی ہوں ،

پردیسی تم بتا سکتے ہو ایسے میں بھی گائے کا دودھ کیوں سوکھتا ہے؟"
میں نے گوالن کے اداس چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔" ایک پرانی کہاوت ہے کہ جب گائے کا دودھ اس کے تھنوں میں ہی سوکھنے لگے تو سمجھو راجہ کی نیت میں کھوٹ آگیا ہے۔

" راجہ کی نیت میں کب کھوٹ آتا ہے مسافر؟ "
" جب وہ پرجا کے دکھ کو بھول جاتا ہے۔ "
" راجہ پرجا کے دکھ کب بھولتا ہے؟ "
" جب اپنے سکھوں میں لین ہو جاتا ہے، یہ بہت لمبی کتھا ہے گوالن، تم نہ سن سکو گی، تھک جاؤ گی۔ "

" نہیں نہیں مجھے سب سناؤ، میں نہیں تھکوں گی، تم بولتے جاؤ، میں سنتی جاؤں گی۔ جب راجہ اپنے ہی سکھوں میں لین ہو جاتا ہے، تب کیا ہوتا ہے؟ "

" تب دودھ میں پانی، چاول میں کنکر، آٹے میں مٹی، سچ میں احتیاط اور محبت میں ہوشیاری داخل ہونے لگتی ہے۔

" جب راجہ اپنے ہی سکھوں میں لین ہو جاتا ہے، تو کسان کو کھیت سے، مچھیرے کو تالاب سے، لکڑہارے کو جنگل سے نائی کو اپنے استرے سے محبت نہیں رہتی، سپاہی کمزور ہو جاتا ہے چوکیدار کو رات کو نیند آنے لگتی ہے اور مؤذن کو وقت کا احساس نہیں رہتا۔

اور یہ وہی سمے ہوتا ہے، جب رنڈیاں سہاگنیں کہلانے لگتی ہیں، اور بیویوں کو چوٹھے چوکے سے زیادہ سنگھار پٹار میں جی لگنے لگتا ہے، باپ کو اپنے نطفے پر شک ہونے لگتا ہے اور ماں اپنی جوان بیٹیوں سے جلنے لگتی ہیں۔

یہ بہت لمبی کتھا ہے گوالن، پرت پر پرت اترتی جائے گی میں کہتا رہوں گا اور تم سنتی چلی جاؤ گی، دن بیتتے چلے جائیں گے راتیں آتی رہیں گی، یگوں کا چکر چلتا رہے گا، اور یوں جب ہم دم لینے کے لئے ایک جگہ ٹھہر جائیں گے تو ہمیں یہ دیکھ کر بے حد تعجب ہوگا کہ ہم جہاں سے چلے تھے، ٹھیک اسی جگہ پر کھڑے ہیں ابھی آگے نہیں بڑھے ہیں۔ تم دہی گوالن ہو جو دودھ کا مٹکا ایک طرف رکھے دھیان گیان سے کہانی سن رہی ہو اور میں وہی داستان گو ہوں جسے ابھی بہت کچھ کہنا باقی ہے۔

یہ قصوں کی بڑھیا بڑی عجیب و غریب ہوتی ہے، کہیں نہیں تھکتی، اپنی لاٹھی کے سہارے دھیرے دھیرے گاؤں گاؤں، شہر شہر، محلے محلے، کھونٹ کھونٹ کی سیر کرنے کی اس کی بڑی پرانی عادت ہے، اس کے ساتھ کہاں تک چلو گی، تم دودھ بیچنے والی گوالن تھک جاؤ گی۔ اور میں مگدھ پوری کا داستان گو بھی کہانی سناتے سناتے ایک دن سو جاؤں گا۔

اس لئے آؤ ہم تم مل کر یہ سب کچھ بھول جائیں، اور ہم آپس میں شادی رچا لیں۔ "

" نہیں مسافر، شادی تو میں تم سے جبھی رچاؤں گی جب تم اپنی ساری کی ساری کہانی سنا دو۔ "

" ارے واہ گوالن، یہ بھی کیا شرط ہوئی۔ تم مجھ سے شادی کر لو، پھر دیکھنا میں تمہیں ہر روز ایک نئی کہانی سنایا کروں گا ساری ساری رات جاگ کر تمہارے لبوں کے گنے چوستا رہوں گا اور سارا دن تمہیں میٹھی میٹھی کہانی سنایا کروں گا، اتنی کہ تم سنتے سنتے .....

" نہیں مسافر، گوالن دیدے نچا کر بولی، مجھے نہ بناؤ، میں کوئی دودھ پیتی بچی نہیں، پہلے کہانی پوری کرو۔ "

پھر گوالن نے مجھے مٹکا بھر دودھ پلایا، ساگ روٹی کھانے کو دی۔ پھر جب میں نے روٹی کھالی، دودھ پی لیا تو میں نے ڈکار لے کر پھر کہانی سنانا شروع کر دیا۔ ہاں میں کیا کہہ رہا تھا۔

" تم یہ کہہ رہے تھے مسافر کہ جب راجہ کی نیت میں کھوٹ آتا ہے، تب وہ اپنے عیش و آرام میں ہی کھویا رہتا ہے۔ "

" اور جب ایسا ہوتا ہے تو پیسوں کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور ضرورت بڑھتی جاتی ہے، ضرورت بڑھتی ہے تو لگان کی شرح

رہتی ہے۔

پہلا مچھیرا راج پاٹ چلانے کے لئے کسان سے مٹھی بھر اناج کی ضرورت پڑتی تھی، پھر جب ضرورت بڑھی تو مٹھی سے دو مٹھی ہوئی، دو سے چار، چار سے آٹھ، آٹھ سے اسی، پھر ہوتے ہوتے جب کسان کو اپنے اور اپنی بیوی بچوں کے پیٹ بھرنے کے لئے مٹھی بھر اناج بچنے لگا تو اسے کھیتوں سے محبت نہ رہی، اور اس نے اپنا پرانا، برسوں کا پرانا دھندہ چھوڑ دیا اور مچھیرے سے کہا مچھیرے بھائی مجھے مچھلی پھنسانے کا گر سکھا دو۔ مچھیرے کا بھی لگ بھگ وہی حال تھا۔ جو کسان نہیں جانتا تھا کہ وہ خود دن بھر میں جتنی مچھلیاں پھنساتا سو میں سے ایک، ایک سے دو، دو سے چار سو میں سے نوے راجہ کے آدمی راج پاٹ چلانے کے لئے لے جانے لگے، چنانچہ مچھیرے نے چپکے سے اپنا جال اس کے حوالے کیا اور لپکا ہوا لکڑہارے کے پاس پہنچا اور بولا بھیّا تو بہت لکڑیاں کاٹ چکا، اب ذرا مجھے بھی اپنا ہنر سکھا، اور تو کوئی دوسرا دھندہ شروع کر دے۔

لکڑہارا یہ سن کر مسکرایا، اپنا گنڈا سا اٹھایا اور مچھیرے کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کیا، چلو بھائی جان بچی اب کوئی دوسرا کام کروں گا تو پیٹ بھر اناج نصیب ہوگا۔ یہاں تو جتنی لکڑیاں کاٹو تین چوتھائی تو راجہ کے آدمی لے جاتے ہیں، ایک چوتھائی لکڑی لے کر بازار جاؤ تو اتنے بھی پیسے نہیں ملتے کہ ....

چنانچہ لکڑہارا بھاگا چڑی مار کے پاس، چڑی مار نے خوشی خوشی اپنا پھندہ اسے دے دیا، اور اٹھ کھڑا ہوا اور سیدھا پہنچا دھوبی کے یہاں، دھوبی نے اپنا گدھا اس کے نام لکھ دیا اور چل پڑا موچی کے پاس، موچی نے حجام کو یاد کیا۔ جو ہر روز اس کے سامنے سے مونچھوں کو بل دیتا ہوا گزرا کرتا تھا، اس نے حجام کی خوشامدیں کیں حجام نے دل ہی دل میں موچی کی تعریف کی اور اپنا استرا قینچی موچی کو بخش دی، حجام پیڑ کے نیچے بیٹھا دیکھتا تھا کہ اسکول ماسٹر روز روز [illegible] ہے، اس نے اسکول ماسٹر کے گھر جا کر دھرنا دے دیا۔ اسکول ماسٹر کی حالت تو اور بھی خستہ تھی۔ ایک تو یہ کہ وہ اسکول ماسٹر تھا، دوسرے یہ کہ وہ شاعر بھی تھا۔ اس کی سفید قمیض کے نیچے بنیان کتنی گندی تھی اس کا کسی کو پتہ نہیں۔ راجہ کا وزیر اس کی تنخواہ میں سے نوے فیصد ٹیکس کے نام پر وصول کر لیتا تھا۔ اس نے دیکھا کہ شہر کا مشہور حجام آج اس کی دہلیز پر یوں بیٹھا ہے تو اسے ایک ترکیب سوجھی، اس نے کہا، میاں حجام میں اپنا کاغذ قلم تو تمہیں دے دوں گا مگر ایک شرط ہے۔

"وہ کیا شرط ہے ماسٹر جی جلدی کہئے۔"

"پہلے بتا، تو راج محل تو جاتا ہے نا؟"

"ہاں جاتا ہوں! راجہ جی کے بال تراشنے۔"

"تو پھر میرا ایک کام کر۔ راج محل میں میرا ایک دوست ہے جو بہت اچھی کہانیاں لکھتا ہے، ملک کے بڑے بڑے جریدے میں اس کی کہانیاں چھپتی ہیں۔ پہلے وہ ہم لوگوں کے بیچ تھا۔ اس لئے ہم لوگوں کے بارے ہی میں لکھتا تھا۔ لیکن جب سے وہ راج محل میں گیا ہے، راج دربار اور راجہ کے زنان خانے کے افسانے ہی لکھتا ہے۔ اس سے کہو، کبھی فرصت ملے تو ادھر آئے، اپنے پرانے یار دوستوں سے ملے اور ان کے حال زار پر افسانے لکھے۔"

حجام نے وعدہ کیا کہ ماسٹر جی میں ایسا ضرور کروں گا، چنانچہ حجام راجہ جی کے بال تراشنے جب راج محل گیا تو موقع دیکھ کر کہانیاں لکھنے والے کو ماسٹر جی کی ساری بات بتا دی۔

وہ یہ سنتے ہی یکایک چونکا، ارے تم نے تو خوب یاد دلایا۔ کہانیاں لکھنے والا تو پہلے ہی سے نالاں تھا، روز روز کے جھوٹ سے وہ عاجز آگیا تھا، جب اسے حجام نے ماسٹر جی کا سندیسہ سنایا تو اسے تقویت ملی، اسے یہ سوچ کر بے حد شرم آئی کہ جن دوستوں کو چھوڑ کر یہاں راج بھون میں آ چھپا تھا وہ دوست اسے بھولے نہیں تھے اور اپنے دل میں اس کے لئے وہی اپنائیت رکھتے تھے۔

وہ ایک دن چپکے سے راج محل سے نکل بھاگا، باہر نکل کر دیکھا تو دنگ رہ گیا، کہیں روشنی نہیں تھی، نہ کہیں جھاڑ فانوس تھا،

...ف بر بنگے قہقہے، نہ شمعیں تھیں، نہ قندیلیں، ہر طرف تاریکی ہی تاریکی کا راج ماں تھی، یا ہر کی دنیا کو جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا، آج وہ اس سے بھی زیادہ اندھیری تھی، زیادہ ویران تھی۔

اس نے آگے بڑھنا چاہا کہ اپنے پرانے دوستوں کو تلاش کرے، مگر اس کے قدم آپ ہی آپ رک گئے۔ اسے ندامت محسوس ہو رہی تھی، کیسے وہ اپنے دوستوں سے ملے گا۔ کس طرح ان کے روبرو وہ کھڑا رہ سکتا ہے، آج تک اس نے کتنی جھوٹی کہانیاں لکھی ہیں۔ جھوٹ جھوٹ کی ندی میں وہ بہتا بہتا کتنی دور نکل گیا ہے، اس کا تو حلیہ ہی بدل گیا ہے، یہ سوچ کر اس کے آنسو نکل آئے، شرم سے گردن جھک گئی ...

اور ..... اور وہ اپنے دوستوں کے پاس جانے کی بجائے، دوسری طرف نکل گیا۔

میں ذرا رکا تو گوالن پٹ سے بولی۔ "دوسری طرف کدھر نکل گیا کہانی لکھنے والا۔ اپنے ساتھیوں کے پاس نہیں گیا تو کس کے پاس چلا گیا۔؟"

"ایک ..... ایک گوالن کے پاس۔" میں نے دزدیدہ نگاہوں سے تکتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

"گوالن کے پاس۔" ذرا دیر کے لئے اس کے چہرے پر تردد کے آثار جھلکے، پھر وہ چونک پڑی۔ "اچھا تو تم اپنی بات کر رہے ہو ...... مسافر۔" وہ یوں ہنسی جیسے گائے کے دودھ کی پہلی دھار گلے میں گرتی ہے۔ "بہت بدمعاش ہو مسافر تم تو ...."

"اب تک تو نہیں تھا گوالن۔ تم نے بدمعاش بنا دیا ہے پل بھر میں۔"

"تو بھاگو یہاں سے، بڑے آئے کہانی لکھنے والے۔" وہ جھٹ سے روٹھ گئی اور اٹھنے لگی، میں نے کب بلایا تھا تمہیں۔

"ارے ارے روٹھ گئی گوالن، میں نے تو بدمعاش کا مطلب ہی کچھ اور لیا تھا، جیسے کافر کے معنی ہوتے ہیں ویسے ہی بدمعاش کے۔"

"کیا؟" گوالن کی بھنویں پھر تن گئیں۔

"نہیں سمجھیں، تمہیں بتاتا ہوں، ترکی زبان میں کافر کے دو مطلب ہوتے ہیں۔ جیسے ابھی میں تمہارے پاس بیٹھا، تمہارے حسن کی تعریف کرنے کی بجائے راج محل میں رہنے والی فارسی اور ترک سے لپٹی لپٹی شہزادی کی خوبصورتی کا بکھان کروں تو یہ کافر ہوا پھر جیسے میں ابھی تمہارے رخسار کی نرم نرم جلد پر انگلیاں پھیرتے ہوئے ایک محویت کیفیت میں ڈوب کر کہہ دوں کہ تمہارے سامنے تو خدائی بھی ہیچ ہے گوالن، تو تم فوراً کہہ سکتی ہو کیا کفر بولتے ہو جی۔"

"میں پھر نہیں سمجھی، تم کیا کفر کفر بولتے ہو جی۔"

"بات دراصل یہ ہے گوالن کہ کفر بولنا، برا نہیں۔ برا ہے کفر تولنا۔ چنانچہ میں کفر تولنا نہیں چاہتا، صاف تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، بولو کرو گی مجھ سے شادی ......؟"

"نہیں میں تم سے [illegible] ہوں۔ تم جانے کون نہ کون ذات ہو۔ [illegible] گوالن۔"

"میں بھی [illegible] ہوں، گوالن۔ میں نے آہستہ سے اس کے کان [illegible]، کہانیاں تو بعد میں لکھنے لگا، داستان گو کہو۔"

"نہیں مسافر [illegible] نہیں۔"

"تو، یہ [illegible] کر لیا میری بات [illegible]"

"تم [illegible] میری گائے کو دوہ سکتے؟"

"اگر تم نے میری [illegible] واقعی گوالے کے بچے ہو۔"

"اگر وہ [illegible] ہو جائے گی۔"

"ہاں [illegible] نہیں تو دوہ سکتا۔"

"[illegible] گوالن نے بڑا اعتبار [illegible]"

"[illegible] دوہ نہیں سکا [illegible]"

"[illegible] گوالن، ایک [illegible]"

[illegible]

"... چھوڑ دو، دھنوں کو ہاتھ لگاؤ۔ میں
... لگی، ارے تم کتنے بچے ہو؟"
"وہ ... ذرا تجسس نگاہوں سے مجھے تاکتی رہی، مجھے
... تو پھر گائے کے تھنوں کو ہاتھ۔"
میں جھٹ سے اُٹھا اور تھنوں کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا
وہ دو قدم ... ہو گئی۔
"ارے ... رہنے رہنے ..... گائے کے تھنوں کی بات
... ہوں۔" وہ شرما کر اندر ہی اندر کھلکھلا اٹھی۔
... وہ معاف کرنا گوالن ..... غلط سمجھ گیا ..." اسے ہنستا
... حوصلہ بڑھا، اور میں نے گائے کے تھنوں کو سہلانے لگا
... دودھ دوہنے سے پہلے کرتے ہیں۔
... بس، بس رہنے دو .... میں سمجھ گئی۔"
... سمجھ گئی؟"
... تم گوالے مگر ذرا ...."
... چلے مت ڈھونڈو، گوالن اگر میں آزمائش میں کھرا
... تو پھر ......"
... اس امتحان کو چھوڑ کر جو بھاگ آئے۔"
... سا امتحان؟"
... تم اپنے دوستوں کو چھوڑ کر بھاگ آئے۔ ان کے دکھ
... ان پر کہانیاں نہیں لکھیں۔ پہلے تم اپنے پرانے
... ان کے دکھوں کا حال سنو، پھر اس پر
... پھر میں تم سے شادی کروں گی ....."
... مل سکتا ہوں، پرانے دوستوں سے گوالن، وہ
..." میں نے بے چارگی اور مایوسی سے کہا۔
... ہمارے گاؤں کے پنڈت جی کہتے ہیں،
... بچھڑے ... کو بہلاوا دیتے ہیں۔
... دوستوں سے ملو، پھر کہانیاں لکھو ...."
... بڑی افسردگی سے کہا

میں جب تک تمہاری راہ دیکھوں گی۔"

یہ کہا اور دھیرے سے آگے بڑھ گئی۔ وہ دھیرے دھیرے جا رہی تھی اور اس کے پاؤں کے جھانجر چھن چھن بج رہے تھے اور میرا دل ایسے ہی ہلکورے کھا رہا تھا، جیسے اس کے مٹکے کا دودھ اس کے چلنے سے چھلک رہا ہوگا۔

چنانچہ پھر میں اپنے دوستوں سے ملنے کے لئے بڑھا، لیکن مل نہ سکا، راستے ہی میں راجہ کے حواریوں نے مجھے پکڑ لیا اور کہا چلو مہاراج کا من اُداس ہے۔ کوئی کہانی سناؤ، ان کا من بہلاؤ۔"

میں نے کہا مجھے چھوڑ دو۔" میرے یار انتظار کر رہے ہیں اور مجھے ان سے ملنا بے حد ضروری ہے، میرا راستہ کھوٹا نہ کرو۔"

مگر وہ نہ مانے، بہت سمجھایا بجھایا، منتیں کیں، ہاتھ جوڑے لیکن وہ لوگ بھی ایک ہی ڈھیٹ تھے، نہ مانے اور مجھے زبردستی راج محل میں لے آئے۔

راجہ نے کہا،" جلدی سے ایک چٹپٹی کہانی لکھو اور میرا دل بہلاؤ کہ آج کے کھانے میں ایک مکھی گر گئی تھی، جس کے سبب میرا موڈ بہت خراب ہے، اور دل بے حد اُداس ہے۔"

میں جلا بیٹھا ہی تھا روز روز کے جھوٹ سے تنگ آ ہی چکا تھا، میرے اپنے دوست احباب کی پکار مجھے کھینچ رہی تھی، ادھر محل کے باہر کی دنیا کی اندھیر نگری دیکھ ہی چکا تھا۔

چنانچہ میں نے ایک کہانی لکھی،

میں ذرا دم لینے کے لئے رُکا تو طبنچہ جان نے جھٹ سے تالی بجائی، لکھی؟ کیا لکھا ذرا بتاؤ نا ---

میں نے طبنچہ جان کہانی لکھی اور راجہ کو سنائی کہ

کہ ایک نگر میں ایک راجہ تھا جس کی تین سو چھیاسٹھ رانیاں تھیں۔ راجہ ہر رانی کے پاس ایک رات جاتا، اس طرح ایک سال پورا ہوتے ہوتے ساری رانیاں راجہ کے ساتھ سونے کی سعادت حاصل کر لیتیں۔ لیکن پھر بھی ایک رہ جاتی۔

ایک ایسے رہ جاتی کہ سال میں تین سو پینسٹھ دن ہوتے ہیں

اور چھ گھنٹے۔ اور بیویاں تھیں تین سو چھیاسٹھ۔

اس طرح ایک رانی جو بچ رہتی، راجہ اس کے ساتھ ہر چوتھے سال سوتا۔

لیکن وہ رانی بھی اور رانیوں کی طرح ہر سال ایک بیٹے کو جنم دے لیتی۔

کہانی ابھی اتنی ہی سنائی گئی تھی کہ مہاراج کی پیشانی پر بل پڑ گئے "، کیا کہانی کار یہ آج تم ..... یہ کیسی جھوٹی کہانی سنا رہے ہو روز تو سچی کہانیاں سناتے تھے۔"

میں جھک گیا۔ سرکار آگے سنئے تو یہ بھی سچی دکھنے لگے گی؟

ذرا دیر مہاراج خاموش رہے، ٹکٹکی لگائے میرے چہرے کو تکتے رہے۔ پھر بولے۔

"اچھا سناؤ۔"

تو مہاراج، راجہ کا وزیر جو راجہ سے زیادہ ہوشیار ہوا کرتا ہے، نے ایک دن راجہ کو بتایا کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے مہاراج، آپ فلاں رانی کے پاس چار سال میں ایک بار جاتے ہیں، اور رانی کے ہر سال ایک بچہ ہوتا ہے، اس لئے ذرا ایک چھوٹی رانی سے مل کر پوچھئے۔"

قصہ مختصر، راجہ چھوٹی رانی کے پاس پہنچے اور بولے، رانی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی، کہ میں چار سال میں ایک بار تمہارے پاس آتا ہوں، لیکن تم ہر سال ایک راج کمار کہاں سے پیدا کر لیتی ہو

چھوٹی رانی جانتی تھی، ایک نہ ایک دن یہ سوال اس سے ضرور پوچھا جائے گا۔ لہٰذا جواب اس نے پہلے سے ہی سوچ رکھا تھا۔ جھٹ بولی۔

واہ مہاراج، آپ بھی کتنے بھولے ہیں۔ آپ خود تو سچ مچ چار سال میں آتے ہیں۔ لیکن آپ سوچئے تو، آپ میرے سپنوں میں تو ہر رات آتے ہیں۔ بھلا ایسے میں راج کمار .....

ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، مہاراج نے قطع کلام کیا، اب میں سمجھ گیا۔

راجہ کو بھی جواب چاہئے تھا، اور اس کے سوا دوسرا کوئی جواب راجہ کی تسکین بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ابھی طلیچہ جان میں نے کہانی اتنی ہی سنائی تھی کہ مہاراج پھڑک اُٹھے، کہا کہانی کار تم آخر کیا کہنا چاہتے ہو۔

پاس ہی وزیر بھی کھڑا تھا۔ اس نے بھی مہاراج کی بات دہرائی، ہاں ہاں کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو۔

میں نے پہلے جان کی امان چاہی، پھر کہا مہاراج بات صرف اتنی سی ہے کہ گوالن کی گائے جوان ہے وہ اسے کھانے کو بھی خوب دیتی ہے، اس کے باوجود گائے کا دودھ تھنوں میں سوکھتا جاتا ہے

"پھر ...؟" ذرا دیر ہوئی تو مہاراج نے پوچھا۔

"پھر ...؟؟" وزیر نے بھی دہرایا۔ "پھر تم کہنا کیا چاہتے ہو"

"سرکار کہنا میں فقط اتنا چاہتا ہوں کہ گائے دودھ کم دینے لگے گی تو ظاہر ہے اسے پورا کرنے کے لئے گوالن کو دودھ میں پانی ملانا پڑے گا۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں گوالن ایسا ضرور کرے گی۔ اور دودھ میں پانی مل گیا تو سمجھئے سرکار کوئی ثابت نہیں کر سکتا ہے، اس میں پانی کہاں ہے، اور کتنا ہے، پھر مہاراج رفتہ رفتہ جیسے جیسے دودھ سوکھتا جائے گا پانی کی مقدار بڑھتی جائے گی اور ایک دن ایسا آئے گا کہ دودھ ختم ہو جائے گا فقط پانی رہ جائے گا۔ تب مہاراج لوگ پانی کو ہی دودھ سمجھنے لگیں گے اور وہی دن سمجھئے قیامت آ جائے گی۔"

بس اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ وزیر نے مہاراج کے کان میں کچھ سرگوشی کی، اور مہاراج یکایک بھڑک اُٹھے ...

پھر وہ جوتے پڑے ہیں، وہ جوتے پڑے ہیں طلیچہ جان کہ کچھ میں ہی جانتا ہوں ....

تو خوب درگت بنی تمہاری، جوتے بھی کھائے سر بھی پھڑوایا اور گوالن بھی نہیں ملی۔

ہاں طلیچہ جان، خوب درگت بنی اور مایا ملی نہ رام ---
ہائے میں واری جاؤں، کیسے دُکھ سے بولتے ہو جی

طلیمہ جان نے میرے گلے میں باہیں ڈال دیں، اور تب ایک بوسہ لیا۔

اسے تو چھوڑو سب کو، اور یہیں رہ جاؤ اور کرلو مجھ سے شادی ...... طلیمہ جان نے پٹ سے آنکھ مار دی۔

"تم سے شادی؟"

ہاں ہاں جی، جب چکر ہی ایسا چل نکلا ہے تو ...

"مگر" ..... میں نے طلیمہ جان کی بات کاٹ دی ... مگر وہ گوالن ۔ ۔"

اجی گوالن کو چھوڑو، اور ملا نے دوا سے دودھ میں پانی، وہی ٹھیک ہے .....

ہاں ..... شاید وہی ٹھیک رہے گا ... ؟

.... ؟؟

●●

آیندہ شمارے میں

افسانہ نگار

شوکت حیات

کے چھ افسانوں کی

خصوصی پیش کش

ملاحظہ کریں

مادرِ وطن

بنگلہ : سوبھاش مکرجی
اردو : علقمہ شبلی

مجھے اپنی ماں سے تھی بے حد محبت
مگر اس پہ ظاہر نہ کرتا تھا یہ میں
بچا کر میں پیسے ٹفن کے
ہمیشہ ہی لاتا تھا اس کے لئے پھل
میں یہ دیکھتا تھا
کہ چہرے پہ اس کے
دمکتے ہیں اشکوں کے دیپ
مگر پھر بھی اس سے نہ کہتا تھا یہ میں
کہ میں چاہتا ہوں اسے

اے میرے وطن ، میری ماں !
بیاں کس طرح میں کروں وہ محبت ،
جو تیرے لئے ہے مرے جسم و جاں میں

وہ دھرتی ، کہ جس نے مری پرورش کی
ہر اک یاد اس کی ہے ثبت
مرے ہاتھ پر
مرے ہاتھ کی انگلیوں پر
میں چھوتا ہوں جس شے کو بھی
تری ہی جھلک دیکھتا ہوں میں اس میں
مری ماں !

مرے دل کا ہر تار بجتا ہے تجھ سے

مری ماں !
ہمیں خوف کچھ بھی نہیں
جو آئے ہیں بے رحم پنجوں سے لینے کو تیری زمیں
وہ کھائیں گے منہ کی ،
انہیں سرحدوں سے بہت دور جانا پڑے گا

ہم اپنے ہی ہاتھوں سے کرتے تھے تعمیر اپنا جہاں
ہم ایسا ہی کرتے رہیں گے
بفیضِ تمنائے دل

مری ماں !
ہمیں دخلِ بے جا سے کچھ ڈر نہیں
فقط پھوٹ پڑتا ہے دل میں
جوالا غضب کا

ہمارے تھکے ہاتھ ، ماں !
خموشی سے گاتے رہیں گے
تری ہی محبت کے گیت !

●●

سالِ نو کا تحفہ

دل کے ٹکڑے مرے !
اس نئے سال میں
چاہتے کیا ہو تم ؟

تم کو روٹی ملے ،
اور ہر روز کچھ دودھ بھی '
اور رنگین کھلونے بھی کچھ
یا
پھینک دو آسماں پر
اپنے رنگوں کا بکس
اور
اپنی دھرتی پہ پھیلا دو
ایک دنیا نئی
فکر سے ہر بشر جس میں آزاد ہو
زندگی ہو جہاں
خواب ہی خواب بس !

●●

دونوں طرف

بنگلہ : سوبھاش مکرجی
اردو : علقمہ شبلی

ہیں دو آنکھیں ہم ارضِ بنگال کی
الگ کر رہی ہے ہمیں ایک ناک
مگر اس کی پرواہ کرتا ہے کون ؟

مقفّل ہے در
اسی واسطے کھولتا ہوں میں کھڑکی

وہ بنگال ، جو اُس طرف ہے ،
ہے ویسا ہی جیسا کہ بنگال میرا

●●

....شگاف.... دراڑ.... خلا.... ہوا....
(جب کیفیتوں نے تبدیلی چاہی)

شوکت حیات

....ش....گ....ا....ف....

.... تجربوں، مشاہدوں اور نتیجوں کی ٹکر....
.... دیکھتے دیکھتے تہ در تہ اوتھل پوتھل....
.... روشنی کا تکون آنکھوں کے سامنے....
.... تا حدِ نظر پانی کی ہاتھ ہاتھ....
.... تہ در تہ پھر اوتھل پوتھل....
.... منظر کچھ بدلا؛ کچھ نہیں بھی....
.... روشنی ویسے ہی رہی جیسے تھی....
.... تا حدِ نظر پانی کی ہاتھ ہاتھ جیوں کی تیوں....
.... دھیرے دھیرے ایک شگاف نے سر ابھارا....
.... وہ یوں بن گیا جیسے وہی تھا....
.... یوں بن گیا جیسے وہ نہیں تھا....
.... اور اس گھڑی وہ چپکا رہا....
.... رویا اور ہنسا....
.... سوچا اور بھٹکا....
.... خالی خالی شگاف میں ہواؤں کی نشست و برخاست....
.... اپنے آپ کو آنکھوں میں سمیٹے شگاف کے ہر چھور تک ہانپتا کانپتا بھٹکتا رہا....
.... اور کہیں کچھ نہ پاکر ——— کہیں کچھ نہ کھو کر شگاف کے باہر ——— دونوں ہتھیلیاں پیشانی پر

....، انگلیاں بالوں میں ....، آنکھیں بند....
.... پھر شرارے بھی تھے....
.... حرارت بھی تھی....
.... لیکن قدم اٹھنے کی تاب نہ لا پاتے تھے....
.... توانائی کا امکان آخری سانسیں لے رہا تھا....
.... اور جاں کنی کا عالم....
.... نزع کا موسم....
.... ہتھیلیاں سر پر....
.... انگلیاں بالوں میں....
.... اور آنکھیں بند....

....د....ر....ا....ڑ....

.... تجربوں، مشاہدوں اور نتیجوں کی ٹکر....
.... دیکھتے دیکھتے تہوں میں پھر اوتھل پوتھل....
.... آنکھوں کے سامنے روشنی کا رقص....
.... تا حدِ نظر پانی کی ہاتھ ہاتھ....
.... منظر کچھ بدلا؛ کچھ نہیں بھی....
.... دھیرے دھیرے شگاف میں پھر پھڑاہٹ ہوئی....
.... دھیرے دھیرے بے سمت اضافوں اور پھیلاؤ میں دراڑوں کی تشکیل....
.... وہ یوں ہوا جیسے وہی تھا....
.... یوں جیسے نہیں تھا....

....بوسے کی آوازیں پھر ابھریں ....
....سسکیوں نے پھر دم توڑا ....
....سوچوں کی لکیریں فالج زدہ ٹانگوں کی مانند اکڑ کر ٹھٹکیں....
....خالی خالی دراڑوں میں ہواؤں کی آمد و رفت....
.... خود کو آنکھوں میں سمیٹ کر دراڑوں کے ہر چھور تک ہانپ کانپ کر پہنچا ....
.... اور کہیں کچھ نہ پا کر —— کہیں کچھ نہ کھو کر ان دونوں کے درمیان معلق دراڑوں سے فرار —— اور ....
اور دونوں ہتھیلیاں پیشانی پر ......، انگلیاں بالوں میں....
....، اور آنکھیں بند .....
.... پھر بھی شرارے تھے ....
.... حرارت تھی ....
.... تھرتھراہٹ تھی ....
.... توانائی .....؟ .....
.... دراڑوں میں مقید ...!
.... ہتھیلیاں سر پر ......انگلیاں بالوں میں......
اور آنکھیں بند ....

....خ...ل...ا...

.... تجربوں، مشاہدوں اور نتیجوں کی ٹکر ....
.... روشنی آنکھوں کے سامنے پھر رقصاں ....
.... تا حدِ نظر ہاتھ ہاتھ کرتا ہوا پانی ....
.... منظر کچھ بدلا، کچھ نہیں بھی....
.... رنگ بکھرے —— نہیں بھی ....
.... پھیلی اور سمٹی بھی ....
.... دراڑوں نے پھیلنا شروع کیا....

....ایک کائنات پھیلتی دراڑوں میں سمٹنے لگی ....
....اننت رفتار سے اننت سمے تک پھیلتی ہوئی دراڑیں خلا میں ڈوب گئیں ....
.... وہ یوں اٹھا جیسے وہی تھا....
....یوں چونکا جیسے نہیں تھا....
....سانس لینے میں دشواری ہوئی تو دم پھولنے لگا....
....خود کو آنکھوں میں سمیٹا ....
....یکجا ہوا اور خلاؤں کے چھوروں تک پہنچنے کی سعی میں ہاتھ پیر مارتا رہا ....
.... بھٹکتا رہا ....
.... سونگھتا اور سنتا رہا....
....اور........کہیں کچھ نہ پا کر —— کہیں کچھ نہ کھو کر محرومی اور یافتی کے بیچ معلق خلاؤں کے باہر ——
دونوں ہتھیلیاں پیشانی پر ....انگلیاں بالوں میں...
.....آنکھیں بند ....
.... اب نہ ہوائیں تھیں ....
.... نہ شرارے تھے ....
.... حرارت تھی....
.... اور نہ توانائی ....
.... ایک گہری آہ ....
.... ایک زوردار ہنسی ...
.... ہتھیلیاں سر پر ....
.... انگلیاں بالوں میں ....
.... اور آنکھیں بند ....

...ہ...و...ا...

....تجربوں، مشاہدوں اور نتیجوں کی ٹکر....

.... تہوں میں اتھل پتھل ....
.... روشنی آنکھوں کے سامنے گڈ مڈ ....
.... نظریں جہاں تک جاتی تھیں ہاٹھ ہاٹھ کرتا پانی....
.... منظر کچھ بدلا، کچھ نہیں بھی ....
.... رنگ بکھرے اور ٹوٹ گئے ....
.... روشنی کڑکی اور بجھ گئی ....
.... ہاٹھ ہاٹھ پانی ابخروں میں گم ....
.... وہ یوں تھا جیسے وہی تھا ....
.... یوں تھا جیسے نہیں تھا ....
.... دیکھتے دیکھتے خلاؤں میں تڑپھڑاہٹ ہوئی ....
.... دباؤ کا پنچھی اور بھی نیچے جاکر دم توڑنے لگا....
.... سُن ...... سُن ...... سنسناتی خلائیں....
.... سر...... سر ...... سرسراتی ہوائیں ....
.... دونوں ہتھیلیاں پیشانی پر ...... انگلیاں بالوں
میں ...... اور آنکھیں بند دوڑتا رہا....
.... اِس چھور سے اُس چھور تک ....
.... اُس ڈگر سے اِس چوراہے تک....
.... ٹوٹتا ....
.... بھٹکتا ....
.... سونگھتا ....
.... سُنتا رہا....
.... شن شن شن ...... شن شن شن ....
.... وہ خلاؤں میں بے وزن اور با حرکت ہوگیا....
.... سیماب کی طرح لرزتا ہوا حرکتوں میں مصروف
پناہ گزیں لمحوں کو مٹھیوں میں دابے رہا....
.... چاہا کہ رک کر دو گھڑی دم لے ....
.... لیکن تڑپھڑاتی خلاؤں کا سمندر اسے اپنی گرفت میں
لئے جہاں تہاں پھینکتا ہوا منڈلاتا رہا....

.... اُس نے آنکھیں کھولیں تو ان کی ریزہ ریزہ ہونے کی اذیت بھگتی ....
.... (تڑپھڑاتی خلائیں وحشت انگیز طریقے سے چیخ رہی تھیں) ....
.... مٹھیاں کھولیں تو جلنے کی مہک نتھنوں میں داخل ہوئی ....
.... (تڑپھڑاتی خلائیں وحشت انگیز طریقے سے رو رہی تھیں) ....
.... ہاتھ چلائے تو ان کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی سزا بھوگی ....
.... (تڑپھڑاتی خلائیں بے دردی سے جوار بھاٹا جیسے قہقہہ لگا
رہی تھیں) ....
.... پیر چلائے تو ان کے سفوف سے دوچار ہوا ....
.... (تڑپھڑاتی خلائیں وحشت انگیز طریقے سے چیخ رہی تھیں) ....
.... دریچوں کو وا کیا اور گرد صاف ہوئی تو چھتوں کے دھڑ دھڑ
گرنے کی آوازوں سے آشنا ہوا....
.... اور اب ———— ....
.... نہ تہیں تھیں، ....
.... نہ روشنی تھی ....
.... نہ ہاٹھ ہاٹھ کرتا پانی ....
.... نہ منظر نہ رنگ و بو ....
.... صرف شگاف ....
.... صرف دراڑیں ....
.... صرف خلائیں ....
.... صرف ہوائیں ....
.... شگاف سے دراڑوں تک ....
.... دراڑوں سے خلاؤں تک ....
.... خلاؤں سے ہواؤں تک ....
.... اب صرف ہوائیں تھیں ....
.... ان کا تصادم اور انسلاک ....
.... پُرزور ہوائیں ....
.... ٹھٹھرتی ہوائیں ....
.... فالج زدہ ہوائیں ....

●●

غزل

منموہن تلخ

یہاں سے بھی کہاں بھاگوگے اگلی صبح کے ڈر سے
وہاں ہو تم کہ سناٹوں کو پچھلی رات بھی ترسے

وہ آیا مرحلہ تنہائیاں اندر کی رو دیں گی
کسی لمحے کوئی آواز آئے گی برابر سے

مجھے کیوں شہر نے دیوار در دیوار گھیرا ہے
تو کیا میں سچ میں ہوں باہر ہی باہر اپنے اندر سے

بدن شیشوں کے بھی چبھ جائیں اس وسعت میں چل چل کر
یہاں کیسے نبھے گی، سیکھ لو رستے کے پتھر سے

خود اپنی جست سے ایک ایک کر کے سب ہوئے زخمی
گلہ یہ ہے کہ پھینکا ہے کسی نے ان کو اوپر سے

کوئی اب گھر کے اندھے فاصلوں میں سوچتا یہ ہے
کرن سورج سے کیوں اک لے نہ لی چلتے سمے گھر سے

اکیلا ہوں مگر ہر لحظہ یہ محسوس کرتا ہوں
کہ جیسے کوئی گذرا ہے ابھی میرے برابر سے

سفر ہے ذات کی پہچان کا، تو کیا یہ پوچھوں میں
کہ ہم کیوں چھوڑ رہے ہیں بستیاں باہر ہی باہر سے

یہ کس کے لمس سے اپنے لہو میں وہ نہا اٹھے
جنھیں ہموار کرنے تھے یہ رستے اپنی ٹھوکر سے

یہ بس اک آخری آواز دے لوں اور چلتے ہیں
نہ جانے کون مل جائے کسے اپنے مقدر سے

یہ کیا آواز ہے جو خود بلا کر دور دے مارے
تعجب ہے کہ یہ آواز آئے ایک اک گھر سے

نہ جانے کون کٹتے ساحلوں پہ کہہ رہا تھا کل
کوئی موجِ بلا آئے، گذر جائے مرے سر سے

ذرا سننے تو دو یہ دور کی آواز کیسی ہے
صدا یہ آ رہی ہے تلخ باہر سے کہ اندر سے

غزلیں

محمود عشقی

نام میرا اس طرح پوچھا گیا
سرد موسم میں پسینہ آگیا

رنگ و بو کے ساتھ وہ دیکھا گیا
جس کو پہروں ذہن میں سوچا گیا

گرد کا ہمدرد بننے کے لئے
راستوں کے ساتھ میں چلتا گیا

کس طرح صحرا میں پروائی چلی
کس طرف آخر یہ سناٹا گیا

کس طرح کلیوں کی آنکھیں کھل گئیں
پربتوں کا کون دل دھڑکا گیا

کتنی آنکھوں میں ہوئے روشن چراغ
کتنے انگاروں پہ وہ سبنکا گیا

وقتِ ہجرت آکے عزت کا خیال
پاؤں میں زنجیر سی پہنا گیا

نیکیوں کو ورغلانے کے لئے
میں کبھی کاشی کبھی کعبہ گیا

●●

زندگی کا ہوتا ہے آفسوں میں گھیراؤ
کچھ نہ کر کے جینے کا گر مجھے تو بتلاؤ

ہے سبھی کلرکوں کا یہ نوشتۂ قسمت
صبح کو چلے جاؤ شام کو چلے آؤ

کتنے دل ہیں پتھر کے یہ شمار کرنے کو
سب کے آستانوں پر اپنے ہاتھ پھیلاؤ

خودکشی تمنّا کی ہو رہی ہے قسطوں میں
راستوں پہ کرتا ہوں خونِ دل کا چھڑکاؤ

دشمنی کی سرحد بھی مستقل نہیں ہوتی
بات مت کرو لیکن کچھ قریب آجاؤ

جل گئی ہے شہوت سے ہر صلاحیت میری
اتنی بے حجابی سے جسم کو نہ لہراؤ

یوں خلا میں مت گھومو اے گھٹاؤ آوارہ
جھک مری زمینوں پر ٹوٹ کر برس جاؤ

●●

ہوئے ہیں خواب ان کے آج پورے
ادب میں آگئے کچھ کن کھجورے

ولادت وقت سے پہلے ہوئی تھی
پھریں گے در بہ در یہ منہ بسورے

بچھا کر تخت اس پر ناچتے ہیں
یہ اتھلے ذہن کے انسان ادھورے

حجابوں کے جہاں پردے پڑے تھے
کھڑے ہو کر وہاں یہ خوب گھورے

اندھیرے میں اٹھالیں گے چونی
یہ اندھے اپنے مطلب کے ہیں پورے

لگا دیں گے وہاں یہ آگ فوراً
جہاں بھی جائیں گے لکڑی کے چھرے

گلستاں کا بدل ڈالیں گے نقشہ
اگر سرسبز ہو جائیں دھتورے

●●

ماضی کے جالے

[illegible]

رضیہ گھر آئی تو سارا کام پڑا تھا۔ کھانا وہ پکا گئی تھی اس نے سالن گرم کرنے کے لئے گیس کے چولھے پر رکھا۔ صبح کے کپ سا سر دھو کر الماری میں رکھے تب تک سالن گرم ہو چکا تھا۔ اس نے کھانے کی میز پر کپڑا بچھایا۔ پلیٹ اور چمچہ میز پر رکھ کر چینی کی پڑی ڈش میں چاول اور پیالے میں شوربہ نکالا۔ کرسی میز کے قریب کی، پھر ہاتھ دھو کر کرسی پر آ بیٹھی۔ پہلا لقمہ منہ میں لیا ہی تھا کہ خیال عدالت کے کمرہ کی طرف چلا گیا۔ چمچہ اس نے میز پر رکھ دیا۔ افسر کیسے گھر چھوڑنے پر راضی ہو گیا؟ نیلوفر کو بھی اس نے لینے کے لئے اصرار نہیں کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے کئے پر پچھتا رہا ہو۔ ظاہر ہے ورنہ وہ اسے کیس واپس لینے کے لئے کیوں کہتا "رضیہ گھر کو تباہ کر کے کوئی فائدہ نہیں" اس نے خلاف عادت بڑے نرم لہجے میں کہا تھا۔ اس نے کیس واپس لے لیا ہوتا۔ لیکن اس نے سوچا کہ اگر افسر نے پھر اس کے ساتھ حقارت آمیز رویہ اختیار کیا تو وہ کیا کرے گی؟ افسر نے جب اس کی طرف دیکھا ایسے دیکھا جیسے کسی حقیر کیڑے کو دیکھ رہا ہو۔ اس وقت اس کا جی چاہتا کہ وہ زمین میں سما جائے یا فضا میں تحلیل ہو جائے تاکہ افسر اسے نہ دیکھ سکے۔ "یہ چیز یہاں کیوں رکھی ہے وہ چیز ایسے کیوں پڑی ہے۔" اتنا کہہ کر وہ غصہ سے پٹک دیتا۔ تمہارے ماں باپ نے کیا تم کو کچھ سکھایا نہیں۔ کون سے جاہلوں کے خاندان سے آئی ہو۔ کسی نے تمہیں تہذیب نہیں سکھائی۔ اپنے میکے کو برا بھلا کہتے سن کر اسے رونا آ جاتا تھا۔ اس کی دس سالہ بچی نیلوفر بھی اسے [illegible] کرتی تھی۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی آدمی غیر ارادی طور پر کچھ

سکڑ سا جاتا تھا۔ کوئی چیز کبھی بھی اس کی مرضی کے مطابق نہ تھی۔ کہیں جانے کی بات کرو وہ چڑ جاتا۔ اتنا گھومنا پھرنا ٹھیک نہیں، وہ کہتا۔ خود رات کے دو دو بجے تک دوستوں میں سرگشت کرتا رہتا۔ اچھا ہی ہوا اس نے طلاق لے لی۔ رضیہ نے ایک لمبی سانس لی اور پھر چمچے سے لے کر ایک لقمہ منہ میں ڈالا۔ لیکن آخر آخر میں وہ کس قدر بدل گیا تھا۔ عدالت میں جب بھی ان کی نظریں ملیں اس نے کتنی محبت سے دیکھا تھا۔ اس نے پھر چمچہ رکھ دیا۔ اس کے دل و دماغ میں کشمکش ہو رہی تھی دماغ کہتا تھا اس نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک ہی کیا اور دل کہہ رہا تھا کہ اس نے اچھا نہیں کیا۔ وہ کھانا ادھورا چھوڑ کر اٹھ گئی۔ ہاتھ دھو کر کھڑکی میں آ گئی۔ کھڑے ہوتے ہی اسے احساس ہوا کہ وہ آزاد ہے کوئی اب اسے ٹوکنے والا نہیں۔ اب اس کی حرکت کسی کو بری نہیں لگے گی۔ شادی کے بعد آج پہلی بار اسے اس طرح آزادی کا احساس ہوا تھا۔

کچھ دیر وہ اسی طرح کھڑی رہی ہو گی کہ اسے احساس ہوا کہ ابھی تو بہت کام پڑا ہے۔ اس نے بستر جھٹکا۔ چادر تبدیل کی۔ پردے بدلے۔ کھڑکیوں اور الماریوں کو کپڑے سے جھٹکا میز کو کپڑے سے صاف کرنے لگی تو افسر کی تصویر پر نظر گئی۔ ایک لمحے کے لئے اسے خوف محسوس ہوا جیسے اس کا وجود اب بھی سامنے کمرے پر چھایا ہوا ہو۔ کچھ دیر کے لئے وہ ٹھٹھک گئی۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ تصویر باہر پھینک دے یا ٹکڑے ٹکڑے کر دے لیکن پھر اس نے تصویر میز کی دراز میں رکھ دی۔ نیلوفر کے

کھلونے بے ترتیبی سے فرش پر پڑے تھے انھیں یکجا کر کے شیلف پر رکھ دیا۔ نوکرانی جھاڑو دے کر گئی تھی پھر بھی کافی دھول ہو رہی تھی۔ اُس نے سوچا اب نوکرانی پانچ بجے آئے گی۔ وہ خود ہی فرش صاف کرنے لگی۔ فرش صاف کر کے اُٹھی تو اڑھائی بج رہے تھے۔ اُسے خیال آیا۔ کچھ دیر کمر سیدھی کر لے پھر ساڑھے چار بجے تک نیلوفر آ جائے گی۔ وہ بستر پر لیٹ گئی۔ ایک بار پھر اس کا خیال عدالت کے کمرے کی طرف گیا لیکن اس نے اس خیال کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ اس نے سوچا کوئی فلم دیکھنی چاہیے لیکن لوگ کیا کہیں گے۔ سب ہی اس کے شوہر سے واقف تھے شاید کسی کو بھی تعجب نہ ہو۔ اس نے اٹھ کر ریڈیو لگایا اور پھر دراز ہو گئی۔

ساڑھے چار بجے نیلوفر آئی۔ اُسے اس نے کپڑے تبدیل کرنے کے لئے کہا۔ چائے بنا کر دی۔ بسکٹ دیئے۔ خود بھی چائے پی پھر کپڑے بدل کر نیلوفر کے ساتھ تفریح کے لئے نکل پڑی۔

سامنے سے خورشید داراب جی اور مسز پریرا آ رہی تھیں وہ اسے دیکھ کر رک گئیں۔ بڑی رحم آمیز نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں اسے۔ جیسے علیحدگی اس نے خود نہ لی ہو بلکہ افسر نے دی ہو۔ چند ہی گھنٹوں میں خبر ہر جگہ پھیل گئی تھی۔ مختصر سے سلام علیک کے بعد وہ آگے بڑھ گئی۔

کچھ دیر آگے چل کر مسٹر بسواس سے مڈبھیڑ ہوئی۔

"مسز ..... میرا مطلب ہے مس رضیہ"۔ انھوں نے کہا "آپ نے بہت اچھا کیا اس وحشی BRUTE سے الگ ہو گئیں۔"

مسٹر بسواس کا اس طرح کہنا اسے اچھا نہیں لگا۔ وہ چاہ رہی تھی کہ لوگ اس سے یہ موضوع نہ چھیڑیں۔ وہ مسٹر بسواس سے فوراً رخصت لے کر آگے بڑھ گئی۔

دو تین دن اچھے گذرے بس کچھ افسوس اس وقت ہوتا جب افسر کا عدالت میں دیکھا چہرہ اُسے یاد آتا۔ لیکن ساتھ ہی آزادی کا نیا نیا خوش گوار احساس بھی تھا۔ لیکن جیسے جیسے دن گذرتے گئے، وہ کچھ اکتاتی سی گئی۔ ملازمت کرنے کی اُسے نہ خواہش تھی نہ ضرورت۔ اسے اپنے والدین کی طرف سے اچھا خاصہ ترکہ ملا تھا۔ کئی کمپنیوں میں اس کے شیئر تھے جہاں سے منافع ملتا رہتا۔ نیلوفر نے ایک دو بار پوچھا

"پپا کہاں گئے ہیں؟"

شاید وہ بھی کچھ خوش ہی ہو کہ اب ہر بات پر اُسے کوئی ٹوکنے والا نہ تھا۔

رضیہ، خورشید داراب جی اور سلمیٰ مقصود کے کہنے پر کلب جانے لگی۔ کلب ایک پرانی عمارت کے گراؤنڈ فلور میں تھا۔ کچھ ٹیبل اور کرسیاں رکھی تھیں۔ ورانڈے میں بید کی کرسیاں اور تپائیاں رکھی تھی۔ وہ عموماً ورانڈے میں بیٹھتی۔ کیونکہ اندر مردوں میں گرما گرم بحث چل رہی ہوتی یا بڑے شور و غل کے ساتھ تاش کھیلا جا رہا ہوتا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے فضا بوجھل رہتی۔ کبھی کبھی وہ بھی تاش کے کھیل میں شریک ہو جاتی جو اس نے شادی سے پہلے سیکھا تھا۔ لیکن زیادہ تر وہ عورتوں میں بازار بھاؤ یا فیشن وغیرہ پر جو باتیں ہوتی اس میں حصہ لیتی۔ تقریباً سب ہی لوگوں سے وہ کبھی نہ کبھی مل چکی تھی لوگوں نے شروع میں چند دن اس سے ہمدردی ظاہر کی۔ اسے اس طرح خود اپنے آپ کو موضوع بنتے دیکھ کر بڑی جھنیپ محسوس ہوئی لیکن آہستہ آہستہ لوگ اسے بھول گئے۔ ہر بات کچھ دن میں پرانی ہو ہی جاتی ہے۔

رضیہ کا دل چاہتا تھا وہ افسر کے متعلق کچھ سُنے وہ کیا کر رہا ہے، کہاں ہے، کیسا ہے۔ اُس کی یہ خواہش اس طرح پوری ہوئی کہ دو مہینوں کے بعد افسر یکایک کلب کا موضوع بن گیا۔

رضیہ کلب میں تاش کھیل رہی تھی۔ پاس کی میز پر افسر کا نام سُن کر اس نے کنکھیوں سے ادھر دیکھا جہاں اس کا نام لیا گیا تھا۔ پھر کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگی۔ مسٹر درما دوسروں کو بتا رہے تھے کہ افسر کا بزنس فیل ہو گیا۔ لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اس حادثہ کا تعلق

رضیہ سے چھوٹ گیا۔ اس نے سنا تھا کہ افسر رضیہ سے علیحدگی کے بعد بہت خاموش ہو گیا تھا۔ افسردہ رہتا تھا۔ کچھ لاپرواہ بھی ہو گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا کہ انھوں نے اسے کبھی کبھی نیلوفر کے اسکول کے باہر گاڑی کھڑی کر کے اسے نیلوفر کو تکتے بھی دیکھا ہے۔ افسر کے بارے میں طرح طرح کی باتیں ایک ایک کر کے رضیہ کو معلوم ہوتی گئیں اس نے سوچا کلب میں لوگ اسے ہی الزام دیتے ہوں گے۔ رضیہ سے ان کی ہمدردی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔ اس خوف سے کچھ دن وہ کلب نہیں گئی لیکن پھر افسر کے متعلق کچھ جاننے کی خواہش سے مجبور ہو کر وہ دوبارہ کلب جانے لگی۔ چار پانچ مہینے کے بعد اس نے سنا کہ افسر امریکہ چلا گیا پھر کافی دنوں تک اسے افسر کے متعلق کوئی خبر نہیں ملی اگرچہ وہ کلب جاتی رہی۔ لوگوں سے ملتی رہی۔

ایک صبح وہ نوکرانی کو ٹھیک سے کپڑے دھونے کی ہدایت کر رہی تھی کہ ڈاکیہ خط ڈال گیا۔ کافی دنوں بعد کوئی خط اس کے گھر آیا تھا۔ وہ بہت کم اپنی سہیلیوں سے خط و کتابت کرتی تھی۔

خط امریکہ سے آیا تھا۔ اس کا تجسس بڑھ گیا۔ لفافے کی اُلٹی طرف اس نے دیکھا کہ کس نے لکھا ہے۔ لیکن کچھ بھی لکھا ہوا نہیں تھا۔ افسر کا تو نہیں؟ لیکن اس کی ہینڈ رائٹنگ تو نہیں معلوم ہوتی۔ اس کا دل پھر بھی دھڑکنے لگا۔ اس نے سرا چاک کیا۔ اس کی سہیلی مینا کا خط تھا۔ اسے نہ جانے کیوں ہلکی سی مایوسی ہوئی۔ لکھا تھا:

پیاری رضیہ!

تمہارے شوہر کو یہاں آج ایک دعوت میں دیکھا تو تمہاری یاد بڑی شدت سے ستانے لگی اور تمہیں خط لکھنے بیٹھ گئی۔ اس دعوت میں مجھے پتہ چلا کہ تم نے افسر سے علیحدگی اختیار کر لی ہے مجھے حیرت بھی ہوئی اور دکھ بھی تفصیل سے لکھو، یہ سب کیسے ہوا۔ افسر توقع کے خلاف بڑی خوش دلی سے ملا۔ اس کے ساتھ ثریا دسیم بھی تھی۔ سنا ہے وہ اکثر اس کے ساتھ دیکھی جاتی ہے۔

تم شاید میرے بارے میں جاننے کی خواہش مند ہو گی۔ میں یہاں بڑے مزے میں ہوں۔ میرے شوہر بھی ٹھیک ہیں۔ ہمارے دو بچے ہیں جو اسکول جاتے ہیں۔ تم جلد از جلد خط لکھو پھر تفصیل سے باتیں ہوں گی۔

تمہاری مینا

بہت دنوں کے بعد افسر کے بارے میں جان کر اسے خوشی سی ہوئی۔ اگرچہ ثریا دسیم کا ذکر اسے کھٹکا لیکن اب اس کا افسر پر حق ہی کیا تھا پھر بھی اس کا جی چاہا کہ افسر کی اس سے دوستی نہ بڑھے۔

ایک مہینے بعد مینا کے خط سے اُسے پتہ چلا کہ افسر نے شادی کر لی اسے کچھ رنج تو ہوا لیکن اس نے یہ سوچا شاید یہی اچھا ہوا۔ ہو سکتا ہے وہ اب زیادہ خوش ہو۔

دن گزرتے رہے۔ مینا کے خطوں سے اسے معلوم ہوتا رہا۔ افسر نے کس دعوت میں شرکت کی۔ کس بازار میں نظر آیا۔ کس تقریب گاہ میں ملا۔ دن بھر وہ گھر کا کام کرتی۔ شام میں کلب چلی جاتی۔ کبھی نیلوفر کو لے کر ٹہلنے نکل جاتی۔

ایک شام اس نے کلب میں سنا کہ افسر کا اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ نہ جانے کیوں اُسے لگا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس کی ذمہ دار ہے۔ مینا نے اسے یہ بات کیوں نہیں لکھی؟ اُس نے سوچا۔ وہ فوراً گھر لوٹ آئی اور مینا کو خط لکھا۔ آنکھوں میں آنسو اُمڈنے لگے تھے لیکن اُس نے ضبط کیا۔ رات نیلوفر کو سلا کر وہ شب خوابی کے کپڑے تبدیل کرنے لگی تو اس کی نظر اپنی کلائیوں میں جگمگاتی چوڑیوں پر پڑی۔ کپڑے بدل کر اس نے چوڑیاں اُتاریں اور ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں رکھ دی۔

وہ بستر پر جا لیٹی۔ زندگی یکایک اتنی بے رنگ ہو گئی تھی پہلی بار اسے احساس ہوا کہ علیحدگی کے بعد بھی وہ ہر وقت افسر کے متعلق سوچتی رہی تھی ...

اور اب سوچنے کے لئے کچھ بھی تو نہیں رہ گیا تھا۔

غزلیں

سلطان اختر

جانے کیسا بوجھ کاندھوں پر لدا ہے
آج کل ہر شخص جھک کر چل رہا ہے

ہر طرف سے کشمکش میں گھر گیا ہے
اس کے چاروں اور دیوارِ صدا ہے

دریا دریا موجزن کیسا ترنم
صحرا صحرا کس کا نغمہ گونجتا ہے

ہر زباں پر ہے خدا کا نام روشن
دل مگر تاریکیوں کا مقبرہ ہے

اور کتنی صدیاں گذریں گی سفر میں
اور یہ کتنے جنم کا راستہ ہے

چُن لو اب پلکوں سے وعدوں کی مسافت
ناپ لو آنکھوں سے کتنا فاصلہ ہے

سامنے خواہش کی دیواریں تنی ہیں
پشت سے دامن کو کوئی کھینچتا ہے

گھر، گلی، بازار، کوچے آب دیدہ
شہر میں یہ کس کا ماتم ہو رہا ہے

ہم نے جھیلی ہے کڑے دن کی رفاقت
آپ نے تو صرف لوگوں سے سنا ہے

●●

درختوں تلے سبز سایہ نہ تھا
کسی شاخ پر برگِ تازہ نہ تھا

حقیقت یہی ہے وہ افسانہ تھا
یہ ویرانہ پہلے بھی ویرانہ تھا

کئی حادثوں نے پکوڑا ہے مجھے
مگر ایک بھی مرگ آسانہ تھا

میری طرح سادہ ورق تھے سبھی
کہ چہروں پہ کچھ بھی تو لکھا نہ تھا

جو کہنا تھا دیوار و در کہہ گئے
کسی نے کچھ اُس گھر سے پوچھا نہ تھا

مجھے زلزلوں نے ہلایا بہت
مگر میں کبھی دیوارِ خستہ نہ تھا

جسے قتل کرنا پڑا خود مجھے
وہ میں ہی تو تھا میرا سایہ نہ تھا

سبھی اندر اندر سے منتشر
کوئی شخص باہر سے ٹوٹا نہ تھا

بہت بے سبب خود کو ضائع کیا
مجھے زندگی کا سلیقہ نہ تھا

●●

غزلیں

لطف الرحمن

قریبِ دل سے جو پہنچے تری نظر کا دکھ
صدف کا دکھ بھی وہی ہے جو ہے گہر کا دکھ

ملے جو تجھ سے تو پرسش کو بھول بیٹھا ہے
کسی سے پوچھ نہ اب اس کی رہ گزر کا دکھ

عیاں بھی ہو کے مکمل عیاں کبھی نہ ہوا
تمہارا درد بنا ہے مرے ہنر کا دکھ

صدا ہی سے گزرتے رہے ہر اک لمحہ
ادھر کے ساتھ برابر رہا ادھر کا دکھ

میں اپنے ساتھ تری جستجو میں نکلا ہوں
دو گونہ بوجھ ہوا ہے مرے سفر کا دکھ

بکھر بکھر کے یہ اپنی ہی مشعلگی میں جلا
ہوا بجھا جو گئی تو کھلا شرر کا دکھ

مکیں بدلتا ہے، ٹوٹتا بکھرتا رہے
ہر ایک فرد سے وابستہ ہے یہ گھر کا دکھ

خود آگہی کی کرن تیرگی میں ابھری ہے
بنے نہ کیسی آتی ہوئی سحر کا دکھ

مجھے عذاب نہ دے اس طرح سرِ محفل
کہ میرا بوجھ ہے صحرائے معتبر کا دکھ

●●

ہے شش جہت کا ہر اک دکھ مری صدا کا دکھ
مری غزل میں ہے آئندہ کی فضا کا دکھ

قرار مل نہ سکا بادلوں کی بستی میں
عجیب طرح کا دکھ ہے مری انا کا دکھ

بھٹک رہی ہے ہمیشہ نئی سحر کے لئے
یہ کس سحر کی تمنا ہوئی صبا کا دکھ

میں تجھ سے مل کے بھی تیرا یقین ہو نہ سکا
اس انتہا پہ بھی ہوں اپنی ابتدا کا دکھ

نہ جانے دشت میں کیا گذری ایک قطرے پہ
صدف کے دل میں تو پنہاں ہے اک خلا کا دکھ

ہر اک مقام پہ کتنے غبار چھوٹ گئے
یہ حادثہ بھی ہوا ہے ہر اک ہوا کا دکھ

وہ اچھے وقتوں کو لیتے گئے ہیں ساتھ اپنے
گزرنے والے ہمیں دے گئے بلا کا دکھ

تری فضاؤں میں زندہ ہے اب بھی گونج مری
ترے لئے میں ہوا ہوں سدا سدا کا دکھ

مری صدا کے تعاقب میں ہے سکوت کوئی
اٹھا رہا ہوں بکھرتی ہوئی صدا کا دکھ

●●

اب اپنی جیت کا دکھ ہے نہ اپنی ہار کا دکھ
ہر ایک پل ہے یہی اپنے انتشار کا دکھ

عجیب مرحلۂ غم ہے تو سنبھال مجھے
گئے رتوں کا کوئی دکھ نہ انتظار کا دکھ

کوئی بھی اس کی حدوں کا پتہ چلا نہ سکا
ہے میرے غم کی طرح بحرِ بے کنار کا دکھ

رہی نہ سمت کی تعیین بھی سفر میں مرے
کہاں کہاں نہ گیا لے کے اعتبار کا دکھ

ہے اس کی چپ کی تہوں میں سمندروں کی پکار
قریب آ کے کبھی دیکھ کوہسار کا دکھ

نہ بازگشت نہ آواز پر کوئی آواز
تہی صدف کا الم ہے مری پکار کا دکھ

نہ پوچھ آبلہ پائی کا دکھ سرِ منزل
یہاں نہ یاد دلا مجھ کو رہ گذار کا دکھ

پلٹ کے آئے گا کل صبح پھر یہی سورج
کرو نہ اتنا بھی جاتی ہوئی بہار کا دکھ

سنا مجھے تو یہی اہلِ درد کہہ کے اٹھے
غزل میں چھپ نہ سکا اس غزل نگار کا دکھ

●●

قید

علی حیدر ملک

ہم دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔
وہ ایلورا کی کسی مورتی کی طرح۔
میں گندھارا کے کسی نقش کی مانند۔
مورتی میں جنبش پیدا ہوئی ——————

"علی جان تم؟"
نقش بھی تھرتھرایا ——————
"مردولا تم؟"

"کہیں ہم دونوں خواب تو نہیں دیکھ رہے؟" مردولا نے بچوں کی طرح مجھے چٹکی لی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو مجھے اس بات پر ہنسی آجاتی لیکن اس وقت میں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ہاں! شاید خواب ہی دیکھ رہے ہیں —— جاگتی آنکھوں کا خواب۔"

"تم پاکستان سے کب آئے؟"
"دو دن ہوئے۔ آج تیسرا روز ہے۔"
"کس طرف ہو؟ ایسٹ میں یا ویسٹ میں؟" —— اس نے بڑے مضطرب لہجے میں سوال کیا لیکن قبل اس کے کہ میں اس کے سوال کا جواب دوں اس نے میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا ——

"چلو کہیں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کرتے ہیں۔"

پھر ہم دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے، سر گھما گھما کر ایک دوسرے کو دیکھتے کیفے ٹیریا میں جاکر، گنگا کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس سیٹ لے کر بیٹھ گئے۔

"ہاں تو ایسٹ کی طرف ہو یا ویسٹ کی طرف؟"
"ایسٹ میں۔"
"کس جگہ کون سے شہر میں؟"
"کھلنا میں ہوں۔"
"کھلنا میں، واقعی؟"
"ہاں! —— تمہیں یقین کیوں نہیں آرہا؟"
"نہیں نہیں۔ اس میں یقین نہ کرنے کی کیا بات ہے۔ میں اس لئے پوچھ رہی تھی کہ میں بھی تو کھلنا ہی کی ہوں نا!"

کھلنا کی ہو نہیں بلکہ تھیں۔"
"کیوں۔ کیا تم اب پٹنہ کے نہیں رہے؟" —— اس نے اپنی بڑی بڑی لٹوں کو جھٹکا دے کر قدرے متانت سے کہا۔

"علی جان! یہ بھی عجیب حادثہ ہے کہ میں کھلنا سے پٹنہ آگئی اور تم پٹنہ سے کھلنا پہونچ گئے۔ ہے نا عجیب حادثہ؟"
میں خاموش رہا۔
"حادثہ شاید صحیح لفظ نہیں ہے اس کے لئے۔ کوئی اور لفظ ہونا چاہئیے۔ اگر نہیں ہے تو ایجاد کرنا چاہئیے۔"
میں پھر بھی خاموش رہا۔
"کیوں تم خاموش کیوں ہوگئے؟ —— کچھ بولتے کیوں نہیں؟"
"تم جو بول رہی ہو؟"
"ہاں ہاں۔ تم تو یونیورسٹی کے زمانے سے مجھے باتونی سمجھتے ہو۔ کیا خطاب دیا تھا مجھے تم نے؟"
مردولا کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔
"اچھا چھوڑو —— اب یہ بتاؤ کہ کیا کر رہے ہو۔ شادی

"[illegible] ؟"

"[illegible] ملازم ہوں ۔"

"[illegible] سے نفرت اب تک ختم نہیں ہوئی نا !"

[illegible] نہیں ۔ صرف ہنس دیا ۔

"——— اور شادی ؟"

"نہیں کی ۔"

"کیوں ؟ ۔"

یہ سوال جیسے اس نے بغیر سوچے ہوئے یوں ہی بے خیالی [illegible] کر ڈالا تھا ۔

"بس نہیں کی ۔"

چند ثانیوں کے لئے ہم دونوں کے بیچ خاموشی کا ایک وسیع و عمیق سمندر حائل ہو گیا ۔

میں نے بکھرتے ہوئے خیالوں کو یکجا کیا اور پھر گھڑی کی طرف دیکھتا ہوا بولا ۔

"۹ بج گئے ۔ مجھے ایک صاحب سے ملنا بھی ہے ۔ اب چلنا چاہئے ۔"

اس نے بالوں کی چوٹی بناتے ہوئے کہا "چلو ، لیکن پھر کب اور کہاں ملاقات ہوگی ؟"

"میں دریا پور میں اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں اگر چاہو تو کل وہاں آجاؤ ۔"

وہی نا جن کے ہاں تم اکثر جایا کرتے تھے ۔ چوراہے کے قریب والا دو منزلہ مکان ۔ ٹھیک ہے میں کل خود وہاں آجاؤں گی ۔"

[illegible] باتھ روم سے آکر میں اخبار دیکھ رہا تھا ، جب [illegible] اطلاع دی کہ کوئی صاحبہ مجھ سے ملنے آئی ہیں ۔

"کون ؟" ۔ میں نے یہ غیر ضروری سا سوال ملازم سے کیا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ مردولا کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا ۔

"نہیں معلوم صاب ۔" ملازم نے جواب دیا مگر میں اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی ، چپل گھسیٹتا ہوا ، ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ چکا تھا ۔

"ارے حد ہو گئی ۔ تمہاری عادت ذرا بھی نہیں بدلی ۔" مردولا نے مجھے دیکھتے ہی کہا ۔

"کون سی عادت ؟"

"وہی دیر سے اُٹھنے اور دیر سے تیار ہونے کی ۔ تمہیں یاد ہے تم فرسٹ پیریڈ میں ہمیشہ لیٹ پہونچا کرتے تھے ۔"

"ہاں یاد ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اب میں تیار جلد ہو جاتا ہوں"

"اچھا ؟" ۔ اس نے اچھا کچھ اس انداز میں کہا جیسے اُسے یقین نہ آ رہا ہو ۔

"تم چائے پیو ۔ دیکھو میں کتنی جلد تیار ہو جاتا ہوں ۔"

اندر جا کر میں نے ملازم کو باہر چائے دینے کو کہا ، اور خود کپڑے تبدیل کرنے لگا ۔ کپڑے تبدیل کر کے ڈرائنگ روم میں آیا تو مردولا کی چائے ابھی ختم نہیں ہوئی تھی ۔

"واقعی تم میں کچھ تبدیلی آگئی ہے ۔" اس نے آہستہ سے کہا اور جلدی جلدی چائے ختم کر کے اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ "چلو اب چلیں ۔"

"کہاں چلیں گے ؟"

"کہیں بھی ۔"

سارا دن ہم لوگ شہر کا طواف کرتے پھرے ۔ گول گھر پٹنہ مارکیٹ ، یونیورسٹی کیمپس ، مہندرو گھاٹ ، سیٹی کا گوردوارہ ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہم لوگ شہر دریافت کرنے نکلے ہوں ۔

شام کو تھک کر چور ہو جانے کے بعد ہم لوگوں نے سوڈا فاؤنٹین میں ڈوسا کھایا ، چائے پی اور پھر مردولا قدم کنواں

چلی گئی۔ میں دریا پور واپس آگیا۔

چند دنوں بعد ستھوا مارکیٹ کے قریب ہم دونوں پھر ملے۔

"ابھی تو تم رہوگے نا؟"

"نہیں۔ پرسوں یہاں سے کلکتہ کے لئے روانہ ہوجاؤں گا وہاں ایک روز قیام کے بعد ——————"

"کچھ دن اور رہو نا! — کیا تم اپنے پٹنہ سے اکتا گئے ہو؟"

"نہیں اُکتایا تو نہیں لیکن میرے ویزا کی مدت ختم ہو رہی ہے اس لئے مجبوری ہے۔"

"مجبوری؟ — ہاں مجبوری ہی تو ہے۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تو ایسا کرو کہ مجھے بھی لے لو۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"مذاق نہ کرو۔ تم کہاں جاؤ گی؟"

"تم ہمیشہ میری باتوں کو مذاق ہی کہہ کر ٹالتے رہے ہو۔ میں مذاق نہیں کر رہی۔ پوری سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں۔"

"تمہارے پاس کاغذات موجود ہیں؟"

"کیسے کاغذات؟"

"ایک غیر ملک کے سفر کے لئے۔"

"وہ میرے لئے غیر ملک کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا تم اس جگہ کو اپنے لئے غیر تصور کرتے ہو؟"

"اب تو یہی حقیقت ہے۔"

"میں بہرحال تمہارے ساتھ چلوں گی۔ لے چلوگے نا مجھے؟"

"مردولا! بچوں کی طرح ضد نہ کرو۔ میں تمہیں بغیر ویلیڈ ڈاکومنٹس (VALID DOCUMENTS) کے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔"

"نہیں لے جا سکتے؟"

"میرے لئے یہ ممکن نہیں۔"

"اور اگر میں کسی طرح وہاں تمہارے پاس پہونچ جاؤں تو؟"

"میں تمہیں خوش آمدید کہوں گا۔"

دفتر سے واپس آیا تو ملازم نے بتایا کہ ایک محترمہ آئی ہوئی ہیں۔

"کیا نام تھا اُن کا؟" — میں نے دریافت کیا۔

"مردولا مکرجی۔"

"کہاں گئیں وہ؟"

"سامان رکھ کر شہر کی طرف گئی ہیں۔"

اتنے میں مردولا آگئی۔

"تم بہت دنوں زندہ رہوگی۔ ابھی ہم تمہاری ہی باتیں کر رہے تھے۔"

"بہت دنوں زندہ رہنے کی آرزو کسے ہے؛ میں نے اپنی ایک خواہش کی تکمیل کر لی یہی بہت ہے۔"

"تم آئیں کیسے؟"

"بس آگئی۔"

وہ میرے ساتھ ہی رہنے لگی۔ شام میں اکثر ہم لوگ ساتھ ہی نکلتے۔ دن کے وقت وہ تنہا ادھر اُدھر گھومتی رہتی۔

شہر میں چہ می گوئیاں شروع ہوگئیں۔ قیاس آرائیوں کی دیوار روز بروز اونچی ہونے لگی۔

ایک دن مردولا نے مجھ سے کہا۔ "یہ انٹیلی جنس والے سخت کند ذہن ہوتے ہیں۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"وہ لوگ مجھے جاسوس سمجھتے ہیں۔ جہاں جاتی ہوں میرا پیچھا کرتے اور طرح طرح کے سوال کرتے ہیں۔"

"احتیاط برتا کرو۔ زیادہ ادھر اُدھر گھومنا اچھا نہیں۔"

"اپنے جذبات کا گلا کیسے گھونٹ دوں آخر؟"

اس کے بعد سے وہ کچھ پریشان پریشان سی رہنے لگی۔

ایک دن دفتر سے واپس لوٹا تو ملازم نے اطلاع دی کہ مردولا بی بی چلی گئیں۔ کہتی تھیں صاحب کو بتا دینا کہ میں چلی گئی کیونکہ اب میرے یہاں رہنے سے انھیں بھی نقصان پہونچ سکتا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں ملازم سے مزید بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور خاموش ہو گیا۔

پھر خبر ملی کہ مردولا ہندوستانی سرحد پر گرفتار کر لی گئی اور کلکتے کی جیل میں بند ہے۔ میں نے فوراً کلکتہ پہونچنے کی کوشش کی لیکن کاغذی فاصلے کو عبور کرنے میں مجھے کئی روز لگ گئے۔ کلکتہ پہونچ کر بڑی دوڑ دھوپ کے بعد مردولا سے ملنے کی اجازت حاصل کر سکا۔

جیل میں میں نے ٹھہر ٹھہر کر، گلوگیر آواز میں اس سے کہا

"مردولا! مجھے افسوس ہے کہ تم قید میں ہو اور ———"

اس نے میری بات کاٹ کر قدرے اونچی آواز میں کہا ——— "لیکن ذرا یہ بھی تو سوچو کہ میں قید میں کب نہیں تھی۔"

●●

بقیہ: قدروں کے زوال ....

آج کی زندگی کی ناگزیر حقیقت کے روپ میں تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے ادب میں بھی انحطاط اور انتشار کا شدید احساس تخلیق کے ردعمل میں پڑ کر غیر جذباتی نہ رہ کر جذباتی کردار کا ہی حامل بن جاتا ہے۔ درد کا بھی تخلیقی استعمال حسین ترین ادبی کاوش کو جنم دیتا ہے۔ جہاں ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں انحطاط اور انتشار کا احساس تو شدید ہو سکتا ہے لیکن اس کی فنی کایا کلپ نہیں ہو سکتی۔ ایسی تخلیق فن نہ ہو کر قطعی طور پر ضائع ہو جانے کے مترادف ہے۔

●●

مرتضیٰ راہی

سمندروں کو سمجھنے دو اے ہوا، مجھے
تمہاری مٹھیوں میں کچھ سہی، دکھاؤ مجھے
پڑا ہوں راستے میں کب سے بے تعلق سا
عجیب مسئلہ ہوں میں، کبھی اُٹھاؤ مجھے
رنگے ہوئے ہیں مرے نام سے در و دیوار
جگہ جگہ نہ بناؤ کہ پھر مٹاؤ مجھے
تمام روشنی، ذہن و نظر سے چھین کے بھی
بچا سکو تو مرے سائے سے بچاؤ مجھے
پہاڑ، دشت، سمندر، فضا، کھنڈر، بستی
جہاں سکون ملے، زیرِ غور لاؤ مجھے
تمہاری محنتوں کا پھل تمہارے سر پہ ہے
میں اک لچکتی ہوئی شاخ ہوں، جھکاؤ مجھے
چمک دمک سے، مرا اصل تیرگی میں ہے
جھپٹ پڑو ابھی مجھ پر، جو دیکھ پاؤ مجھے

●●

خدا کو وہم، گماں سات آسمانوں کو
کہاں کہاں کی اُڑاتے ہو کس ہوا میں ہو
میں ٹوٹ پھوٹ کے بھی ریزہ ریزہ قائم ہوں
مری نہ مانو تو میرا خطِ شکست پڑھو
جبیں جبیں سے میں تم کو رجوع کرتا ہوں
کہ آفتاب کی خاطر افق افق نہ پھرو
سوال یہ ہے کہ پتھر خدا بنا گئے
جواب یہ ہے کہ خاموشی اختیار کرو
اُداس اُداس فضا دل کی روشنی مانگے
دریچے ذہنوں کے کھولو، چراغ گل کردو
گھروں میں چھپ کے گنواؤ نہ اپنی جانِ عزیز
بچاؤ کے لئے شمشیرِ بے نیام رہو
زمیں پیروں سے کب کی نکل چکی راہی
خلاء کا دور ہے یہ، اونچ نیچ مت دیکھو

●●

غزلیں

[illegible]

ہو گی برسات بھیگ جاؤں گا
اب کے میں بھی لہو نہاؤں گا
لے اُڑے گی یہ تیز و تند ہوا
چاروں اطراف پھیل جاؤں گا
کھینچ لے گی مری زمین مجھے
میں ستارہ سا ٹوٹ جاؤں گا
پھر نئے دردِ رائیگاں کی تلاش
پھر نئے زخم کو سجاؤں گا
پھر کوئی روشنی نظر آئی
پھر اندھیروں میں ڈوب جاؤں گا
چوڑیوں کی صداؤں میں گم ہوں
دائروں سے نکل نہ پاؤں گا
اپنے بھیتر سمٹ گئے سب لوگ
بند مٹھی کسے دکھاؤں گا

●●

میں اکیلا گنہگارِ ہوس
میرے چاروں طرف حصارِ ہوس
سارے چہروں کی مٹ گئی پہچان
بھر گیا آنکھ میں غبارِ ہوس
چوٹ پتھر پہ بیٹھتی ہی نہیں
اور جل اُٹھتا ہے شرارِ ہوس
آگ اس کے بھی دل میں روشن ہے
میں اکیلا نہیں شکارِ ہوس
سرد پڑنے لگا بدن پھر بھی
سر سے اُترا نہیں بخارِ ہوس
کیسی رُت آ گئی خدا جانے
پیڑ پودوں پہ ہے بہارِ ہوس

●●

ٹیبل کے نیچے ٹیبل کے اوپر

شاہدہ یوسف

ناہید ٹیبل پر ناشتہ لگائے گھنٹوں سے اختر کا انتظار کر رہی تھی لیکن اختر کا نہانا ہی ختم نہیں ہو رہا تھا وہ گھنٹوں سے مختلف شعراء کے اشعار گنگنا گنگنا کر اپنے جسم پر شاور کی بوچھار کئے جا رہا تھا اور وہ ٹیبل پر اس کی گنگناہٹ کی آواز سن کر اور بھی جھنجھلا رہی تھی،

"اب نہانے گئے ہیں تو نکلنے کا ارادہ ہی شاید نہیں ہے۔ کتنے کام پڑے ہوئے ہیں، پیٹ میں چوہے الگ کود رہے ہیں لیکن انھیں تو اپنے کام سے کام ہے۔"

اتنا سوچتے ہوئے اس نے غسل خانے کے دروازے کو زور سے پیٹ ڈالا۔ اس ہنگامے سے گھبرا کر اختر نے دروازہ کھول دیا اور ڈریسنگ گون پہنے ہوئے ہی ناشتے کی میز پر آگیا اور کہنے لگا کہ میں نے کتنی بار کہا ہے تم میرا انتظار نہ کیا کرو۔ لیکن تم سنتی کب ہو فضول ہنگامہ کر کے پریشان کر دیا" اور خاموشی سے ناشتہ کرنے لگا۔

اختر کی اس بات پر ناہید کو غصہ تو بہت آیا لیکن خاموش رہنے میں ہی عافیت محسوس کی اگر کچھ کہتی تو بات بڑھ جاتی، اختر کا غصہ خدا کی پناہ، وہ غصے میں بالکل دوسرا آدمی ہو جاتا تھا اور یوں اتنا دلچسپ، اتنا پُر مذاق گھنٹوں باتیں کرتے رہیئے لیکن وقت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ ناہید کی سہیلیاں اور رشتہ کی بہنیں بھابھیاں اس کی قسمت پر رشک کرتیں اور وہ بھی خود کو کچھ کم خوش قسمت نہیں سمجھتی لیکن یہ سب اس وقت تک درست تھا جب تک اختر کا موڈ اچھا ہوتا، اس غصے کے وقت تو کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ اس سے بات کرے [illegible] سب بچا رے نیچے الگ ڈرے رہتے اور اللہ میاں سے دعائیں مانگا کرتے کہ اس کا غصہ جلد ختم ہو اور گھر میں امن امان قائم ہو۔

ناہید نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں وہ بہت مختلف تھا۔ گھر کے سبھی لوگ مل جل کر رہا کرتے تھے۔ زندگی ہنسی مذاق میں گذرا کرتی تھی۔ گھر کے سبھی لوگ ایک بڑے کمرے میں رات گئے گپ شپ کرتے۔ ایک عجیب ہنگامہ رہتا۔ بغیر مقصد کے لوگ گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔ کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ بچپن سے ناہید نے یہی سنا تھا کہ ہنسنا بولنا صحت کے لئے مفید ہے یہی سنتے سنتے وہ اس سرحد پر آگئی جب ایک ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر جب زندگی کا نیا دور شروع ہوا تو ایک ایسے شخص کو اپنے پاس پایا جس کے یہاں ہر وقت کا ہنسی مذاق یا گپ بازی فضول سی چیز تھی۔ اختر کے خیال میں سب باتوں کا ایک وقت ہونا چاہئے تھا، یہ کیا کہ ہر وقت فضول باتیں کئے جا رہے ہیں، خواہ مخواہ ہنسے جا رہے ہیں، ناہید اس ماحول میں آ کر کافی دنوں تک اجنبیت محسوس کرتی رہی۔ وہ زیادہ بولنے زیادہ ہنسنے اور لوگوں کو ہنسانے کی عادی تھی۔ اچانک اس پر پابندی لگ گئی تو ناہید کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ گھٹ جائے گی، فنا ہو جائے گی وہ جو ہر وقت قہقہے لگاتی پھرتی تھی ایک دم خاموش ہو گئی اب اسے اختر کے ساتھ ہنسنا پڑتا، اس کے ساتھ بولنا پڑتا اگر کبھی جوش میں آ کر زیادہ باتیں کرتی تو اختر فوراً ٹوک دیتا۔ "ناہید تم اتنا کیوں بولتی ہو، یہ اچھی بات نہیں۔ سوسائٹی میں ایسے لوگ کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔" اور پھر ناہید کا جی چاہتا کہ سوسائٹی کا گلا گھونٹ دے اور اتنا ہنسے اتنی باتیں کرے کہ آخر تھک جائے [illegible]

[illegible] خوشی سے آنسو بہا لیتی۔

اختر اس کی خاموشی سے سمجھ جاتا کہ ناہید کو رنج پہنچا ہے تو کسی بہانے وہ دلچسپ باتیں چھیڑ دیتا اور پھر ناہید بھی اختر کی تلخ باتیں بھول جاتی اور اس کی دلچسپ باتوں میں کھو کر تھوڑی دیر کے لئے اپنے حقیقی ماحول سے بے خبر ہو جاتی۔

اختر بہت خوب صورت تھا۔ بعض خاندانوں پر خدا کی خاص مہربانی ہوتی ہے۔ اختر کے خاندان کے سبھی افراد خصوصیت سے اچھی شکل صورت کے تھے۔ اختر کو حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت سے بھی خدا نے نوازا تھا اسے دلچسپ باتیں اور مزیدار لطیفے سنانے پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ ان سب باتوں کے ساتھ اسے شاعری سے بھی بچپن سے لگاؤ تھا اور خود بھی اچھا خاصا شاعر تھا، جب یہ ساری باتیں اکٹھی ہو جائیں تو انسان انسان نہیں رہتا بلکہ کوئی دیوتا نظر آنے لگتا ہے۔ اس دیوتا کو بھی پوجنے والی اس کی آرتی اتارنے والی بہت ساری پجارنیں تھیں۔ وہ سب کچھ جانتی تھی بلکہ اکثر محسوس کرتی تھی کہ اختر بھی اپنی کسی نہ کسی پجارن سے ذاتی طور پر دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ ان لوگوں سے جب بھی ملتا خاص خوشی محسوس کرتا شروع میں ناہید کو یہ باتیں بہت دکھ پہنچاتیں لیکن وہ اختر سے کبھی اس سلسلے میں کچھ نہ کہتی دل ہی دل میں کڑھا کرتی۔ اور پھر اختر کی زندگی میں ایک ایسی ہستی داخل ہوئی جس سے خود ناہید کو بے حد ہمدردی تھی مگر افسوس دونوں کے درمیان کئی دریاؤں کا فاصلہ تھا۔ لیکن اس طویل فاصلے کے باوجود بھی خط و کتابت کا سلسلہ چلتا رہتا اور اختر اس کی دلچسپی دیکھ کر تمام خطوط ناہید کو پڑھنے کو دیتا جو خود لکھتا وہ دکھاتا، اختر کو تعجب ہوتا کہ وہ کتنا جلتی کس طرح گزرتی ہے شروع میں وہ یہ باتیں پسند نہیں کرتی تھی ناہید اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیتی گرچہ اس کا جی چاہتا کہ کہہ دے تمہیں خوش دیکھنے کے لئے میں یہ غیر فطری باتیں برداشت کر رہی ہوں کوئی عورت اپنے پیار پر دوسرے کا قبضہ یا شرکت نہیں چاہتی لیکن اس نے ان باتوں کا کبھی خیال نہیں کیا۔ اس کا اختر خوش رہے بس اس کی یہی تمنا تھی، مگر افسوس دریاؤں کے پاٹ طویل ہوتے گئے اور وہ آنکھوں کو چکا چوند کرنے والا ستارہ کہیں گم ہو گیا۔ اختر کو وقتی طور پر اس کا بہت رنج ہوا لیکن قدرتی طور پر اسے برداشت کرنے کی بہت زیادہ صلاحیت تھی۔ اس لئے اس نے اس جذباتی حادثہ کو بہت اطمینان سے برداشت کر لیا۔ ناہید اختر کو بے وفا ہونے کا طعنہ دیتی۔ سچی بات یہ تھی کہ خود ناہید کو اس کا بہت افسوس ہوا تھا۔ اس کا جی چاہتا کاش وہ اس ستارے کو اختر کے دامن میں ٹانک سکتی۔

اختر آہستہ آہستہ نارمل ہو گیا اور پچھلے حادثہ کو بھولنے لگا، یا بھلانے کی کوشش کرنے لگا۔ کئی ہستیاں جو ذاتی طور پر اس میں یا اس کی شاعری میں دلچسپی لیتی تھیں بعض سے خود اختر بھی دلچسپی لینے لگا تھا۔ لیکن ناہید کا دل اب اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ وہ خود اختر کی دلچسپیوں سے دلچسپی لیتی گھنٹوں اس سلسلے میں اختر سے باتیں کرتی، اختر اس کی باتوں سے بے حد متاثر ہوتا اور ناہید سے کہتا " اس خانۂ دل میں جو بھی آئے لیکن دل ناچیز پر تمہارا ہی قبضہ ہے۔"

وہ جانتی تھی کہ اختر کی بات صحیح نہیں۔ کسی بھی بیوی کو محبوبہ کا فخر حاصل نہیں ہوا ہے اور شاعر لوگ یوں بھی عاشقوں کی فہرست میں سر فہرست ہوتے ہیں، یہ سب جانتے ہوئے بھی ناہید اختر کی باتوں سے ایک خاص خوشی محسوس کرتی۔

اختر دوسرے شعرا کی طرح پی کر بہکتا نہیں تھا، بلکہ بے حد اچھی باتیں کیا کرتا۔ ناہید اس کی باتوں میں کھو کر بھول جاتی کہ اختر سے جیسی محبت کی وہ خواہش مند ہے ویسی محبت اسے نہیں ملی۔ اور پھر اس وقت اختر کی تمام تر محبت ناہید اور صرف ناہید کے لئے ہوتی۔ ناہید کا جی چاہتا کاش یہ لمحہ ابدی ہو جائے ٹھہر جائے تاکہ وہ اختر کی حسین آنکھوں میں کھو کر سب کچھ بھول رہے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ "وقت کو کس نے قید کیا ہے"۔ گھڑی تیزی سے آگے بڑھنے کا اعلان کرتی رہتی اور پھر ناہید کا سارا

نوں ٹوٹ جاتا اور وہ اسی دنیا میں واپس آجاتی جس سے اس کو ڈر لگتا تھا۔

بچے بڑھ رہے تھے ان دونوں کی عمریں بھی بڑھ رہی تھیں اس کے با۔ جود بھی دونوں ایک دوسرے کے لئے بے حد جذباتی تھے۔ ناہید کی رشتے کی نندیں جٹھانیاں ناہید کا مذاق اڑاتیں کہ تم لوگ ابھی تک نئے جوڑے کی طرح ایک دوسرے کے لئے بے چین رہتے ہو۔ لیکن وہ کسی کی بات کا برا نہیں مانتی وہ جانتی تھی محبت پر وقت کی دھول نہیں پڑتی۔

ناہید اس طرح کے جذبات سے دوچار تھی کہ اس نے اختر کے ٹیبل پر ایک لفافہ پڑا دیکھا جس کی تحریر سے نسوانیت جھلک رہی تھی۔ اسے تجسس نے آگھیرا اور اس نے خط نکال کر جلدی جلدی پڑھ لیا۔ یہ خط اس کی سب سے عزیز دوست شہلا کا تھا جس نے اپنا نام یوں گھما کر لکھا تھا کہ کوئی پڑھ نہ سکے خط میں کوئی خاص بات اس کے علاوہ نہیں تھی کہ وہ ایک ہفتہ سے روزانہ شام کے وقت اختر کا انتظار کرتی ہے اور حسب معمول وہ صورت دیکھانے بھی نہیں آیا ہے۔ خط میں کہیں ذکر نہیں تھا کہ اپنی بیگم کو بھی لانا یا نہ لانا۔ ناہید نے سوچا کہ دیکھو میں نے سبھوں کو اتنی چھوٹ دے رکھی ہے پھر بھی لوگوں کو ٹیبل کے نیچے کی کاروائیوں میں کتنا لطف آتا ہے۔

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی اختر اب تک گھر واپس نہیں آیا تھا۔ ناہید کو بے چینی ہو رہی تھی۔ یہ پریشانی غصے میں بدلنے والی تھی کہ ٹھیک اس وقت اختر آہستہ سے کمرہ میں داخل ہوا۔ ناہید کو دیکھ کر مسکرا کر کہا:

"تم اب تک جاگ رہی ہو، کھانا کھالیا، معاف کرنا کچھ ایسی بحث نکل آئی کہ وقت سے نہ آسکا اور کافی دیر ہوگئی، اختر نے اتنے خلوص سے معافی مانگی کہ وہ اپنے غصے کو بھول گئی جیسے وہ کبھی غصہ نہ تھی۔ ناہید نے سوچا یا اللہ وہ کون سا جذبہ ہے جو مجھے اس شخص کے آگے اتنا مجبور کر دیتا ہے کہ میں چاہتے ہوئے بھی اس سے جھگڑ نہیں سکتی اتنا بھی پوچھ نہیں سکتی کہ کس سے بحث نکل آئی تھی اور بحث کا موضوع کیا تھا یا کچھ بھی ....

اختر کی قربت ہی اس کے لئے سب کچھ تھی اس کو اپنے پاس دیکھ کر اس کی تمام شکایتیں دور ہوگئیں۔

اور پھر وہ اختر کو بہت پیار سے دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو کتنی دیر لگادی۔ مجھے کس قدر ڈر لگ رہا تھا...... تم کہیں پھنس تو نہیں گئے تھے۔

اور پھر جواب میں اختر نے ناہید کو اپنے مضبوط بانہوں میں لے لیا اور جب وہ مل گئے سارا گلہ جاتا رہا۔

غزلیں

محسن زیدی

جتنا تہذیب بدن سے میں سنورتا جاؤں
اتنا ہی ٹوٹ کے اندر سے بکھرتا جاؤں

زندگی جیسے کلنڈر پہ بدلتی تاریخ
میں شب و روز کے مانند گذرتا جاؤں

کیا پتہ خوابوں کی تعبیر ملے یا نہ ملے
کسی کاغذ پہ انھیں نوٹ ہی کرتا جاؤں

صحنِ گلشن سے تو اک آخری رشتہ بھی گیا
خشک پتوں کی طرح اب تو بکھرتا جاؤں

تہِ ظلمات اُن آنکھوں کے دیے جلتے ہیں
زینہ زینہ میں اجالوں میں اُترتا جاؤں

گردِ دامن کی طرح مجھ کو اڑانے والے
عکس بن کر تری آنکھوں میں ٹھہرتا جاؤں

کتنے گھبرائے ہوئے ہیں مرے قاتل محسن
آستینوں پہ لہو بن کے ابھرتا جاؤں

●●

چندر پرکاش شاد

چھٹی جب دھند، کوسوں فاصلے نکلے
کہ جتنے عکس تھے، اُس پار کے نکلے

سرابوں نے اچھالا شہر میں واپس
یہ کس اُمید پر ہم ڈوبنے نکلے

عجب عکسِ ندامت ہو گئے ہیں ہم
جنھیں سمجھا تھا پتھر، آئینے نکلے

خود اپنی ہی صدائیں لوٹ کر آئیں
جو گنبد تھے نظر میں، کھوکھلے نکلے

سرِ دہلیز کب تھے ہم شبِ وعدہ
عجب پھر گمرہی کے سلسلے نکلے

کسی پاگل نے جیسے سنگ پھینکا ہو
کچھ ایسے ہم دیارِ غیر سے نکلے

●●

پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ "مصطفیٰ آ گیا۔؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں سر۔" نور محمد کی نظر اس امریکی بوتل پر تھی۔ شروع اپریل میں اسے ایک بنگالی بیرسٹر کے گھر سے ولایتی شراب اور بڑھیا سگریٹ مل گئے تھے۔ اس نے دونوں چیزیں بہت چھپا کے رکھیں، پھر بھی وہ مشتاق علی کا بچہ لے اڑا تھا۔ سالے کی کتے کی ناک ہے۔ اور یہ کرنل ہے بڑھیا مال آپ ہڑپ کر جاتا ہے۔ کوٹا بھی پورا نہیں دیتا۔ اس نے کرنل کو گالی دی۔

مشتاق علی کمرے میں آیا اور سیلوٹ کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"آئے وہ لوگ؟" کرنل نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہ کچھ کافروں کو لے کر گئے ہیں۔ بولتے تھے ادھر سے فارغ ہو کر آئیں گے۔"

کرنل نے کچھ سوچا اور باہر نکل گیا۔

مشتاق علی، نور محمد کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ نور محمد سمجھ گیا کہ مشتاق علی کے ہاتھ نیا مال لگا ہے۔

"ایل۔ ایم۔ جی ہے؟" نور محمد نے پوچھا۔

"ہیلی کوپٹر۔" مشتاق علی نے پیلے دانت نکال دیئے۔

"ایل۔ ایم۔ جی بہت چلالی، سوچا ذرا ذائقہ بدلوں، آ جا ڈیوٹی کے بعد، تو بھی کاڑا ایجیو۔"

باہر برآمدے میں کرنل کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ دونوں بت کی طرح خاموش ہو گئے۔

کرنل اندر آیا۔ اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا، آنکھیں سکڑ گئی تھیں ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور وہ بار بار ہاتھوں کی مٹھیاں کھول اور بند کر رہا تھا۔ وہ آ کر کرسی میں بیٹھ گیا۔ پھر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"یہ نہیں ہو سکتا، کبھی نہیں ہو سکتا۔" وہ نہ جانے کس سے کہہ رہا تھا۔

نور محمد نے مشتاق علی کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نور محمد کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ کرنل کی بے چینی اور گھبراہٹ کی وجہ کوئی بری خبر ہے۔

کرنل اب بنگال کے نقشے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی نظریں نقشے پر ان چھاؤنیوں کو دیکھ رہی تھیں جہاں پاک فوج ڈیرہ ڈالے تھی۔ ان کی پوزیشن مضبوط تھی اور ان کے پاس کئی ماہ کے لئے راشن اور اسلحہ تھا۔ وہ تیزی سے پلٹا اور میز پر رکھا ٹرانسمیٹر آن کر دیا۔

"جنرل مانک شا کا پیغام راؤ فرمان علی کے نام"

"شٹ اپ۔" کرنل گرجا اور ٹرانسمیٹر بند کر دیا۔ اس نے اپنا گلاس دوبارہ بھرا اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ اسے بنگالیوں پر سخت غصہ تھا کہ وہ پاکستان کی سالمیت ختم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اسے اسلام آباد میں بیٹھے جرنیلوں پر غصہ تھا کہ مجیب کو پھانسی نہیں دے رہے تھے۔ اسے امریکہ پر غصہ تھا کہ وہ پاکستان کو ایٹم بم نہیں دے رہا تھا۔ اسے چین پر غصہ تھا کہ وہ بھارت پر حملہ نہیں کر رہا تھا۔ اسے ساتویں امریکی بیڑے پر غصہ تھا کہ وہ بے حد سست رفتار تھا۔ وہ سب سے ناراض تھا۔

شام کی اداس خاموشی میں کسی عورت کی چیخ گونجی۔ کرنل نے آواز کی سمت دیکھا۔ ٹینک کے پاس کچھ سپاہی ایک عورت کو بنکر میں گھسیٹ رہے تھے۔ عورت بنگالی زبان میں شاید ان سے رحم کی درخواست کر رہی تھی۔

کرنل کو اس زبان سے نفرت تھی۔ یہ لوگ مسلمان ہو کر ہندی اور سنسکرت کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اسے اس قوم سے نفرت تھی۔ یہ آج تک ہندوؤں کا لباس پہن رہی تھی۔ اس نے گلاس لبوں سے لگایا اور ایک سانس میں خالی کر دیا۔

وہ چیخیں اب دب گئی تھیں۔ کسی نے عورت کے منہ میں شاید کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ کرنل کو وہ بنگالی لڑکی یاد آئی جو ہزار کوشش پر بھی برف کی طرح سرد اور منجمد رہی۔ کرنل نے تنگ آ کر اسے گولی مار دی تھی۔

کرنل نے تیسرا پیگ بنایا۔ آسمان میں GNATS کی آواز گونجی۔ وہ اس کے سر پر سے دھاڑتے ہوئے گزر گئے تھے۔ ان کے تمام جہاز تباہ ہو چکے تھے۔

[illegible] کرنل نے آنکھیں موند لیں۔ اسے محسوس
ہوا اس کے اندر کہیں خلا پھیلتا جا رہا ہے۔ اسے خبر ملی تھی
[illegible] ہتھیار ڈالنے [illegible] پر غور کر رہے ہیں۔ اور کہا۔ ان ماو
[illegible] سے نکالنے کے لئے جنرل مانک شا سے چند
[illegible] بہت بھگت رہے تھے۔ کرنل اس بات پر ماہر بچوں کو گالیاں
دینا چاہتا تھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ ٹیلی فون کی طرف دیکھا بھی لیکن
جنگ کرنے کا حوصلہ نہ کر سکا اور یہی بے حوصلگی، مجبوری اور مایوسی
کا احساس اسے پریشان کر رہا تھا۔

اس نے تیسرا پیگ حلق میں انڈیل لیا۔

"ہتھیار ڈال دو۔" گہری ہوتی ہوئی شام بولنے لگی تھی

"ہتھیار ڈال دو۔" GNATS کی گونج کہہ رہی تھی۔

"ہتھیار ڈال دو۔" امریکی شراب کی رائے تھی۔

کرنل نے چوتھا پیگ بنا سوڈے کے پیا۔ وہ تین لفظ "ہتھیار ڈال دو" جیسے اس کے اندر کہیں ریکارڈ ہو گئے تھے۔ وہ اس آواز کی مسلسل ضربوں سے بچنا چاہتا تھا۔ اس نے پانچواں پیگ بھی بنا سوڈے کے پیا۔ اب وہ آواز دور۔ دور ــــ دور چلی گئی تھی۔ چھٹے پیگ نے آواز کا گلا گھونٹ دیا۔ کرنل مسکرایا اور بوتل میں بند سنہری آگ کو دیکھ کر بولا۔ "تم بھی اپنے بنانے والوں کی طرح حرامی ہو۔"

کرنل نور محمد کو مصطفےٰ سے متعلق چند ہدایات دے کر آفیسرز میس کی طرف چلا گیا۔ وہ تنہائی سے بچنا چاہتا تھا۔

میس افسروں سے بھرا تھا۔ وہ لوگ بے تحاشہ پی رہے تھے بے تحاشہ کھا رہے تھے، بے تحاشہ باتیں کر رہے تھے۔ دس پندرہ بنگالی لڑکیاں ان کی خدمت پر مامور تھیں۔ افسران سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے، لیکن وہ یوں بے حس تھیں جیسے گوشت پوست کی عورتیں نہیں بلکہ مٹی کی چلتی پھرتی مورتیاں ہوں

کرنل کو دیکھ کر کچھ جونیئر افسر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ان کے چہرے شراب اور کھانے کے باوجود بجھے بجھے اور اترے ہوئے تھے۔ ان کے حوصلے پست اور آنکھوں میں بیزاری کی سی کیفیت تھی۔ وہ سب جیسے مشینی زندگی گزار رہے تھے۔ اپنے وجود اپنے دل و دماغ سے الگ ہو کر۔

"سر کیماری جل رہا ہے۔" ایک لیفٹیننٹ نے بتایا۔

"STOP IT."

"B.B.C. کی خبر ہے سر۔"

"انگریز ہمارے دشمن ہیں۔"

"سر، ہمارے گھروں سے نہ کوئی خط آ رہا ہے نہ پیغام۔ تمام سلسلے منقطع ہو چکے ہیں۔" ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "نہ ہمیں ان کی خبر ہے، نہ انہیں ہمارا پتہ، یہ کیسی۔" وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ کرنل کی چھوٹی، تیز اور گولی کی سی خطرناک ٹھنڈک لئے آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ لیفٹیننٹ نظریں جھکا کر ایک طرف ہٹ گیا۔

"ینگ مین!" کرنل نے اطمینان سے کہا۔ "یہ جنگ ہے ایک مکار دشمن کے ساتھ، ساری دنیا اسے پاکستانی علاقے سے فوجیں ہٹا لینے کے لئے کہہ رہی ہے، لیکن وہ ڈھٹائی پر تلا ہوا ہے اسے ان بازوئے حیدری کو ایک مرتبہ پھر آزمانا ہے۔ مجاہدو! آخری فتح ہماری ہوگی۔ دشمن کو ایک بار پھر غزنوی اور اورنگ زیب یاد آ جائیں گے۔ یہ سود خور بنئے، یہ درخت، سانپ اور پتھر پوجنے والے جاہل ہم غازیوں سے کیا لڑیں گے۔ چیئر اپ مائی بوائز۔" کرنل نے اپنا گلاس ہوا میں اونچا کیا۔ "پاکستان زندہ باد۔"

سارا ہال زندہ باد کے نعروں سے گونج گیا اور پھر ایک دم موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ شاید وہاں موجود افسروں میں سے کسی کو بھی فتح کا یقین نہیں تھا۔ شاید انہیں ان الفاظ کے کھوکھلے پن اور بے معنی ہونے کا احساس ہو گیا تھا۔ شاید یہ جھوٹ اب زیادہ دیر تک تقویت نہیں دے سکتا تھا۔

"ENJOY YOUR SELF" کرنل نے اس طرح

کیا۔ جیسے وہ واقعی فتح یاب ہو کر لوٹ رہا ہو، اور آگے بڑھ گیا۔

اس سیکنڈ لیفٹننٹ نے ایک لڑکی کے ہاتھ سے جام لیتے ہوئے سوچا۔ وہ لاہور، اپنے گھر کب پہنچے گا، اپنے بوڑھے ماں باپ سے کب ملے گا۔ اپنے بڑے بھائی جو ۶۵ء کی جنگ میں مارا گیا تھا، کی قبر پر اس سال پھول چڑھا سکے گا کہ نہیں۔ وہ یہاں سے نکل بھی سکے گا کہ نہیں۔ اُسے عجیب سی مایوسی اور شکست کا سا احساس ہوا۔ اس نے جام حلق میں انڈیل لیا۔ شراب اُس کے ذہن کو ماؤف کرتی چلی گئی۔ وہ لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ایک اداس، بجھی ہوئی، بے جان مسکراہٹ جو ہونٹوں کے مالک سے کہتی ہے "تم ہار گئے، تم مر گئے، تم ختم ہو گئے۔" ایک دم نہ جانے اسے کیا ہوا کہ اس نے لڑکی کو شانوں سے دبوچ لیا اور اُسے زور زور سے جھنجھوڑنے لگا۔ پھر اُس کے ہاتھ لڑکی کی گردن کے گرد سخت ہو گئے۔

"میں تمہیں مار ڈالوں گا۔ تمہارا نام و نشان مٹا دوں گا۔ میں — میں —"

کچھ افسروں نے زبردستی اُسے لڑکی سے الگ کیا۔

"سالا، لڑکیاں تو پہلے ہی مل نہیں رہیں۔" ایک افسر نے آہستہ سے کہا۔

وہ اس کے شانوں پر سر رکھ کر پھپھک کر رو دیا۔

ایک افسر بھیڑ میں سے آگے بڑھا اور اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر ہال سے باہر لے گیا۔

کرنل نے جاتے جاتے بہ نظر پلٹ کر دیکھا اور نشن دان کے قریب کھڑے چند سینیئر افسروں میں جا شامل ہوا۔ جو یحییٰ خان کی تقریر سن رہے تھے۔ صدر مملکت نے واضح طور پر اعلان کر دیا تھا کہ وہ ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔ اور یہ جنگ خون کے آخری قطرے تک لڑی جائے گی۔

"لیکن جنرل نیازی اور راؤ فرمان علی کا کہنا ہے کہ انہیں اسلام آباد سے ہدایات موصول ہوئی ہیں کہ وہ اگر مناسب سمجھیں تو SURRENDER کر سکتے ہیں۔"

"راؤ صاحب نے یو تھانٹ سے مدد مانگی ہے۔"

"WE ARE DOOMED"

"مسٹر مصطفےٰ آ گیا ہے۔" مشتاق علی نے آ کر بتایا۔

کرنل کا چہرہ، جو افسروں کی باتیں سن کر پھیکا پڑ گیا تھا پھر چمکنے لگا۔ وہ افسروں کو حوصلے اور ہمت سے کام لینے کی تلقین کر کے میس سے نکل گیا۔

کرنل جب اپنے دفتر میں پہنچا، البدر کے رضاکار دیوار کے ساتھ قطار میں کھڑے تھے۔ مصطفےٰ کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ کرنل کو دیکھ کر اس نے سگریٹ بجھا دیا اور کھڑے ہو کر سیلوٹ کیا۔ کرنل نے سر کی جنبش سے سلام کا جواب دیا اور کرسی پر جا بیٹھا اس نے تمام رضاکاروں کو سر سے پاؤں تک دیکھا، آخر اس کی نظر مصطفےٰ پر آ کر ٹھہر گئی۔

تنگ پتلون پر چمڑے کی جیکٹ پہنے وہ پتلا اور لمبا نوجوان سینکڑوں بنگالیوں کا خون کر چکا تھا۔ کئی گھر جلا چکا تھا۔ ہندوؤں کی تو اس نے آبادیوں کی آبادیاں جلا کر خاک کر دیا تھا۔ کرنل کے لئے ایک عورت روز مہیا کرنا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا اس کا چہرہ لمبوترہ، جبڑے ابھرے ہوئے، پیشانی تنگ، ناک طوطے کی طرح مڑی ہوئی اور آنکھیں چھوٹی اور گول تھیں۔ اس کی انگلیاں پتلی، لمبی اور ٹیڑھی تھیں۔ جسم کے جوڑ ابھرے ہوئے تھے۔ اس کے اوپر کے نوکیلے دانت تھوڑے اونچے اور باہر کو نکلے ہوئے تھے، جس سے اس کی شکل اور بھی ڈراؤنی ہو گئی تھی۔

"دیر کر دی؟" کرنل نے مسکرا کر کہا۔

"جی ... مصطفےٰ ... نے کچھ ... کیا ... کو مکتی باہنی ...

... [illegible] ... ہم ... کر ... چاہئے ...

[illegible]

"[illegible] جاتے ہو۔" کرنل نے کہا۔ "ہمیں [illegible] کرنا چاہئے۔"

"[illegible] مسلمان کدوگون ہیں۔ ! نہیں سر۔"

مصطفےٰ نے کہا۔ "اس کے لئے مسلمان جو ہیں ہمارا ایک [illegible] مسلمان ہسپتال پہنچا دیتا ہے۔"

کرنل سر جھکائے کچھ سوچ رہا تھا۔ مصطفےٰ کے ذہن میں اپنا ہی جملہ گونج رہا تھا۔ مسلمان کی رگوں میں کافر کا خون۔ اُس کے آباؤ اجداد برہمنوں کے برہمن تھے جو اورنگ زیب کے زمانے میں مسلمان ہو گئے تھے۔ وہ اس خیال، اس کانٹے کو نکال پھینکنا چاہتا تھا لیکن یہ خیال شاید اس کے خون میں رچ بس گیا تھا۔

"اور وہ بنگالی غدار۔؟" کرنل نے اپنے خیالات سے ابھر کر پوچھا۔

"اس کا گھر جلا دیا اور اس کی آنکھیں نکال کر ہم نے اُسے سڑک کے کنارے ایک درخت سے لٹکا دیا ہے تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔"

"کیا نام تھا اُس کا۔؟" کرنل نے فہرست دیکھی۔

"ظفر۔"

یہ نام اس فہرست میں نہیں تھا۔ کرنل مسکرایا۔ "ایک سو چھیالیس۔" پھر اس نے مصطفےٰ سے پوچھا۔ "ڈاکٹر مرتضیٰ کے [illegible] بچے۔؟"

"بچے نور محمد کی کوٹھی میں ہیں۔" مصطفےٰ نے بتایا۔ "[illegible] بیوی کو ہم زندہ نہیں لا سکے۔ اس نے چھت سے [illegible] لگا کر خودکشی کر لی۔"

"[illegible] میں شراب اور کھانا تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" [illegible] فہرست مصطفےٰ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "سپاہیوں [illegible] ہو گیا ہے۔ صبح سے پہلے پہلے کام ختم ہو جانا [illegible] ہمارا [illegible] پہنچ چکے ہیں۔"

[illegible] انتظام جس [illegible] دو ہزار آدمی

ایک ساتھ۔"

کرنل مسکرایا۔ اس کے ذہن میں گیس چیمبرز کی تجویز تھی۔

مصطفےٰ نے فہرست جیب میں ڈالی اور اپنے آدمیوں کو لے کر میس کی طرف چلا گیا۔

کرنل نے گھڑی دیکھی اور نور محمد کو آواز دی۔ نور محمد فوراً آ گیا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی اس کی نظر بوتل پر پڑی۔ اُسے دکھ ہوا کہ کرنل آدھی سے زیادہ بوتل ختم کر چکا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ جب کرنل اوپر جائے گا تو وہ یہ بوتل اُڑا لے گا۔ کرنل کے ہاتھ میں لڑکی کا ہاتھ ہو تو اسے باپ کا نام تک یاد نہیں رہتا، اور اب کرنل پھر آ بیٹھا اور شراب وہ گھڑوں کے حساب سے پی سکتا تھا۔

"وہ دونوں بچے کہاں ہیں۔؟"

"میرے کمرے میں۔"

کرنل نے پیگ تیار کیا اور گلاس لئے کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ نور محمد نے اُسے ایک اور گالی دی۔ اور بوتل میں کم ہوئی سنہری آگ کو حسرت سے دیکھا۔

کرنل نے اندھیرے میں وہ دس بتیاں دیکھنے کی کوشش کی جو عمارت کے پچھواڑے KILLING SQUAD کے لئے نصب کی گئی تھیں۔ ایک سو پینتالیس گولیاں۔ نہیں چھیالیس۔ اس نے ڈاکٹر مرتضیٰ کو بھی اس فہرست میں شامل کر لیا، جو اوپر اس کی رہائش گاہ میں قید تھا اسے افسوس تھا کہ شاہدہ نے تیسری منزل سے چھلانگ لگا کر جان دے دی تھی۔ وہ لمبے بالوں، بڑی بڑی کالی آنکھوں اور سانولے رنگ کی بھری بھری سی بنگالن ایک رات وہ بھی اس کے کمرے میں ہوتی تو۔ اور وہ چوہدری بہادر وہ مکتی باہنی کے چھاپہ مار جنہوں نے کئی پاکستانی فوجیں ہلاک کر دیئے تھے۔ جائیں گے کہاں۔؟ بنگالیوں سے ان کا دماغ چھین لو، وہ ناکارہ ہو جائیں گے۔ یہ رائے .A .I .S کے [illegible] افسر کی تھی۔ لیکن یہ بے وقوف کرنل کی تجویز پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ گیس چیمبرز سے کام کس قدر آسان ہو سکتا ہے۔ [illegible]

CRUDE طریقہ استعمال کیا تھا۔ تجربہ کے طور پر۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں بائیس دس بارہ سال کی عمر کے لڑکے بند کر کے، اندر پتھر کے کوئلوں کی انگیٹھیاں سلگا کر رکھ دی تھیں اور بچوں سے کہہ دیا تھا کہ انہیں سردی کی وجہ سے کیا جا رہا تھا۔ صبح صرف پندرہ مردہ پائے گئے سات بے ہوش تھے۔ انھیں سنگینوں سے ہلاک کرنا پڑا تھا۔ خون صاف کرنے کے لئے الگ سے محنت کرنا پڑی تھی۔

"نور محمد۔۔ !"

"یس سر۔"

"بچوں کو اوپر لے آؤ۔" کرنل نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور بائیں دروازے سے کوریڈور میں چلا گیا جہاں سے سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔

جب کرنل کے قدموں کی چاپ لکڑی کی سیڑھیوں پر دُور ہوتے ہوتے ختم ہو گئی۔ تو نور محمد نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور لپک کر بوتل اٹھائی اور منہ سے لگا کر آخری قطرہ تک پی گیا۔ اس نے لب خشک کئے اور کمرے سے نکل گیا۔

"حرامی ساری پی گیا۔" باہر کھڑے سپاہی نے شکایت کی۔

نور محمد نے نفرت اور غصہ سے اس کی طرف دیکھا اور اکڑ کے چلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

جب وہ بچوں کو لیکر اوپر پہنچا کرنل بستر پر سر تھامے بیٹھا تھا۔ وہسکی سے بھرا گلاس سامنے تپائی پر رکھا تھا۔ قریب ہی کرنل کا پستول رکھا تھا آہٹ پا کر کرنل نے ان کی طرف دیکھا۔ دونوں بچے دیوار کے ساتھ سہمے سے کھڑے تھے۔ بڑی لڑکی خدیجہ نیرہ چودہ سال کی تھی۔ اور لڑکا اقبال نو دس سال کا۔ ان کے چہرے اس طرح سفید اور منجمد سے تھے جیسے کسی نے سارا لہو نچوڑ لیا ہو۔

کرنل نے شراب کا گھونٹ بھرا اور نور محمد سے عقبی کمرے کا دروازہ کھولنے کے لئے کہا۔ نور محمد نے حکم کی تعمیل کی۔

"باہر آجاؤ ڈاکٹر۔"

ایک چالیس بیالیس سالہ شخص، لڑکھڑاتا ساتاریکی سے کمرے کے اجالے میں آگیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ چہرہ مار کی وجہ سے مسخ ہو گیا تھا۔ ہونٹ اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں ران پر جہاں پاجامہ جل گیا تھا ایک تازہ زخم نظر آ رہا تھا۔

"ابو۔" بچے دوڑ کر باپ سے لپٹ گئے۔

ڈاکٹر پیار سے اس کے سروں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"اماں مر گئیں۔" خدیجہ نے روتے ہوئے بتایا۔

ڈاکٹر نے بچوں کو سینے سے لگا لیا اور کرنل کی طرف دیکھا کرنل اطمینان سے سگار کے کش لے رہا تھا۔

"ڈاکٹر اب بھی بتا دو وہ چوہدری برادرز کہاں ہیں۔؟" کرنل نے نرمی سے کہا۔

"میرا جواب تمہیں معلوم ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"فضول، تمہاری ضد، صرف تم بنگالیوں کا نقصان کر رہی ہے۔" کرنل اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ میرے آدمیوں نے تمہاری ساری کالونی جلا کر راکھ کر دی ہے۔ وہ بچ کر نہیں جا سکتے۔ تم سے پہلے بھی لوگ ایسی جاہلانہ حرکتیں کر چکے ہیں۔"

"ڈاکٹر۔" کرنل گرجا۔

نور محمد کی رائفل جیسے کسی مشین حرکت سے ڈاکٹر کی طرف تن گئی

"ڈاکٹر مجھے زبان کھلوانا آتا ہے۔"

ڈاکٹر مسکرا دیا۔

"تم ابھی بولو گے، یہیں، اسی وقت۔" کرنل تقریباً چیخا آسمان میں GNATS کی آواز گونجی۔ ڈاکٹر نے کھڑکی سے باہر آسمان کو پُر امید نگاہوں سے دیکھا۔ ستارے روشن تھے۔

کرنل نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

"ڈاکٹر، یہ طیارے تمہیں بچا نہیں سکیں گے۔ انہیں ہماری توپیں ابھی گرا لیں گی۔ بھارتی فوج پاکستان کے کسی حصے پر قدم نہیں رکھ سکتی۔ وہ یہ غلطی کبھی نہیں کریں گے۔ وہ ہمیں ہزار سال سے جانتے ہیں۔"

ڈاکٹر ہنسا۔

"کرنل، تم جانتے ہو کہ تمہارے سب باتیں غلط ہیں، تم جھوٹ، فریب اور بیگناہی کے جالوں میں خود پھنسے ہو — تم —"

"کتے۔" کرنل دہاڑا۔

"وہ تو اسلام کا دین نہیں کرنل۔"

نور محمد نے رائفل کا لاک کھول دیا اور جست باندھ لی۔

"اس طرح نہیں۔" کرنل کے نتھنے پھول رہے تھے۔ "شیر خان کو بلاؤ۔" کرنل نے کہا۔

چند منٹ بعد ایک چھ فٹا پٹھان کمرے میں آ گیا۔

"سو ڈاکٹر مجھے وہ دونوں بھائی چاہئیں، ہر قیمت پر۔"

"تم انسان سے واقف نہیں ہو کرنل۔ تم بنگال کو سمجھے ہی نہیں۔"

"بنگال، بنگال، بنگال۔" کرنل چیخا۔ "میں سب ختم کر دوں گا۔ شیر خان۔" کرنل نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔ "تم جانتے ہو تمہیں کیا کرنا ہے۔"

کرنل حکم دے کر جیسے ہر چیز سے لاتعلق ہو گیا۔ اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

وہ چینی ٹینک اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔ اس کی لمبی نالی سائے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ دور کہیں گولیاں تھوڑے تھوڑے وقفے سے چل رہی تھیں۔ تبھی ٹینک کے پیچھے سے ایک سایہ تیزی سے نمودار ہوا اور ایک طرف کو بھاگنے لگا۔ گولی چلی۔ ایک نسوانی چیخ فضا میں گونجی اور تاریکی میں ڈوب گئی۔ کسی نے ٹینک سے ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ کرنل نے دیکھا، ٹینک سے چند قدم کے فاصلے پر ایک ننگی عورت اوندھے منہ سڑک کے کنارے پڑی تھی۔ دوسرے ہی لمحہ ٹارچ بجھ گئی۔

کمرے میں بچوں کی چیخیں گونجیں۔ کرنل نے پلٹ کر دیکھا۔ شیر خان نے اقبال کو ڈاکٹر سے کھینچ کر الگ کر دیا تھا اور اب ایک گرم سلاخ لئے ڈاکٹر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"نہیں — نہیں۔" خدیجہ تڑپ کر چلائی۔

"ابّو۔" اقبال رونے لگا۔

شیر خان نے سلاخ ڈاکٹر کے شانے پہ رکھ دی۔ کپڑا جلا۔ گوشت چرچرایا۔ ڈاکٹر نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کا بدن درد سے اکڑ گیا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ فرش پر بیٹھ گیا۔

"کیوں ڈاکٹر!" کرنل نے سگار کا کش لیا۔

اقبال باپ کی طرف بڑھا۔ نور محمد کی سنگین درمیان میں آ گئی۔

"مرتضیٰ، ملک سے غداری شہادت نہیں ہوتی۔"

"جے بنگلہ۔" ڈاکٹر کے لبوں سے نکلا۔

"خدا تمہیں غارت کرے، تمہیں کیڑے پڑیں۔" خدیجہ نے بددعا دی۔ "تمہارا کوئی نہ رہے۔"

کرنل مسکرایا۔

"بنگالیوں کو زبان درازی کی عادت ہوتی ہے۔" کرنل کا چہرہ ایک دم سوکھی لکڑی کی طرح سخت اور کھردرا ہو گیا۔ اس نے گلاس خالی کر دیا اور ہونٹ خشک کر کے بولا۔ "شیر خان، یہ لڑکی بہت باتیں کرتی ہے۔"

شیر خان کسی مشین کی طرح ڈاکٹر کو چھوڑ کر خدیجہ کی طرف آ گیا۔ وہ سہم کر دیوار سے جا لگی۔ شیر خان نے سلاخ ایک طرف رکھ کر خدیجہ کو دبوچ لیا۔ اقبال نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔

خدیجہ اب کمرے میں ننگی کھڑی تھی

نور محمد نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

ڈاکٹر نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

کرنل نے گلاس پھر شراب سے بھر لیا۔

شیر خان اگلے حکم کا منتظر تھا۔

خدیجہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے خود کو ڈھانپنے کی بے سود کوشش کر رہی تھی، اقبال رو رہا تھا۔

"کرنل، خدا تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔" ڈاکٹر بولا

"ڈاکٹر، خدا غداروں کا نہیں، مجاہدوں اور غازیوں کا ساتھ دیتا ہے۔" کرنل نے کہا۔ "شیر خان، اس بنگالن پر پاکستانی مہر لگا دو۔"

شیر خان خدیجہ پر کسی بھوکے بھیڑیے کی طرح ٹوٹ پڑا اور اسے فرش پر چت گرا لیا۔ اس کا بھاری فوجی جوتا خدیجہ کے سینے پر تھا اور وہ اپنی شلوار اتار رہا تھا۔

"ابو۔" خدیجہ جیسے پاتال سے بولی۔

"بتا دو ڈاکٹر۔" کرنل نے کہا۔

"ابو۔" اقبال کانپ رہا تھا۔

"کرنل خدا کے لئے۔" ڈاکٹر نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

"ابو۔" خدیجہ کے آنسو فرش کو بھگو رہے تھے۔ "ابو۔"

"کرنل۔"

"ابو، اسے کچھ مت بتانا۔" خدیجہ کچلی جا رہی تھی۔

"شیر خان!" کرنل گرجا۔

شیر خان کسی درندے کی طرح خدیجہ کو بھنبھوڑنے لگا۔ خدیجہ کی چیخیں کمرے میں گونج رہی تھیں۔ اقبال بہن کو بچانے کے لئے لپکا۔ نور محمد کی سنگین اس کے پیٹ کے آر پار ہو گئی۔ وہ تڑپا پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ نور محمد نے لاش کے شانے پر جوتا رکھ کر سنگین باہر نکالی، خون صاف کیا۔ پھر جوتا صاف کیا اور اٹین شن ہو گیا۔

خدیجہ چیخ رہی تھی۔

شیر خان اسے دبوچے تھا۔

نور محمد کی رائفل تنی ہوئی تھی۔

کرنل امریکی شراب پی رہا تھا۔ قطرہ، قطرہ۔

نیچے کچھ فوجی گاڑیوں کے رکنے کی آواز آئی۔ کچھ فوجی بجری پر چلتے ہوئے شاید ایک دم پوزیشن لے کر کھڑے ہو گئے۔ کوئی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔

مصطفیٰ تھا۔

کمرے کا منظر دیکھ کر ایک شاید [illegible] لاش کو پھلانگ کر دوسری طرف کرنل کے قریب [illegible]

"سب آ گئے۔؟" کرنل [illegible]

"یس سر۔"

"[illegible]" کرنل نے [illegible] سب کو پچھواڑے لے جاؤ۔ سب انتظام ہو گیا ہے [illegible] دس سپاہی ساتھ لے لینا۔ سمجھ گئے۔؟"

وہ لوگ چلے گئے۔

چند منٹ بعد گولیاں چلنے لگیں۔

"ایک، دو، پانچ، نو، چودہ، بیس۔" کرنل شوق سے گن رہا تھا۔ "ڈاکٹر اب تم بنگالی ہزار سال تک نہیں اٹھا سکو گے، تمہاری لڑکیاں، تمہاری عورتیں پنجابیوں، [illegible] اور سندھیوں کو جنم دیں گی۔"

گولیاں دس دس کی گنتی میں چل رہی تھیں۔

"تیس، چالیس، پچاس۔"

اچانک کمرے میں گولیوں کی آواز گونجی۔ کرنل نے پلٹ کر دیکھا۔

ڈاکٹر اس کا پستول لئے شیر خان پر گولیاں داغ رہا تھا۔ کرنل نے لپک کر ڈاکٹر کو دھکا دیا اور پستول چھین لیا۔ شیر خان فرش پر لڑھک کر ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر گھسٹتا ہوا خدیجہ کے قریب پہنچ گیا تھا اسے کوئی گولی نہیں لگی تھی۔ لیکن وہ مر چکی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کی آنکھیں بند کیں اور اس کی لاش اسی کی دھوتی سے ڈھک دی۔ وہ اقبال کی طرف بڑھا۔ ایک گولی چلی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

کرنل نے سگار سلگایا لیکن اب وہ گنتی بھول چکا تھا۔

اپنی تخلیق کے اختتام پر اپنا پتہ ضرور تحریر کریں

...سے پہلے

قاضی سلیم

۱۱۰

چار روپے

مکتبہ شب خون کتاب گھر۔ الہ آباد ۳

"نجات سے پہلے" قاضی سلیم کا مجموعۂ کلام ہے۔ جس میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۰ء تک کی نظمیں شامل ہیں۔ ان میں [illegible] تین تین مصرعے کی، جاپانی صنف سخن ہائیکو کے فارم میں [illegible] عنوان کے تحت شائع کی گئی ہیں۔ چند نظمیں معرّی ہیں اور [illegible]

اختر الایمان نے "کچھ شاعر کے بارے میں" کے زیر [illegible] شاعر کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"قاضی سلیم نے ایک آسودہ ماحول میں پرورش
پائی ہے۔ ذہنی اور معاشی پریشانیاں جو
اکثر لکھنے والوں کے حصے میں آتی ہیں شاید انھیں
ان سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ معاشی آسودگی
کے ساتھ ساتھ شاید جنسی نا آسودگی بھی نہیں۔
ایک آسودہ زندگی گزار رہے ہیں۔"

[illegible] کی شاعری احساس محرومی، بے حاصلی اور کرب سے [illegible] ہے۔ یہ کرب روح اور احساس کا کرب ہے کہ اس عہد کے [illegible] انسان کا سرمایہ ہی یہی ہے۔ لیکن اس کرب کا اظہار انھوں نے [illegible] اسلوب یا مندرجہ الفاظ کے ذریعہ نہیں کیا ہے جیسا [illegible] شعرا عموماً کر رہے ہیں۔ اور جس کے باعث جدید [illegible] احساس و جذبے کی ترجمانی کے بدلے بعض مخصوص الفاظ و تراکیب کے حصار میں اسیر ہوتی جاری ہے

قاضی سلیم کی نظموں کے بارے میں اختر الایمان کا خیال ہے کہ:

"ان نظموں کے کردار کسی بالادست کی گرفت میں ہیں
یا بہ حیثیت مجموعی تمام نظموں کا موضوع انسان اور
غم انسانیت ہے۔"

اور اسی لئے آگے چل کر انھوں نے اس کی شاعری کو "شاخِ نہالِ غم" کا نام دیا ہے۔ یہ صحیح ہے اور اس کا اندازہ مجموعے کے نام سے ہی ہو جاتا ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ اس شاخِ نہالِ غم کی جڑیں ابھی بہت گہرائی میں نہیں اتر پائی ہیں۔ موضوعات زیادہ تر سامنے کے ہیں۔ جنھیں منفرد فنکارانہ یا مفکرانہ بصیرت ہنوز نصیب نہیں ہوئی ہے۔ قاضی سلیم کے یہاں ایک مایوس کن بات یہ ہے کہ ان کی شاعری میں کسی بھی جہت سے ارتقاء کی علامتیں مفقود ہیں۔ حالانکہ بیس سالہ انتخاب میں یہ توقع کی جاتی ہے کہ دورِ آخر کی شاعری ابتدائی زمانے کی شاعری سے فنی اور فکری طور پر زیادہ پختہ اور نکھری ہوئی ہوگی۔ ویسے تاثر کے لحاظ سے طویل نظموں کی نسبت مختصر نظمیں مثلاً ایک نظم، ایک کتبہ، یاد وغیرہ زیادہ کامیاب ہیں۔

اردو میں تین مصرعوں کی نظموں کا رواج اگر بہت عام نہیں ہوا تو اب ایسا نیا اور کمیاب بھی نہیں رہ گیا ہے لیکن حمایت علی شاعر نے اس فن میں جو مہارت حاصل کر لی ہے، اور اس کے جتنے کامیاب نمونے پیش کئے ہیں۔ کوئی اور شاعر وہاں تک نہیں پہونچ سکا ہے قاضی سلیم کی کوششیں جو انھوں نے ہائیکو کے عنوان سے کی ہیں۔ (احمد ندیم قاسمی نے تین مصرعے کی نظم کو ثلاثی کا نام دیا ہے) کامیاب ہیں۔ اگر وہ اس کی طرف خصوصی توجہ کریں تو عین ممکن ہے کہ اس صنف کی ترقی کا باعث بن جائیں۔

تین مصرعے کی نظم کے انداز و معیار کے اظہار کے لئے پہلے حمایت علی شاعر کی ایک نظم ملاحظہ فرمائیے۔ [illegible]

"شاعری، پیغمبری" ؎

پھر کوئی فرمان اے ربِ جلیل !
ذہن کے غارِ حرا میں کب سے ہے
فکر محوِ انتظارِ جبریل

اور اس کے بعد قاضی سلیم کے ہائیکو کی مثالیں دیکھئے ؎

آج تم
میری یادوں کا اثاثہ ہو
کئی فصل کا مالک ہوں میں (I)

کیا سیاہی کے مداوے کے لئے
اک سفیدی ہے !
— اور کوئی رنگ ؟ (IV)

جانے کل کیا ہو
تعاقب نہ کرو
بدلیو ساتھ برس کر کھلی (V)

قاضی سلیم کے اسلوب میں تخاطب، مکالمے اور ڈرامائی عناصر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اور یہ شاید آج کی اُجاڑ، بنجر اور خشک زندگی کا لاشعوری ردّعمل ہے کہ ان کے یہاں جھیل، سیلاب اور سمندر جیسے الفاظ کا استعمال بڑی کثرت سے ہوا ہے مثال کے طور پر :

ع ایسا ہوا ایک رات سمندر کے دیوتا (عروسِ البلاد)
ع ہمیشہ کے سمندر کا بلاوا (کہو ـ کچھ تو کہو)
ع شیشوں پر پانی قطرہ قطرہ پھیلتا بڑھتا (مکتی)
ع کہ جیسے سمندر بلوئے کوئی (ٹھیک تین بجے ـ رات تین بجے)
ع جھیل کی آنکھ جھپکی (آزادگی)
ع جیسے ایک ندی کی پسی ہوئی چمکیلی گیلی ریت پر (لمس)
ع [illegible] جھیل کی تہ میں جب ڈوبتی ہے (شانتی کا [illegible])

ع سیلِ بے کراں [illegible]

قاضی سلیم نظم کے شاعر ہیں اور [illegible] آخر الایمان بھی نظم کے شاعر ہیں اور بہت [illegible] وہ یہ سمجھتے ہیں کہ :

"جہاں تک غزل کی زبان کا سوال ہے میں
سمجھتا ہوں کہ غزل کی شاعری اپنا امکان
ختم کر چکی ہے۔"

تو ان کے اس خیال سے اتفاق کرنا محال ہو جاتا ہے۔ (یہ درست ہے کہ اردو میں نظم کے وسیع امکانات ہیں لیکن اس کے معنی ہرگز یہ نہیں کہ غزل کے امکانات بالکل ختم ہو گئے ہیں۔ شاید اخترالایمان کے ذہن میں یہ غلط خیال بیٹھ گیا ہے کہ غزل نظم کا بدل ہے یا نظم غزل کا ورنہ وہ ایک صنف کا یہ رشتہ دوسری صنف سے اس طرح پر نہ جوڑتے)

"نجات سے پہلے" صاف ستھری اور اچھی چھپی ہے۔ کتاب کی پشت پر شاعر کی تصویر کے اوپر ژاں کاکتو کا ایک قول درج ہے

"جب تم یہ کتاب نکال کر یکایک پڑھنے لگو اور میرے
یہ الفاظ دل جمعی سے پڑھنے میں کامیاب ہو جاؤ تو
تم کو لگے گا، دھیرے دھیرے میں تمہارے اندر بستا
جا رہا ہوں۔ تم مجھے اپنے طور پر دوبارہ جلاؤ گے
ایسے میں ہو سکتا ہے میرا کوئی انداز نظر، میرا کوئی
رویہ چپکے سے اپنا لو۔ میں نوجوان نسل سے
خطاب کروں گا۔ آس سمجھے ـ جب میرے گوشت
پوست کا وجود نہ ہوگا تو میرا خون تحریر دوں سے
مجوزا ہو گا۔"

امید ہے کہ بہت جلد کتابوں میں اس طرح کے اقوال کی شمولیت کا "فیشن" عام ہو جائے گا۔

CB 80 D

you buy **Chandan**

best in

Furniture

They are

★ LOVELY

★ RELIABLE

★ DURABLE

District

EMPORIUM

Gaya

OT 40

OC 25

گیان اکادمی، ریڈ ہاؤس، بنگلہ جیون روڈ، گیا

شرح خریداری

سال کے لئے ۱۲ روپے
دو سال کے لئے ۲۲ روپے
تین سال کے لئے ۳۰ روپے

فی کاپی
ایک روپیہ

جولائی ، اگست ۱۹۷۲ء

آفس : بیراگی ، گیا

فون :
آفس ، ۶۶۲
رہائش ، ۵۳

کتابت :
قمر نظامی

مطبع :
ہند پریس گیا

شمارہ
۲۵ ، ۲۶

مرتبین
کلام حیدری ، پرکاش فکری

محتویات

حرفِ ادب

ادبی نقاد اور اس نقاد میں جو ادبی تنقید کی حدود سے تجاوز کر گیا ہے یہ فرق نہیں ہے کہ ادبی نقاد خالصتاً "ادبی" ہوتا ہے یا اس کی اور کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ نقاد جو ادب کے سوا کسی دوسری چیز میں دلچسپی نہیں رکھتا اس کے پاس کہنے کے لئے بھی بہت کم ہوتا ہے کیونکہ ایسے میں اس کا ادب خالص ایک علیحدہ اور منقطع سی چیز بن کر رہ جاتا ہے۔ شاعر شاعری کے علاوہ بھی دلچسپیاں رکھتا ہے کیونکہ ان کے بغیر اس کی شاعری خالی خالی سی رہے گی۔ شاعر اس لئے شاعر ہے کہ اس کی غالب دلچسپی یہ ہے کہ وہ اپنے تجربے اور اپنے خیال کو (تجربہ اور سوچنے کے معنی یہ نہیں کہ وہ شاعری کے علاوہ کچھ اور دلچسپیاں بھی رکھتا ہے) شاعری کا جامہ پہنا دے۔ اس طرح وہ نقاد ادبی نقاد کہلائے جانے کا مستحق ہے جس کی بنیادی دلچسپی یہ ہو کہ وہ اپنے پڑھنے والوں میں شاعری کی تفہیم پیدا کرے اور ان میں شاعری سے لطف اندوز ہونے کے جذبے کو ابھارے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ شاعر کی طرح دوسری چیزوں میں بھی دلچسپی رکھے۔ کیونکہ ادبی نقاد کی حیثیت صرف کسی فنی ماہر کی نہیں ہے جس نے اصول وضع کیے ہیں جن کی پابندی ان لکھنے والوں کو کرنی چاہیے، جن پر وہ تنقید کر رہا ہے۔ نقاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک پوری اکائی کی حیثیت رکھتا ہو۔ ایک ایسا آدمی ہو جس کے لئے اپنے معیار اور اصول ہوں۔ جس کے پاس علم بھی ہو اور زندگی کا تجربہ بھی۔

اب ہم یہ سوال کسی ایسی تحریر کے بارے میں اٹھا سکتے ہیں جو ادبی تنقید کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئی ہو۔ کیا اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ وہ تفہیم پیدا کرے اور ہماری لطف اندوزی میں اضافہ کرے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ممکن ہے کہ وہ تحریر کوئی مفید اور جائز سرگرمی کی حیثیت رکھتی ہو اور ہم اسے نفسیات، عمرانیات، منطق، تعلیمات یا اس قسم کے کسی دوسرے نام سے موسوم کر دیں۔ ایسی تحریروں کے بارے میں کوئی فیصلہ ماہرین فن ہی کر سکتے ہیں اہل علم نہیں کر سکتے۔ ہمیں سوانح عمری اور تنقید میں بھی امتیاز کرنا چاہیے۔ عام طور پر سوانح عمری تشریحات کے سلسلے میں ایک مفید چیز ہوتی ہے لیکن یہ تفہیم کے لئے راستہ بھی کھولتا ہے۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سوانح ہماری توجہ شاعری سے ہٹا کر شاعر کی طرف مبذول کر دے۔ ہمیں چاہیئے کہ ایسے میں ہم شاعر کے دورِ حیات، اس کے زمانے کے سماجی حالات اور وہ مروجہ خیالات جو اس کی تحریروں میں ظاہر ہوتے ہیں اور اس کے زمانے میں وہاں کی حالت کو شاعری کی تفہیم کے ساتھ خلط ملط نہ کر دیں۔

ایسا علم ممکن ہے شاعری کی تفہیم کے سلسلے میں اہمیت رکھتا ہو۔ مزید برآں یہ کہ علم کی اپنی جگہ وہی اہمیت ہو جو تاریخ کی ہوتی ہے۔ لیکن شاعری کی توصیف کے لئے یہ چیزیں ہمیں دروازے تک تو لے جاسکتی ہیں لیکن اس کے بعد ہمیں اپنا راستہ خود تلاش کرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ علم و آگاہی کے حصول کا مقصد بنیادی طور پر یہ نہیں ہے کہ ہم خود کو کسی دور دراز کے زمانے میں محسوس کرنے لگیں تاکہ جب ہم اس زمانے کی شاعری کا مطالعہ کریں تو اسی طرح سوچ سکیں اور اسی طرح محسوس کرسکیں جس طرح اُس شاعر کے ہم عصروں نے سوچا اور محسوس کیا تھا حالانکہ اس تجربہ کی اپنی جگہ قدر و قیمت ہے۔ اس طرح ہم غالباً خود کو اپنے زمانے کے قید و بند سے آزاد کرلیتے ہیں تاکہ ہم براہ راست تجربہ حاصل کرسکیں۔ اور اس شاعری سے فوری ربط اور تعلق پیدا کرسکیں۔ اس بات کو یوں کہا جاسکتا ہے کہ جو بات سیفو کی 'اوڈس' (ODES) پڑھنے کے لئے اہمیت رکھتی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہم تخیل کی مدد سے خود کو دو ہزار پانچ سو سال پہلے کے یونان میں لے جائیں بلکہ دراصل اہمیت اس تجربے کی ہے جو مختلف زبانوں اور زمانوں کے اُن تمام بنی نوع انسان کے لئے یکساں ہے جن میں شاعری سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔

اگر ادبی تنقید میں ہم سارا زور تفہیم پر صرف کردیں تو ایسے میں یہ خطرہ ہے کہ ہم کہیں تفہیم سے پھر تشریح کی طرف نہ چلے جائیں۔ ایسے میں یہ خطرہ بھی ہے کہ تنقید کو کہیں اس طرح نہ استعمال کرنے لگیں جیسے وہ کوئی سائنس ہے۔ تنقید نہ تو سائنس ہے اور نہ وہ سائنس ہو سکتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر ہم لطف اندوزی پر زیادہ زور دیں گے تو ہم داخلی اور تاثراتی تنقید کی طرف چلے جائیں گے اور اس طرح ہم لطف اندوزی سے بھی زیادہ فائدہ نہ اُٹھا سکیں گے اور ہماری یہ لطف اندوزی صرف تفریحِ طبع اور وقت گزاری بن کر رہ جائے گی۔

--

(ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ)

گریز پا

...غضب میں
...شفقت بھری گود یاد آرہی ہے،

...جسم سے جھٹک کر دور پھینک
دو گی؟

...کچھ بول رہا ہے
...نئی زبان کی تخلیق ہو رہی ہے
...یا — ہونے والی ہے
...ہکلاتے ہوئے لفظ پھوٹ رہے ہیں
...تک تیز تیزاب میں نہلا دیا
گیا ہوں

...
...ہوئے
...ہوئے میرے راستے
پہ کھڑے ہوں گے
...وہی وحشی بھیڑیے
نتھنے پھلائے ہوئے

مجھے بیدردی سے اچھالتے ہوئے
آگے نکل جائیں گے

تو کیا پھر اسی طرح
چقماق کے پتھروں سے لویں پھوٹیں گی
اور میرے جسم کو جگہ جگہ سے جھلس دیں گی

یا

میں ۔ پھر چھلنی چھلنی کر دیا جاؤں گا.

اس عظیم کائنات کے دھڑ سے ٹکے ہوئے
ہم بالشتیوں کے برابر انسان
کتنے مجبور ہیں
ایک دوسرے سے
کتنے غیر تعلق ہیں
جیسے خلا سے گرتے ہوئے لوہے کے ٹکڑے
یا ۔ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے زمین
اور آسمان

جن کا ۔ نہ تو کوئی افق ہے
اور ۔ نہ کوئی درمیان
بس اسی طرح ہم لاتعلق
ایک خود فریبی کی آنچ سے
اپنے آپ کو چمکاتے رہتے ہیں
جلا دیتے رہتے ہیں
اگرچہ یہ جانتے ہیں
تم ۔ نہ تو مجھے ان ڈھلانوں سے لڑھکنے
سے بچا سکو گی
اور نہ تمہاری کوکھ میں اُگے ہوئے جھاڑ
مجھے اٹکا سکیں گے
نہ میری ماں کی شفقت بھری گود مجھے
تھام سکے گی

میں لمحہ بہ لمحہ
گرتا جاؤں گا
گرتا جاؤں گا
گرتا جاؤں گا

●●

شمارہ ۲۴-۲۵

تکنیک

عتیق اللہ

ادھوری رات
میرے بازو پر اپنے سیاہ بال پھیلائے لیٹ گئی ہے
اندھیرا
روشنیوں کے بطن سے
دھیرے دھیرے ٹپک رہا ہے
دور سے بھیڑیوں کی مکروہ آوازیں
گرم سلاخوں سے داغے ہوئے شہر کو
ڈراؤنے خواب دکھلا رہی ہیں
دن بھر کا تھکا ماندہ — شور، غوغا
پاس کے زمیں دوز نالے میں پھنس کے
دم توڑ چکا ہے

ایسے میں
تمہارے انتظار کی لویں
ہتھیلی پہ ٹھہرے ہوئے پارے کی بوند سے
چمک کر تھرّانے لگی ہیں

تمام راستے منھ بسور کے
دریا پار نکل گئے ہیں
جیسے
اب یہ دو رویہ مجھے
کسی مانوس لمس سے
کبھی سیراب نہ ہو سکیں گے
پوسٹر لگی دیواریں
کہنی ٹکائے ہوئے
اپنی ہزار آنکھوں سے
تمہیں آتے ہوئے
کبھی نہ دیکھ سکیں گی

اور تم
شاید
کبھی نہ آؤ گی
کبھی نہ آ سکو گی

[illegible] — پیش گوئی

روشنی [illegible] اپنے زوال پر ہے
مجھے اپنے بارے میں کچھ نہیں کہنا ہے
بس اتنا ہی کافی ہے
روشنی اپنے زوال پر ہے

سب
اپنی اپنی گٹھریاں باندھ لیں
مٹھیوں میں اپنی چیخوں کا غبار کس لیں
فاختاؤں کے جھنڈ۔ دیوداروں
کے ادھر رک گئے ہیں
اور۔ ہمارے سفر مخالف سمتوں کی طرف ہیں
موت چار سموں پر سیاہ پر کھولے منڈلا رہی ہے
جھلسے ہوئے سمات والے جنگلی گھوڑے
ہمارے تعاقب میں ہیں

اب ہمارے کندھے نوچ لیے جائیں گے
ہماری کمر کا گوشت اکھاڑ دیا جائے گا
اور
ہم اندھیرے کی سرنگ میں بہا دیے جائیں گے

میں تو کہوں گا
مگر۔ اتنا ہی کہوں گا
روشنی
اپنے زوال پر ہے
روشنی
اپنے زوال پر ہے

--

ماتم یک شہر

شہر کا ایک پیر زمین میں دھنسا ہوا
اور۔ دوسرا لوہے کے پستانوں پہ دراز

میں ایک پرانے چھوڑے ہوئے تکیے پر
سفید گھستے ہوئے جبلے میں
آنکھیں میچے ہوئے پڑا ہوں

اور
میرے اندر اور باہر
مینڈریک کی جڑیں پاؤں پھیلا کے
لپٹ گئی ہیں

--

ادب میں بے معنویت کا تصور

ڈاکٹر محمد مثنیٰ

ABSURD دراصل ایک فلسفیانہ اصطلاح ہے جسے عہد حاضر میں فلسفۂ وجودیت کی مقبولیت نے عام کر دیا ہے، لیکن ادب کی دنیا میں اسے قبولیت کی سند مارٹن ایسلن کی مشہور تصنیف THE THEATRE OF THE ABSURD کی اشاعت کے بعد ملی۔ ۱۹۶۱ میں اس کتاب کے چھپنے کے بعد فلسفۂ وجودیت سے مستعار یہ اصطلاح انگریزی ادب کے قارئین کے لئے جانی پہچانی اور مانوس سی چیز بن گئی۔ البرٹ کامیو نے THE MYTH OF SISYPHUS میں کائنات کے اندر انسان جس تکلیف دہ اور کربناک صورت حال سے دوچار ہے اس کی نہایت متحرک، جاندار اور پُر اثر تصویر پیش کی ہے اور اس صورت حال کی وجہ سے اس کی زندگی میں جو بے معنویت اور عدم مقصدیت پیدا ہو گئی ہے اس کو نہایت چابک دستی سے اُجاگر کیا ہے بے معنویت اور عدم مقصدیت کی اس آگاہی اور شعور سے ایک طرح کے مابعد الطبیعاتی کرب کی جو کیفیت پیدا ہوئی وہی THEATRE OF THE ABSURD کے لکھنے والوں کی تخلیقات کا مرکزی موضوع بن گئی۔ ان میں بیکٹ (BECKETT) آیونسکو (IONESCO) ژینے (GENET) اور ہیرلڈ پنٹر (PINTER) وغیرہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان ڈرامہ نگاروں اور ان کے پیش رو ڈرامہ نگاروں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ بیکٹ، آیونسکو اور اس قبیل کے دوسرے ڈرامہ نگاروں کے یہاں منطقی ربط اور ساخت کے عمل سے دامن چھڑا کر تجربے کی عدم معقولیت کو اسٹیج پر مرکزی جگہ عطا کی گئی ہے۔

فلسفہ کی دُنیا میں اس اصطلاح کے پس منظر کا مطالعہ دل چسپ بھی ہے اور خیال انگیز بھی مگر یہاں صرف اشاروں ہی میں باتیں کرنا ممکن ہے۔ قدیم نظام ہائے فکر میں انسان کی بنیاد ایک مشترک "جوہر" پر رکھی گئی تھی جسے عقل سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ عقل کی حکمرانی پر حد سے زیادہ زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی خرد کا وجود اور اس کی انفرادیت پامال اور مجروح ہو کر رہ گئی اور اس کی شخصیت کے غیر عقلی عوامل یکسر نظر انداز کر دیے گئے۔ اس کی جبلتوں اور تمناؤں کو گویا جلاوطن کر دیا گیا۔ ردعمل کے طور پر اس فلسفیانہ میلان کا ظہور ہوا جسے وجودیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس کے نزدیک وجود جوہر پر مقدم ہے یعنی فرد ایک مستقل وجود کی حیثیت رکھتا ہے جس کی تشکیل میں عقل اور غیر عقلی دونوں عناصر کارفرما ہیں۔ انسان ہر لمحہ اپنی تخلیق آزادانہ طور پر کرتا ہے اور آزادی اس کی فطرت کا اصل جوہر قرار پاتی ہے۔ آزادی کے ذمہ دارانہ احساس کا بوجھ جو ارادہ اور انتخاب کے عمل میں اس کے وجود پر طاری رہتا ہے اُسے ایک شدید بحران سے دوچار کرتا ہے جس سے گزرنے کے دوران انسان اپنے اصل وجود سے باخبر اور آگاہ ہوتا ہے چنانچہ خوف، دہشت اور کرب کے وسیلے سے اُسے عصری مسائل اور کائنات کا احساس ہوتا ہے۔ عصری مسائل [illegible]

مستقل شے بنتا ہے جبکہ بریخت کی نظر میں کچھ ایسے دکھ ہیں
جن کا علاج ممکن ہے اور ان دکھوں پر نظر ڈالنے کے بعد ہی
عالمگیر آلام پر غور کرنے کا وقت آئے گا۔ یہاں وابستگی کا
سوال بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے (COMMITTED
وابستہ ادب بجائے خود ایک الجھن پیدا کرنے والا مسئلہ ہے
جان مینڈر نے (WRITER AND COMMITMENT)
"ادیب اور وابستگی" میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ
LOOK BACK IN ANGER ایک زبردست
ڈرامہ ہے لیکن یہ ناوابستہ (NON COMMITTED)
بھی ہے اور وابستگی کے معنی بہرحال سیاسی وابستگی کے نہیں ہوتے
کوئی بھی ادیب ان معنوں میں وابستہ ہوتا ہے کہ اس کی تحریر
قدروں سے عاری دنیا میں قدر کی متجسس رہتی ہے۔ وابستگی
آفاقی ہوتی ہے، داخلیت پسند شاعر اس کے بیرونی چہرے
کو تلاش کرنے کی بجائے اس کی اندرونی تہ کی کھوج لگاتا
ہے۔ آرنلڈ ویسکر غالباً انتہائی وابستہ ڈرامہ نگار ہے لیکن
وہ مسائل کے جو حل پیش کرتا ہے وہ کسی پروپیگنڈہ باز یا مصلح
اخلاق کے تجویز کردہ حل نہیں معلوم ہوتے بلکہ واضح طور پر
ایک فن کار کے پیش کئے ہوئے حل معلوم ہوتے ہیں مثال کے
طور پر وہ اصلاح کا ذریعہ تعلیم اور فن کو قرار دیتا ہے۔ اگر ہم
اس بات پر متفق ہو جائیں کہ عام طور پر ANGRY ڈرامہ
کسی خاص موضوع سے متعلق اور سیاسی نوعیت کا ہوتا ہے،
جبکہ ABSURD ڈرامہ ابدی، آفاقی اور فلسفیانہ ہوتا ہے تو
ہمیں THEATRE OF CRUELTY کی توجیہ بھی
کرنی پڑے گی۔ جو اپنے تاثر کے لحاظ سے ABSURD
اور اپنے مدعا کے لحاظ سے ANGRY ہے۔ ہم کو مارٹن
ایسلن کے اس دعوی کا جواب بھی دینا پڑے گا کہ بنیادی
صورت حال پر زور دینے کی وجہ سے ABSURD ڈرامہ
بھی سماجی طور پر اتنا ہی برمحل اور مناسب ہے جتنا سماجی

حقیقت نگاروں کے تخلیق کردہ [illegible]
موضوعات کو پیش نہیں کرتا اس [illegible]
کے تغیرات اور تبدیلیوں سے محفوظ رہ کر [illegible]
ایسے ہی مختلف تنقیدی اصطلاحوں کے استعمال
میں ڈراموں کی ہیئت بھی معاون ثابت نہیں ہوتی نظریات
مناسبت سے زیادہ سہولت ہی کی رو جاتی ہے حقیقت
یہ ہے کہ ان دونوں کو الگ الگ خانوں میں اس طرح تقسیم
کرنا ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک کی خصوصیات کا دوسرے کی
خصوصیات سے کوئی تعلق ہی نہ ہو غالباً یہی سبب ہے کہ ڈیوڈ
گروسووگیل (GROSS VOGEL) نے بڑی سہولت
اور آسانی کے ساتھ بریخت، آیونسکو، بیکٹ اور ژینے کو
ANGRY ڈرامہ نگاروں میں ایک ساتھ شمار کر لیا ہے۔
اروِنگ وارڈل (IRVING WARDLE) نے
(NEW ENGLISH DRAMATISTS) میں ABSURD
ڈرامہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے "اس کی خصوصیات
ہیں خارجی دنیا کی جگہ ایک اندرونی (LANDSCAPE
حقیقت اور واہمہ کے درمیان کسی واضح تقسیم کی عدم موجودگی،
وقت کی جانب ایک آزادانہ رویہ جو داخلی مطالبوں کے
مطابق پھیل اور سکڑ سکتا ہے، ایک تمثیلی ماحول جو ذہنی کیفیات
کو بصری استعاروں کی شکل میں پیش کرتا ہے، زبان اور تجربہ کا
انتہائی سختی کے ساتھ درست ہونا جو زندہ تجربہ کے استناد
کے خلاف مصنف کے لئے ڈھال کے طور پر کام آسکے" یہاں
اس حقیقت کا اظہار دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ وارڈل
بے معنویت (ABSURD) کے ڈرامہ کی تعریف [illegible]
سے اسی لئے کر سکا ہے کہ اس سے سات برس پہلے ایسلن نے
THE THEATRE OF THE ABSURD نام کی
کتاب لکھی تھی۔
ایسلن کی کتاب جب شائع ہوئی [illegible]

[illegible] (KAFKA) اور [illegible] میں
[illegible] شعر اور
[illegible] ان کی
[illegible] خاص طور پر
[illegible] ایسلن نے (ABSURD) ڈرامہ کے
[illegible] شیکسپیر، ولسن اور گوئٹے کا نام
[illegible] ساتھ انصاف نہیں کیا ہے بقول کینتھ ٹینان،
(KENETH TYNAN) اس کتاب کے مطالعہ
ABSURD ڈرامہ کی خصوصیات کو سمجھنے میں جو مدد ملتی
اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے مگر اس میں انتہا پسندی
یا مبالغہ کی کیفیت پائی جاتی ہے اس سے بھی انکار
نہیں کیا جا سکتا چنانچہ ایسلن نے جہاں شیکسپیر، گوئٹے اور
[illegible] کا ذکر کیا ہے وہاں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ڈرامائی ادب
سارا ذخیرہ بیکٹ اور اینسکو جیسے ڈرامہ نگاروں کے
[illegible] آنے کا پیش خیمہ ہو۔

جب ایسلن نے ABSURD DRAMA کا
[illegible] تو اس بات پر اپنے افسوس کا اظہار کیا کہ اس کی
[illegible] عنوان ABSURD کا استعمال کثرت کے ساتھ
[illegible] معنوں میں بھی ہوا۔ اس کے باوجود اسے اس بات کا بھی
احساس تھا کہ اس کی کتاب کی افادیت مسلّم ہے کیوں کہ
[illegible] کی مدد سے بہت ساری فنی تخلیقات کو جن میں پیچیدہ
[illegible] پائی جاتی تھی ایک رشتہ میں پرونا ممکن ہو سکا
ان تخلیقات کے بارے میں بصیرت حاصل کرنے میں بھی
[illegible]۔ ایسلن کے خیال میں بے معنویت کے ڈرامہ
(ABSURD DRAMA) جیسی تحریک کا کوئی وجود
[illegible] اصطلاح محض اسی معنی میں کارآمد ہے کہ اس کی
[illegible] ڈرامہ نگاروں کو ہم ایک مخصوص عنوان کے تحت
[illegible] صفات اور خصوصیات

مشترک طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس کے نزدیک یہ محض غلط
فہمی [illegible] ہے [illegible] مراد ہے۔ اس بیان سے
یہ بات [illegible] صاف ہو جاتی ہے کہ ABSURD ڈرامہ
کا شمار کسی قسم کی تحریک کے ضمن میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا
استعمال [illegible] سہولت کے پیش نظر کیا جانا چاہیے تا کہ
بعض مشترک خصوصیات، کیفیات اور میلانات پر مبنی ڈراموں
کو تنقیدی مباحث کے پیش نظر ایک عنوان کے تحت پیش کیا
جا سکے۔ ایک دلچسپ بات اس سلسلے میں یہ کہی جا سکتی ہے کہ
اس غلط فہمی کی ذمہ داری ایک حد تک خود ایسلن کے حد سے
زیادہ بڑھے ہوئے جوش و خروش پر بھی ہے جو ABSURD
ڈرامہ کے تجزیے کے سلسلے میں اس کے یہاں قدم قدم پر پایا
جاتا ہے۔

ان ڈراموں کے بارے میں سب سے زیادہ دلچسپ
اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ مروجہ اصولوں اور قاعدوں کو توڑ
دینے کے باوجود یہ بہت کامیاب ہیں۔ اس قسم کے ڈراموں نے
ایقان کی گم شدگی (DISILLUSIONMENT) کی
کوکھ میں جنم لیا ہے۔ یہ آگہی اور شعور ہمارے عہد کا مقدر بن
چکا ہے۔ جس کا اظہار کامیو کے THE MYTH OF
SISYPHUS اور بیکٹ، آڈموف، آئینسکو اور ژینے
کے ڈراموں میں بڑی شدت کے ساتھ ملتا ہے۔ زندگی کی
بے معنویت اور عدم مقصدیت اور آدرش کی گم شدگی سارتر
اور کامو کے ڈراموں کا بھی موضوع ہیں لیکن انھوں نے
خلاف عقلیت میلانات کو رسمی اصطلاحوں میں پیش کیا ہے جبکہ
ABSURD ڈرامہ نگاروں کے یہاں ان کے اظہار کے لئے
نئی موزوں اور مناسب ہیئت کا استعمال ملتا ہے۔ ان
ڈراموں میں بے معنویت ABSURDITY کے متعلق بحثیں
نہیں ملتیں بلکہ وہ اپنے مکمل وجود کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے
ان ڈراموں کے مطالعہ سے نمایاں طور پر اس

بات کا پتہ چلتا ہے کہ ان میں پیش کیے ہوئے مسائل کی تعداد
مقابلتاً محدود ہے۔ مخصوص موضوعات۔ زندگی، موت، تنہائی
اور ابلاغ کے مسائل ہیں۔ اپنے منفرد مزاج اور ماہیت کے
باعث یہ صرف ایک شاعر کی طرح بے حد ذاتی اور نجی وجدان
اس کے اپنے وجود کے احساس اور کائنات کے متعلق اس کی
انفرادی بصیرت کے ابلاغ کو اپنا مطمح نظر بناتے ہیں یہ بصیرت
ایک ایسی ہیئت اختیار کرلیتی ہے جو ایسلن کے نزدیک کسی رمزیہ
یا پیکری نظم کے مانند ہوتی ہے جس میں زبان محض ایک جزو کی
حیثیت رکھتی ہے اور لازمی طور پر حاوی نہیں ہوتی نتیجہ کے
طور پر ان ڈراموں سے وہی اثرات مرتب ہوتے ہیں جو برخیت
اپنے ناصحانہ سوشلسٹ ڈراموں کے ذریعہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔
یعنی بے گانگی یا بے معنویت والے ABSURD ڈرامہ میں اس
بات کی شناخت آسان کام نہیں ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ
برخیت اپنے ناظرین کے تنقیدی اور ذہنی رجحان کو متحرک
کرنا چاہتا تھا جبکہ ABSURD ڈرامہ اپنے ناظرین کے ذہن
کی گہری تہوں کو چھوتا ہے۔ یہ اپنے ناظرین کو اس بات کا
چیلنج بھی دیتا ہے کہ وہ بے معنویت سے معنی پیدا کریں اور مبہم
طور پر محسوس کرنے کی بجائے صورت حال کا شعوری طور پر
مقابلہ کریں اور بنیادی (ABSURDITY) بے معنویت
کو ہنستے کھیلتے محسوس کریں۔ ایسے ڈراموں میں پریشانی،
ناامیدی، گم شدگی، التباس (ILLUSION) اور
بے مقصدیت کا شدید احساس اور شعور پایا جاتا ہے۔
ABSURD ڈرامہ کو بیسویں صدی کی دوسری تہائی
کے ڈراموں سے جو خصوصیت خاص طور ممیز کرتی ہے وہ ایک
سنجیدہ مقصد کی موجودگی ہے۔ یہ اعلیٰ مقصد دراصل سارتر
اور کامیو کی رکھی ہوئی وجودی بنیاد سے ابھرتا ہے۔ اب
ایک ایسا نادار انسان مقصد سے عاری نظر آنے لگتا ہے۔ اگرچہ
وہ متعین تصورات کے گھیرے میں اب بھی پھنس سکتا ہے اور

[illegible] جاتا ہے [illegible]
بے بس کر رہ جاتا ہے لیکن اس [illegible]
پہچانتا ہے کہ چاروں طرف کثرت کے [illegible]
پیدا ہو چکا جو اس کی آزادی کو محدود [illegible]
عادت اس کے خیالات پر پہرہ [illegible]
[illegible] زبان بھی ایک مردہ شے بن کر ابلاغ کو [illegible]
ہے اور اس کی تنہائی میں شدت پیدا کرتی ہے۔ اس [illegible]
کا شدید احساس جاگ جاتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے آدمی
اپنے اعمال کا مجموعہ ہے۔ اور ان میں سے ہر عمل کسی [illegible]
صورت حال میں اس کا شعوری انتخاب ہے یہ سارے احساسا
اور تاثرات آیونسکو، بیکٹ اور ژینے کے ڈراموں میں
بھرپور انداز میں جھلکتے ہیں۔ آیونسکو نہ تو فنی ضابطوں کا
پابند ہے اور نہ سیاسی اور مذہبی ضابطوں کا لیکن اس کے
ڈرامے محض تفریحی نہیں ہیں THE CHAIRS اور THE
KILLER سے EXIT THE KING تک ایک
طویل سفر ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ آیونسکو اگرچہ سیاسی طور
پر وابستہ نہیں تھا لیکن اس کے باوجود وہ وابستگی اور
پابندی (COMMITMENT) سے محفوظ نہیں
رہ سکا۔ اس کے نزدیک سب سے پہلا COMMITMENT
وجود ہے باقی چیزیں فروعی ہیں۔ آیونسکو کے یہاں پوری
زندگی کی جان لیوا فطرت کا احساس اور کرب ہے۔ اس
کی میکانکی خصوصیت اور رمزیہ حسن کے احساس کے فقدان
پر گہری تشویش کا اظہار ہے اور فردکی تنہائی کا شعور اور ابلاغ
کی دقتوں کا بھرپور احساس ہے۔
آیونسکو کے یہاں تنہائی کے شکار جو کردار ملتے ہیں
بیکٹ کے یہاں ان کی جگہ آوارہ گرد اور بے خانماں قسم کے
کردار ملتے ہیں۔ اس کی عالمی شہرت اس کے ڈرامہ
WAITING FOR GODOT کی [illegible] ہے

[illegible] ہوتے۔ اس کی اس شہرت
[illegible] کے یہاں ماہیئت کے
[illegible] محسوس ہوتی ہے۔ آئنسکو کی
[illegible] فلسفہ اور سائنس نے ایک
[illegible] حقیقت کے طور پر نیستی (NOTHING)
[illegible] کے لئے یہی نیستی پارہ پارہ ہے اس لئے اہمیت
اس میں سکتی ہے جو غیر پابند طور پر نیستی کا اظہار کر سکتا ہو
بیکٹ کے یہاں نیستی سے زیادہ کوئی چیز بھی حقیقی نہیں
اگر کسی حقیقی چیز کا وجود ہے بھی تو اس کا علم حاصل نہیں
ہو سکتا اور اگر کسی حقیقی چیز کا وجود ہو بھی اور اس کا علم
حاصل بھی کیا جا سکے تو اسے زبان کے ذریعہ معرض اظہار میں
لایا نہیں جا سکتا۔ بیکٹ زبان کو علم کے راستہ میں ایک
ناقابل عبور دیوار سمجھتا ہے اور اپنے اس عقیدہ پر اصرار کرتا
ہے کہ ہم کیا ہیں اور کہاں ہیں کا علم ہمیں کسی طور پر حاصل نہیں
ہو سکتا۔ اس کے کردار نہ صرف یہ کہ فلسفی کہلانے سے انکار
کرتے ہیں بلکہ فلسفہ کی جہالت پر چوٹ کرتے ہیں۔ لیکن اس
کے باوجود انھیں مستقل ایسے ہی سوالوں سے سروکار رہتا ہے
جو افلاطون سقراط سے آج تک بنیادی مسائل بنے ہوئے ہیں
کائنات، خدا اور ذاتی وجود کی ماہیت۔ اس کے کردار
اپنی سماجی صورت حال سے کٹے ہوئے ہونے کے باعث
[illegible] اور بار بار [illegible] کرداروں کی طرح فیصلہ کن لمحات کے
مقابل کبھی نہیں آتے اور ذمہ دارانہ آزادی انتخاب اور
کرب کے بوجھ تلے دب کر ختم ہو جاتے ہیں۔

ژینے کے ڈرامے عام طور پر فینٹسی (FANTASY)
اور خواب پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور سماج میں پھنسے ہوئے ایسے
افراد کی زندگی کی تصویر پیش کرتے ہیں جو خواہشات اور شہوات
کے ہاتھوں [illegible] کی تلاش میں سرگرداں ہیں حالانکہ ان کی
قسمت میں [illegible] ہے [illegible] اس سے ظاہر ہے کہ جب
جنسی خرافات کی ایک عمارت کو ڈھا دیتا ہے تو دوسری فضا
قائم ہو جاتی ہے۔ اس کے ڈراموں میں اسیلن کے نزدیک
نفسیاتی حقائق، سماجی احتجاج اور ABSURD ڈراموں
کے پہلے نقوش پائے جاتے ہیں۔ سارتر کو ژینے کے یہاں
وجودی انسان کے وجود کا احساس تو ہے جو شعوری طور پر
اپنی ذات کا انتخاب کرتا ہے اور نتائج کی ذمہ داری بھی
قبول کرنے کو تیار رہتا ہے لیکن وہ اسے ABSURDISTS میں
شمار نہیں کرتا حالانکہ ABSURDISTS کے نقوش اس
کے یہاں اتنے گہرے ہیں کہ اسے محسوس کئے بغیر چارہ نہیں۔
ژینے کے یہاں دراصل دو ڈراموں کا تصادم نظر آتا ہے
ایک وہ ڈرامہ جو روزمرہ کی چیزوں کو خارج سے دیکھتا ہے
اور دوسرا وہ ڈرامہ جو ایک مکمل التباس پیدا کرتا ہے
اور اس طرح اس گندی اور متعفن دنیا سے اس کا رشتہ
ٹوٹ جاتا ہے جس پر اس کی بنیاد ہے۔

اسیلن نے ABSURD کی اصطلاح کو ڈرامہ
کے ساتھ اس قدر قطعیت اور کامیابی کے ساتھ استعمال کیا
کہ ادب کی دوسری اصناف کے سلسلہ میں اس کا تصور خاصا
دھندلا پڑ گیا۔ ولسن (COLIN WILSON) کی
مشہور تصنیف THE OUTSIDER نے اس حد بندی
کو پار کر کے ناولوں کی ABSURDITY کی طرف توجہ
مبذول کرانے میں سب سے اہم اور نمایاں حصہ لیا۔ اس
سلسلہ میں سب سے پہلا قابل ذکر نام آندرے مالرو کا ہے،
جس نے تین برس جیل کی زندگی گزارنے کے بعد اور اس ذاتی
تجربہ کو شدت سے محسوس کرنے کے بعد اجنبیت کے احساس
کے ساتھ ساتھ ABSURDITY کی آگاہی حاصل کی چنانچہ
اس کی کتابوں اور ناولوں میں ABSURDITY کا احساس
شدت کے ساتھ جھلکتا ہے THE CONQUERORS اور
THE ROYAL WAY کا بنیادی موضوع ABSURDITY

رہا ہے۔ اسی طرح MAN'S ESTATE میں بھی وہی
مسائل سامنے آتے ہیں جو ABSURDITY کا احساس
پیدا کرتے ہیں۔ ہیمنگوے کو شروع ہی سے اس بات کا یقین
تھا کہ اس دور میں جینا غیر معمولی طور پر مشکل کام ہے۔ مالرو
کی طرح اسے بھی اس بات پر اصرار ہے کہ فرد انتہائی اہمیت کا
حامل ہے جس کی خواہش ایماندار اور کھرا بننے کی ہوتی ہے اور
ایمانداری کی ذمہ داری بھی اسی پر عائد ہوتی ہے۔ مالرو کی
طرح اس کا بھی عقیدہ ہے کہ بہترین فیصلہ اسی وقت ممکن ہے
جب موت مقابل ہوتی ہے۔

مالرو اور ہیمنگوے کے بعد سارتر اور کامیو کا تذکرہ
کسی قدر تفصیل کا مطالبہ کرتا ہے۔ سارتر ایک عظیم ادیب ہونے
کے ساتھ ساتھ ایک اہم فلسفی بھی ہے اور سیاسی مفکر بھی۔ اس کا
نام وجودیت کے ساتھ اتنے گہرے طور پر وابستہ ہو گیا ہے کہ ایک
کے ذکر کے ساتھ دوسرا بھی ذہن میں فوراً آجاتا ہے اگرچہ سارتر
شروع میں وجودیت کی اصطلاح سے کتراتا رہا اور ۱۹۴۶ء
کے بعد ہی اپنے کو وجودی کہنے پر راضی ہو سکا۔ حقیقت یہ
ہے کہ وجودیت کسی مکتبۂ فکر کا نام نہیں ہے بلکہ ایک فکری اور
ذہنی میلان کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض بنیادی باتوں میں
ایک دوسرے سے سخت اختلاف رکھنے کے باوجود وجودیت
کے دائرہ میں ان سب کو شمار کرنے میں قباحت محسوس نہیں
ہوتی۔ مثال کے طور پر کرکیگارڈ اور مارسل خدا پرست ہیں،
جبکہ ہائیڈیگر اور سارتر دہریے لیکن عقائد کا یہ اختلاف ان
کے وجودی ہونے کی راہ میں کسی طرح حائل نہیں ہوتا۔ اصل
میں یہ سب کے سب فلسفیانہ نظاموں اور روایتی فلسفوں کے
بنیادی طور پر مخالف ہیں اور انسانی وجود کو انسانی جوہر پر
مقدم خیال کرتے ہیں۔ یہی وہ بنیادی رشتہ ہے جس میں یہ
سارے مختلف العقیدہ مفکر بندھے ہوئے ہیں اور اسی وجہ
سے وجودیت پسند کہے جانے کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔

سارتر کی تحریروں [illegible]
تصادم اور اختلاف کی [illegible]
[illegible] (SINCERITY) اور [illegible]
کے درمیان پاتا ہے۔ اس کے [illegible]
میں مضمر ہے کہ ہم اپنے آپ کو اور [illegible]
سمجھتے ہیں کہ چیزیں جیسی ہیں ویسی [illegible]
مختلف نہیں اور ہم اپنے مزاجات کے [illegible]
اگر ہم چاہیں بھی تو اس سے انحراف نہیں کر سکتے [illegible]
شدید عقاید کے باب میں [illegible] کو سارتر [illegible]
ہے کیونکہ ہم ان بھی باتوں کے انتخاب میں آزاد ہیں اور ہمیں
ان کے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ آزادی [illegible]
کا سبب بنتی ہے لاشیئت کی آگہی سے پیدا ہوتا ہے۔ [illegible]
بدنیتی کی وجہ سے اس لاشیئت سے فرار اختیار کرنے کی
کوشش کرتے ہیں۔ مخلص فرد لاشیئت کا سامنا کرتا ہے
اور 'ناشیا' کا تجربہ حاصل کرتا ہے۔ سارتر اپنے فلسفیانہ
تصورات کو اپنے ناولوں اور ڈراموں کے فارم میں پیش کرتا
اور یہ حقیقت ہے کہ وہ اسے ایک اعلیٰ مقصد کا ذریعہ بنا
ہے۔ 'ناشیا' (NAUSEA) میں ہیرو کے ذریعہ
سارتر کے اس خیال کا اظہار بھرپور طور پر ہو جاتا ہے
زبان اور کائنات ایک دوسرے سے بری طرح علیحدہ ہیں
اور ان کی جدائی اور علیحدگی اسی حالت میں دور ہو سکتی ہے
جب ادیب خود کو ایک انتہا پسندانہ صورت حال میں ڈال
دے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ سارتر کا ناول 'ناشیا'
بحیثیت ناول کس قدر طویل ہے اور اس کی فلسفہ طرازی
[illegible] تب بھی اتنی بات کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا
NAUSEA کی آگہی سے کرب اور ABSURDITY [illegible]
جتنا شدید اس ناول میں ہے اس کی مثال شاید ہی [illegible]
مل سکے گی۔

THE OUTSIDER [illegible]
[illegible] کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔
[illegible] کے سلسلے میں جو چیز ہمارے سامنے
[illegible] سب سے زیادہ ذکر ملتا ہے وہ
THE MYTH OF SISYPHUS [illegible]
[illegible] ABSURDITY کے فلسفی
کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے ۱۹۳۸ میں کامو کی NOCES
شائع ہوئی جس کے بنیادی موضوعات چار ہیں زندگی کی
بے معنویت، کائنات کا انکار بغیر اس کو ترک کئے ہوئے،
ملال قلب اور مسرت۔ زندگی کے متعلق جو رویہ NOCES
میں متغزلانہ انداز میں ملتا ہے اسی کی فکری تحقیق و تلاش
THE MYTH OF SISYPHUS میں ملتی ہے لیکن
یہاں بھی ایک خاص کیفیت بہت نمایاں ہے اور وہ یہ کہ کامو
ABSURDITY کے احساس کو بیان کرنا چاہتا ہے اس
کا فلسفہ نہیں پیش کرنا چاہتا۔ کامو کے خیال میں ABSURDITY
کا احساس کسی بھی آدمی کو سڑک کے نکڑ پر ہو سکتا ہے۔ اس
طرح کا فوری اور اچانک احساس چار طریقوں سے ممکن ہے

۱ ۔ بہت سے لوگوں کی زندگی کا میکانکی انداز
انھیں اپنے وجود کی اہمیت اور مقصد کے
بارے میں سوچنے پر مجبور کر سکتا ہے یہ گویا
ABSURDITY کا اشارہ ہے۔

۲ ۔ وقت کے گزرنے کا شدید احساس یا اس
حقیقت کی آگہی کہ وقت ایک تباہ کن قوت ہے

۳ ۔ ایک اجنبی دنیا میں چھوٹ جانے کا احساس
کامو کا خیال ہے کہ جس دنیا کی تشریح ہم کر سکیں
خواہ وہ کمزور اور خراب دلائل ہی کے ذریعہ
ممکن نہ ہو وہ ہمارے لئے اجنبی نہیں رہتی لیکن
ایسی دنیا جس سے بصیرت اور التباسات
یکایک علیحدہ ہو گئے ہوں۔ ہمارے لئے اجنبی ہو
جاتی ہے۔ تنہائی اور اجنبیت کا یہ احساس
شدت اختیار کر کے NAUSEA کی حد تک
پہنچ جاتا ہے جبکہ روزمرہ کی جانی پہچانی چیزیں
بھی اجنبی محسوس ہوتی ہیں۔

۴ ۔ دوسرے وجود سے الگ اور علیحدہ ہونے کا احسا[س]

کامو کے نزدیک دماغ جس کو وحدت کی ضرورت
ہوتی ہے اور کائنات جس میں دماغ کو انتشار کا تجربہ ہوتا
ہے دونوں کے درمیان ہم آہنگی کا فقدان ہی -ABSUR
DITY ہے۔ اور اس کا فطری رد عمل یہ ہوتا ہے کہ فر[د]
یا تو خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے یا بالکل مخالف سمت
گامزن ہو کر یکایک عقیدہ کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ خود
بھی دو طرح کی ہو سکتی ہے، رجائی اور فلسفیانہ۔ کا[مو]
دونوں کو مسترد کرتا نظر آتا ہے۔ اس کے خیال میں ان[سان]
کو ABSURDITY کے احساس کو تسلیم کر لینا چاہئے
اس کے عمل کا محرک بن کر اس کو احساسِ آزادی ا[ور]
جذبہ عطا کر سکتا ہے۔ اس کی نظر میں کوئی بھی فن
بذات خود ایک ABSURD منظر ہوتا ہے
ایسا منظر جس میں خود آگہی اس طرح آ جاتی ہوتی
دوسرے اسے دیکھ کر خود آگاہ ہو سکیں اور ایک شخص
تقدیر سے واقف ہو سکیں۔

نوٹ

اس مقالہ کی تیاری میں ARNOLD P. HINCHLIFF کی کتاب THE ABSURD سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔

علیم اللہ حالیؔ ——— (بنگلہ دیش کے المیہ سقوطِ ڈھاکہ کو) ——— آخری الو...

عقیدے ——— گلیوں کے چند آوارہ مسخرے لونڈوں کی صورت
کھڑے ہوئے
اس غلیظ انبار پر مسکرا رہے ہیں
صحفِ اعلیٰ ——— کہ جن کو صدیوں سے
ہم نے پاکیزگی کی اونچی بلندیوں پر سجائے رکھا تھا
اب خس و خاشاک ہو چکی ہیں
بڑے بزرگوں، قدیم بھیجے ہوئے خدائی
سفیروں نے بھائی چارگی اور اخوت و آشتی کے جو کچھ
سماوی تحفے عطا کئے تھے
وہ سب کے سب اب
تمام پاکیزہ رشتہ ناتوں کے ساتھ جل کر فنا ہوئے ہیں
تمام فقرے ——— کہ جو
مقدس زبان میں برکتِ تاثر کا دعویٰ رکھتے تھے
اب ہمارے ہی بھائیوں کے لہو میں ڈوبے ہوئے پڑے ہیں

کہا گیا تھا کہ
میری رسی کو اپنے ہاتھوں کی ساری طاقت سے تھامے رہنا
ادھر وہ رسی جلی ہوئی ہے
اُدھر وہ دست بریدہ فریاد کر رہے ہیں
یہ بند مٹھی بتا رہی ہے کہ اب بھی ان کی گرفت ڈھیلی
نہیں پڑ سکی ہے

یہاں بھی سورج ہے سر پہ رقصاں
یہاں بھی ہے آنسوؤں کی بارش
یہاں بھی ہے سناٹگی کا عالم
اب اے خدا کس طرح کوئی الزام سر جھیلنے کا اپنے سر لے

آخری بوند کی فصل

(منظر کاظمی کے نام)

زمیں!
کرب میرا وہی
جس سے ہیں منسلک

زخم میرا وہی
جس سے گہرائیوں میں پگھلتی ہوئی
خاکِ جاں!
دودھ کے تھال میں
چاند حل ہو چکا
روشنی اجنبی رات کی داستاں ہو گئی
وہ جو نکلا تھا
جنگل میں تازہ پھلوں، مُشک کی کھوج میں
بھٹکے رستوں کے اندھیروں کا لقمہ بنا
حادثے جب گپھاؤں کے اسرار سے
[illegible] کی کمان [illegible] بر آمد ہوئے
[illegible] خون میراث میں سینہ سینہ روایت بنے
[illegible]
[illegible] میں ریزہ ریزہ ہوئی

تیرے پستان سے
سنگ ریزے لہو رول کر
دانت میں منتقل ہو گئے
آگ، تانبا، لہو
دودھ، گیہوں، شہد
کھیت، کھلیان، جنگل، ندی
پھول پھل، سبز دریا، پہاڑوں کے یہ سلسلے
یعنی مور و مگس
جن و انس
حد تو یہ کہ خدا دیوتا تک کو تو نے جنا
اور پھر دودھ کی دھار دھاگا بنی
خشک ہوتی گئی
آخری بوند کی فصل
خوشبو، چمک کاٹنے کی
ابھی رُت تو آئی نہیں

رفتار دیکھتے ہیں۔ اور جب کرمزین نے 'THE MONK'
(CALAIS) کا مطالعہ کیا تو اس نے ان تمام مقامات کی
زیارت کی جہاں یارک (YORICK) کے قدم گئے تھے۔
اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب ایک دوسری SENTI-
MENTAL JOURNEY - بھی جاتی ہے۔ اگرچہ مختلف
نظر آتا ہے تو وہ خود [illegible] اور اس کے رجحانات جو
اسٹرن کے یارک سے قطعی مماثلت نہیں رکھتے۔

کرمزین نے اسٹرن کی خود بینی SELF CRITICI-
SM - کی تکنیک سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اس لئے جب
اس نے یوروپی کلچر کو اجاگر کرتے ہوئے ان تمام گوشوں پر
نظر ڈالی جو اس کے سنجیدہ مطالعہ کے خاص موضوع رہے تھے
تو اسے ایک تعلیم یافتہ روسی فرد کے جذبات کی صحیح عکاسی میں
بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ بہت برسوں کے بعد HERZEN
کو بھی کرمزین کی تصنیفوں میں اپنے ہی خیالات و احساسات کی
بازگشت سنائی دی۔ اس سے رفتہ رفتہ روس کے پڑھے لکھے
طبقہ میں روحانی توکل اور آزادی کی قدر بڑھتی گئی۔ اور مغربی
فلسفہ و ادب کو اپنے زاویۂ نظر سے سمجھنے کی روسی ادیبوں کی
کوششیں مقبول ہوتی گئیں۔ لازماً یہ کتاب غیر ملکیوں کے لئے بھی
دلچسپی کا مرکز بن گئی۔ لہٰذا ۱۸۰۰ میں اس کا ایک جرمن ترجمہ
اور ۱۸۰۳ میں انگریزی ترجمہ شائع ہوا۔

اٹھارہویں صدی کی ایک بہترین نثری تصنیف
الکزنڈر ریڈیشیف ALEXANDER RADISCHEV کی
JOURNEY FROM PETERSBURG
TO MOSCOW بھی اسٹرن کی روایات سے ہی مزین
ہے۔ اس انگریز مصنف کی بذلہ سنجی، اس کی داخلی پاکیزگی اور
آزادی سے اس کی وابستگی اور محبت اس کے ہم عصر روسی مصنفوں
کے مذاق سے پوری طرح ہم آہنگ تھیں۔ ریڈیشیف نے خود کہا
ہے کہ جرمن تحریریں YORICK'S JOURNEY پڑھ کر

اس کے اندر اس کتاب کی ہیروی [illegible]
[illegible] لیکن اس کی تصنیف [illegible]
زبان اور لہجہ میں اسٹرن سے بالکل [illegible]
ہوتے ہیں۔ ریڈیشیف روس کا پہلا [illegible]
جاگیرداروں کے ظلم و استبداد سے تنگ [illegible]
عوام زندگی کی ایک انتہائی بسیط تصویر پیش کی [illegible]
مناظر کے ساتھ ساتھ جو مسافر کے تجربے [illegible] اس
عہد کے ان تمام اصولوں اور اقدار کے خلاف [illegible]
اور کچھ پہیلیاں بھی اس کتاب میں یکجا نظر آتی ہیں جو صنف
کی انسانی فطرت کے عین منافی دکھائی دیتے ہیں۔ ریڈیشیف کی
تصنیف میں جذباتی تذکرے فلسفیانہ افکار سے ہم آہنگ دکھائی
دیتے ہیں۔ زندگی سے عین قریب فطرت کے جو [illegible]
[illegible] اس نے 'ODE TO FREDOM' [illegible] پیش کئے
ہیں۔ ان کے بارے میں کیتھرین دوم CATHERINE II
کا قول ہے:

"یہ نظم (ODE) جس میں آزاد کو قتل کی
دھمکیاں دی گئی ہیں ظاہری طور پر بھی بالکل
باغیانہ ہے اور اس میں کروم ویل (CROM
WELL) کی مثال بھی مدحیہ طور پر پیش کی گئی ہے"

ریڈیشیف کی کتاب پر پابندی عائد کر دی گئی اور
اسے خود بھی جلاوطن ہو کر سائبیریا چلا جانا پڑا۔ تاہم ذہین
طبقہ کے بیدار مغز نوجوانوں کو اس کالعدم کتاب کے مطالعہ اور
اشاعت سے روکا نہیں جا سکا۔ اس سلسلے میں سرجی گلنکا
(SERGEI GLINKA) کی مثال کافی دلچسپ ہے
جو بعد میں تاریخی کہانیوں اور ڈراموں کے لئے کافی مشہور ہوا۔
کیتھرین دوم کے آخری زمانہ حکومت میں جب GLINKA
ابھی نوجوان ہی تھا اور گمنامی کی زندگی گزار رہا تھا، ریڈیشیف
کی کالعدم تصنیف اور SENTIMENTAL JOURNEY

[illegible]
[illegible]
[illegible] کچھ دکھتی ہیں
[illegible] ہیں۔
DECEMBRIST [illegible]
[illegible] رکھنے والے الزاگ اسٹرن اور ڈیشیف
دونوں ہی سے واقف تھے۔

دورِ عصر کے ترقی پسند ادیبوں میں بھی SENTI-
MENTAL JOURNEY کو ایک مقبول کتاب کا درجہ
حاصل رہا ہے۔ ALEXANDER GRIBOYEDOV
WIT WORKS WOE جیسی کامیڈی کا
مصنف ہوا اور DECEMBRIST BESTUZHEV
MARLINSKY کے قلمی نام سے مشہور ہے، دونوں ہی اپنی
اپنی تصنیفوں میں اس کتاب سے بطور حوالہ کچھ نہ کچھ نقل کرنے
میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جہاں ایک
طرف اسٹرن کے کچھ ایسے حلیف ہیں، وہیں کچھ ایسے مداحوں کا بھی
ایک حلقہ ہے جو اپنی ہی ذات کی چہار دیواری میں محبوس ہے
اور عادات کی حد تک جذباتی ہے۔ یہ حلقہ ڈرامہ نگار الگزنڈر
شاخوسکوی کے (PLAYWRIGHT ALEXANDER
SHAKHOSKOY) کا جو اپنی کامیڈی THE NEW
STERNE میں مزاح اور فضول کی حدوں سے آگے نہ جا سکا
یہ تصنیف ۱۸۰۵ میں چھپی اور ۱۸۲۲ میں سینٹ پیٹرس
برگ کے مالی تھیٹر (MALY THEATRE) میں
اسٹیج کی گئی۔

اس کامیڈی کا ہیرو ایک خوابیدہ شاعر فیالکن
(FIALKIN) ہے (اس لفظ کو روسی زبان میں سیجی
رنگ کے لئے استعمال کرتے ہیں) اس کی صورت حلیت متانت
اور [illegible] اس کی شخصیت کو

[illegible] ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ آزاد خیال ادب نواز لوگ
[illegible] اس حقیقت کو شبہ نہیں رکھتے تھے
کہ [illegible] اسٹرن اور دراصل لارنس اسٹرن کی دنیا کتنی بڑا
نمایاں فرق ہے۔ تاہم VESTNIK EVROPY
(EUROPEAN NEWS) نے جسے کرزین نے
جاری کیا تھا مگر بعد میں جسے رجعت پسند اور طبقاتی تفریق
کا زبردست حامی کیشینوسکی (KACHENOVSKY)
نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا، اس فرق کو نظر انداز کرنے کی
انتہائی کوشش کی۔ شاخوسکوئی کی کامیڈی کو اسٹیج کئے جانے
کی تجویز پر اس رسالے نے SENTIMENTAL
JOURNEY کے ان تمام فن کاروں پر خوب حملے کئے
جنھوں نے COMMON SENSE کو بروئے کار لانے
کی ضرورت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ "اگر ہم اس
بات کا مطالعہ بنظر غائر کریں کہ اس شیریں جذباتیت کا آغاز
کب ہوا۔ اور اس کا رخ کس جانب تھا تو ہم پر یہ بات منکشف
ہو جاتی ہے کہ اس کی بنیاد بھونڈی نمائش اور جہالت پر کھڑی ہے
اور جس کا لازمی انجام نازک مزاجی، نکما پن اور ناقابل برداشت
سہل پسندی ہے۔" یہ بات کچھ ان ہی تنقیدوں جیسی
ہے جو اسٹرن خود اپنی زندگی میں بھی سنتا رہا تھا۔ بہرکیف
۱۸۲۲ میں ہی PUSHKIN بھی TRISTRAM
SHANDY کا بڑی سرگرمی سے مطالعہ کر رہا تھا۔ وہ پہلا
روسی ادیب ہے جس نے اسٹرن کے مزاح کو سراہا۔
اسے THOMAS MOORE کی گل پوش رومانی نظم
لالہ رخ کی بجائے جو اس نے ابھی ابھی پڑھی تھی۔ اسٹرن کی
QUIRKS میں زیادہ گیرائی نظر آئی تھی۔ PUSHKIN
کہتا ہے:

"پوری کی پوری لالہ رخ TRISTRAM
SHANDY کی دس سطروں کے برابر بھی نہیں۔"

PUSHKIN مصنف کی قوت مشاہدہ سے بہت
زیادہ متاثر ہوا تھا۔ اس نے SENTIMENTAL
JOURNEY کا بڑی توجہ سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ اسٹرن کے
خیال و افکار کی آزادی اور آفاقیت سے بھی کافی متاثر تھا
۱۸۲۳ء میں اس نے اسٹرن کو انگریزی ادب کی ان تمام عظیم
شخصیتوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا جنھوں نے اٹھارھویں
صدی میں نثری ناول نگاری کی لاج رکھی تھی۔

PUSHKIN کی ہی طرح مشہور روسی نقاد
BELINSKY نے بھی اسٹرن کو پہلی مرتبہ ایک ظرافت
نگار کی حیثیت سے ہی سمجھا۔ اس نے اس کے مزاح میں باغیانہ
عنصر کو بڑی قدرت سے محسوس کیا GULLIVERS
TRAVALS کی ہی طرح TRISTRAM SHANDY
میں بھی اسے IRONY OF NEGATION کا ایک
نمونہ نظر آیا۔ BELINSKY نے اسٹرن کو ہمیشہ ہی اٹھارھویں
صدی کے ممتاز ادیبوں میں شمار کیا اور اسے VOLTAIRE
SWIFT اور ROUSSEAU کے شانہ بشانہ لا
کھڑا کیا۔

لیو ٹالسٹائی (LEO TOLSTOY) بھی
خصوصاً اپنے ابتدائی دور میں اسٹرن سے بہت زیادہ متاثر
ہوا۔ اپنے آخری زمانہ میں ٹالسٹائی نے ان کتابوں
کی ایک فہرست تیار کی تھی جو اسے بہت پسند آئی تھیں اور جنھوں نے
اسے متاثر کیا تھا۔ ان کتابوں کی فہرست میں جو اس نے چودہ سے
بیس سال کی عمر میں زیر مطالعہ لائی تھیں SENTIMENTAL
JOURNEY کا نام سب سے پہلے آتا ہے اور اس بات
کی بھی نشان دہی ملتی ہے کہ اس کتاب نے اس پر بڑے گہرے
اثرات چھوڑے تھے۔ ۱۸۵۱ء میں جب ٹالسٹائی اپنے
اسلوب کی درستگی کے لئے کوشاں تھا اس نے SENTI-
MENTAL JOURNEY کے تقریباً ایک تہائی
حصے کا ترجمہ کیا۔ لیکن اس انگریزی [illegible]
واشگاف طور پر [illegible]
اپنی ڈائری میں یہ الفاظ قلم بند کئے۔ " [illegible]
عجیب و غریب ادیب اسٹرن میں کہانی [illegible]
جانے کی بہترین صلاحیت موجود ہے تاہم وہ [illegible]
موضوع سے بھٹکنا (DIGRESSIONS) مخل اور
خلل طلب ہوتا ہے۔ " بہر حال اس نے [illegible]
بھی اس نے SENTIMENTAL JOURNEY
کو از سر نو پڑھا اور نتیجتاً کچھ نئے مفہوم بھی تلاش کئے جنھیں
وہ اپنے پہلے مطالعہ میں حاصل نہیں کر سکا تھا۔ ۱۸۵۲ء
میں اس کی ڈائری میں جو الفاظ بطور ریمارک آئے وہ یہ تھے
" اسٹرن کو پڑھا۔ بہت خوب! "

سوویت لٹریچر میں ٹالسٹائی کی تصانیف پر
اسٹرن کے اثرات کا سوال بڑا اہم رہا ہے۔ نقاد یہ محسوس
کرتے ہیں کہ تصنع، روایات، اور سخت عقلیت پسندی سے
احتراز جو اسٹرن کے خیال میں انسانی نفسیات کو کمزور کرتے
ہیں ٹالسٹائی کو ہمیشہ ہی عزیز رہا۔ اور ابھی اس کی ادبی
زندگی کا آغاز ہی تھا۔ اور وہ تصنیف و تالیف کی دنیا میں
اپنے لئے ایک الگ راستے کا متلاشی ہی تھا کہ اسٹرن کے
براہ راست اثر میں آ گیا اور اسٹرن کی روح میں جو "بھٹک"
موجود تھی اور جس کا نوجوان ٹالسٹائی نے اپنے اوائل عمر میں
اتنا وسیع استعمال کیا تھا، بالآخر وہ اس سے اجتناب برتنے
لگا۔ اسٹرن کے اسلوب کی دوسری خصوصیات مثلاً [illegible]
وضع (POSE) کی تصویر کشی میں اس کی مہارت کو ٹالسٹائی
نے محسوس کیا اور اپنے ادبی مذاق میں سمو لیا۔ بہر حال یہ تمام
چیزیں ثانوی تھیں SENTIMENTAL JOURNEY
کے ترجمے پر ٹالسٹائی کی ادبی کوششیں اور اس کتاب پر
اس کے ناقدانہ افکار [illegible]

تعلق رکھتے ہیں۔ ورتسمان (VERTSMAN) نے ایک بالکل ہی الگ نظریہ اپنایا۔ وہ اسٹرن کی تصنیفات کی [illegible] پر ہی زیادہ زور دیتا ہے جو عہد نوری کے محدود دائرے سے [illegible] نکل گئی تھی اور جو ادب کو پیش آنے والی ترقیوں کی پیش گوئی کر رہی تھی:

"سنجیدگی و شوخی، جد و تمسخر، تنقید ذات و تسلی ذات یہ سب چیزیں یارک (YORICK) کے کردار میں اپنی پوری طمانیت کے ساتھ موجود ہیں۔ اسٹرن کے مزاج کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ ذہن کی مختلف کیفیتوں کے آپسی تناسب کو پوری طرح اجاگر کر دیتا ہے۔ اسٹرن ہی وہ پہلا ادیب ہے جس نے احساس کی ان غیر مرئی اور تشکیک آمیز ترنگوں کو آشکارا کیا اس کے اس انکشاف کی اہمیت کو اگر کسی نے پوری طرح سراہا تو وہ اس زمانہ کے دو عظیم فرانسیسی ادیب والٹر (VOLTAIRE) اور ڈڈراٹ (DIDEROT) ہیں۔"

اسٹرن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے VERTSMAN نے برابر ہی یہ بات دہرائی کہ یہ عظیم مصنف انیسویں صدی کے رومان پسند اور حقیقت نواز ادیبوں کا پیش رو ہے۔ اس قسم کے خیالات پر مشتمل ایک مقالہ جو اپنے فلسفہ اور ادبی پس منظر کے لئے بھی ممتاز تصور کیا جاتا ہے سب سے پہلی بار ۱۹۴۱ میں منعقدہ سمپوزیم FROM THE HISTORY OF ENGLISH REALISM میں منظر عام پر آیا۔ VERTSMAN کی ہی طرح ANN ELISTRA-TOVA نے بھی اسٹرن کے بارے میں کچھ ایسے ہی خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اس نے اپنی ابتدائی تصنیف THE — [illegible] OF THE AGE OF ENLIGHTENMENT (1966) کے لئے ایک باب وقف کر دیا اور اس باب [illegible] خاص بات بیان کی ہے وہ اس کا یہ [illegible] عہد کا ترجمان ہوتے ہوئے بھی اس کے محدود [illegible] نکل گیا تھا۔ اس نے لکھنا اس وقت شروع کیا تھا جب عہد نوری کی تحریک خود رو بہ زوال تھی۔ اسٹرن کی [illegible] ظرافت میں اسباب کو نہیں بلکہ ان سے انحراف کو ہی قانون کا درجہ حاصل ہے۔

ANNA ELISTRATOVA کا خیال ہے کہ اسی انداز ظرافت نگاری کو بعد G. B. SHAW نے بھی اپنایا تھا اور اسے مناسب ترقی دی تھی۔ TRISTRAM SHANDY کے مصنف کی بیدار روح اس بات کا ثبوت مہیا کرتی ہے کہ وہ کیوں RABELAISEAN HUMOUR کی طرف اس درجہ ملتفت تھا اور عہد نوری کے SCHEMATIC CONSTRUCTION نے کیوں اس پر کچھ اثر نہیں چھوڑا۔

اسٹرن کی ظرافت نگاری حال کے ہمارے بیشتر علما کے مباحثوں کا خاص مباحثوں کا خاص موضوع رہا ہے۔ ۱۹۶۰ میں لینن گراڈ کے ایک مشہور نقاد MARIA TRANSKAYA نے ایک دوسرے مشہور روسی نقاد کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"APPOLON GRIGORIEV کا یہ کہنا کتنا درست ہے کہ اسٹرن کی ظرافت نگاری اٹھارھویں صدی کے توحشانہ SCEPTICISM سے پیدا ہوئی ہے اور اسے HAMLET کی مغموم جذباتیت اور پرُوہم رمز و کنایے کے درمیان تقسیم کیا جا سکتا ہے اور جو ایک [illegible]

پر خندہ زن ہے۔"

ANNA ELISTRATOVA نے اس خیال
کی بڑے مدلل تردید کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر ہم نے اسٹرن کو
اس انداز سے سمجھنے کی کوشش کی تو اس کی ظرافت کا سارا حسن
زائل ہو جائے گا۔ GESTER کی PSEUDONYM
جسے اسٹرن نے HAMLET سے اخذ کیا ہے براہ راست
ناقابل فہم تھی مگر جیسا کہ ہم جانتے ہیں یہ TRAJIC
COMEDY کی ایک عمدہ مثال ہے

"اب جہاں تک یارک کا سوال ہے یا اس کے
نصف کی بات ہے تو یہاں ہمیں زندگی کی شوخی
مجسم نظر آتی ہیں اور ہمیں یارک کے قدموں کی ہلکی
سی چاپ پر GESTER کی کلاہ میں لگے
گھنگھروؤں کی جھنجھناہٹ سنائی دیتی ہے۔
مگر اسی کے ساتھ ساتھ اس کی لمبی لمبی سانسوں
میں قبر کی ہیبت ٹھنڈک کا بھی گمان ہونے لگتا
ہے۔"

اگر ہم اسٹرن کی ظرافت کے ذرائع ڈھونڈ کر ایک نام
دینا چاہیں (اور جیسا کہ بلاشبہ ہے) تو وہ RABELAIS
یا SHAKESPEARE کسی پر بھی سبقت نہیں
پا سکتا۔ ANNA ELISTRATOVA بیسویں
صدی کے ترقی پسند ناول نگاروں کی جستجو اور TRISTRAM
SHANDY کے درمیان کسی تعلق پر کوئی استفسار نہیں کرتی
اس کے تمام دلائل کی بنیاد گوئٹے (GOETHE) کے
اس مشہور قول پر ہے کہ اسٹرن کو کسی ایک میدان میں بطور نمونہ
پیش نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس نے ان تمام حقیقتوں کی پیش گوئی
کر دی اور عملاً کر دکھایا جو اس کے بعد پیش آنے والی تھیں
VERTSMAN نے بھی اس خیال کو بنا کسی حجت کے تسلیم کیا
اور یہ گتھیاں ختم کر دی کہ:

"اسٹرن اپنی تمام اصلیتوں کے ساتھ آنے والی
صدی کے ادب کے لئے خام مال (RAW
MATERIAL) مہیا کرتا ہے۔"

بہر کیف موجودہ عہد اس نقطہ نظر کی از سر نو پرکھ کے لئے ہمیں آ
دے رہا ہے۔ لہٰذا یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ
WELLS اور THOMAS WOLFE ـــــ
TRISTRAM SHANDY میں جدید ناولو
کے لئے سامان آرائش دیکھ لیا تھا۔

ہمارے تنقیدی ادب میں قبل سے ہی اس بات کی کوش
رہی ہے کہ اسٹرن کو نئی آنکھوں سے پڑھا جائے اور یہ معلو
کیا جائے کہ بیسویں صدی کے ادب سے وہ کن معنوں میں قریب
تھا۔ ۱۹۲۱ میں جواں سال ادیب VICTOR
SHKLOVSKY نے ایک کتابچہ شائع کیا جس کا نام
STERN'S TRISTRAM SHANDY AND
THEORY OF THE NOVEL تھا۔ یہ کتابچہ
بڑی ہی سرگرمی سے لکھا گیا اور گرچہ اس کی تمام باتیں قابل تسلیم
نہیں ہیں تاہم یہ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے اور مصنف
نے بڑے گہرے مشاہدے کئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

"اس کتاب میں ہر شئے بے ترتیب اور الٹی
پلٹی ہے مگر یہ انتشار دانستہ ہے اور اس کا اپنا
ایک حسن ہے۔ اس کتاب میں PICASSO
کی تصویروں جیسا ہی ایک سربستہ قانون ہے۔"

اپنے اس کتابچہ میں SHKLOVSKY نے اسٹرن کے ادبی
تصورات، اس عہد کی طرز معاشرت اور اس کی مختلف ادھو
مگر دلچسپ کہانیوں کے تذکرے بھی کئے ہیں SHKLOVSKY
کا دھیان ظاہر ہے ان ابواب کی طرف ہی مرکوز تھا جو انتہا

(بقیہ صفحہ ۶۹ پر)

ہشت ہشت

لطیف حزیں

آنکھوں کے پردوں میں رقصاں
اُن پتلیوں کے سایہ کا اسقاط ہوا ہے ...
حمل کے دنوں کانچ کی چوڑیوں سے
ہاتھ کتنے ہرے ہو رہے ہیں
ایک بوسہ سے پہلے
میں اِن آنول کے ٹکڑوں کو گنتا چلوں ....
سات جمع ایک / سات جمع ایک
.. کہ اُن کرچیوں بھری شاموں میں
دردِ زہ ہی تھا

چاک پیٹ کے اکناف زرد لہو میں
رحم کے اُس طرف
شمار کنندہ ایک رات / ایک رات
ہشت ستارہ کی صورت میں
جاں کناں ہے
ایک بیضہ کی صورت میں جنم ہوا ...
فنا عکس ہے
کہ اوّل ہی اوّل
ہزاروں حیاتوں کا

میں صرف پرکاش لیا ہوں
اور شمار کنندہ کروں میں اِن نطفوں کا
ہزار شکلوں میں
کہ ایک موت کا بوسہ ہوں میں ....
اِن بوندوں میں نہیں
ذرّوں میں
اک لہو قزح ہوں
... اُن شاموں میں اک ادا لحد میں ڈوبی
مجامعنی پہلوؤں سے
نزع کی سانس ترکِ قصّہ ہے
اِس لحد کے ذرّوں میں
بے ترتیب استخواں
لوحِ بے کنارہ بے کنندہ
یہیں ایک زائچہ کے لئے
اپنی داستان کے لبوں سے کوئی
ایک ہشت روئے / ایک ہشت ہنسے ..

حسین الحق

ایک افسانہ نگار

چھ افسانے

ایک خصوصی پیشکش

میں کا تعارف

- بلند ہمتی کا نوحہ
- اندھی دشاؤں کے سا
- کھلی ہونٹوں کی چاپ
- میری تمہاری کہانی
- بلبلہ
- شکستیدہ

پھر بھی چار چیزیں مجھے [illegible] سکون بخشتی ہیں: کتابیں، موسیقی، سگریٹ اور [illegible]

ابّا، اماں، آپا، شیمی اور عین تابش میری کائنات ہیں، میں جب بھی اپنے بارے میں سوچتا ہوں، تو یہ لوگ میرے خون کی آتی جاتی لہروں کے درمیان اس طرح سرسرانے لگتے ہیں کہ ان کے بغیر اپنی نامکملیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔

ابّا میری ذہنی ساخت پہ بری طرح اثر انداز ہوئے ہیں، انہوں نے آزادروی کو میرا شعار بننے دیا، کھلی آنکھوں سے مجھے دنیا کا مطالعہ کرنے کا موقع دیا اور میری مرضی کے مطابق مجھے اپنی راہ متعین کرنے کا اختیار بخشا، اُن کا یہ پیار میری فطرت پہ اس طرح اثر انداز ہوا ہے کہ میں پیار کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہ جانتا ہوں اور نہ جاننا چاہتا ہوں۔

بڑی بڑی آرزوؤں اور مرادوں سے پیدا ہوا اور بڑے ناز و نعم میں پلا، دس سال تک "بہشتی" بنا رہا، کانوں میں دُرّ لٹکے، اور زندگی بھر کے لئے امام حسینؑ کی غلامی میں دیا گیا۔ اس ناز و نعم کا نتیجہ بہت غلط نکلا، آج صورت حال کچھ یوں ہے کہ میرے یہاں محبت کے علاوہ کسی شئے کا گذر نہیں، محبت کی میرے نزدیک بہت اہمیت ہے، گو کہ مجھے میرے ماں باپ، بھائی، بہن اور کچھ دوستوں کے علاوہ دوسرے لوگوں سے محبت کے بدلہ میں روایتی طور پر دھوکا اور بے وفائی ہی ملی ہے پھر بھی ع

از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

اور شاید مجھے نہ صرف یہ کہ دوسرے مذاہب بلکہ خود اسلام کی بھی تاریخ فتح و نصرت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ رسول کریمؐ ساری دنیا کے لئے رحمت بن کر آئے تھے اور انہوں نے اپنی پوری زندگی میں کسی کو قتل کرنا تو درکنار ایک طمانچہ بھی نہیں مارا۔

سیاسی طور پر ابتدا میں ابّا کے اثرات غالب تھے، چونکہ وہ خود کانگریسی، مولانا آزادؒ کے زبردست معتقد اور کسی زمانے میں جمعیۃ علماء ہند کی ضلعی شاخ کے ناظم بھی تھے اس لئے میں بھی اُسی راہ پہ آگے بڑھا لیکن آج جب اُن کے خیالات کا تجزیہ کرتا ہوں تو تقلید سے کنارے ہو کر بھی انہیں بالکل صحیح پاتا ہوں۔

گاندھی جی کا اہنسا کا نظریہ بھی میرے لئے بہت پُرکشش ہے شاید اس لئے کہ میں آج تک کسی سے لڑائی میں جیتا نہیں ہار میرا مقدر رہی اور ہے، وجہ جو کچھ بھی ہو لیکن ہتھیار مجھ کو ہمیشہ میرے لئے سوہانِ روح بنتی ہے، میں نے ہیروشیما، اور ناگاساکی کے دکھوں کو وہاں موجود نہ ہونے کے باوجود اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس کیا ہے اور رانچی کے فسادات میں اپنی بہن کو کھو چکا ہوں اس لئے اشرف المخلوقات جب ہیروشیما، ناگاساکی، ویت نام، فلسطین، کشمیر، پنجاب، نواکھالی، جبل پور، احمد آباد، رانچی اور بنگلہ دیش پیدا کرتا ہے تو مجھے مخلوق اور خالق سب کی شرافت پر شک ہونے لگتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ بس یہی کہوں "بدھم شرنم گچھامی"!

لیکن مسئلے کا واقعی حل تو یہاں بھی نہیں ہے!

دراصل یہ سب کچھ سیاست دانوں کی حرام کاریوں کا نتیجہ ہے، اقبال نے خدا سے کہا تھا ع

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

لیکن شاید اقبال بھول گئے کہ اسی چراغ سے ہم آگ بھی لگاتے ہیں، میں انسانوں سے بہت مایوس ہوں، جب تاریخ کا مطالعہ کرتا ہوں تو پاتا ہوں کہ بُرے لوگ ہر دور میں زیادہ تعداد میں رہے، برائیاں ہر دور میں عروج پر رہیں، اور نیک لوگ ہر دور میں کم رہے، لوگوں کو صحیح راستہ دکھانے والوں کو کبھی اُن کی زندگی میں وسیع پیمانے پہ وہ عزت اور شرفِ قبولیت نہیں ملا جو شیطان کا مقدر ہے اور تب اُس وقت سب کچھ گڈمڈ ہو جاتا ہے، پھر مجھ میں

نہیں آتا کہ کنٹرولنگ پاور کس کا زیادہ ہے؟ دائرہ اثر
کس کا وسیع ہے؟ جیت کس کی ہو رہی ہے؟ اور ہار کس کی؟
"خدا اور شیطان" — انسان تو دو ملاؤں کے درمیان
کی مرغی بن کر رہ گیا ہے۔!

میں ہر قسم کے CONFIRMATION کے خلاف ہوں
کیونکہ قطعیت نے انسانی زندگی میں زمانی بالجبر سے زیادہ بڑے
گناہ کار کا رول ادا کیا ہے، اس قطعیت نے دنیا کو جہنم بنا کر
رکھ دیا ہے، اگر آج یہ قطعیت اور مسلمات ختم ہو جائیں کہ
کون زمین کس کی ہے؟ کون ملک کس کا؟ کون ہندوستانی ہے
کون چینی؟ کون ہندو ہے کون مسلمان؟ کون اپنا ہے
کون غیر؟ تو پھر کون کس پہ بم گرائے گا؟ کون کس کی زمین
پہ قبضہ کرے گا؟ کون کس کو مارے گا؟ کون کس پہ ظلم کرے گا!
لیکن مجھے احساس ہے کہ یہ سب کچھ دیوانے کا خواب ہے اور بس!

میں ——— غربت، پیار اور خواب کے مثلث
کے درمیان گردش کرتا ہوا آدمی جہاں سے جہاں تک پہنچا
ہوں اس سفر میں مجھے سہارا دینے والوں اور راستہ دکھانے
والوں میں باجی اماں، خالہ جان، گرو بھیا، خلیل بھیا،
اور سرور کو میں کبھی بھلا نہ سکوں گا ان کے احسانوں سے میری
گردن جھکی ہوئی ہے۔

ان لوگوں کے علاوہ بھی چند لوگ میری زندگی میں بہت
اہمیت رکھتے ہیں جن کے ذکر کے بغیر میں اپنے تعارف کو بھی مکمل
نہیں پاتا، ان لوگوں میں خالو ماموں اور سہسرام کے ایک اچھے
شاعر ظفر رضوی سرفہرست ہیں جنہوں نے ابتدائی مراحل میں مجھے
COACH کیا، پھر کیف سہسرامی جن سے میں نے افسانہ نگاری
کی بنیادی باتیں سیکھیں، پھر کالج میں داخل ہونے کے بعد
حسن آرزو جنہوں نے اس منزل میں یقیناً میری رہنمائی کی اور
پٹنہ پہنچنے کے بعد اپنے جن اساتذہ سے میں نے بہت کچھ پایا
ان میں علامہ جمیل مظہری، پروفیسر اختر اورینوی، اور ظہیر صدیقی
وغیرہ وہ حضرات ہیں جن کے آگے میں آج بھی عقیدت سے سر
جھکا سکتا ہوں اور عملی زندگی میں جو لوگ میرے لئے مثال
بنے ان میں ابا، باجی اماں، ماموں جان، چھوٹے چچا
اور مشتاق ماموں مرحوم سرفہرست ہیں، اور دوست جن کے
بغیر میں اپنے آپ کو سدا تنہا اور غیر محفوظ محسوس کرتا ہوں
ان میں معین شبنم، شفق، علی امام، فخر رضوی، شمیم ہاشمی، سرور، حسن
اور ابرار ملک وہ اشخاص ہیں جو میری سانسوں کی آمد و شد کا
ایک حصہ بن چکے ہیں۔

ان کے علاوہ بھی کچھ لوگ ہیں جو مجھے بہت یاد آتے ہیں
اور جب یاد آتے ہیں تو بہت دکھ دیتے ہیں لیکن جن
کے بارے میں میں کچھ کہہ نہیں سکتا، کچھ لکھ نہیں سکتا!

اور ایک نہایت غیر اہم اور غیر ضروری بات :-
میں ۲ نومبر ۱۹۴۹ء کو پیدا ہوا، اس دن محرم
کی دس تاریخ تھی۔

ہند کا یہ سفر روحانی

PASSAGE TO INDIA

والٹ وھٹ مین
ترجمہ: پروفیسر عبدالرؤف

ایشیا کے وہ اساطیرِ قدیم
وہ حکایاتِ کہن
عہدِ پارینہ کے سینے میں جو محفوظ رہے
صداقات جو اک کہر کے ساتھ
صفحۂ روزگار سے ہیں عیاں
اور سائنس کا انکشافِ جدید
صرف یہ ہی نہیں میرا تصور
بلکہ وہ داستانیں انھی کی
جن سے ہے مایہ دار افریقہ
جن کی نسبت سے ایشیا کا وقار
نور کی وہ شعاعِ ملکوتی
دور تک پھیلتی، بکھرتی ہوئی
معتبر خواب اور صحیفے جو
دل کی گہرائیوں کو چھوتے ہیں
شاعری کے عظیم رزمیے

وہ مذاہب قدیم ملت کے
سب کو نسبت ہے میرے موھلے
اور مندر بنا رہے ہیں جو
آفتابِ سحر کی کرنوں میں
سوسن و یاسمین سے خوشتر
مندرو تم تو وہ کہانی ہو
دستِ تحقیق جس کو چھو نہ سکے
آگہی کی کمند سے آزاد
رفعتِ آسماں کے ہم راز ہو
اونچے اونچے کلس مناروں کے
تابشِ نور سے نکھرتے ہوئے
سرخ، تازہ گلاب ہوں جیسے
جن پہ قلعی چڑھی ہو سونے کی
ان مناروں کی داستانِ جاوید
فانی انساں کے خواب کی تعبیر

مندرو اور چمکتے مینارو
میں سواگت تمہارا کرتا ہوں
گیت گاتا ہوں میں تمہارا بھی
اے مری روح کیا تو نہیں دیکھتی
کہ مشیت نے روزِ ازل کس طرح
فیصلہ یہ کیا
کہ زمیں ناپی جائے گی
گزرگاہیں اور شاہراہیں بنیں گی
قومیں آباد ہوں گی ، پڑوسی بنیں گی
شادی اور بیاہ کے ان میں رشتے رچیں گے
سمندر کے سینے پہ رستے بنیں گے
مسافت نہ ہوگی
منسلک ہوں گے ، اک دوسرے سے ممالک
اور سمندر کے سیاحو ، اے ناخداؤ
ڈھونڈنے والو اقلیمِ تازہ جہاں کے

فنِ تعمیر کے ماہرو !
اور انجینئرنگ
کلوں اور مشینوں کے اے چابکدستو !
تاجرو ، جن کا مقصد فقط نفع خوری نہیں
آتما اور پرماتما کے لئے
تم نے عزمِ سفر تھا کیا
اک نئی سی عقیدت ابھرتی ہے دل میں میرے
تمہارے لئے

بند مٹھی کا نوحہ

حسین الحق

آتے جاتے لمحوں کے درمیان ہواؤں نے یک رخی سازشی معاہدہ پر دستخط کر دیا اور میں نے آہستہ سے دشاؤں کی سگندھ محسوس کرنا چاہا تو وجود کے چاروں جانب راستوں پر کڑوی کسیلی رطوبتوں کا احساس ہوا۔

وہ کہ لمحوں کا اسیر تھا، میں کہ آتے جاتے لمحوں کے درمیان دشاؤں کی سگندھ محسوس کرنی چاہتا ہوں، اور تم کہ لمحوں کی افراتفری میں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرے ہو اور بکھر بکھر کر ٹوٹے ہو۔

راستوں کے بیچ سے ہٹ جاؤ کہ آنے والے تمہیں روند کر چلے جائیں گے۔

لیکن دم لو کہ کل اور آج کی باتیں زنگ آلود ٹین کا خالی ڈبہ ہیں، دم توڑتی اور ریت پر سر پٹختی مچھلیوں کے مرنے کا انتظار کرو کہ زندہ شے پیٹ میں جا کر بہت اودھم مچاتی ہے یوں ساحلی ریت پر گھروندے نہ بناؤ ابھی اس کمرے سے کوئی آ سکتا ہے (جس کی پیشانی پہ سرخ بلب جل رہے ہیں) اور پھر صور لگانے والا تمہارا انتظار کرے نہ کرے، کیا پتہ!

چاپ پھر ابھرتی ہے، پھر ڈوبتی ہے، کوئی آ رہا ہے، بچ کر کہاں جاؤ گے؟ بھاگو! میں دیکھوں گا کہ بچ کر تم کہاں جا سکتے ہو کہ آتے جاتے لمحوں کے درمیان ہواؤں نے یک رخی سازشی معاہدہ پر دستخط کر دیا ہے اور میں ...... اور تم ......
اور وہ ....."

اسٹریچر پر جب وہ اس کمرے کی طرف جا رہی تھی تو میں نے اس کے پھولے ہوئے پیٹ پر ہاتھ رکھا تھا "درد کیسا ہے؟"

جواب شاید اس نے دیا یا شاید نہیں دیا لیکن رات کی تاریکی اور پیٹ کا درد ..... شدت کا احساس کیسے ہو کہ کوکھ اور کائنات کی درمیانی منزل ابھی آنے والے کچھ اور لمحوں کے لئے اپنا وجود مختصر کئے ہوئے ہے اور میں سوچتا ہوں کہ اس سے کہوں "کوشش کرنا کہ اب کے بستی والے نامراد نہ ہوں کیونکہ آتے جاتے لمحوں کے درمیان ...."

میں کاریڈور میں کھڑا ہوا اسنساتی ہواؤں کی سرگوشیاں سننا چاہتا ہوں اور باہر اندھیرے میں آتے جاتے، ایک دوسرے سے ٹکراتے سایوں کو دیکھنا چاہتا ہوں اور اس کی بات یاد کرنا چاہتا ہوں "درد اتنا شدید ہے جیسے بچہ منہ پر آ گیا ہو۔"

اس سمے میں نے اسے تسکین دی تھی لیکن دل ہی دل میں ہنسا بھی تھا "تم کو ہر مرتبہ یہی شک رہتا ہے کہ بچہ جیسے منھ پر آ گیا ہو اور پھر کوئی ایسی رات آتی ہے جب آپ ہی آپ سب کچھ بہ کر نہ جانے کہاں چلا جاتا ہے اور آنے والی صبح تمہارا پچکا ہوا پیٹ لے کر میرا منھ چڑاتی ہے اور تمہیں شرماتی ہے۔"

لیکن میں تو ہمیشہ چپ رہا اور اب کے تو پہلے سے ڈاکٹر نے کہہ رکھا ہے "پیٹ میں واقعی بچہ ہے اور نارمل انداز میں اس کا ارتقا ہو رہا ہے۔"

ساحلی ریت پر مچھلیاں زور زور سے سر پٹک رہی ہیں اور سمندر بہ بہ کرتا ہوا دوڑتا ہے اور پھر بے تحاشہ اپنی پہنائیوں میں گم ہو جاتا ہے۔

آنے اور جانے کا یہ تفاوت
ڈوب جائیں گے ہم
ڈوب جاؤ گے تم

اے رابعہ ...... اے طاہرہ ..... اے عمارہ !
اپنی کہانیاں ان کے سامنے سناؤ کہ ان کے یہاں صدیوں
سے بچوں نے جنم لینا چھوڑ دیا ہے اور اسی کارن میری، میری
ماں، میری بہن، میری داشتہ، نہ جانے کون ؟ کوئی ہے
جو ان کے پرکھوں کا شراپ بن کر ان پر حاوی ہو گئی ہے ،
پوچھتے ہیں، صبح و شام پوچھتے ہیں۔
جنم سے لے کر مرن تک کے ہر لمحے پر چھائی ہوئی ہے ۔

اے رابعہ .... اے طاہرہ .... اے عمارہ !
اپنی کہانیاں سناؤ ! تمہاری کوکھ کے اُن بچوں کا حشر کیا
ہوگا جو کلبلاتے کیڑوں کی طرح وجود میں آنے کے لئے بیتاب
ہیں، ہونٹوں کو سی کر کب تک بیٹھو گی ؟ ساحلی ریت پر گھروند
بنانے والوں کا ساتھ دینے کی مجرم تو تم بھی ہو، اپنے اپنے
پائجامے اوپر کر لو، اب کے ازار بند ذرا کس کر باندھنا۔

اے رابعہ ..... اے طاہرہ ...... اے عمارہ !
مت روؤ ! اچھا رہنے دو ! میں تمہاری کہانی نہیں
سنوں گا ......"

میں انھیں کیسے بتاؤں کہ ناریل کے درختوں کے پیچھے سے
ہم نے سرسراہٹ، بے چینی، سسکی اور قہقہے کی آواز صاف
صاف سنی تھی اور آتے جاتے لمحوں کے درمیان جب ہوا اُن
یک رُخی سازشی معاہدہ پر دستخط کیا تھا تو جانے میں نے کیا سوچا
تھا، جانے میں نے کیا چاہا تھا، بس اتنا یاد ہے کہ صدیوں بعد
میری بستی کے لوگ خوش ہوئے ہیں اور وہ جو میری کوئی نہیں ہے
وہ جو میری سب کچھ ہے اپنا پھولا پیٹ سب کو دکھاتی ہے اور
بستی والے خوشی میں جھوم جھوم کر نگاڑے بجاتے ہیں اور تب میں
ایک کونے میں جاکر چپکے سے اپنی آنکھوں کی نمی اپنے دامن میں
جذب کر لیتا ہوں اور جیسے خود سے کہتا ہوں ....."

اے رابعہ .... اے طاہرہ ..... اے عمارہ "
میں کاریڈور سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا لمبے لمبے قد آور
درختوں کے درمیان آجاتا ہوں، پھر اچانک خیال آتا
ہے کہ میں بیچ رستے پہ کھڑا ہوں۔
(راستوں کے بیچ سے ہٹ جاؤ ورنہ آنے والے تمہیں
روند کر چلے جائیں گے)

میں ایک کنارے ہو کر تھکے تھکے قدموں بلا قصد اور
بلا ارادہ کسی طرف بڑھ رہا ہوں، پرسکون ہوں، کچھ بے چین
بھی اُس کے واسطے جو میری کچھ نہ ہو کر بھی سب کچھ ہے، اُس
کے واسطے جو میری سب کچھ ہو کر بھی کچھ نہیں ہے، ابھی ابھی
نرس نے بتایا " اب جلد ہی کچھ ہونے والا ہے " ۔
"جلدی کرو ... جلدی کرو " میرے پاس وقت نہیں ہے"
کوئی میرے بغل سے کہتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ گیا، میں نے
چاہا کہ اُسے دوڑ کر پکڑ لوں لیکن جانے والا بہت دور
جا چکا ہے، کوئی آ رہا ہے۔ چاپ پھر اُبھرتی ہے، پھر ڈوبتی
ہے .... کوئی آ رہا ہے، بچ کر کہاں جاؤ گے ! بھاگو ! میں
دیکھوں گا تم بھاگ کر کہاں تک جا سکتے ہو ؟

بھائی ! تم کو غلط فہمی ہوئی ہے، ہم نیند کے ماتے لوگ
صدیوں سے اپنی طرح آدھی جاگی اور آدھی سوئی آنکھوں کے
سہارے تھاہ اور اتھاہ کے درمیان معلق کھڑے ہیں کہ نہ
بڑھتے بنتا ہے، نہ رکتے بنتا ہے، جسم یہاں ہے تو روح وہاں
ہاتھ وہاں ہے، تو پیر یہاں، آنکھ یہاں ہے تو کان وہاں
ہم کہاں جائیں گے ؟ " ٹوٹے، بکھرے اور دکھی لوگ !"

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن
کچھ سجھائی نہیں دیتا، بس ہوا کی سنسناہٹ ہے اور سمندر کی
ہو ہو !

ساحلی ریت پر مچھلیاں اب اپنے آخری پر وس سے

گذر رہی ہیں۔

میں اُلٹے پاؤں پھر کاریڈور کی جانب لوٹ جاتا ہوں
وہ کمرہ میری اور میری ہستی کی تمناؤں کا واحد مرکز ہے جہاں
سرخ رنگ کا بلب جل رہا ہے، نرس کمرے سے باہر آتی ہے
یہ وہی ہے جسے میں پہلے سے محسوس کرتا رہا ہوں، میں اُس کی
جانب استفہامیہ نظروں سے دیکھتا ہوں، وہ میرا مطلب
سمجھ جاتی ہے۔

" سر اب پروسس شروع ہوا ہے، سارا مادّہ بہ رہا ہے
خون اور پانی کا رنگ، ہلکا نیلا خون پانی بن جائے۔"

" جلدی کرو سسٹر، جلدی کرو، وقت بہت کم ہے۔"

" ہم کیا کرسکتے ہیں سر؟"

میں اندھیرے میں باہر کچھ تلاش کرتا ہوں، کوئی وجود
کوئی سایہ، کوئی سرگوشی، پھر کچھ نہ پا کر خود سے کہتا ہوں۔

"ہم کیا کرسکتے ہیں؟"

دُکھ والے لمحے نہ تو رکتے ہیں نہ چلتے ہیں، جانے کیا ہوگا
کوئی ہے جو اندر کا سب کچھ نوچ کھسوٹ کر اُجاڑ کرنے پر تُلا
ہوا ہے، میں اپنے وجود کے جانے انجانے رستوں پر کڑوی
کسیلی رطوبتوں کو محسوس کرتا ہوں اور اپنے کو اطمینان دلاتا
ہوں لیکن کچھ ہے، کچھ نہیں ہے، جانے کیا ہے؟ جانے کون
ہے؟ جو ساحلی ریت پر دم توڑتی مچھلیوں کو اسیر کئے ہوئے ہے
چھوٹی چھوٹی آنکھیں، پیاری پیاری آنکھیں، جانے کیسی کیسی
حسرت لئے ایک دوسرے کو تاکتی ہوں گی۔

" الوداع ....."

" الوداع ....."

" رووُمت ...... ہمارا کیا ہے؟"

" رووُمت ..... ہم بھی آتے ہیں۔"

چاپ پھر اُبھرتی ہے، پھر ڈوبتی ہے، کوئی آرہا ہے،
کوئی آگیا ہے۔

" بھائی: ڈراتے کیوں ہو؟ کون ہو؟ کہاں سے
آئے ہو؟ کہاں جاؤ گے؟ یوں چپکے سے آکر بغل میں
کیوں کھڑے ہوگئے ہو؟ ذرا روشنی میں آؤ کہ میں آتے
جاتے لمحوں کی سگندھ محسوس کرنا چاہتا ہوں۔"

جانے کون ہے؟ نہ کچھ کہتا ہے نہ سنتا ہے پھر بھی
اتنا قریب ہے کہ سانسوں کا حق دار ہوگیا ہے۔ میں باہر کی
طرف منہ کرکے زور زور سے سانس لینا چاہتا ہوں لیکن سانس
رُکتی ہی جاتی ہے۔

" بھائی میرے! یاد لو، یاد دے دو، یہ کیا کرتے ہو
یہ کیوں کرتے ہو؟"

اور تب اُسی سمے نرس باہر آتی ہے، یہ وہی ہے جسے
میں اکثر محسوس کرتا رہتا ہوں، اب کے میرے سوال سے پہلے
ہی جواب ملتا ہے، وہ نظریں نیچی کئے ہوئے اور دکھ بھرے
لہجے میں وہ مجھے بتاتی ہے۔

بہت دیر تک بہت کچھ بہتا رہا، پھر کچھ منہ پر آکر رک
گیا، سر وہ کچھ تھا ضرور لیکن کیا تھا اس کا پتہ نہ چل سکا کیونکہ
چند لمحوں تک وہ منہ پر رُکا رہا، پھر بڑی تیزی کے ساتھ اندر
کی جانب لوٹ گیا، ہم نے بہت کوشش کی سر، لیکن کہیں کچھ
نہ ملا جانے وہ کیا تھا سر؟ جانے وہ کیوں تھا سر؟"

میں بہت دیر تک یوں ہی کھڑا رہا، اور وہ بھی جو میرے
بغل میں چپکے سے آکر کھڑا ہوگیا تھا ہم ایک دوسرے کو پہچانے بغیر اور
ایک دوسرے کو دیکھے بغیر ایک دوسرے کو اپنی اپنی آنکھوں میں جذب
کرتے رہے۔ اور پھر جب وہ اسٹریچر پر واپس اپنے کمرے کی طرف
جارہی تھی۔ تو میں نے سرگوشیوں میں اُس سے پوچھا۔"

" اندر ہے نا؟"

اس نے بہت ہی کمزور لہجے میں جواب دیا۔

" پتہ نہیں!"

مخفی تبسم

غزل

سر جھکاتا ہے نہاں تیرا مقدر ہے الگ
گھر کی دیوار جدا راہ کا پتھر ہے الگ

ایک سورج پسِ دیوار چمکتا ہے جُدا
ایک سایہ اسی دیوار سے ہٹ کر ہے الگ

آسماں پر ہے عجب چاند ستاروں کا سماں
دل میں دیکھو تو یہاں رات کا منظر ہے الگ

پاس تیرے ہوں کہ قطرہ ہے نہاں دریا میں
دور تجھ سے ہوں کہ صحرا سے سمندر ہے الگ

فرصتِ عمر ہے کم حرفِ تمنا سن لو!
بات شکووں کی نہ پوچھو کہ وہ دفتر ہے الگ

اندھی دِشاؤں کے سائے

حسین الحق

میری بیوی ADVANCE STAGE میں تھی اور میں نے احتیاط برتنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی کیونکہ میں سب کچھ برداشت کر سکتا تھا اور اپنے بچّے پر آنے والی ہر مصیبت اور دُکھ سے بے فکر ہو سکتا تھا لیکن یہ بات میری حدِ برداشت سے باہر تھی کہ وہی میرے بچّے کو بھی پریشان کرے جو کل میرے پُرکھوں کو پریشان کر چکا ہے اور آج میری زندگی دوبھر کر رہا ہے مجھے اگر کم از کم اِس کا بھی اطمینان ہوتا کہ کچھ دور جانے کے بعد اس سے ملاقات ہوگی تو میں مطمئن رہتا کہ یوں بھی سفر میں کچھ راستہ طے کرنے کے بعد خوشبوئیں اور بدبوئیں دونوں اپنا لمس چھوڑ جاتی ہیں اور انسان اُن دونوں کے درمیان فرق کرنا جان جاتا ہے اور کسی ایک کو کنارے پھینک دینے کی طاقت بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن میں وہ صبح کیسے بھول جاؤں جب میں ہزاروں میل گہرے سیاہ غار سے منوں اندھی مٹیوں کی پرتیں ہٹا کر اوپر آیا تو سب سے پہلا احساس جس نے آگے بڑھ کر میرا دامن تھاما وہ اس کی آمد کا تھا۔

آپ اسے اعلان کہئے، احساس کہئے یا سرگوشی لیکن بہرحال کچھ تھا ضرور جو خلاؤں کی چادر پھاڑ کر اور سنسناتی ہواؤں کے سینے چیر کر آتی جاتی سانس کی طرح بس ایک خوف زدہ کیفیت بن چکا تھا جس کو محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یوں مشہور تو یہ بھی ہے کہ صرف میں ہی نہیں بلکہ میرے پُرکھوں نے بھی اپنی بیویوں سے صحبت کے وقت اور ماؤں نے اپنے بچّوں کو گھونٹی دیتے وقت سانسوں کے زیروبم

پلکوں کی جنبش اور انگلیوں کے سہارے یہ بتا دیا تھا کہ وہ آنے والا ہے........ وہ کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔

میں پُرکھوں کی بات نہیں کر رہا ہوں کہ بہرحال وہ مر چکے لیکن خود مجھے اس نے بہت پریشان کیا، روحوں میں دانت گاڑ کر دراڑیں پیدا کرنے کی بات جہاں سے شروع ہوتی ہے اُسی نقطے سے اس کا سفر بھی شروع ہوتا ہے، کہنے والے تو کہتے ہیں کہ وہ ہر جگہ، ہر موڑ اور ہر پل ہمارے ساتھ رہا اور زندگی کے تمام بڑے چھوٹے لمحوں پر حاوی ہے لیکن مجھے تو جو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرکزی حیثیت دراصل اسی کی ہے باقی سب کچھ تو اسی ایک دائرے کے گرد گردش کرنے والے نقطے ہیں، اور میں اسی نقطے اور دائرے کے چکر سے بچنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ دھڑکا تو ہر وقت لگا رہتا ہے کہ "وہ آنے والا ہے ..... وہ کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔"

.... وادی میں الاؤ جل رہے تھے، جشن منایا جا رہا تھا، لوگ الگ الگ ٹولیوں میں زندگی کی لذتوں کو چکھ رہے تھے۔ کسی طرف آج کے کئے گئے شکار کا حال بیان کیا جا رہا تھا اور کہیں اُن خطروں کو اشاروں کے سہارے سمجھانے کی کوشش کی جا رہی تھی جو کسی وقت بھی درپیش ہو سکتا تھا کہ اچانک سب کی آنکھوں میں کالے پیلے سائے لہرانے لگے، آنکھوں ہی آنکھوں میں سب نے ایک دوسرے سے کچھ کہا، خموش لب ...... اور گویا آنکھیں ....

اور پھر یوں ہوا کہ لوگوں کے قدم تھم گئے، چہرے پیلے پڑ گئے

روشنیاں ماند پڑ گئیں اور سب اپنے اپنے پڑاؤ کی طرف
دبے قدموں چل دیئے اور آپ اسے اعلان کہیئے یا احساس یا
سرگوشی لیکن بہر حال کچھ تھا ضرور جو خلاؤں کی چادر پھاڑ کر
اور سناتی ہواؤں کے سینے چیر کر آتی جاتی سانس کی طرح بس
ایک خوف زدہ کیفیت بن چکا تھا ـــــ کیفیت جو احساس
بن جاتی ہے کہ "وہ آنے والا ہے ـــــ وہ کسی وقت بھی
آ سکتا ہے ـ "

یہ واقعہ بہت پرانا ہے لیکن سانسوں کی آمد و شد کا ایک
حصہ ہے کیونکہ ہم کس لمحے کو کس لمحے سے الگ کریں یہ فیصلہ بہت
دشوار ہے اور پھر ..... میں تو آج بھی آدمیوں کے درمیان آگے
پیچھے، دائیں، بائیں سرکتے ہوئے، تھرکتے قدموں اور
تھکی آنکھوں کے کونوں میں جھانکتے ہوئے اس اعلان یا
احساس یا سرگوشی کو پڑھ لیتا ہوں کہ "وہ آنے والا ہے...
وہ کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔"

میں تاگوں کا مالک ہوں اور اب تک میں سیکڑوں لاکھ دیوں
کے سروں پر تاگا رکھ کر اور ان کے پورے جسم کو تاگے سے ناپ کر
دیکھ چکا ہوں، تاگا نہ تو کبھی بڑھتا ہے، نہ گھٹتا ہے ......
پھر بھی کچھ ہے ضرور جو آنے والا ہے ..... کسی وقت بھی
آ سکتا ہے۔

پہلے تو میں یہ سمجھتا تھا کہ اول تو یہ کہ وہ ہے ہی نہیں اور
اگر ہے تو کائر ہے، کمینہ ہے، ڈھونگی ہے، نظر باندھنے والا
ہے جو جب جی چاہے، جیسے جی چاہے بس لوگوں کو خوف زدہ
کرتا رہتا ہے، اس میں خود کھل کر سامنے آنے کی طاقت نہیں
اسی لئے ڈھونگ رچاتا ہے، ہر دشا پر چھا کر سب کی نظر باندھ
دیتا ہے، خود سب کو دیکھتا ہے، جو جی چاہتا ہے کرتا ہے
اور ہم بس دیکھتے رہ جاتے ہیں... ... سوچتے رہ جاتے ہیں کہ
کیا کریں ..... کیا بہتر ہو بس !
لیکن گذشتہ دنوں کے واقعات نے اس کے نہ ہونے
کی بات کو دھندلکوں کا مسافر بنا دیا ہے اور کم از کم ایک واقعے کو
فراموش کرنا تو میرے لئے ناممکن ہے کہ اس نے اس وقت اپنی
سانسوں کو میری پلکوں میں انڈیل دیا جب میں اپنی بیوی میں
اتر رہا تھا۔ اترنے کے اس نئے عمل سے پہلے کئی سال تک
ہم دونوں کو اداس دل اور بھیگی پلکوں کی امانت سونپ
چکا تھا اور اس لئے صرف اسی مرتبہ نہیں بلکہ پچھلی کئی دفعہ
بھی ہم دونوں نے پوری احتیاط برتی مگر کوئی تھا جو کوکھ میں
گھس کر سب کچھ ختم کر دیتا اور اب کے بھی یہی ڈر ہم دونوں پہ
حاوی تھا اور اس لئے ہم دونوں چاہتے تھے کہ جڑیں اتنی گہری
ہوں کہ کوئی طوفان ہلا نہ سکے، ہم نے بیج بونے کے وقت بھی تمام
بہتر طریقے استعمال کئے لیکن لمحہ ..... بس وہ ایک لمحہ .....
جو صدیوں پہ حاوی ہوتا ہے نہ جانے کیسے بکھر گیا اور ہم دونوں
ہی اس آہٹ پہ چونک گئے جو نہ جانے کس کی آمد کا اعلان
تھی ـــــ ہم ایک دوسرے سے چپک گئے..... ساکت لب
ساکت پلکیں ...... اور ساکت جسم ..... باہر گھٹا ٹوپ
اندھیارا ...... ہوا کی سنسناہٹ ...... اور ان سب کے
درمیان ایک چاپ ..... ایک سرگوشی ..... ایک احساس۔"

"کوئی آ رہا ہے !" میری بیوی بید کی طرح کانپ
رہی تھی۔

میں نے اپنی پوری طاقت جمع کی اور چیخ کر کہنا چاہا
"ڈھونگی سامنے کیوں نہیں کرتا؟ صرف چاپ کے سہارے
عورتوں کو ڈرانا جانتا ہے؟" لیکن میں نے محسوس کیا کہ
میری آواز کو خود بھی پالا مار گیا ہے۔

پھر آہستہ آہستہ خود ہی وہ چاپ بھی کسی سمت کھو گئی
اور ادھر خلاف توقع نہ جانے کیسے پانی بھی قطرہ قطرہ کر کے
جڑ تک پہنچ چکا تھا۔

"پھر وہی ہو گا؟" میری بیوی کی خوف زدہ آنکھوں
میں سوال دانت نکوسے کھڑا تھا۔

"پاگل۔" میں نے بیوی کو اطمینان دلانے کے لئے اس کے گال تھپتھپائے اور چارپائی سے اٹھ گیا لیکن خود میری رگ رگ میں آتی جاتی لہریں بھی اُن ہی لمحوں سے ڈر رہی تھیں جو سب کچھ ہوا میں بکھیر دیتے ہیں۔

"نہیں، نہیں ... ایسا نہیں ہوگا۔" میں نے اپنے آپ کو اطمینان دلایا لیکن بس ایک احساس ... ایک اعلان ایک سرگوشی ...... "وہ آرہا ہے ..... وہ کسی وقت بھی آسکتا ہے۔"

تو پھر یوں ہوا کہ لمحے لمحوں پر دھڑا دھڑ گرگر کر ٹوٹنے لگے اور اب میری بیوی ADVANCE STAGE میں تھی۔

یہ بھی صحیح ہے کہ میری بیوی کے یہاں واضح طور پر اس کی آمد کا کوئی تصور نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ ہر ایک کی آمد سے نہ جانے کیوں ڈر جاتی تھی ...... چونک چونک پڑتی تھی، اور میں جانتا تھا کہ یہ وہی شئے ہے جو میرے سامنے دھند بن کر مجسم کھڑی ہے اور میری بیوی کی رگ رگ میں خون بن کر دوڑتی رہتی ہے اور میں اس بات سے ڈرتا بھی تھا کہ جو شئے سامنے ہے اُسے تو رد کیا جا سکتا ہے مگر جب خون اور سانس بن جائے تو اس کا کیا علاج ہوگا؟ اور اگر کہیں یہی سانس میرے بچے کا بھی مقدر بن گئی تو؟ تو؟

میں نے کئی بار اُسے اس سے آگاہ کرنے کا ارادہ بھی کیا لیکن عین اسی لمحہ وہ ایک احساس مجھ پہ حاوی ہو جاتا ہے "کوئی ہے ..... کوئی سُن رہا ہے ..... کوئی دیکھ رہا ہے .... کوئی آرہا ہے ....."

اور میری زبان ہمیشہ لفظوں کو ترستی ہی رہی اور میری بیوی اپنی سانسوں سے لت پت اُس بوجھ کو اُٹھائے گھومتی رہی جو میری بخشش تھی۔

"اے کاش ...... اے کاش!"

"دیکھئے نا .... اِدھر اُدھر چاروں طرف کیا دیکھ رہا ہو" میری بیوی بچے کو پیار سے چومتے ہوئے میری جانب نظریں جھکا کر اور مسکرا کر بولی۔

"تو گویا سانسیں اُس کا بھی مقدر بن گئیں۔" میں نے سر جھکا لیا، آج سارا اثاثہ لُٹ چکا تھا اور وہ ہو چکا تھا، جس کا مجھے ڈر تھا۔

"کائر! تو اس پر بھی چھا گیا؟ یہ بھی تیرے ڈر سے چاروں طرف دیکھ رہا ہے کہ کہیں تو آ نہ جائے ... کہیں تو آ نہ گیا ہو۔"

"نہیں میرے بچے ..... نہیں! میں تیری حفاظت کروں گا" میں اُس کی جانب جھکا اور اُس کا بوسہ لینا چاہا لیکن یکدم چونک کر جلدی سے کنارے ہٹ گیا۔

"میں وہ تو نہیں بیٹے، جو تم چیخ چیخ کر رونے لگے۔" میں نے اس سے کہنا چاہا لیکن میری بیوی نے بچے کو اپنے سینے میں سمیٹ لیا اور اب وہ سسک سسک کر رو رہا تھا اور چُسر چُسر پی رہا تھا۔

"آپ سے ڈر گیا!" بیوی نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں! AUDIPUS COMPLEX ہے۔" میرے بھائی نے ہنستے ہوئے کہا۔

ہنسی، مسکراہٹ اور سسکیوں کے اس امتزاج سے میں نے کوئی ایسا لمحہ تلاش کرنا چاہا جو میرا ہو لیکن میری مٹھیاں چمڑے کے سوا اور کچھ نہ پا سکیں۔

اور اب یہ آخری لمحہ ہے جو میرے سامنے ہے، میں جس کا قیدی ہوں۔

میں اور میری بیوی دالان میں بچے کو کھلا رہی تھی کہ اب میں بچے کو پیار بھی کرتا ہوں، اُسے گود میں بھی لے لیتا ہوں، وہ اب مجھ سے ڈرتا بھی نہیں ہے لیکن اُس کی آنکھیں .... میں ان آنکھوں سے بہت ہراساں ہوں کہ یہ ہر وقت نہ جانے کیا کھوجتی رہتی ہیں، کبھی اِن آنکھوں میں

...ے پیلے سائے لہراتے رہیں، کبھی سرخ ڈوروں کی نوچ نظر
...تی ہے اور کبھی یہی آنکھیں موسیٰ کی آنکھیں بن جاتی ہیں...
...ں نے بارہا ان آنکھوں کو کسی ایک مرکز پر لانا چاہا لیکن
...ی کبھی قید ہوئے ہیں؟

میری دالان کے اوپر چھپر تھی اور جہاں پر میرے بچے کی
...ارپائی تھی اس کے بائیں جانب اوپر میں ایک گول تھی، میرا
... کھیلتے کھیلتے بار بار اس گول کی جانب تاکتا جیسے سمندر کا
...سارا جھاگ اسی کا ورثہ ہو۔ میں نے اپنے بچے کی نظروں کا
...تعاقب کیا تو معلوم ہوا کہ گول کے ایک سوراخ پر مرکوز آنکھیں
...بھی ہوئی ہیں جس میں بچھو اور کنگوجر سی مشابہت کا کوئی جانور
...بار بار جاتا ہے اور پھر باہر آتا ہے... جاتا ہے اور پھر باہر
...آتا ہے... جاتا ہے اور پھر باہر آتا ہے۔

ابتدا کے چند پل شہادت اور بیچ والی انگلی کے فاصلے
...پر محیط تھے، پھر فاصلہ بڑھتا گیا.... لمحوں کا بھی اور انگلیوں
...کا بھی۔

فاصلہ: انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کا
فاصلہ: انگوٹھے اور بیچ والی انگلی کا
فاصلہ: انگوٹھے اور بیچ والی انگلی کے بغل والی انگلی کا
فاصلہ: انگوٹھے اور چھنگلیا کا

اور اب دائرہ ٹوٹ چکا تھا..... فاصلہ طویل ہو چکا
تھا، لمحہ فاصلے کی قید توڑ کر دائرے سے باہر آ چکا تھا۔

اور میرے بچے کی آنکھیں.... اور گول.... اور
سوراخ..... اور بچھو والا کنگوجر جیسا جانور
"اور میرے بچے کی آنکھیں ....."

"بیٹا...... ادھر دیکھو.... بیٹا!" میں نے
اسے چٹکیوں کے سہارے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا۔

لیکن میرے بچے کی آنکھیں .... اور بچھو اور کنگوجر
جیسا جانور .... اور ان آنکھوں کا رنگ ..... اور کالے
پیلے سائے..... اور ایک احساس...... ایک اعلان..
ایک سرگوشی...... "وہ آ رہا ہے..... وہ کسی وقت
بھی آ سکتا ہے۔"

اب کے یہ احساس میری سرخ رگوں کو بھی زندہ نہ
کر سکا بلکہ پورے وجود پر پیلے رنگ چھا گئے۔

"بیٹا..... شش..... بیٹا۔" (آواز کو پھر پالا
مار گیا)

اور اب کے جو میری نظریں اٹھیں تو ایک عجیب منظر
میرے سامنے تھا: بچھو اور کنگوجر جیسا وہ جانور سارے
دائروں کی ٹوٹن سے بے پروا ایک جگہ ساکت کھڑا تھا۔

"ایسا کیوں؟ ایسا کیوں؟" میرے وجود کے
اوپری حصے میں سیاہ بادل امڈ گھمڈ کر برسنے کی تیاری
کر رہے تھے۔

اور میرے بچے کی آنکھیں.... اور ان آنکھوں کا رنگ
جیسے انتظار کے سارے بہاساگر ان میں امڈ پڑے ہوں۔

اور پھر ایک نیا منظر: بچھو خطِ مستقیم <——>
کی شکل میں تبدیل ہو گیا اور کنگوجر زاویہ قائمہ <——>
بنا کر اس کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

میں نے اپنا سینہ پکڑ رکھا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ سانس
اور جسم کا رشتہ منقطع ہو کر ہی رہے گا..... یہ کیا ہو رہا ہے
یہ کیا ہو رہا ہے؟

اور پھر چند لمحوں بعد، بچھو اور کنگوجر دونوں صلیب
< + > کی صورت ایک دوسرے میں پیوست
تھے۔ اور اچانک ہوا کا زور بڑھ گیا، طوفانوں کی آمد
آمد تھی، بادل امڈ گھمڈ کر برسنے والے تھے، اور میرے
بچے کی آنکھیں، اور آنکھوں کا رنگ، اور میں، اور میری
بیوی جو آنے والے تمام طوفانوں سے بے خبر بچے کی پھلیاسی
رہی ہے، اور ہوا کی سنسناہٹ، اور طوفان، اور

یادِ باراں، اور ان سب کے درمیان ایک اعلان، ایک احساس، ایک رنگینی " وہ آرہا ہے.... وہ آرہا ہے۔"
اور اب وہ گونج سے الگ ہو گیا، کچھ دیر تک آسمان وزمین کے درمیان حرکت رہا.... اور اب وہ زمین پہ آکر ٹک گیا ہے....

" اسے...... اسے۔" میں نے آہستہ سے اپنی بیوی کا شانہ دبایا۔

میں نے اشارے سے اس وارث طرف متوجہ کیا۔
" ارے ٹھیک یاد دلایا آپ نے!" وہ وہیں پہ ہیٹر پہ رکھے ہوئے دودھ کو اُبلتا دیکھ کر ہیٹر کی طرف لپکی۔
" سنئے! ذرا دروازے کی طرف دیکھتے رہیے کوئی آنہ جائے۔" میری بیوی نے ہیٹر پر سے دودھ اُتارتے ہوئے کہا اور میں اُس سے یہ بھی نہ کہہ سکا...... " وہ آرہا ہے...... وہ آگیا ہے۔"

اور اب وہ بڑھ رہا ہے۔ .. اُس کا حلیہ بھی عجیب ہے آنکھیں ماتھے پر، ہونٹ غائب، ناک غائب.... صرف آنکھیں....... بس آنکھیں......"
" اور میرے بچے کی آنکھیں..... اور اُن آنکھوں کا رنگ......"

اور اب وہ میرے بچے کے سرہانے آگیا ہے.....
میں پسینے میں شرابور ہو رہا ہوں.....
وہ میری طرف تمسخرانہ انداز میں دیکھتا ہے، پھر بچے کے ماتھے پر جھکنے لگتا ہے.... وہ جھک رہا ہے..... وہ جھک رہا ہے...... میں دیکھ رہا ہوں...."
اور اچانک نہ جانے کہاں سے میرے اندر طاقت عود کر آئی اور میں نے اسے گھونسے گھونسے مارنا شروع کر دیا لیکن وہ میرے گھونسوں سے لاپروا میرے بچے کے ماتھے کی طرف جھکتا جارہا ہے۔

میں گھبراہٹ میں اُسے گھونسوں اور لاتوں سے مار رہا ہوں لیکن پھر بھی وہ جھکتا جارہا ہے۔
میں مار رہا ہوں وہ جھک رہا ہے!
میں مار رہا ہوں وہ جھک رہا ہے!!
میں مار رہا ہوں وہ جھک رہا ہے!!! ●●

غزلیں

مصور سبزواری

مجھی میں ٹھہر تھکی شام کا رلن میں ہوں
بھٹکتی روح تر آخری بدن میں ہوں

نہ جیت پائے گا سیلِ ہوس میں اب مجھ سے
تو موج موج سمندر پون پون میں ہوں

حصارِ جسم کے دیوار و بام ہوں گے کبھی
بس اب تو ٹوٹتے انگ انگ کی دکھن میں ہوں

یہاں پہ کون ہے یہ کس سے ڈر رہا ہوں میں
یہاں فقط پسِ دیوار جان و تن میں ہوں

صدائیں دیتے ہو کس کو یہاں رہا ہے کون
بس ایک دشتِ فنا کا اکیلا پن میں ہوں

نظارے ڈوب گئے کشتیاں ابھرنے کے
اٹھوں گا کیا بڑے گرداب کی تھکن میں ہوں

مصورؔ اپنے سے خود کو بچا کے رکھوں گا!
کہ اپنا قاتلِ جاں اپنا راہزن میں ہوں

■ ■

دائروں کا پہرہ اک دیوار پر لگتا رہا
کچھ نہ ہونے پر بھی نامعلوم ڈر لگتا رہا

آٹھویں پتے نے اس کے کھل کے کی یلغار رات
پیڑ دن میں جو سبھوں کو بے ضرر لگتا رہا

ناشنیدہ داستانِ سنگ کا لہجہ تھا میں
کون سنتا سب کو آسیبی کھنڈر لگتا رہا

سبز موسم میں تھا خوں آشام وہ نخلِ ہوس
پت جھڑوں میں شاخ شاخ اس کی ثمر لگتا رہا

جانے کس خشتِ ملامت کا ہدف میں بن گیا
قہقہہ اک میرے پیچھے عمر بھر لگتا رہا

بے صدا دھرتی تھی ساری آسماں نہلا بے چراغ
ہر قدم پر پول لمحوں کا گجر لگتا رہا

اس پرانے قلعہ میں جب جھانک کر دیکھا کبھی
چھت تلے اک عفریت کا گنبد سا سر لگتا رہا

■ ■

آزاد گلاٹی

غزلیں

ہوا پسند تو غمِ حسن کا ہیں شکار صورتیں
بچھڑ کے گھر سے گرد ہیں وہ تابدار صورتیں

کبھی کرن سے کس طرح ملے کہ ان دنوں سبھی
لئے پھرے ہیں جیسے اک غبار دھار صورتیں

شفق، دھنک، زمیں، فلک، ہوا، خلا، گماں، یقیں
وہ شخص مر کے پا گیا ہے صد ہزار صورتیں

نظر میں تیرتے ہیں سبک کشتیوں کے بادباں
سڑک پہ ڈگمگا رہی ہیں لوچدار صورتیں

دلوں کے کرب ملگجی مسکراہٹوں میں ڈھانپ کر
نکل پڑی ہیں بن کے شام کا سنگھار صورتیں

وہ پھول رنگ لوگ کس تپش کی زد میں آ گئے
ہمیں ملی ہیں اس نگر میں ریگزار صورتیں

--

وہ جو کسی کا روپ دھار کر آیا تھا
میرے اندر بسنے والا سایا تھا

وہ دکھ بھی کیوں ہم کو تنہا چھوڑ گئے
کیا کیا چھوڑ کے ہم نے جنہیں اپنایا تھا

خود تم نے دروازے بند رکھے، ورنہ
میں اک تازہ ہوا کا جھونکا لایا تھا

میری اک آواز سے ساری ٹوٹ گئیں
وہ دیواریں جن پر تُو اترایا تھا

ویراں دل میں غم کے پریت بھٹکتے تھے
میری چپ پر کسی صدا کا سایا تھا

اس میں ایک جنم بھر کے دکھ سمٹے تھے
وہ آنسو جو پلکوں پر لہرایا تھا

--

کھوئی ہوئی رُتوں کی چاپ

حسین الحق

نمائش میں لگی ہوئی ایک تصویر :

برش .... رنگ ...... لاتعداد خوب صورت چہرے،
برسوں آگے کے کلنڈر ...... مصوّری کے لئے آمادہ
ہاتھ ...... پھر ایک گوشے میں صرف ایک تصویر ......
...... برسوں آگے تک کے متعدد کلنڈر ......
پھر ایک گوشے میں صرف ایک تصویر ......
برسوں آگے اور برسوں پیچھے کے متعدد کلنڈر ......

تفصیلات صیغۂ راز میں ہیں لیکن آپ کا فیصلہ کیا ہوگا،
میری رائے کو ابھی کنارے رکھئے۔ میں تو ہمیشہ پچھلے
دروازے کے شگافوں سے ہاتھ ڈال کر اگلا دروازہ کھول دیتا
ہوں اور آنے والوں کو خبر تک نہیں ہوتی کہ کون تھا جو کہاسے
کی طرح اُتر گیا اور سانس کی طرح نکل گیا تو لمحوں کی اِس نمائش
سے پرے اُس ایک چہرے کو میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا جس نے
سانسوں کے زیر و بم کے درمیان مجھ سے کہا تھا " میں جب بھی
سوتا ہوں کوئی سایہ سا میرے قریب آتا ہے اور کہتا ہے " چلو!
میں تمہاری پریشانیاں محسوس کرتا ہوں تسلیم کہ تم نے سمندروں
کی گہرائی کو اپنا مقابل بنایا اور آج یہ صورت ہے کہ پل پل
میں بلبلوں کی طرح پھوٹ پڑتی ہو لیکن میں نے تم سے کہا تھا نا
کہ سب سچ ہے اور سب جھوٹ ! میں اپنے بیٹے سے بھی یہی کہتا
ہوں لیکن اُس کی ضد مجھے کبھی کبھی سپر ڈالنے پر بھی مجبور کرتی
ہے یوں بظاہر اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیتا ہوں مگر پھر بھی وہ یہ
کہتا ہوا باہر چلا جاتا ہے " کرائے کا مکان بہرحال کرائے کا
مکان ہے یہاں خواہ آپ نئے نئے فرنیچر کیوں نہ آراستہ کریں لیکن
اس سے بہتر فٹ پاتھ ہے جو کسی کی جاگیر نہیں۔"

کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ اُس سے پوچھوں " فٹ پاتھ
واقعی آزاد علاقہ ہے ؟ "
ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ دیواروں پہ لکھ دینے سے سرحدیں
ٹوٹنے سے باز آجائیں اور موت کے ٹرک دوسرے علاقوں میں
داخل نہ ہوں اور نہ فٹ پاتھ رہے اور نہ کرائے کا مکان۔
میں اعداد و شمار کی تمام منازل سے واقف ہوں۔ چودہ
طبق کا نام بھی سُن چکا ہوں اور انتالیسویں سیڑھی کی بات بھی
میں اس سے بھی واقف ہوں کہ پانسٹھ، پینسٹھ، تریسٹھ
اور اکہتّر کے درمیان ۳، ۲ اور ۴ کا فرق ہے اور یہ بھی کہ فٹ پاتھ
پہ سونے والوں کے سروں پہ کھلا آسمان ہے جہاں بارش کسی وقت
بھی اُن کے گال چھو سکتی ہے، گرمی اُن کے کپڑے اتروا سکتی ہے
اور سردی اُن کی جلد ......
جب شفق سہسرام سے سلّی گوڑی روانہ ہوا تو وہاں سے
اُس نے مجھے خط لکھا کہ یہاں ہر طرف اور ہر جگہ کے لوگ بڑے
معصوم ہیں اور یہ بھی کہ سلّی گوڑی کے چار پانچ اسٹیشن پہلے ہی سے وہ سرزمین
شروع ہو جاتی ہے جو اس علاقے کا مقدّر ہے۔
میں نے اُس کے خط کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا
" لیکن برف کے نیچے دبی آگ ...... "
(پھر میں نے یہ جملہ کاٹ دیا)
تو یہ ساری باتیں ایک طرف اور سانسوں کے زیر و بم کے
درمیان اُس کا گھبرائے ہوئے لہجے میں مجھے یہ بتانا ایک طرف
" میں جب بھی سوتا ہوں تو کوئی سایہ سا میرے قریب آتا ہے اور

کہتا ہے "چلو"!

میرا پہلا مکان کافی اچھا اور آرام دہ تھا۔ کئی کمرے تھے دالانیں تھیں۔ دروازے سے آگے کے راستے میں دونوں طرف خوبصورت پھول کھلتے (جو کبھی مہک دیتے تھے اور کبھی نہیں) لیکن میں پچھلے کچھ دنوں سے بہت پریشان تھا کیونکہ پچھلے دروازے کے شگاف سے ہاتھ ڈال کر صبح سے شام تک اگلا دروازہ کھولے کھڑا رہتا مگر کوئی چاپ بھی نہیں دکھتی۔ یوں میں بڑا کھوکھلا ہوں۔ میں نے اس وقت بھی نہیں دیا تھا جب میں اپنی ماں کا گوشت اور ہڈیاں اور چمڑے اور خون اور اس کے جسم کے کپڑے سب کچھ کتر کتر کر کے چبا گیا تھا اور نوالے کر کھا گیا تھا اور ڈکار تک نہیں لی تھی مگر رستوں کی بے لباسی مجھ سے برداشت نہیں ہو سکی اور میں نے اپنا مکان تبدیل کر دیا اور تب اسی سمے میرے بیٹے نے (جو میری طرح ہی گردش کرتا رہتا ہے) کہا تھا "کرائے کا مکان بہرحال کرائے کا مکان ہے۔" لیکن پھر بھی میں ہر لمحہ یہ محسوس کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ میں خوش ہوں۔ ان لمحوں میں بھی جب اس دھرتی کے ہونٹوں پر پیاس سے پپڑی پڑ گئی جس سے میں اُگا تھا ...... اور جب دف بجتے اور رجز گاتے ہوئے جوشیلے نوجوانوں نے میرے گھر کو روشنی کے میناروں پر بلند کر دیا تھا اور جب کوکھ کے رشتوں کی قسم دینے والیوں کی کوکھ زبردستی اپنے فطری عمل میں مشغول کر دی گئی تھی...... اور جب...... اور جب اور جب میں نے دو خط استوا کی دوریوں کو اپنی دو انگلیوں میں جکڑ لیا مگر روٹی اور ہونٹ کا فاصلہ نہ طے کر سکا تھا۔

میں ان تمام منزلوں سے بخوبی گزر چکا ہوں اور میں نے کبھی کوئی پریشانی محسوس نہیں کی مگر سانس کے زیر و بم کے درمیان ایک دن اس نے کہا تھا "میں جب بھی سوتا ہوں تو کوئی سایہ سا میرے قریب آتا ہے اور کہتا ہے چلو!"

میں نے اس سے پوچھا "اس نے تمہیں کبھی کوئی نقصان پہنچایا"

نہیں کبھی نہیں۔ وہ تو بس آتا ہے۔ میرے چہرے پر آہستہ سے اپنا ہاتھ رکھتا ہے اور کہتا ہے "چلو"

"تب پھر تم اتنا پریشان کیوں ہو؟"

"وہ میری نیند کیوں توڑتا ہے؟ میں سونا چاہتا ہوں۔"

"تم اپنے ذہن کو وسوسوں سے خالی کر کے سویا کرو۔ تمہیں خواب نہیں ستائیں گے۔"

کیا بات کرتے ہو؟ وہ جھلا گیا۔ تمہیں ایک دن کا واقعہ بتاتا ہوں۔ میں ایک جگہ شادی میں گیا تھا۔ ۲ بجے رات تک شادی کا ہنگامہ رہا اور بستر پر گیا تھا تو اس قدر تھک چکا تھا کہ پل بھر میں آنکھ لگ گئی۔ اس رات میں کچھ بھی نہیں سوچ سکا تھا لیکن اس رات بھی اس نے میرے چہرے پر آہستہ سے اپنا ہاتھ رکھا اور کہا یہاں کیوں ہو؟ چلو!

"کہاں؟" اس نے پوچھا

"وہیں ...... جہاں ......"

"ہاں ...... کہاں؟" میرا شوق کچھ بڑھ گیا تھا اس لفظ کے بعد تو میری آنکھ ہی کھل گئی۔

تو صدیوں تک میں اس انتظار میں کھڑا رہا کہ شاید کوئی اگلے دروازے سے آئے لیکن جب رستوں کی بے لباسی اشتہار بننے لگی تو میں نے آہستہ سے وہ مکان ہی چھوڑ دیا اور کرائے کے مکان میں چلا آیا۔

نمائش میں لگی ہوئی ایک تصویر:

کرائے کا مکان اور فٹ پاتھ

ڈسمل سے پہلے اور اکائی کے داہنی طرف لاتعداد صفروں کے بعد ————

پیاسی دھرتی
کوکھ کا فطری عمل
روٹی اور ہونٹ کا فاصلہ
اور ......

[بقیہ صفحہ ۵۶ پر]

غزلیں

نازش انصاری

یہ بات پھر سے سمندر میں گھس کے دیکھوں گا
کہ پہلے میں بھی سمندر تھا ریت کیسے بنا

ہر آتی جاتی ہوا پیٹتی ہے دروازہ
ہمارا گھر نہ ہوا دستکوں کا شہر ہوا

میں اپنے جسم میں خوابیدہ تھا کہ اک سورج
مجھے نکال کے، سایہ بنا کے بھول گیا

غریب شہر کو اک لمحہ سازگار نہیں
جو اپنے آپ کو لینے تمہارے پاس آتا

ہر آنکھ پہلے گزرتی ہے دکھ کے ساگر سے
کوئی کٹورہ کبھی بے سبب نہیں چھلکا

--

دیکھا شناس ہاتھ پہ اک ڈھونڈتا ہے گھر
جیسے مرے نصیب میں لکھا ہوا ہے گھر

چھت کی منڈیر پر ہیں کئی چاند سوچ میں
ہوگا کبھی ہمارا بھی وہ کون سا ہے گھر

وہ کون شخص ہے کہ نہ آیا جو کہہ کے بھی
جس کے لئے خوشی سے اجاڑا گیا ہے گھر

یہ شکل سا کھلونا جو بے فائدہ ہی تھا
جب وہ نہیں رہا ہے تو سونا لگا ہے گھر

سچائی کے گناہ میں پچھلے برس کے ساتھ
دیوار گیر سولی پہ لٹکا ہوا ہے گھر
بیٹھے بٹھائے گزرا ہے ایسا بھی حادثہ
اپنے بدن کی طرح پرایا لگا ہے گھر --

غزل

سُلطان اختر

مری بُزدلی پہ ہنسا تھا بہت
مرا خوف مجھ سے بڑا تھا بہت

مجھے دیکھ کر رو رہا تھا بہت
مرا عکس مجھ سے خفا تھا بہت

بظاہر سبھی مطمئن تھے مگر
بباطن وہاں زلزلہ تھا بہت

اُسے دیکھنے کی طرح دیکھتے
وہ سادہ صفت خوشنما تھا بہت

مجھے کھو کے بھٹکا تھا جو دربدر
وہ احساس تو سرپھرا تھا بہت

بدن میں عجب سنسناہٹ سی تھی
لہو میں کوئی چیختا تھا بہت

میں اپنے لئے اجنبی ہی رہا
مرا رنگ مجھ سے جُدا تھا بہت

ترے قرب نے تازگی بخش دی
کہ میں خشک ہونے لگا تھا بہت

زباں پر نہ تھی اُس کی مدح و ثنا
مگر دل میں خوفِ خدا تھا بہت

میری تمہاری کہانی

حسین الحق

میرے تہ در تہ کمرے کا درمیانی حصہ بارش کے پانیوں سے تر بتر ہو رہا ہے اور یہی ہوتا ہے میں سوتے وقت چاروں طرف سے گھوم گھوم کر، چھو چھو کر اور سونگھ سونگھ کر یہ اطمینان کر لیتا ہوں کہ کمرے میں کہیں کوئی سوراخ نہیں ہے اور پھر بستر پہ جانے سے پہلے نہایت احتیاط کے ساتھ تمام دروازوں کو بند کرتا ہوں لیکن ہر آدھی رات کو نیند ٹوٹ جاتی ہے اور بارش کے قطروں کا لمس، نیند کے غیر محسوساتی وجود کے تمام اجزاء کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ میں نے جب اپنے دوست علی ا۔م سے اس پریشانی کا ذکر کیا تو وہ ہنس کر کہنے لگا:

"یہ قطرے ہماری روح ہی کا تو ایک حصہ ہیں ان کے قرب سے گھبراتے کیوں ہو؟"

میں اس کی اس قسم کی باتوں کا اکثر جواب نہیں دیتا ہوں لیکن میں اس حقیقت سے واقف ہوں کہ ندی کا کوئی حصہ کٹ کر کسی صحرا میں ضرور کھو گیا ہے ورنہ یہ کبھی ممکن ہی نہ تھا کہ بنیادوں میں پانی اس طرح گردش کرنے لگے جیسے شریانوں میں لہو۔ کبھی کبھی اس پر بہت غصہ آتا ہے جس نے مکان میرے نام بیع کر دیا مگر آج تک اپنا چہرہ نہ دکھایا ورنہ اس سے کم از کم اتنا تو ضرور کہتا کہ "حضرت! اگر مکان ہی دینا تھا تو کوئی آہنی مکان دیا ہوتا۔ کم از کم اس کے ٹوٹنے اور مرنے کا تو خوف نہ رہتا۔ لیکن شاید کسی نے اس کو میرے اس ارادے سے باخبر کر دیا تھا اس لئے کہ ایک مرتبہ اُس نے دروازے پر سے زور سے پکار کر کہا تھا۔

"آہنی مکان چاہتے ہو؟ اگر کسی نے اس پر آگ رکھ دی تو .... ؟ ؟

تو ؟ ؟ ؟

اور اس "تو" کا جواب تو تم بھی نہ دے سکیں کہ تم نے گرمی کی نہ جانے کتنی دوپہریں میرے ساتھ لوڈو کھیلتے ہوئے گزار دیں۔ تم سے جب میں نے تمہاری شادی کے ایک دن پہلے پوچھا تھا:

"اگر تم مجھے بھلا نہ پائیں تو؟"

اور میرے اس سوال کے بعد تم آدھا گھنٹہ تک میری انگلیاں اپنی انگلیوں میں پھنسائے کھڑی رہیں اور پھر اچانک مجھے پن چبھو کر اپنے آنسو پونچھتی ہوئی بھاگ گئیں۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں نے اس چبھن کو اور زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرنا چاہا لیکن اچانک ہی مجھے یہ احساس ہوا کہ درد تو ختم ہو گیا لیکن جیسے ہی یہ احساس ہوا اسی لمحہ اچانک پھر ٹیس اُبھری...... اور...... ...... اور...... اور پھر درد معدوم ہو گیا۔

اور تب میں نے بڑی بے بسی کے ساتھ سوچا کہ اگر یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا تو ...... ؟

تو ..... ؟ ؟

تو میں تم سے یہ کہہ رہا تھا کہ ہر روز یہی ہوتا ہے کہ جب لہو کے سرخ سمندر میں شام ڈوب جاتی ہے اور محسوس کی ہوئی اجتماعی کیفیات کی ساری جبریہ اور المیہ حقیقتیں افق کی طرح

آنکھیں پھیلائے اور جبڑے وا کئے میری جانب بڑھتی ہیں تو میں آہستگی کے ساتھ ندی کی نرم خرام لہروں کے سہارے زمین دوز کمرے میں چلے جانے کی کوشش کرتا ہوں مگر میں جیسے ندی کے حلق سے نیچے قدم رکھتا ہوں، سارے جرثومے بیک وقت مجھ پر حملہ آور ہو جاتے ہیں اور میں گھبرا کر پھر بالائی منزلوں کی طرف بھاگ کھڑا ہوتا ہوں۔

تم سن رہی ہو نا؟ ممکن ہے تم کہو "تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔" لیکن یہ تو تمہارا مخصوص جملہ ہے مجھے یاد ہے جب میں نے تم سے کہا تھا "میرا لباس پھٹ گیا ہے۔ تمہارے پاس دھاگوں کی کمی نہیں ہے اسے ذرا رفو کر دو۔" تو اُس وقت بھی تم نے یہی کہا تھا لیکن اُس کے بعد تم نے اپنے کمرے میں جا کر کمرہ بند کیوں کر دیا؟ اور دو گھنٹوں تک تم اندر کیا کرتی رہیں؟ مجھے نہیں معلوم! بارش زور پکڑتی جا رہی ہے اور آس پاس کہیں کوئی چھتری بھی نہیں ہے جس کا سہارا لے کر پانی کی بھوار، چھینٹوں اور ریلوں سے بچا جائے۔ کمرے کا سارا سامان بھیگنے لگا ہے، دیوار پہ ٹنگے ہوئے کپڑے، نظم اور کہانیوں کی کتابیں، میں جس چادر کو سینے سے لگا کر سوتا ہوں وہ چادر کھونٹی پہ ٹنگی ہوئی باسکٹ، ٹیبل پہ رکھے ہوئے لیٹر پیڈ، تھرماس گلدستے، آئینہ، پیپر ویٹ، میں ان سب چیزوں کو کہاں رکھوں؟ کیسے بچاؤں؟ خود پانی کے اِس ریلے سے کیسے بچوں!

بس! تمہاری ہمیشہ کی یہی عادت ہے نہ جانے کس گوشے سے چپکے سے نکل کر سامنے آجاتی ہو اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کر دیتی ہو "اُس مکان میں چلے جاؤ۔"

تم کو کیا پتہ؟ تم نے تو آج تک اُس مکان کی ڈیوڑھی پہ بھی قدم نہیں رکھا ہے۔ تم کیا جانو کہ برسوں سے پانی دھوپ اور ہوا کا زور سہتے سہتے سارا پھوس اُڑ چکا ہے۔ شاید چند تنکے بچ گئے ہوں۔ دیواروں سے مٹی گل گل کر بہنے لگی ہے دھوپ کی سختی سے چھتیں تڑخ تڑخ گئی ہیں اور کالے پانیوں کی بھوار سہتے سہتے کمرے کی زمین میں اتنی سیلن ہو گئی ہے کہ قدم رکھتے ہی پھسلن کا احساس ہونے لگتا ہے۔

میں تم سے کہہ رہا ہوں! تم جانتی ہو کہ میں تم سے جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ مکان پا کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ میں خوشی سے اس قدر دیوانہ ہو گیا تھا کہ یہ بھی معلوم نہ کر سکا کہ مکان کس نے دیا؟ کیوں دیا؟ کب دیا؟ اور اسی لیے آج مجھ سے کوئی سوال کر بیٹھے کہ راہوں کی دھندلاہٹ سنائے اور خاکیت کو لطیف نمائیت میں تبدیل کرنے کی ان کوششوں کا سلسلہ کس موڑ سے شروع ہوا تو شاید میں جواب نہ دے سکوں گا، میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو اس پگڈنڈی پہ رواں دواں پایا۔ ممکن تھا کہ میں کسی اور گلی میں نکل جاتا لیکن تم نے مجھے ہمیشہ گمراہ کیا۔ کبھی تو تم نے یہ کہہ کر مجھے بہلایا کہ "تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔" اور کبھی جو میں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ "میرا کمرہ اکیلے بھائیں بھائیں کرتا رہتا ہے اور تم بھی خواہ مخواہ دوسرے مکان میں رہ رہی ہو اسی کمرے میں آجاؤ۔"

تو تم کبھی مثلث، مربع، کبھی زاویہ قائمہ اور کبھی صفر کے احساسات کو اپنی آنکھوں کے وجود کا ایک حصہ بنا کر بہت دیر تک دیکھتی رہیں اور جب بھی ایسا ہوا تو خود مجھے بھی اِس دھند کے مدہم وجود کے احساس نے ہپناٹائزڈ کر دیا.... تم سے کیا کہوں اور کیوں کہوں؟

تم نے تو لفظوں کو قتل کر ڈالا ......

اور تم پہ کیوں الزام رکھوں کہ یہ المیہ تو خود میری اپنی ذات سے تعلق رکھتا ہے کہ جب ہونٹ لرزتے ہیں اور کوئی صدا آنکھیں کھولنے لگتی ہے تو تم سامنے آجاتی ہو اور میں پھر یہ سوچتا رہ جاتا ہوں کہ تم سے کیا کہوں؟ اور کیوں کہوں ؏

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو

تم! جو رگوں کی ٹوٹن، دلوں کی دھڑکن اور لہو کی رفتار میں

رچ بس چکی ہو۔ میں جب بھی تمہارے بارے میں غور کرتا
[ہو]ں تو آسمان پہ کالے دیوؤں کا لشکر نظر آنے لگتا ہے اور نگاہوں
[کے] سامنے پھر دھند چھانے لگتی ہے۔

"دھواں .... دھواں ...... کہرا .... اندھیرا۔"
"بتاؤ یہ کون سا مقام ہے ؟

میں یہاں اس لئے تو نہیں بھیجا گیا ہوں کہ تمام رات دھند
...رے اور اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا ہوں اور جب
...ح ہونے لگے تو کوئی چیل، کوئی فاختہ، کوئی عقاب، آسمان
...ے نیچے اُترے، میری آنکھوں میں اپنے پنجے گاڑے ...
...ب اُڑ جائے تو میں پوچھتا پھروں ......

دھواں ..... دھواں ..... کہرا .... اندھیرا ...
بتاؤ یہ کون سا مقام ہے ؟

لیکن کون بتائے گا ؟ یہ اندھیری رات ... ہوا کا زور
...انی کی ٹپ ٹپ ...... نہ جانے تم کچھ محسوس بھی کر رہی ہو
نہیں ؟

میں بہت دکھی ہوں دوست! میرے پاس یہی تو ایک کمرہ
ہے جسے میں آخری پناہ گاہ کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہوں
...ن بھر کی دوڑ دھوپ اور ناکامیوں کے بعد جب میں اپنے
...رے کے دروازے پہ قدم رکھتا ہوں تو سکون حاصل کرنے
...ی خوشی بے قرار کر دیتی ہے اور میں بے سدھ ہو کر سوچتا ہوں
...کن ہر آدھی رات کو یہ مصیبت ٹوٹتی ہے۔

میری تمنا ہے کہ کبھی تو ایسا ہوتا کہ آدھی رات کو آنکھ
کھلتی تو دیکھتا کہ گلاب و لالہ کے پھول کمرے میں کھل رہے
ہیں اور کمرے کی کھڑکی ٹھٹھکتے قدموں کا آئینہ دکھا رہی ہے
لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ ہر آدھی رات کو نیند ٹوٹتی ہے ،
...رہ کالے پانیوں سے بھرا رہتا ہے اور پھر ساری رات پانی
...وچھ اوچھ کر پھینکنے گذر جاتی ہے۔

مکان دینے والے نے اتنا بھی تو نہیں کیا کہ اگر اس طرح
ٹپکنے والا مکان دیا تھا تو کسی کو بھی میرے ساتھ کر دیا ہوتا جو
کم از کم پانی اوچھ اوچھ کر پھینکنے میں میری مدد تو کرتا۔ میری
حالت تو اس کشتی کی ہو گئی ہے جسے چپ چاپ اکیلے بہتے
رہنا ہے، مانجھی کے اشارے پر چلتے رہنا ہے اور کچھ بھی نہیں
کہنا ہے۔

میں بھی کمرے میں بھرے ہوئے پانی کی لہروں پہ نیچے
اوپر ہوتا ہوا بہتا چلا جا رہا ہوں ..... نہ جانے کب تک
بہتا رہوں گا ..... نہ جانے کہاں تک بہتا چلا
جاؤں گا۔ یہ کون سا سفر ہے جس میں پانی پہ نادیدہ چپو کی
سرگوشی کے علاوہ کوئی آہٹ تک نہیں اور اس پر ستم
یہ کہ تم نے ابھی کچھ دنوں پہلے مجھ سے کہا تھا "تمہارا لباس
بہت پھٹ گیا ہے۔ لاؤ رفو کر دوں۔"

میں تم سے کیا کہتا کہ جب ہونٹ لرزتے ہیں اور کوئی
صدا آنکھیں کھولنے لگتی ہے تو تم سامنے آ جاتی ہو۔

لیکن خیر! جب آدمی ایک مکان چھوڑ کر دوسرے مکان
میں آتا ہے تو عقلمندی اور سلیقہ پن کا تقاضا یہی کہتا ہے
کہ پرانے فرنیچر، سامان، اور ساری چیزیں وہیں چھوڑ دی
جائیں اور اگر کوئی شخص محسوس کرتا ہے کہ پرانے ساز و سامان
کو وہ ترک نہیں کر سکتا تو اُسے دوسرا مکان ہی نہیں لینا چاہئے
اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے تو .... ؟ .... تو .....؟
تو .... ؟

تو میں اپنے بدن سے تمہارا گوشت کاٹ کر زمین و
آسمان کے بیچ خلا کی لامحدود وسعتوں میں گم کر دیا تھا اگر
تم اپنے پرانے گھر سے دھاگوں کی گٹھری بھی ساتھ لیتی آئیں۔
اور پھر عجیب مقام پر آ کر کھڑا ہو گیا ہوں ..... بتاؤ میں کہاں
جاؤں ؟ میرا کمرہ پانی سے بھر چکا ہے .... کمرے کا سارا
سامان پانی میں ڈوب چکا ہے۔ میں اوب چھپ کر رہا ہوں۔
تیرنا آتا تو اب تک تیرتا ہوا کسی نہ کسی کنارے پہنچ ہی جاتا۔
[بقیہ صفحہ ۶۹ پر]

غزلیں

لطف الرحمٰن

اب کے یوں اندر و باہر کا سراپا ٹوٹا
دیکھتے دیکھتے ہر اپنا پرایا ٹوٹا

لوگ ٹوٹے بھی تو سب ساتھ ہی مل کر ٹوٹے
سانحہ دیکھ مرا شہر میں تنہا ٹوٹا

بس اسی لمحۂ یکجائی میں زندہ ہیں ہم
ایک اک کر کے ہر اک لمحۂ تنہا ٹوٹا

ایک لمحے کے لئے خود پہ ہوئے تھے ظاہر
عمر بھر ہم پہ اسی درد کا صدمہ ٹوٹا

کیا بتاؤں میں تجھے، ترکِ ملاقات کے بعد
ٹوٹنا جتنا نہ تھا مجھ کو، میں اتنا ٹوٹا

سلسلہ توڑنا جانا ہے کوئی رشتے کا
آنکھ جھپکی تھی کہ ہر رنگ تماشا ٹوٹا

شور سنتا ہوں، اندھیروں کا برستا ہوا شور
لے اڑی راہ سے اب پاؤں کا رشتہ ٹوٹا

کچھ نہ کچھ ربط ہے احساس سے ہر منظر کو
دیکھ! چڑھتے ہوئے دریا میں کنارا ٹوٹا

اب تجھے پا کے بھی شاید نہ سنور پاؤں گا
میں تری راہ تجسس میں کچھ ایسا ٹوٹا

چپ کے جنگل میں بھٹکتا ہے صدا کا ٹوٹا
کس قدر کرب میں ہے تیری ادا کا ٹوٹا

گرد آ آ کے لپٹ جاتی ہے، دامن سے ترے
اس میں شامل تو نہیں کوئی ہوا کا ٹوٹا

اس کو تشکیک کے صحرا میں بھٹک جانے دے
پھر یہیں لوٹ کے آئے گا خدا کا ٹوٹا

بن کے سناٹا کسی دشت میں کھو جائے گا
اور جائے گا کہاں تیری صدا کا ٹوٹا

خودکشی کا جو اٹھاتا ہے یہ ہر لمحہ عذاب
یہ بھی ہوگا کوئی اپنی ہی انا کا ٹوٹا

لوٹ جانے کی تمنا میں ہے بیگانۂ ذات
کتنی مشکل میں ہے دن رات فضا کا ٹوٹا

میرے ذروں کو بیابان کی وسعت دیدے
اور کیا چاہتا ہے رسم وفا کا ٹوٹا

ٹوٹنا سب کا مقدر ہے مگر دیکھ مجھے
تو نے توڑا تو میں کس درجہ بلا کا ٹوٹا

اس نے چاہا تھا سنور جاؤں میں بکھرے لیکن
سانحہ یہ ہے مرا، میں ہوں سدا کا ٹوٹا

غزلیں

طف الرحمٰن

...ونہ ہو یہ بھی کسی درد نہاں کا ٹوٹا
...ب سے بیٹھا ہے الگ اپنی فغاں کا ٹوٹا

...ب غمِ ریختن و رنجِ شکستن بھی نہیں
...ب تو ٹھہرا ہے کوئی سارے جہاں کا ٹوٹا

...ھی ہے مجھے حسرت سے ہر اک شے کی شکست
...بہت ٹوٹ کے بھی میں ہوں یہاں کا ٹوٹا

...ھر سے بننے کا بھی امکان نہیں ہے کوئی
...کس کو معلوم کہ کوئی ہے کہاں کا ٹوٹا

...بن نہ بننے میں مکمل تھا، نہ ہوں ٹوٹنے میں
...امکمل ہی رہا شیشہ گراں کا ٹوٹا

...ور تو جو ہو مگر یہ ہے بڑی رسوائی
...سب کی نظروں سے گرا اپنی زباں کا ٹوٹا

...ہے ہر اک شخص کے چہرے پہ کسی دکھ کا غبار
...س کو بھی دیکھئے ہے شہرِ غماں کا ٹوٹا

...پنے ہی شور میں گم ہوگئی خود اپنی پکار
...ون ہے میری طرح اپنی کماں کا ٹوٹا

...عتبارات کی سرحد سے نکل آیا ہے
...انے کس کھوج میں پھرتا ہے گماں کا ٹوٹا

■ ■

میں بھی شاید ہوں کسی تیرے بھرم کا ٹوٹا
مجھ سا ہوگا نہ کوئی دیر و حرم کا ٹوٹا

بند دروازوں کے پیچھے بھی ہے کچھ چوٹ چھپی
ہنسنے والوں کو بھی پایا کسی غم کا ٹوٹا

کل جو اک شخص کو دیکھا تو وہ اپنا سا لگا
وہ بھی تھا میری طرح کتنے جنم کا ٹوٹا

تو بتا کیسے سلامت ہے ترا آئینہ
میں تو ہوں خیر کسی سنگِ ستم کا ٹوٹا

مجھ کو برسوں پہ یہ محسوس ہوا ہے جا کر
کہ خدا کا بھی نہیں اپنے صنم کا ٹوٹا

اس کی قسمت میں ہواؤں کی رفاقت بھی نہیں
گرد بھی ہو نہ سکا، گردشِ کم کا ٹوٹا

جانے کس لمحۂ جانسوز میں ٹوٹا تجھ سے
خوب بکھرا ہے ترے رنج و الم کا ٹوٹا

وہ کوئی سانحۂ حسرتِ تعمیر نہ ہو
اب بھی محتاجِ توجہ ہے کرم کا ٹوٹا

سب نے سمجھا کہ یہ تعمیر کی منزل میں ہے
ٹوٹتا ہی رہا ہر لمحہ عدم کا ٹوٹا

■ ■

دستِ لمحات کی ضربوں سے تو پتھر ٹوٹا
لیکن اک شخص کا مجھ سے نہ تصور ٹوٹا

تجھ کو کھو بیٹھا تو پھر خود کو نہ پایا میں نے
یعنی میں ٹوٹ کے بکھرا تو مکرر ٹوٹا

اس کٹھن وقت میں بہتر ہے تو اپنے کو سنبھال
میرا کیا، میں تو زمانے میں برابر ٹوٹا

سانحہ سخت بہت سخت ہے اس شخص کا بھی
جس کی آنکھوں میں ہر اک چیز کا منظر ٹوٹا

اور رہنا ہے مجھے بھول بھلیوں میں ابھی
مجھ سے لمحوں کا نہ یہ سلسلۂ در ٹوٹا

اعتبارات میں بکھرا ہے مرا ریزۂ جسم
کس بلندی سے گرا میں کہ سراسر ٹوٹا

جبریت کی یہ دیوار نہ ٹوٹی لیکن
اہلِ جرأت کا کئی بار یہاں سر ٹوٹا

کچھ کمی رہ گئی بننے کے عمل میں شاید
کہ میں تنہا بھی بہت تجھ سے بھی مل کر ٹوٹا

ہشت پہلو سے سنوارا تھا تجھے میں نے غزل
ناشناسوں کے تصرف میں یہ گوہر ٹوٹا ■ ■

بلبلہ

حسین الحق

"بنجی! پتوں کی نہیں کھونا چاہتا ہوں۔ تم میرے ساتھ کھولتے ہوئے سمندر میں کودنے کے لئے تیار ہو؟"

"میں پہلے ہی سمجھتا تھا کہ تم یہی جواب دو گے لیکن تم نے کبھی یہ محسوس کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی کہ ہم نے اپنا کچا مکان شوقیہ مسمار نہیں کرایا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارے علاقے میں سیلاب کی یورشوں نے اپنی دکان سجا رکھی تھی۔"

اصل واقعہ یوں ہے کہ وہ میرے دونوں شانوں پہ آرام سے بیٹھا ہوا ہے۔ میں بار بار اس سے کہتا ہوں کہ میرے شانے دکھ رہے ہیں اب اتر جاؤ مگر اس اللہ کے بندے کے کان پہ جوں تک نہیں رینگ رہی ہے۔

"دیکھو! اب آگے بڑھنا ہے، اب تک تو ہم بلندیوں اور پستیوں کے درمیان رنگ برنگے محسوسات کو اپنے وجود کا ایک حصہ بنا رہے تھے مگر اب چڑھائی ہے میں زیادہ دور تک تمہیں نہیں ڈھو سکوں گا ..... اتر جاؤ..... پلیز اتر جاؤ......"

صدیوں سے یہی ہوتا آیا ہے کہ کوئی ان دیکھا، انجانا اور ان چھوا وجود نہ جانے کہاں سے پورے وجود پہ کیڑوں کی طرح رینگنے لگتا ہے۔ لاکھ کوشش کیجئے کہ کسی طرح اس کو جھٹک دیں مگر ران پہ ہاتھ ماریئے تو کمر پہ سرسرانے لگتا ہے، کمر پہ ہاتھ ماریئے تو سینے میں خارش ہونے لگتی ہے، سینے کو اپنی انگلیوں کا مرکز بنایئے تو ہونٹوں پہ کچھ مچلنے لگتا ہے....."

دیکھو! کھولتے ہوئے سمندر میں ان لوگوں نے اپنی بستیاں آباد کر رکھی ہیں۔ وہ بڑے معصوم اور بھولے بھالے لوگ ہیں۔ انہوں نے اپنے یہاں سے سمتوں کا وجود ختم کر دیا ہے اور سیاہ نقطوں کو بلبلوں کا ڈھیر بنا کر اب اس پہ انا الموں کا گیت گاتے ہیں......"

"تم کہہ دو کہ میرے پتوار شکستہ ہیں اور میں ان کے سہارے کھولتے سمندر میں نہیں کود سکتا۔"

"پتوار کی ضرورت کسے ہے؟ ہم تو یہیں سے اپنے اپنے ہاتھ کاٹ لیں گے......"

"ہاں! ہم خلاؤں پہ بھروسہ کرنے والے لوگ مٹی کے کھلونوں سے دل نہیں بہلایا کرتے۔"

"ہم جنگلوں کے سفر میں کھوئے گئے مسافر ہیں۔ اس کی باتوں پہ یقین کروگے تو رستوں کا سراغ تو الگ ایک مسئلہ ہے ہم خود اپنے آپ میں منزل بن جائیں گے۔"

میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔ وہ دن کو دور دراز علاقوں کا سفر کرتے تھے، اپنی باتیں دوسروں تک پہنچاتے تھے، پھر شام گئے واپس آتے تھے، تو ......"

"اے کمبل والے کچھ آرام بھی کیا کیجئے!"

غلط مبحث مت کرو۔ زمین کے گول ہونے کی بات زندگی کو دہرانے کا مسئلہ اور عطر کی شیشی میں پہنچانے کا کیڑا.. سب بھول چکے ہو؟"

"اف کتنی دیر ہو گئی، وہاں لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے کپڑا بدلے مجھے گھنٹوں ہو گئے اور اب تک میں نے سر نہیں جھاڑا۔"

"تو میرے دونوں قدموں کے بیچ کی زمین ...... اور میرے قدموں کے نیچے کی زمین ..... اور میرے قدموں کے دائیں بائیں کی زمین ......"

"خوشبو تو ہر طرف سے اٹھتی ہے ....."

"جنازے میں شرکت کرنا ایک سماجی خدمت ہے۔"

"امداد باہمی کا مسئلہ صرف لفظوں کی زنجیر نہیں ہماری ایک نہایت اشد ضرورت ہے۔"

"دیکھو! اب اتر جاؤ ...... پلیز اتر جاؤ .... میں واپس آکر پھر تمہیں گود میں لے لوں گا۔"

"تم باتوں کو ہوا میں اڑا نہیں سکتے دوست .... عطر کی شیشی میں پہچانے کا کیڑا ...."

"تم ..... تم گدھے ہو ..... تم ... کمینے، ظالم ہو تم چاہتے ہو کہ دو ہاتھ دس ہاتھ کو کاٹ ڈالیں! تم چاہتے ہو کہ جمود حرکت پر حاوی ہو جائے؟ تم چاہتے ہو کہ ہم دور دراز علاقوں کا سفر کر کے لنکا جائیں اور آدم کے پیروں کے نشان کو اپنے ماتھے کی زینت بنائیں جیسے وہاں کے لوگ کھرچ کھرچ کر مٹانے کی کوشش کر رہے ہیں۔؟"

"میں یہ سب کچھ نہیں چاہتا، میں نجی پرتوں کی تہیں کھولنا چاہتا ہوں ... میرے ساتھ کھولتے سمندر میں کود و!"

انکوائری .... پولیس ...... تھانہ ..... جیل ......

سزا ..... (کھڑ کھڑ کھڑ کھڑ)

دیکھو! تم تو میرے دوست ہو نا؟ کسی کو اس کا پتہ نہیں ہے، بہت دنوں سے وہ قبرستان میں میرے لئے قبروں کا انتخاب کر رہا تھا۔ پرسوں اس نے گورکن بھی بلوائے تھے۔

بزنس میں یہ سب تو چلتا رہتا ہے۔ اتنے دنوں تک وہ مجھ پر حاوی تھا آج اس کو میرے کاندھوں کی ضرورت ہے .... ہے نا؟

تو سنو! میں تم سے جھوٹ نہیں بولتا، میرا یہ کمرہ اکثر میرے لئے قبر بن جاتا ہے، ہر چہار طرف سے منکر نکیر نکلنے لگتے ہیں، جنت، جہنم، اعراف، تمام مقامات کی کھڑکیاں بیک وقت کھول دی جاتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ اسی وقت ہوتا ہے جب وہ مجھ سے کہتا ہے۔ "میں نجی پرتوں کی تہیں کھولنا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ کھولتے ہوئے سمندر میں کود و!"

میں نے وادیوں کی نرم فضاؤں کا ذکر بھی سنا ہے، اور زمین کے گول ہونے کی بات بھی، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ لوگ بڑے معصوم تھے جن میں سے کوئی اپنے کمبل میں کانٹے لپیٹ لیتا تھا اور کوئی بستر پر نیابت کرتا تھا ......"

تلوار لے کر بپھرا ہوا انسان ...... "آج اسے قتل ہی کر دوں گا ..... زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

مسئلہ تو پہلی ہی منزل سے آگے بڑھنے کا ہے۔ CONFESS کو واقعی برداشت کر لینا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں اور اسی لئے میں ہمیشہ اپنے اور دگر دسیسہ پلائی ہوئی دیوار کھڑی کئے رہتا ہوں۔

مگر ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ بضد ہے کہ "میرے ساتھ کھولتے ہوئے سمندر میں کود و۔"

جنازہ اب باہر نکل چکا ہوگا۔ لوگ یہی سوچیں گے کہ BUSINESS POINT OF VIEW سے اس کو خوشی ہوئی۔

"دیکھو! اب اتر جاؤ۔ نہیں تو ٹھیک نہیں ہوگا۔"

وہ خاموشی سے میرے شانوں پر بیٹھا اپنی انگلی سے میرے سر کے بال میرے تالو میں گھساتا رہا۔ وقت بہت ہو چکا تھا، اور اب مجھ سے غصہ برداشت بھی نہیں ہو رہا تھا اس لئے میں نے اسے دھکا دیا۔ وہ دھم سے زمین پر آ کر گرا اور میں تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلا تو یاد آیا کہ تالا کمرے میں چھوٹ گیا ہے، جلدی سے پھر کمرے میں تالا لینے گیا تو وہ مجھے دیکھ کر قہقہہ لگانے لگا۔

" آؤ گے ..... پھر آؤ گے ! "

میں نے اُسے حقارت کی نظر سے دیکھا اور تالا لے کر باہر نکل آیا لیکن کمرہ بند کر رہا تھا تو خیال ہوا کہ کچھ چھوٹ گیا ہے میں نے جلدی سے کمرے کا تالا کھولا اور اپنی چھوڑی ہوئی شے تلاش کرنے لگا مگر سب کچھ میں لے چکا تھا۔ ملتا کیا ؟

" آؤ گے ..... پھر آؤ گے ! " میں پھر جب کمرے سے نکل رہا تھا تو اس نے قہقہہ لگایا ......

میں پھر تالا بند کرنے لگا تو یاد آیا کہ سب کچھ چھوٹ گیا ہے۔ اب کے میں نے دروازے پر ہی کھڑے ہو کر پوری طرح اپنا جائزہ لیا۔ میں نے دیکھا سب کچھ میرے پاس موجود تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کچھ چھوٹ گیا ہے ...... میں بہت دیر تک دروازے پر کھڑا رہا ...... اپنی کھوئی ہوئی شے کے بارے میں یاد کرتا رہا اور وہ اندر سے قہقہہ لگاتا رہا طبیعت پر عجیب سی گرانی تھی پھر بھی میں چل پڑا ...... لیکن ہر لمحہ مجھے ایسا احساس ہوتا جیسے مجھ میں کوئی کمی ہے ..... جی چاہتا ہے کہ روؤں مگر آنسوؤں کی کمک سورج کے سائے میں سانس لے رہی تھی ۔ "

اور کسی طرح میں جب واپس لوٹا تو وہ دروازے پر بیٹھا ہوا مسکرا رہا تھا۔

اسے دیکھ کر : جانے مجھے کیا ہو گیا کہ میں اس سے لپٹ پڑا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ......

" میں تم سے الگ ہو کر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا ... میں مر جاؤں گا ...... مر جاؤں گا۔ " میں نے سسکیوں میں کہا۔

وہ آہستہ آہستہ میری پیٹھ پر اپنے ہاتھ پھیرتا رہا، پھر میری گردن میں اس نے اپنے دانت پیوست کر دیئے اور میرا خون پینے لگا ..... "

بقیہ : کھوئے ہونٹوں ......

اور ......

اور نمائش میں لگی ہوئی ایک تصویر :

تھرڈ کلاس کتابوں پر نئی اور خوب صورت جلدیں چڑھا کر صرف معصوم اور نادانوں کو بے وقوف بنایا جا سکتا ہے ۔ میں یہ سب کچھ برداشت کر گیا اور برداشت کر سکتا ہوں لیکن اسے کیا کروں کہ وہ میرے ہاتھ پکڑ کر سسک سسک کر کہتا ہے " میری راتوں کی نیند اُڑ گئی حسین ۔ اب تو جاگتے میں بھی وہ آ جاتا ہے میرے چہرے پر اپنا ہاتھ رکھتا ہے اور کہتا ہے ، یہاں کیوں ہو ؟ چلو ! "

اور جب پوچھتا ہوں " کہاں چلوں ؟ "

" تو کہتا ہے وہیں ..... جہاں ..... "

اور پھر میری آنکھ کھل جاتی ہے ۔

تو شیم ! اب تم مجھے کہاں لے جاؤ گی ؟ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ پچھلے دروازے کے شگافوں سے ہاتھ ڈال کر اگلا دروازہ کھولنے والے سے یہ اُمید کیوں رکھتی ہو کہ وہ گوشت کے لوتھڑوں کے پل کے سہارے سمندر اور ساحل کے فاصلے بھی طے کر سکتا ہے ! "

لیکن برف کے نیچے دبی آگ ......

میں یہ جملہ لکھتا ہوں

پھر کاٹ دیتا ہوں

پھر لکھتا ہوں

پھر کاٹ دیتا ہوں

پھر لکھتا ہوں

پھر کاٹ دیتا ہوں

اور یہ عمل جاری ہے ــــ !!

ندیم گویائی —— غزلیں

ٹوٹ کر اوپر سے ایسی سرزمیں پر آ پڑا ہوں
رات دن اندھے کنویں میں اپنا چہرہ دیکھتا ہوں

آسماں نے میرے سر پہ جب سے اپنا ڈنک مارا
نیلا پانی ہو کے ساری ہڈیوں سے بہہ رہا ہوں

دور ہوتے جا رہے ہیں میرے مکانات مجھ سے
دھیرے دھیرے چو طرف کی دلدلوں میں دھنس رہا ہوں

سیکڑوں آنکھیں نکل آئی ہیں اب تاریکیوں میں
بجلیوں کے تار چھو کر بلب سا میں جل گیا ہوں

--

کتنے برسوں کی تاریکیوں کا بھرم یوں کھلا ایک دن
کوئی لکڑی سا مجھ میں چٹختا ہوا جل گیا ایک دن

خود بہ خود چیخ اٹھے گا دھنستا ہوا ہڈیوں میں
ان الجھتی ہوئی دلدلوں میں ذرا کود جا ایک دن

سب طرف کے جراثیم میرے بدن میں اتر آئیں گے
میں بدلتی ہوئی ہیئتوں میں بدل جاؤں گا ایک دن

اور کب تک ہواؤں میں بہتا رہوں گا مسلسل یونہی
ان خلاؤں میں میری زمینوں کو پھر سے اگا ایک دن

--

غزلیں

شمیم احمد

کوئی پتھر ہی چلے ٹوٹتے تاروں کی طرح
ہم نے خوابوں کو سجایا ہے دکانوں کی طرح

لوگ نالاں ہیں مرا ان سے گلہ بے معنی
وہ بھی مبہوت ہیں خاموش خداؤں کی طرح

مٹتے لمحوں کی ہوں تصویر مجھے دیکھ تو لو
پھر نہ ہاتھ آؤں گا آوارہ صداؤں کی طرح

گم نہ ہو جائے کہیں قافلۂ اشک رواں
اپنے دامن پہ سجا لو انہیں تاروں کی طرح

اور کیا ہوگا بھلا طوقِ ملامت کے سوا
ہے جو گردن میں حمائل تری باہوں کی طرح

دیکھ سکتا ہی نہیں منظرِ جانکاہ شمیم
دل تو ہے نرم لچکتی ہوئی شاخوں کی طرح

علی اسد

سرسبز جھاڑ پات پہ بادل برس گئے
اک ایک بوند کے لئے ذرّے ترس گئے

کیسا عجیب واقعہ ایک بے نفس کے ساتھ
دو چار گام ساتھ ہی اہلِ نفس گئے

کیا جانے کب سے بیٹھے ہوئے تھے بھرے ہوئے
میں لب کشا ہوا تو مجھ ہی پر برس گئے

آباد اک جہاں تھا یہاں کل کی بات ہے
اے انقلاب لوگ کہاں جا کے بس گئے

مُردے پڑے ہوئے ہیں سڑک پر ادھر اُدھر
کیا فرقہ واریت کے انھیں ناگ ڈس گئے

ہم وہ نہیں کہ راحتِ دل ڈھونڈتے ہوئے
آ کر ترے خیال کی دنیا میں بس گئے

یارو تمام شہر کی رونق کو کیا ہوا
آندھی کے ساتھ اُڑ کے فقط خار و خس گئے

رہ رہ کے آج لینی ہے انگڑائی تیری یاد
آ جا کہ میری باہوں کے ہالے ترس گئے

یاروں کی بات چھوڑ اسد اپنی بات کر
حرص و ہوس کے ناگ تجھے بھی تو ڈس گئے

سعید قیس

سرزمینِ ذہن میں یہ کیسی سرگوشی ہو…
جسم باقی رہ گئے چہروں کی لو پوشی…
اس قدر پھولی پھلی ہے ذات کے صحرا میں…
اپنی اپنی آرزوؤں کی لہو نوشی ہو…
اپنی ہی تصویر سے کرتے رہے ہم گفت…
دوزخِ خلوت میں یوں خلوت فراموش…
جس جگہ یادوں کا دریا تھا وہاں اُڑتی…
بھول تو کی یاد لوٹی آرزو دوشی ہو…
چھوتے ہی جام بدن کو لڑکھڑا اُٹھے…
تیری رگ رگ میں جواں تاثیرِ مدہوشی…
اس قدر ہے حبس برگِ زیست بھی ملتے…
آرزوؤں کی ہوا قیدی خاموشی ہو…
جاوداں لمحے تھے قدرت زندگی کم…
اس بدن کے میکدے میں خوب مے نوشی…

ارتکاز

تبصرہ

کتاب کا نام ——— ارتکاز
مرتب ——— عبدالرحیم نشتر
صفحات ——— ۱۲۸
قیمت ——— ۴ روپے
ناشر: مطبوعات نشتر۔ نیا بازار۔ کامٹی (ناگپور)
مبصر ——— علی حیدر ملک

نئے شعر و ادب کے ایک "رفتار پیما" اور ایک "مجاہد" (علی الترتیب ڈاکٹر وزیر آغا اور شمس الرحمان فاروقی) کے نام معنون کیا گیا۔ مجموعہ "ارتکاز" نئی غزلوں کا انتخاب پیش کرتا ہے لیکن غزلوں کا انتخاب مرتب نے کیا ہے یا شاعر نے یہ اس سے ظاہر نہیں ہوتا ویسے قیاس یہی کہتا ہے کہ یہ کام مرتب ہی نے انجام دیا ہوگا۔ (شاعروں کا انتخاب بہرحال مرتب ہی نے کیا ہے) مجموعے میں شامل شعراء کی کل تعداد ۳۸ ہے فہرست کا آغاز وہاب دانش کے نام سے ہوتا ہے اور اختتام انور شعور کے نام پر ——— بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شعراء کے نام حروف تہجی کی معکوسی ترتیب میں دئے گئے ہیں مگر ذرا غور کرنے پر یہ راز کھلتا ہے کہ اس قاعدے کو بھی برقرار نہیں رکھا گیا۔ اب یہی دیکھئے کہ آخری نام انور شعور کا ہے جس کے قبل باقر مہدی ہیں۔ باقر مہدی سے پہلے پرکاش فکری کا نام ہے اور پرکاش سے پہلے بشیر بدر کا۔ اسی طرح شہریار سے قبل زبیر رضوی ہیں اور زبیر رضوی سے قبل شہزاد احمد۔ اس کے بعد یہ سمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوجاتا ہے کہ ترتیب کی بنیاد آخر کیا ہے۔ حروف تہجی؟ — حروف تہجی کی الٹی ترتیب؟ شاعروں کا مرتبہ؟ غزلوں کا معیار؟ — کچھ بھی نہیں —

تو پھر؟ ——— شاید مرتب کی بے توجہی یا کاتب کی مرضی — یہ بات اس لئے بھی زیادہ لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ صفحہ ۱۹ پر ممتاز راشد کی غزلیں ہیں۔ اس کے بعد صفحہ ۲۰ اور ۲۱ پر مظفر حنفی کی اور پھر صفحہ ۲۲ پر ممتاز راشد کی غزلیں نظر آتی ہیں۔ اسے محض سہو کہہ کر نہیں ٹالا جاسکتا کیونکہ اس سے آگے بھی یہی حال ہے۔ صفحہ ۶۲ پر زبیر رضوی ہیں۔ صفحہ ۶۳ اور ۶۴ پر شہزاد احمد اور اس کے بعد صفحہ ۶۵ پر پھر زبیر رضوی۔

غزلوں کی تعداد بھی معین نہیں ہے یعنی بیشتر شعراء کی چھ چھ غزلیں شامل ہیں لیکن ندا فاضلی، باقر مہدی اور انور شعور کی صرف دو دو ہیں۔ غزل کے اس انتخاب میں بعض ناگزیر اور اہم غزل نگاروں کے نام نظر نہیں آتے — مگر اس کا ذکر شاید بے جا ہے کیونکہ مرتب نے صاف طور پر اعلان کردیا ہے کہ "اگر چند اہم (یا خاص) نام کی عدم شمولیت گراں گزرے تو اسے مرتب کی کور ذوقی اور تعصب سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور یوں بھی کوئی مرتب ہر شاعر اور ہر قاری کو مطمئن نہیں کرسکتا" اب اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے؟ — اس کے باوجود کتاب میں جو غزلیں شامل ہیں ان کے مطالعے سے

جدید غزل کے حسن و قبح اور نشیب فراز کا اندازہ ضرور ہوتا ہے اس میں جہاں ایک طرف ایسے اشعار نظر آتے ہیں :

منزل تمام مار کے پتھر میں ڈھل گیا
بت اور ایک شخص کا اونچا نصیب ہوا (وہاب دانش)

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہو بدن کا رواں مشت پر میں تھا (وزیر آغا)

زنجیر کی لمبائی تک آزاد ہے قیدی
جنگل میں پھرے یا کوئی گھر بار بسا لے (ندا فاضلی)

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پہ خیال یار کی چادر ہی لے چلیں (ناصر کاظمی)

وہاں دوسری طرف اس طرح کے اشعار بھی ملتے ہیں ،

اترتا نہ علوی کبھی ریل سے
کرایا نہ لگتا اگر ریل کا (محمد علوی)

وہ اوپر سے گنجے تو بنیوان
وہ نیچے سے نکلا چیتھڑوں میں (عادل منصوری)

یہ تو خیر نئی غزل کے مختلف رنگ و رخ کی مثالیں تھیں لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جن میں زبان و بیان کی خامیاں ہی نہیں فاحش غلطیاں بھی موجود ہیں اور جن کے لئے کوئی جواز نہیں پیش کیا جا سکتا (اگر پیش بھی کیا جائے تو ادب کے طالب علم کو قابل قبول نہ ہوگا)

انسان کر رہا ہے خلاؤں میں اب سفر
رستے تمام آہٹ پا کو ترس گئے (قمر اقبال)

دھوپ کمرے میں چلی آجاتی
اپنا دروازہ کھلا ہونا تھا (عبدالرحیم نشتر)

" آہٹ پا " اور " چلی آجاتی " کا استعمال محل نظر ہے

" ارتکاز " میں غزلوں کے بعد " نئی غزل ۔ منظر اور پس منظر " کے عنوان سے بشر نواز کا ایک مضمون بھی شامل ہے جس میں انھوں نے ابتداء سے اب تک کی اردو غزل کا سرسری جائزہ لیا ہے۔ اس مضمون کی اختتامی سطریں یہ ہیں:

" اگر غور سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ موجودہ مسائل اور حالات کے ردّ عمل کے طور پر ہی ان کی شاعری میں مختلف رویئے ابھرے ہیں اور ان رویوں میں ان کی ہی افتاد طبع اور مزاج کا دخل ہے ۔ اس غم گین ، گمبھیر اور سوچتی ہوئی فضا کی تعمیر میں عالمی مسائل تو بہرحال ہیں ۔ لیکن اسی کے ساتھ ہمارے اپنے ملک کے بھی کئی مسائل گھل مل گئے ۔ ان مسائل میں فرقہ وارانہ فسادات بھی ہیں ۔ اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیاں بھی ۔ اُردو کا غیر محفوظ مستقبل بھی ہے اور لکھنے والوں کی غیر یقینی حالت بھی ۔ یہ مسائل صرف ہندوستان کے اردو شاعروں اور ادیبوں کے ہیں اور یقیناً ہماری تحریروں پر اثر انداز ہوئے ہیں ۔ میں کتابوں میں لکھے ہوئے مسائل اور عالمی پیمانے پر ہونے والی شکست و ریخت کی اطلاعات سے ان باتوں کو زیادہ اہم سمجھتا ہوں اور ہندوستانی غزل میں پائی جانے والی غم گین فضا ، دُکھے ہوئے لہجے ، خوف و تحیر اور اس کے ردّ عمل کے طور پر جھنجھلاہٹ ، بیزاری اور اپنے آپ سے اُلجھنے کے انداز کا

جواز اپنی حالات میں پاتا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ آج کی ہندوستانی غزل میں وہ اعتماد، بلند آہنگی، یقینی لب و لہجہ اور زندہ دلی کی کیفیت نہیں ملتی جو پاکستانی غزل میں پائی جاتی ہے میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اچھی غزل کی وہی خصوصیات ہیں جو پاکستانی غزل میں پائی جاتی ہیں۔ صرف میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ آج کی ہندوستانی غزل کی فضا اور لہجہ ہم عصر پاکستانی غزل سے مختلف ہے اور یہ اختلاف دو علیحدہ علیحدہ ملکوں کی سیاست، سماجی حالات اور موجودہ صورت حال کا پیدا کردہ ہے۔ یہاں میں یہ بھی نہیں کہہ رہا ہوں کہ کسی بھی ملک کا ادب عالمی مسائل سے یا مشترکہ انسانی نفسیات سے یا عام عالم انسانی پر پڑنے والے اثرات سے بے نیاز ہو کر صرف اپنے جغرافیائی حدود کا اسیر ہوتا ہے لیکن اس بات پر ضرور زور دے رہا ہوں کہ ہر ملک کے ادب پر اس کے اپنے مسائل، قومی مزاج اور انداز فکر کا نمایاں اثر پڑنا لازمی ہے اور یہ اثر دیگر اثرات کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ اس کلیئے سے ہمارا ادب یا ہماری موجودہ غزل مستثنیٰ نہیں۔ اس لئے ہندوستان کی نئی غزل پاکستانی غزل سے بہرحال مختلف ہے اور اس کا مختلف ہونا ناگزیر ہے۔ البتہ یہ صورت حال ان لکھنے والوں کے پاس نمایاں ہے جو فن کو اپنے طور پر برتتے ہیں اور اسے واقعی اپنی ذات کے اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں۔ محض نقالی کرنے والوں کی بات جانے دیجئے کہ اس قسم کے حضرات کی تحریروں کی بنیاد پر ادیب کے مزاج کا تعین نادانی کہلاتا ہے۔"

ان سطور کو پڑھنے کے بعد یہ سوال بار بار سر اٹھاتا ہے کہ جدید شاعری خصوصاً غزل میں سہل پسندی، تکرار، بے جا ابہام اور بے حسی کی کیفیت آخر کیوں اور کیسے پیدا ہوگئی۔ (شاعری بہرصورت خیال کی، خواہ وہ جیسا بھی ہو، ترسیل کا ذریعہ ہے اور اس کی اپنی فنی اور جمالیاتی قدریں ہیں) اس کے علاوہ بشر نواز نے جس کلیئے کا ذکر کیا ہے، اس کی روشنی میں پاکستان کی شاعری کا مطالعہ بھی اس رائے سے دلچسپ اور مفید ہوگا کہ پاکستانی شاعری پر اس ملک کے حالات و مسائل نے اپنا عکس ڈالا ہے یا نہیں؟

کتاب میں کتابت کی غلطیاں جا بجا موجود ہیں۔ چھپائی بھی ادنیٰ قسم کی ہے اور اس لحاظ سے اس کی قیمت زیادہ ہے۔ [ویسے تبصرے میں قیمت کا ذکر کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ کتابیں خرید کر پڑھتا ہی کون ہے؟ قیمت کم رکھی جائے یا زیادہ دونوں کا انجام ایک ہی ہوتا ہے]

سواد وصوت

قارئین

نسیم محسن چاند، موتیہاری

آہنگ کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ قمر اعظم ہاشمی کا مضمون "موضوع کی تلاش" حاصل رسالہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس طرح کے مسائل پر کھل کر اور ایمان داری کے ساتھ گفتگو کی جائے ۔۔۔۔۔"بات یہ ہے کہ فن کار کے لئے خاموش رہنا تو تکلیف دہ ہے مگر جھوٹ بولنا انتہائی شرمناک ذلت" ان کا یہ جملہ بہت قیمتی ہے۔ فن کار کبھی مصلحت کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔ یہ کام تو سیاست دانوں کا ہے۔ مگر اردو ساُل پڑھنے والا اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ مصلحت چور دروازے سے شہرت یافتہ فن کاروں کے کمرے میں بھی کبھی اپنا روپ بدل کر اور کبھی بالکل برہنہ ہی گھس جاتی ہے، خاص طور پر ان دنوں جب سارے لوگ نشے کی حالت میں ہوتے ہیں اور عام لوگوں کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے۔

علی حیدر ملک کا مضمون "احمد یوسف کے افسانے" بہت مختصر اور تشنہ ہے۔ احمد یوسف ایسے افسانہ نگار پر سیر حاصل مضمون کی ضرورت ہے۔

شبیر احمد کا افسانہ "نکیل آقا کے ہاتھ میں تھی" ایک اچھا افسانہ ہے۔

فاروق شفق، کلکتہ

تازہ شمارہ بس ابھی ملا ہی ہے اس لیے مشمولات کی تمام چیزیں ابھی نہیں دیکھ پایا ہوں۔ منظومات کا حصہ بھی سرسری ہی دیکھ سکا ہوں۔ نظموں میں شاہد احمد شعیب کی نظم خاص توجہ چاہتی ہے۔ واقعی بڑے معرکے کی چیز ہے بقیہ نظمیں بھی اچھی ہیں۔ غزلوں میں زیب غوری کی غزل نے خاصا مایوس کیا۔ انھوں نے ادھر جو اپنا ایک معیار اور انداز بنایا ہے اس سے قطعی یہ الگ ہے۔ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اچھا اور خراب مال چھانٹ چھانٹ کر الگ رکھتے ہوں اور انھیں مناسب موقع محل کے اعتبار سے استعمال میں لاتے ہوں۔ ظہیر صدیقی کی غزلیں البتہ بہت خوب اور بھرپور ہیں۔ ارمان کی تینوں غزلوں میں پہلی زیادہ کامیاب ہے۔ بقیہ غزلیں گوارا بھی جا سکتی ہیں۔

سُلطان اختر، پٹنہ

آہنگ کے شمارے ۲۱-۲۲ میں پرکاش فکری کا آخری صفحہ بشیر بدر کی غزل اور شوکت حیات کا تفصیلی مطالعہ اہم ہے انور سجاد، خالدہ اصغر اور مین را سے قریب ہوتے ہوئے بھی شوکت حیات نے اپنی الگ راہ بنائی ہے۔ آہنگ میں شامل ان کی تمام کہانیاں نئے راستے اور نئی منزل کا پتہ دیتی ہیں۔

ہرچند ان کی سوچوں کا محور بھی آج کے دیگر فن کاروں کی طرح انتشار لاحاصلی، غیر محفوظیت اور بے سمتی ہے، لیکن ان کا اسلوب سب سے الگ سب سے نیا اور سب سے منفرد ہے

مجھے امید ہے کہ شگاف، دراڑ اور ہوا کا مسافر "جو قطبین کے بیچ ہواؤں کی زد میں" جھلس رہا ہے۔ "دو دائرے کے دو کنارے" توڑتا ہوا سبز منڈیر پر سیاہ کبوتر

کے شہر میں بھی اپنی تلاش جاری رکھے گا اور یوں آگے بڑھتا ہوا
اپنے انت سفر کو انست بنائے گا ۔

احمد یوسف ، پٹنہ

خصوصی مطالعے کا سلسلہ بہت خوب ہے کہ اس سے
نئے لوگوں کے متعلق رائے بنانے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے
علی امام ، انور خاں ، شمس ندیم اور اب شوکت حیات
ع خدا کرے نہ تھکیں حشر تک جنوں کے پاؤں
شوکت حیات کی کہانیاں پسند آئیں خصوصیت کے
ساتھ "سبز منڈیر سیاہ کبوتر"۔ ان کے یہاں علامتوں میں
ایک آہنگ ، ایک باہمی ربط ملتا ہے اور وہ ایک بڑے
موضوع کو بڑی کامیابی سے اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں ۔
شوکت حیات اپنی ایک الگ راہ نکالنے کی شعوری
کوشش کر رہے ہیں ۔ ان کے دل میں سیکھنے سکھانے کا جذبہ
اور خوب سے خوب تر کی منزل کی تڑپ ہے اور جب صاحب
فن میں یہ باتیں پیدا ہو جاتی ہیں تو ہم ایک روشن مستقبل کی
سمت دیکھنے لگتے ہیں ۔ میری طرف سے انہیں دلی مبارکباد
پیش کر دیں ۔

شبیر احمد ، پٹنہ

آہنگ کا شمارہ (شوکت حیات کا خصوصی مطالعہ)
نظر نواز ہوا تھا ، نئی پود کے جو دو چار لکھنے والے ہیں
اُن میں شوکت حیات سب سے تیز رو ، تیز فہم ، تیز قلم اور
باشعور افسانہ نگار ہے ۔ وہ افسانے کے خد و خال ، نشیب و
فراز اس کی پیچیدگیوں اور جدید تکنیک سے شعوری طور پر
باخبر ہے ۔ اس کی لانبی لانبی انگلیاں لیلیٰ افسانہ کے خم و پیچ
سلجھانے میں منہمک ہیں ۔
شوکت حیات کی کہانیوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے
کہ افسانہ نگار اپنے دلی جذبات اور کیفیات کے اظہار میں
منصفانہ اور ایماندارانہ رویے کا قائل ہے ۔ یہی کمی مجھے اس کے
ہم عصر دوسرے نئے افسانہ نگاروں میں نظر آتی ہے ۔
حیات (اپنی کہانیوں کی روشنی میں) شاید اس لئے نہیں
لکھتا کہ وہ بہت پڑھا لکھا آدمی ہے ، اور دوسروں پر اپنی
صلاحیت اور علمیت کی دھونس جمانا چاہتا ہے وہ اس
لئے بھی نہیں لکھتا کہ وہ لکھ سکتا ہے ، وہ اس لئے لکھتا ہے
کہ لکھنا اس کی مجبوری ہے اور اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا
شوکت اپنے "میں" کے کرب سے پوری طرح آگاہ
ہے ۔ اور یہ کرب قریب قریب اس کی تمام کہانیوں میں
نظر آتا ہے ۔ حیات ـــ اپنی بعض کہانیوں میں غیر طبعی فضا
بھی قائم کی ہے (کہانی بعنوان "شگاف ، دراڑ ، خلا ،
ہوا") یہ ایک بڑا ہی خوشگوار اور اچھوتا تجربہ ہے ۔
اس کہانی کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری نظروں نے
جن چیزوں کو اب تک دیکھا تک نہیں وہ چیزیں ایک ایک
کر کے ہمارے سامنے سے گزر جاتی ہیں اور اپنا نقش چھوڑ
جاتی ہیں اور تب ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو ہماری زندگی کا
بڑا اہم حصہ ہیں ۔ ہم اب تک اُن سے غافل کیسے تھے "شگاف"
، "خلا" ، "دراڑ" اور "ہوا" ۔ بظاہر کسی اچھی کہانی کا
پلاٹ نظر نہیں آتے ، مگر حیات نے ثابت کر دیا ہے کہ
اس طرح کی چیزیں بھی کہانیوں کا پلاٹ بن سکتی ہیں ۔
حیات کی ایک دوسری کہانی "بکسوں سے دبا آدمی"
نہ صرف یہ کہ اس کا اپنا کرب ہے بلکہ اس معاشرے کے لاکھوں
اور کروڑوں انسانوں کا کرب ہے ۔ اگر فن کار با شعور ہے تو وہ
SUBJECTIV کہانی کو اس انداز سے پیش کرتا
ہے کہ SUBJECTIVITY کے باوجود کہانی
OBJECTIVE ہو جاتی ہے ۔
شوکت حیات کی کہانیوں میں بیک وقت
شعوری رَو ، تجریدی اور علامتی رجحانات کے اثرات اس کی
انفرادیت کے ساتھ حقیقی رنگوں میں ملتے ہیں ۔ پھر بھی مختلف

رجحان کے تحت اس کی کہانیوں کو یوں تقسیم کیا جاسکتا ہے،
"قطبین کے بیچ، ہواؤں کی زد میں" اور "پنڈولم" میں
تجریدیت نمایاں ہے۔ "بکسوں سے دبا آدمی" اور "سبز
گنبد پر سیاہ کبوتر" علامتی کہانیاں ہیں۔ "میں، تم، وہ میں"
اور "دائرے کے کنارے" شعوری رَو کی تکنیک پر لکھی
ہوئی کہانیاں ہیں اور کامیاب کہانیاں ہیں، شعوری رَو
کی تکنیک کو برتنا بڑا مشکل فن ہے۔ بعض بڑے افسانہ نگار
اس انداز کی کہانی لکھنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔

شوکت حیات کا باغیانہ رویہ، جھنجھلاہٹ (جو
معاشرے کی دین ہے) اور تجسس اپنی بھرپور شدت کے ساتھ
ہر جگہ نمایاں ہے۔ نامعلوم کرب اور نامعلوم شے کی تلاش
اُسے ہر سمت بھٹکاتی ہے۔ نتیجے کے طور پر وہ لاسمتی کا شکار
ہوجاتا ہے۔ مگر اس کی اس لاسمتی میں بھی نقوش صاف
نظر آتے ہیں۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے بہرحال یہی لاسمتی
سمت میں تبدیل ہوجائے گی۔ مجھے اس کا یقین ہے، کیونکہ
میں "لا" کے وجود کا سرے سے قائل نہیں۔

شوکت حیات کی سوچوں اور کہانیوں کی تہ در تہ معنویت
کی (KEY) اس کی کہانیوں کے مخصوص الفاظ ہیں،
جنھیں سمجھے بغیر قاری حیات کے تخیل کی گہرائی تک نہیں پہونچ
سکتا، مثال کے طور پر اننت، دراڑ، ہوا، خلا، شگاف
وغیرہ وہ الفاظ ہیں جنھیں حیات نے نئے پیراہنِ معنی عطا
کئے ہیں۔

شوکت حیات اپنے عہد کا وہ اُبھرتا ہوا ایسا افسانہ
نگار جو کچھ کہنے سے پہلے "بے نام نسل" کی بنیاد ڈالتا ہے
(جیسا کہ اس نے "میں کے تعارف" میں لکھا ہے) اور
پھر ان ہم عصروں کو آواز دیتا ہے جنھوں نے اس طرح جدید
اور قدیم ادبی قبرگاہوں سے بہت آگے اپنے اننت سفر کی
ابتداء کی ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ "بے نام نسل" کا یہ پہلا فن کار اپنا
افسانوی سفر جاری رکھے گا۔ وہ ابھی افسانہ لکھتا ہے
اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ اگر اس کا سفر جاری رہا،
تو میری آنکھیں اس زمانے کو دیکھ رہی ہیں جب وہ اپنی منزل
کو پائے گا، اور تب وہ ایک افسانہ نگار کہلائے گا نہیں بلکہ
بڑا افسانہ نگار کہلائے گا۔ میری دعائیں شامل حال ہیں

ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

احمد تبسم، پٹنہ

شوکت حیات کی کہانیوں سے اُردو فن میں ایک
نئے رجحان کی ابتدا ہوتی ہے "بے نام نسل" وہ اپنے
انتساب میں .....

"ان ہم عصروں کے نام جنھوں نے میری طرح جدید
و قدیم ادبی قبرگاہوں سے بہت آگے اپنے اننت سفر کی
ابتدا کی ہے ..... وہ نسل جو بے نام ہے۔"

اس دعوے کے پیشِ نظر شوکت حیات کی کہانیاں
پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا پڑا ہے کہ اب تک کے بنائے گئے ادبی
سانچوں سے انحراف کرنے والا ایک ذہین افسانہ نگار اردو
ادب میں جنم لے چکا ہے۔

شوکت حیات کی چھ کہانیوں میں سے کسی بھی کہانی
کو دوسرے درجے کی کہانی نہیں کہا جاسکتا۔ کہانیوں کے
اس بہترین انتخاب کے لئے "آہنگ" یقیناً مبارک باد
کا مستحق ہے۔

شوکت حیات کی کہانیاں ان کی پچھلی کہانیوں کا
اننت سلسلہ ہیں بقول فن کار "خلا، شگاف، دراڑ، ہوا"
وغیرہ نے لفظ اننت کو جنم دیا ہے۔ ایک نیلا غیر مرئی دھاگا
ان کی ساری کہانیوں میں ایک تسلسل پیدا کرتا ہے۔ وہ
دراصل لامحدودیت کا ہی دھاگا ہے جسے انھوں نے اننت
کا نام دیا ہے۔

عرفانِ ذات اور تقسیمِ ذات کی اُلجھنیں ان کی کہانیوں
کو جہاں ایک طرف حسن بخشتی رہیں وہاں دوسری طرف ان
کے فن کی انفرادیت اجاگر کرتی رہیں۔ ایک 'میں' کے اندر
ہی سارے PERSONS اپنا الگ الگ وجود رکھتے ہیں
اس کے باوجود بھی ایک ہی رہیں۔ اس 'میں' کے اندر
ساری کائنات ڈوبتی اور ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس
طرح شوکت حیات کا 'میں' بسا اوقات پوری کائنات
ہے اور یہ 'میں' کی عظمت ہی نہیں بلکہ شوکت حیات کے
فن کی عظمت بھی ہے۔

شوکت حیات کی داخلیت پسندی چونکہ مخلص اور
سچے اظہار کا وسیلہ ہے اس لئے اس میں فیشن نام کو بھی نہیں
ہے، اسی اظہار کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے مختصر عرصے میں اپنا
ایک طرز پیدا کر لیا ہے۔ اور جدید افسانوی ادب میں ایک
نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔

ساغر زیدی، دھلی ——

شوکت حیات کی چھ کہانیاں پڑھیں۔ "میں کا تعارف"
پڑھا اور انتساب کا یہ اعلان بار بار پڑھا:

"ان ہم عصروں کے نام جنھوں نے جدید و قدیم
ادبی قبرگاہوں سے بہت آگے اپنے انت
سفر کی ابتدا کی ہے۔ وہ نسل جو بے نام ہے۔"

شوکت حیات کا یہ اعلان بے نام نسل اپنے طرز کا پہلا اور بہت
خوب اعلان ہے۔ سریندر پرکاش، بلراج مینرا، غیاث
احمد گدی، انور سجاد وغیرہ کے بعد سامنے آنے والوں کی بھیڑ میں
شوکت حیات وہ پہلا افسانہ نگار ہے جس نے مجھے بہت
زیادہ متاثر کیا۔ "شگاف، دراڑ، خلا، ہوا" (آہنگ
شمارہ نمبر ۲۱) "قطبین کے بیچ ہواؤں کی زد میں" اور "سبز منڈیر
سیاہ کبوتر" وغیرہ کہانیوں کی روشنی میں اگر جائزہ لیا جائے
تو یہ کہانیاں ہر لحاظ سے اردو افسانوی ادب میں اضافے کی
حیثیت رکھتی ہیں۔ شاید غیر مرئی شے کو کردار عطا کرنے والا
یہ پہلا فنکار ہے۔ کم از کم میں نے تو اب تک اس طرح کی
کہانیاں نہیں پڑھیں۔ یہ جان کر سر فخر سے بلند ہو گیا کہ شوکت
حیات کی پیدائش دہلی میں ہوئی ہے۔

شوکت حیات کی ساری کہانیوں میں انہیں کی پیش
کردہ بے نام نسل کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ جہاں تک
میرا خیال ہے شوکت حیات کی بے نام نسل سے یہی مراد
ہے کہ وہ نسل جس نے ترقی پسندوں ہی سے نہیں بلکہ نام
نہاد جدیدیوں کے فرسودہ اثرات سے بھی پیچھا چھڑا لیا ہو
یہ صحیح جدیدیت کی توسیع کا ایک اہم قدم ہے۔

مہدی حسن، لکھنؤ ——

شوکت حیات کی بعض کہانیوں کے ابہام سے اختلاف
رکھنے کے باوجود میں ان کی بھرپور صلاحیتوں کا ذکر کئے بغیر
نہیں رہ سکتا۔ آہنگ میں چھپی ہوئی ان کی کہانیوں میں
کیفیاتی عنصر فلسفیانہ اور فلکیانہ رنگ میں بہت نمایاں ہے
اور اگر ان کی ساری کہانیوں کو "کیفیت ایک" "کیفیت دو"
"کیفیت تین" ...... وغیرہ کے عنوان سے یاد کیا جائے تو
بے جا نہ ہوگا۔

"شگاف، دراڑ، خلا، ہوا" (جب کیفیتوں نے
قیدی بنایا) سے لے کر "قطبین کے بیچ ہواؤں کی زد میں"
تک ساتوں کہانیوں میں ان کی انفرادیت نمایاں ہے میری
حقیر رائے میں اگر شوکت حیات اپنی کہانیوں کے مجموعے کا
نام "شگاف، دراڑ، خلا، ہوا" یا "بے نام نسل"
رکھیں تو بہتر ہوگا کیونکہ بے نام نسل کی دریافت بھی انہی کی
ذہانت کا اٹوٹ حصہ ہے۔

احتشام اختر کا مضمون ناپختہ قلم کی پیداوار ہے
بشیر بدر کی غزل پیاری ہے۔ پرکاش فکری کے آخری صفحہ
کے سلسلے کو جاری رکھئے۔

غلام محمد خان، کلکتہ ــــــــــــــ

اُبھرتی ہوئی بے نام نسل کے سب سے ذہین اور منفرد افسانہ نگار "شوکت حیات" کی چھ کہانیاں میرے سامنے ہیں۔ ان سب کہانیوں میں فن کار نے بنے بنائے سانچوں سے گریز کرتے ہوئے مختلف غیر واضح، مبہم اور نئے سلیقے بنائے ہیں لیکن رویئے اور حس کی ایک ایسی پتلی ڈور ہے جو چھ کہانیوں کے درمیان ایک CHAIN بناتی ہے اور یہ CHAIN کا بنا اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے بہت کم مدت میں اپنا اسٹائل پیدا کر لیا ہے جبکہ اپنا منفرد اسٹائل پانا برسوں کی ریاضت کے بعد نصیب ہوتا ہے۔ اور اس بات کی بھی دلیل ہے کہ شوکت حیات کے یہاں باضابطہ MATURED THINKING PROCESS کا ایک کام کر رہا ہے جو اس بے تسلسلی اور "شگاف، دراڑ، خلا، ہوا" (آہنگ فردی) کے درمیان ایک تسلسل قائم کرتا ہے۔

لطیف الرحمٰن، کلکتہ ــــــــــــــ

شوکت حیات کی چھ کہانیوں کی مخصوص طلسماتی فضا، دھواں دھواں سا احساس، ٹوٹا اور جھنجھلایا ہوا باغیانہ لہجہ اُردو افسانوں میں ایک نئے رجحان کی ابتدا کرتا ہے جسے بقول خود فن کار (شوکت حیات) فی الحال "بے نام نسل کے بے نام رجحان" کے طور پر ہی یاد کیا جا سکتا ہے۔

شوکت حیات کا یہ انتساب کہ — "ان ہم عصروں کے نام جنہوں نے میری طرح جدید و قدیم قبر گاہوں سے بہت آگے اپنے انتت سفر کی ابتدا کی ہے .... وہ نسل جو بے نام ہے" — اردو افسانوں میں ایک نئے بے نام عہد کے آغاز کا اعلان ہے۔

احمد حسین آزاد، گیا ــــــــــــــ

شمارہ ۲۱، ۲۲ کا شوکت حیات انسان ہے، آج کا انسان۔ آج جو روپ بدلے کل بھی تھا، آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ آج کا انسان جو ٹوٹ چکا ہے، بکھر چکا ہے ٹوٹتا اور بکھرتا رہے گا۔ حیرت تو اس پہ ہے کہ وہ اتنا سمٹ بھی چکا ہے کہ بکھرنا مشکل ہے۔ آج کا ٹوٹا، بکھرا ہوا اور بے چہرہ انسان قطبین کے بیچ ہواؤں کی زد میں ہے۔ ذرا سی لغزش اس کے توازن کو بگاڑ کر رکھ دے گی۔ سر کے جانے انجانے بکسوں کے بوجھ سے ہر شخص کو بڑا، بونا اور غیر متوازن نظر آتا ہے۔ ایک ہی "میں" پر کئی چہروں کا نقاب آج کے انسان کا ایک بڑا المیہ ہے۔ چہروں کی بھیڑ میں چہرہ کی شناخت ایک مسئلہ ہے۔ بیشتر فارمولے غلط ثابت ہو چکے ہیں، پاؤں بھی زمین چھوڑ چکے ہیں۔ منزلوں کا وجود وہم و عدم کی وادیوں میں کھو چکا ہے۔ ہکا بکا انسان راستوں کو تک رہا ہے اور بڑھ رہا ہے، بے نام نسل، بے نام منزل کی طرف گامزن ہے۔ اسی آج اور انسان کی کہانی شوکت حیات کے فن کا موضوع ہے۔ آج کا انسان پوچ پوچ مسائل کے درمیان گھر کر پوچ پوچ ہو کر رہ گیا ہے۔ پوچ پوچ موضوع کے ساتھ پوچ پوچ برتاؤ کو شعوری اور غیر فطری نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ الہامی کیفیت کو فن کا روپ بخشنے میں فن کار کو جگر کاوی سے کام لینے اور تخلیقی کرب سے گذرنے کی ضرورت نہیں۔

۱۹۶۰ کے بعد کے نئے افسانوں کا جائزہ لینے کی صورت میں شوکت حیات کے افسانوں کو ترسیل و ابلاغ کے معاملہ میں بلراج مین را، احمد ہمیش اور غیاث احمد گدی احمد یوسف کے افسانوں کی درمیانی کڑی سمجھنا چاہیے۔ نئے افسانوں کے باب میں بلراج مین را، احمد ہمیش، سریندر پرکاش غیاث احمد گدی، کلام حیدری، احمد یوسف اور شفیع جاوید کے بعد شوکت حیات کا نام ضرور لیا جائے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان فن کاروں کے مقابلہ میں فن پر شوکت حیات کی گرفت کچھ ڈھیلی ہے۔ شوکت حیات کے پاس اسلوب اور بہتر اظہار بیان

یں، مواد بھی ہے۔ اس شمارہ میں شامل ان کے افسانوں
ہانی پن بھی ہے اور " بجھوں سے دبا آدمی " کے علاوہ
انوں میں وحدت تاثر پیدا کرنے میں وہ کامیاب بھی
۔ " بجھوں سے دبا آدمی " کے آخری حصہ کے غیر ضروری
رضاحتی جملے حذف کر دئے جائیں تو اس شمارہ کے
ے افسانوں کی طرح فن کی کسوٹی پر یہ افسانہ بھی پورا
سکتا ہے۔ " میں کا تعارف " میں ان کا توانا اور مواد
زاران کے مستقبل کی تابناکی کے لئے اندیشناک ہے۔

بقیہ: ..... اسٹرن کے ...

کانہ حقائق پر مبنی تھے۔ (یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے
ں ناول کے روسی ترجمے میں اصل ناول کی تمام اسلوبی
صیات موجود ہیں) چونکہ موجودہ دور کے تسلیم شدہ ماہر
SERGEI EISENSTEIN نے بھی اپنی
یفوں میں ایسے ابواب سے حوالے نقل کئے ہیں۔

اسٹرن آج بھی ہمارے اسکالروں کی دلچسپیوں
کا مرکز ہے۔ اور نہ صرف انگریزی ادب پر لکھی گئی کتابوں
اس کے تذکرے ملتے ہیں بلکہ ٹالسٹائی اور RABELAIS
ئی نئی کوششوں میں بھی اس کا خاصا تذکرہ آتا ہے۔
TRISTRAM SHANDY کے بدخواہوں نے تو
لغو ثابت کرنے کی بڑی کوششیں کیں مگر آج یہ کتاب
ناقابل فراموش اور زندہ جاوید ناول ہے ——
FRANKOVSKY کے ترجمے کے دیباچے میں
ں ناول کی جو تعریف بیان کی گئی ہے، کس قدر بجا ہے:

" اپنے وجود کے تقریباً دو صدیوں بعد بھی
اس ناول میں وہ بھرپور تازگی موجود ہے
جو صرف عالمی ادب کی اعلیٰ ترین تخلیقات
میں ہی پائی جاتی ہے — "

●●

بقیہ: میری تمہاری کہانی

میں کسی طرح نیچے اوپر گرتا ہوا دروازے تک آتا ہوں
سامنے شور مچاتا سمندر ہے اور ٹپ ٹپ گرتے ہوئے بارش
کے قطرے اندر بھی پانی باہر بھی پانی .... میں کیا کروں؟
ساحل کی ملگجی روشنی میں سمندر کے سینے پر یونہی نظریں
دوڑا رہا ہوں۔

اور اچانک نظریں روشنیوں کے سہارے ٹھٹھک
جاتی ہیں۔

ایک لاش بہتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔
میں تمہارا قرض کب چکا سکوں گا؟ ...... کیسے چکا
سکوں گا؟

میں اپنی پیشانی پہ نمی محسوس کر رہا ہوں۔
محسوس کرتا رہوں گا ......
لیکن نسیم! اگر لاش یونہی بہتی رہی تو .... ؟ ... تو ... ؟
تو ...... ؟ ؟

▬▬

آخری صفحہ

پرکاش فکری

جب ہم نے مشینوں سے دوستی کی اور جب اس دوستی ہی کو سب کچھ جانا اور جب مشینوں کا سہارا ہی ہمارا سب سے بڑا سہارا بن گیا، تو ہم سے ہمارے بہت سے پرانے دوست دامن کش ہو گئے اور بچھڑ گئے۔ اور ہم میں مشینوں کی واحد خصوصیت یعنی اُن کی بے حسی سرایت کرتی گئی۔ اور بے حسی موت کا دوسرا نام ہے۔ یہ موت ہم نے جان بوجھ کر قبول کی کہ دراصل ہمیں اس موت کی نہیں بلکہ زندگی کی جستجو تھی۔ زندگی کو زیادہ سے زیادہ قابل برداشت اور خوشگوار بنانے والے وسیلوں کی تلاش تھی۔ لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ ہم وہی پائیں جو ہم ڈھونڈتے ہیں۔ موتیوں کی تلاش میں اکثر سنگ ریزے ہی ہاتھ لگتے ہیں اور یہی کچھ اس عمل میں بھی ہوا۔ ہم نے سوچا تھا کہ مشینیں ہمارا دکھ درد بانٹیں گی ہمارے کندھوں پر پڑے ہوئے بوجھ کو ہلکا کریں گی۔ اور اس طرح ہم شاید اس نشاط اور اس کیف سے ہم کنار ہو سکیں گے جس کی تلاش میں ہم ازل سے سرگرداں ہیں۔ ازل سے مصائب کے صحرا کی دھول پھانک رہے ہیں تو ہوا یہ کہ ہم نے مشینوں سے دوستی کر لی۔ اس دوستی نے ہمارا دائرۂ عمل تو پھیلایا۔ ہمیں برق رفتاری بخشی۔ ہمارے ارادوں کو مہمیز ملی۔ مگر اس سفر میں اس تیز گامی میں ہمارا بہت کچھ پیچھے چھوٹ گیا۔ اور کسی عزیز شے کا چھوٹ جانا یا کھو جانا ہمیشہ دردانگیز ہوتا ہے۔ یہ سرمایہ جو ہم نے کھویا وہ کچھ ایسا ویسا نہ تھا کہ جس کی تلافی آسانی سے ہو جاتی۔ ہم نے اس تیز گامی میں اپنا احساس دردمندی کھو دیا۔ اپنا وہ احساس مروت کھو دیا جو ہمیں ایک دوسرے کے قریب لاتی تھی۔ یہ دوسرے جن کی قربت کے ہم محتاج تھے وہ صرف انسان ہی نہیں تھے۔ قدرت کے مناظر بھی تھے۔ موسموں کی رنگارنگی بھی تھی اپنے اونٹوں، گھوڑوں، بیلوں اور بھیڑوں کی محبت بھی تھی کہ یہ ہمارے ساتھی اور ہم سفر تھے۔

مگر مشینوں پر انحصار نے ہمیں ان سب سے بے نیاز کر دیا۔ اور ہم بھی رفتہ رفتہ اس سرد مہری کا شکار ہوتے گئے جو سرد مہری صرف مشینوں ہی کا حصہ ہو سکتی ہے۔ کسی ذی روح کا وہ حصہ نہیں بن سکتی۔

ہم اس دَور سے بھی گزرے اور آج بھی دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ اسی دَور میں ہے جہاں آدمی اور جانور اور فطرت کا تکون قائم ہے۔ مگر ہم ایسے لوگوں کو جو آج بھی آدمی اور جانور اور فطرت کے باہمی رشتے پر یقین رکھتے ہیں، کمتر سمجھتے ہیں کہ وہ ابھی مشینوں کی دوستی اور دوستی سے بڑھ کر غلامی کا دم نہیں بھرتے۔ مگر سچ پوچھا جائے تو یہ نئی نئی دوستی ابھی تک اس پرانی دوستی سے محرومی کے زخم کو پورے طور پر مندمل نہیں کر سکی ہے۔ بلکہ کچھ ایسا ہو رہا ہے کہ بے نشان منزلوں کی سمت ہم جتنا آگے بڑھتے ہیں ہمیں پچھلے سفر کے مناظر اور رفاقتیں پیچھے مڑ کر دیکھنے پر اتنا ہی مجبور کرتی ہیں۔

اور مراجعت کی خواہش بار بار اس نئے سفر کی لگن میں آڑے آتی ہے۔ یہ آڑے آنا کسی رقابت یا دشمنی یا بدخواہی کی بنا پر نہیں بلکہ یہ مراجعت کی خواہش اس مہربان اور شفیق باپ

کی طرح ہے۔ (خطرات سے آگاہی کا عمل ہے) جو اپنے بیٹوں کو انجان پانیوں میں کشتیاں ڈالتے ہوئے بے بسی سے بس دیکھتا ہے۔ کچھ کر نہیں پاتا۔ روک نہیں سکتا۔

مگر ہم نے مشینوں پر بھروسے میں خطرات کو ہمیشہ لابدی جانا۔ اور اپنے دل میں اس عقیدے کو پناہ دینے میں کوئی جھجک نہیں محسوس کی کہ مشینیں جب روح کی موت کا باعث بن سکتی ہیں تو جسم کی موت کی کیا قیمت اور کیا اہمیت۔ اس لئے اب کوئی ایسا حادثہ جو ان مشینوں کی دین ہوتا ہے ہم پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ ہم نے اسے روزمرہ کی چیز سمجھ لیا ہے اور روزمرہ کی چیزوں پر کون توجہ دے کہ اس توجہ کا کوئی فائدہ بھی تو نہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ویت نام کا المیہ بھی ماسکو اور پیکنگ اور دنیا کی دوسری راج دھانیوں میں خوش اخلاق کے رنگ میں ذرا بھی بھنگ نہیں ڈالتا۔ اس ساری بے حسی ساری بہیمیت اور ساری بربریت پر اگر کسی کی آنکھیں روتی ہیں تو صرف فن کار کی، جین فونڈا کی جو بار بار اپنے ملک کے قاتل سپاہیوں کو اس قتل سے باز آنے کی تلقین کرتی ہے۔

قتل خود ایک بڑا جرم ہے مگر اس جرم سے بھی بڑا جرم قتل سے لاتعلقی کا اظہار ہے اور ہم اسی لاتعلقی کے شکار ہیں اور اس جرم کو ہوا دے رہے ہیں۔ مگر فن کار کبھی اس جرم سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کے اندر کی معصومیت ابھی فنا نہیں ہوئی ہے اور نہ فنا ہوگی۔ وہ ابھی تک حسن فطرت اور انسانی رشتوں کی جادوگری کا قائل ہے اس ساری مشینی کھڑ کھڑ میں صرف اس کے سینے میں محبت کی شعاعیں روشن ہیں۔ اور صرف اس کی آنکھوں میں دردمندی کے سورج کی کرنیں ہیں۔ اگر یہ دنیا فن کاروں سے خالی ہو جائے اور معصومیت کی یہ آخری پناہ گاہ بھی ختم ہو جائے تو سارے کے سارے انسان ROBOTS میں تبدیل ہو جائیں۔ اس لئے اگر ہمیں یہ معصومیت عزیز ہے تو ہمیں فن اور فن کار کی قدردانی کے آداب سیکھنے چاہئیں۔ مشین ہم سے یہ آداب بھی چھینتی جا رہی ہیں۔ اور ہم اس ملک کے رہنے والے جنہیں ابھی تک مشین پورے طور پر اپنی اسیری میں نہیں لے سکی ہے وہ محض دوسروں کی ریس میں اپنے کو بے حس ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور اپنے اس فعل پر نازاں ہیں۔ اور فن کی ناقدری کو ایک جدید عمل سمجھتے ہیں اور ان سے شکایت کی جائے تو فن کی عدم ترسیل کا غلغلہ بلند کرتے ہیں اور فن کار کو اس الزام سے ملوث کرتے ہیں کہ تم نے اپنی باتوں کو اتنا لاینحل بنا دیا ہے کہ ہمیں فرصت نہیں کہ تفکر احساس کا بار امانت اٹھائیں۔ یہ محض ایک بہانہ ہے، ایک فریب ہے جس میں وہ خود بھی مبتلا ہیں، اور دوسروں کو بھی مبتلا کرتے ہیں۔

فن لاینحل نہیں ہوتا اور نہ فن کار پہیلیاں بجھواتا ہے یہ بے حسی ہے۔ اذہان کا افلاس ہے جو انہیں ایسے کرنے اور کہنے پر اکساتا ہے اس لئے کہ انہوں نے مشینوں پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کر لیا ہے۔ وہ انسانوں اور انسانی احساسات سے جان بوجھ کر بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں اور پھر اس میں مشینوں کا بھی کیا قصور؟ قصور تو ہمارا ہے کہ ہم نے اپنی غلامی کے لئے مشینیں ایجاد کر لیں اور خود ان کی غلامی میں گرفتار ہو گئے۔ اور ہم شروع سے یہی کرتے آ رہے ہیں کہ ہم نے سدا بت بنائے ہیں اور ہمیشہ انہیں خدا سمجھا ہے۔ کیا اس غلامی سے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ کوئی راہ فرار نہیں کیا تمام راستے مسدود ہو گئے ہیں۔ اس کا جواب خاص طور سے انہیں ڈھونڈھنا ہے جو فن کار اور فن سے مغائرت برتتے ہیں، اور یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ مغائرت ایک طرح کی خودکشی کے علاوہ دوسری کوئی چیز نہیں ——

--

LITHO PRESS, Mcleodganj, Gaya.

کلچرل اکادمی، رینا ہاؤس، جگجیون روڈ، گیا

شرح خریداری

سال کے لئے	۱۲ روپے
دو سال کے لئے	۲۲ روپے
تین سال کے لئے	۳۰ روپے

فی کاپی

ایک روپیہ

آہنگ

ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۲ء

دفتر: بیراگی، گیا

فون:

دفتر: ۶۶۲

رہائش: ۵۳

شمارہ

۲۷، ۲۸

کتابت: قمر نظامی

مطبع: ہند لیتھو پریس، گیا

مرتبین

کلام حیدری، پرکاش فکری

محتویات

مزامیر

اگر آپ کو اپنا تحفظ و بقا مطلوب ہے تو اس کا راستہ یہی ہے کہ تنقید کو سمجھئے ، اس کی قدر و قیمت کو پہچانئے ، اس کے صحیح استعمال کا طریقہ سیکھئے لیکن یہ راستہ اتنا آسان بھی نہیں کیونکہ تنقید بلا مبالغہ ایک بہروپیا ہے ، ایسی ایسی شکلیں بدلتی ہے اور اتنی صورتیں اختیار کر لیتی ہے کہ اس پر قابو پانا بے حد دشوار ہے ، لیکن قابو پانا بہرحال ضروری ہے ۔ ہم اس کے اسرار اور رموز سے ضرور واقف ہو سکتے ہیں بلکہ صاف لفظوں میں اسے یوں کہئے کہ تنقید کو ہمیں اپنا اصل موضوع اور مقصود بنانا چاہئے ۔ تنقید ایک چمن ہے اور اپنے اس چمن کو ہمیں خود ہی سینچنا اور تیار کرنا پڑے گا ۔ ہماری بے حزانہ بلکہ مجرمانہ غفلت کی وجہ سے تنقیدی صلاحیت و استعداد کی جیسی کچھ نشو و نما ہونی چاہئے ہو نہیں رہی ہے ، ضرورت اس لگن کی ہے کہ ٹھیک سے اس کی نشو و نما ہو مگر اس کی پوری پوری نشو و نما کا واحد ذریعہ محتاط اور صحیح تربیت ہے اور اس تربیت کا آغاز بھی شروع ہی سے ضروری ہے ۔ اور جس قدر باقاعدگی بھی اس میں ممکن ہو تو برتی جانی چاہئے ، بالخصوص تعلیم ہی کے زمانے سے ۔ کیونکہ اس عمر میں آدمی کا دل و دماغ انتہائی اثر پذیر ہوتا ہے ، اور آسانی سے مڑنے اور ڈھلنے کی پوری صلاحیت اس میں رہتی ہے ۔ ہاں یہ کہا تو جا سکتا ہے کہ تعلیم کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی ، تربیت تو ہم پاتے ہی ہیں لیکن تعلیم گاہوں میں وہ تربیت ہمیں کہاں ملتی ہے جس کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں ۔ تعلیم کے زمانے میں ہماری قوت تنقید پراگندہ رہتی ہے ، اور اس کا ظہور اتفاقاً ہی ہوتا ہے اور کوئی معقول رہنمائی ہمیں مطلق نصیب نہیں ہوتی ۔ وہاں تو ہم یوں ہی تیر چلاتے رہتے ہیں اور جب وہاں سے نکلتے ہیں تب بھی زندگی بھر تیر تکّے ہی چلا چلا کر کام نکالتے رہتے ہیں ۔

اس تیر تکّے والی کیفیت کو کیسے روکا جائے ، اصل سوال یہ ہے ،

حیوانات کو دیکھئے، اس معاملے میں ان کے مظاہرے ہم سے کہیں بہتر ہیں۔ "تنقید" کی یہ نعمت ان کو "جبلت" کی شکل میں ودیعت ہوئی ہے اور بڑی حد تک ان کے تحفظ و بقا کا دار و مدار ان کی اسی جبلی قوت تمیز پر ہوتا ہے۔ ماقبل تاریخ انسانی کا آدمی بھی اسی قسم کی جبلت کا حامل تھا اور بچہ آج بھی اسی جبلت، کا حامل ہوتا ہے مگر جب بڑا ہو جاتا ہے تو اس کی یہ جبلت عقل و دانش بن جاتی ہے۔ یا بن جانا چاہئے۔ ماقبل تاریخ انسانی کا آدمی اپنے اندر بہت ساری اور بھی جبلتیں تقریباً اسی قسم کی رکھتا تھا، جیسی جانوروں کے اندر ہوتی ہیں، مگر عقل و تعقل کی نشو و نما اور تمدن کی غرض اس کے تدریجی ارتقاء نے ان جبلتوں کو پژمردہ کر دیا۔ پھر یہ جبلتیں غیر ضروری ہو کر رہ گئیں، آخر ختم ہو گئیں۔ اور اب آدمی آہستہ آہستہ اپنی عقل و فہم پر اعتماد کرنے لگا۔ اور یہ کیفیت بڑھتی چلی گئی۔ عقل و فہم کو جبلتوں پر فوقیت اور برتری حاصل ہے، کیوں کہ جبلتیں آنکھ بند کر کے یکسر میکانکی انداز سے عمل کرتی ہیں اور ان کو اپنے اجزائے ترکیبی یا نظام عمل کا مطلق شعور نہیں ہوتا۔ لیکن عقل اس کے برخلاف آنکھ بند کر کے میکانکی انداز سے عمل نہیں کرتی۔ یہ جبلتوں سے بلند و برتر اس لئے بھی ہے کہ اسے اپنے وجود کی پوری طرح خبر ہوتی ہے۔ جبلتیں بقائے ہستی میں ہماری معاون و مددگار تو ہو سکتی ہیں لیکن عقل ہماری ترقیوں کے امکانات پیدا کرتی ہے، دروازے کھولتی ہے۔

______ کلیم الدین احمد

وہ

فن کار خود نہ تھی مرے فن کی شریک تھی
وہ روح کے سفر میں بدن کی شریک تھی

اُترا تھا جس پہ باب حیا کا ورق ورق
بستر کے ایک ایک شکن کی شریک تھی

میں ایک اعتبار سے آتش پرست تھا
وہ سارے زاویوں سے چمن کی شریک تھی

وہ نازشِ ستارہ و طنّازِ ماہتاب
گردش کے وقت میرے گہن کی شریک تھی

وہ ہم جلیسِ سانحۂ زحمتِ نشاط
آسائشِ صلیب و رسن کو شریک تھی

ناقابلِ بیان اندھیرے کے باوجود
میری دعائے صبحِ وطن کی شریک تھی

پہلا پتھر

مصطفیٰ زیدی

صبا ہمارے رفیقوں سے جا کے یہ کہنا
بصد تشکّر و اخلاص و حسن و خوش ادبی
کہ جو سلوک بھی ہم پر روا ہوا اس میں
نہ کوئی رمز نہاں ہے نہ کوئی بوالعجبی

ہمارے واسطے یہ رات بھی مقدّر تھی
کہ حرف آئے ستاروں پہ بے چراغی کا
لباسِ چاک پہ تہمت قبائے زرّیں کی
دلِ شکستہ پہ الزام بد دماغی کا

صبا جو راہ میں دشمن ملیں تو فرمانا
کہ یہ تو کچھ نہ کیا ہو سکے تو اور کریں
کہ اپنے دستِ لہو رنگ پر نظر ڈالیں
کہ اپنے دعوئے معصومیت پہ غور کریں

حدیث ہے کہ اصولاً گناہ گار نہ ہوں
گناہ گار پہ پتھّر سنبھالنے والے
اور اپنی آنکھ کے شہتیر پر نظر رکھیں
ہماری آنکھ کے کانٹے نکالنے والے

آڈن اور اس کی شاعری ۔ ایک تعارف

ڈاکٹر عمر مثنیٰ

بیسویں صدی کی تیسری دہائی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ انگریزی ادب میں نئے شاعروں کا ایک ایسا گروہ ابھرنے لگا جو آگے چل کر " آڈن گروپ " کے نام سے مشہور ہوا نئی انگریزی شاعری کے ان نمائندوں میں آڈن کو سب سے زیادہ اہمیت کا مستحق سمجھا جاتا تھا اسی وجہ سے پورے گروہ کی شہرت کا سہرا اسی کے سر رہا۔

آڈن ۱۹۰۷ء میں یارک کے ایک متوسط طبقہ کے خاندان پیدا ہوا۔ اس کا باپ پیشہ کے اعتبار سے میڈیکل افسر تھا لیکن اس کی دل چسپیاں کافی متنوع اور وسیع تھیں۔ باپ کے مزاج اور طبیعت کے اس تنوع کا اثر آڈن کی شخصیت پر پڑنا فطری تھا چنانچہ اس کی ادبی سرگرمیوں میں اس اثر کا عکس صاف طور پر جھلکتا ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت اپنے دَور کے اعلیٰ معیار کے مطابق ہوئی۔ پبلک اسکول کی منزلوں کو طے کر کے آکسفورڈ یونیورسٹی کی علمی اور ادبی دنیا سے بصیرت اور روشنی حاصل کرنا بھی اس کے نصیب میں تھا۔ اسکول کی زندگی میں اس کی طبیعت انجینیر بننے کی طرف مائل تھی اس لئے اس زمانہ میں معدنیات اور علم طبقات الارض سے متعلق کتابیں زیادہ تر اس کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔ اس شوق کے ساتھ ساتھ اسی دَور میں اس کا شعری ذوق بھی پروان چڑھ رہا تھا۔ اس وقت جس شاعر کی تقلید اس کی شعری تخلیقات میں ملتی ہے وہ بلاشبہ ہارڈی ہے۔ ہارڈی کی شاعری نئے شاعروں کے لئے تقلید کا ایک آسان نمونہ تھی کیونکہ اس میں ایک طرح کی ناہمواری ملتی ہے اور اپنی اس خامی کی وجہ سے اپنی تقلید کے سلسلہ میں وہ فنی مہارت اور پختگی کا مطالبہ نہیں کرتی۔ آکسفورڈ پہنچ کر اس نے اپنی شاعری کی طرف کافی سنجیدگی کے ساتھ توجہ کی۔ اس دَور میں اس نے مستقل اور لگاتار شعر کہے لیکن ایک نمایاں فرق کے ساتھ۔ اب اس کی نظر میں ہارڈی کے بجائے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ جدید شاعروں کی تقلید کے لئے مثالی نمونہ بن چکا تھا۔ " آکسفورڈ شاعری " کی ادارت میں بھی وہ نمایاں حصہ لینے لگا۔ آکسفورڈ سے فارغ ہونے کے بعد جرمنی میں بھی اس نے کچھ دن گزارے۔ انگلستان واپس آنے کے بعد اس نے کچھ دنوں کے لئے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ اس کا اثر اس کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے اس کی شاعری میں جو وضاحت اور تفصیل کی کیفیت ملتی ہے اور جذباتیت سے عاری جو دردمندی محسوس ہوتی ہے وہ اس پہلو کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتی ہے۔

آڈن ان بدنصیب شاعروں میں ہے جن کے ساتھ عام طور پر نقادوں نے انصاف سے کام نہیں لیا ہے۔ آڈن کی شاعری پر معقول اور صحیح تنقید کافی تاخیر کے بعد ملتی ہے۔ حالانکہ اس کی شاعرانہ شہرت کے دَور میں نقادوں اور تبصرہ نگاروں نے یا تو اسے قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا یا بے جا تعریف و توصیف کے انبار لگا دئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تعریف و توصیف ایسی باتوں پر مبنی تھی جنھیں آڈن کے شاعرانہ محاسن میں نہیں شمار کیا جا سکتا۔ شروع شروع میں بہت سے نقادوں نے

اس کو اس بنا پر اہمیت دینے کی کوشش کی کہ اس کے یہاں سیاسی پروگرام اور سماجی منصوبہ بندی ملتی ہے۔ اسے ایک ایسا شاعر قرار دینے کی کوشش کی گئی جو انسانیت کا محسن اور نجات دہندہ ہو تعریف و توصیف کے ان کلمات کی تہ میں آڈن کی شاعرانہ انفرادیت اور اصل خصوصیت کا کوئی پہلو بھی اپنی جھلک نہ دکھلا سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب آڈن کے سیاسی نظریات اور سماجی تصورات میں تبدیلی آئی تو اس نوع کے مداحوں کو بڑا دھچکا لگا۔ ایک مخصوص سیاسی نظریہ کی بنیاد پر اس کی شان میں قصیدہ پڑھنے والوں کی مایوسی اور بے زاری کی تو اس وقت کوئی حد نہ رہی جب انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ آڈن نے عملی طور پر امریکہ کو اپنا وطن بنا لیا ہے اور مذہبی قسم کی شاعری شروع کر دی ہے۔

شاعر کی شعریت اور جمالیاتی اور فنی پہلو کو نظر انداز کر کے محض اس کے سیاسی نظریہ اور پروگرام کو غیر ضروری اہمیت دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے نقاد یہ سمجھنے لگے اس غلط فہمی کا شکار ہوئے کہ وہ محض پروپیگنڈہ باز ہے۔ کئی نقادوں نے اس کی مخالفت میں سخت تنقیدیں لکھیں۔ ان میں (لیوس) F. R. LEAVIS کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آڈن کی بدنصیبی تو اسی سے ظاہر ہے کہ لیوس اور اس کے ہم نواؤں نے بھی عام طور پر آڈن کی شاعری کے اسی پہلو کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا جسے ابتدائی دور میں کئی نقادوں نے خاص طور پر نمایاں کرنے اور اہمیت دینے کی کوشش کی تھی۔ اس کی شاعری پر تنقید کرتے وقت ناپختگی اور جذباتی ابال جیسی خامیوں اور کمزوریوں کو اس سے منسوب کرنے کی جو کوششیں کی گئیں اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ سیاسی پروگرام اور سماجی تصورات کو غیر ضروری طور پر اہمیت دیئے جانے کی وجہ سے اس کی اصل انفرادیت اور خوبی اچھے نقادوں کی توجہ سے بھی محروم رہ گئی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ایف (F. R. LEAVAS) آر۔ لیوس جیسے نقاد نے آڈن کی شاعری کو ناپختہ، عامیانہ اور معمولی کہہ کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناقابل اعتنا قرار دیا۔ آڈن کے

شاعرانہ شخصیت [illegible] جیسی [illegible] گئی ہے۔

کوئی چند برس قبل [illegible] نے ایک مستقل کتاب میں آڈن کی نظموں کا تفصیلی طور پر تنقیدی جائزہ لیا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آڈن کی شاعری کا سب سے بڑا عیب جس کمزوری کے شکار [illegible] F.R. [illegible] رہے ہیں ایک دوسرے پہلو سے [illegible] کمزوری [illegible] تنقیدوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس نے بھی آڈن کے شاعرانہ محاسن پر کماحقہ زور دینے کے بجائے اس بات کا رونا رویا کہ آڈن کے یہاں نظریات بڑی تیزی کے ساتھ تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ اس کی شاعری میں استقامت اور مرکزیت کا فقدان ہے۔ ایک کو یہ شکایت ہے کہ آڈن کے یہاں ایک مخصوص سیاسی نظریہ سے وابستگی ملتی ہے۔ دوسرا اس کے فقدان کا رونا روتا ہے۔ ان ساری باتوں کی طرف اشارہ کر دینے کا مطلب صرف اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ اس قسم کے مباحث کے ہجوم میں آڈن کی اصل شاعرانہ حیثیت گم ہو کر رہ گئی اور بہت دنوں تک اس کی شاعری کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آڈن اپنی شاعری کے ذریعہ بڑے گہرے تاثرات پیدا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے لئے وہ جن علامتوں کا سہارا لیتا ہے وہ بیشتر روایتی اور پرانے انداز کی ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے اس کے یہاں ایک طرح کے خارجی رنگ کے باوجود داخلی قسم کی شاعری ملتی ہے۔ یہ داخلیت اس کی شاعری میں کہیں ابہام کی کیفیت بھی پیدا کر دیتی ہے۔ اس کی نظمیں مجموعی طور پر ایک نئی کائنات تعمیر کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ایک ایسی شعری کائنات جس میں مخصوص علامتی خصوصیات بار بار اپنی جھلک دکھلاتی رہیں۔ بری مناظر سے لے کر منفرد کرداروں تک اور مستقل واقع ہونے والے حالات تک۔ جدید نقاد شاعر کی اس ذاتی اور نجی علامتی کائنات کی تہیں بڑی خوب صورتی اور اہمیت کے ساتھ کھول

...ہی اس نجی علامتی کائنات کی تعبیر میں
...کا استعمال کرتا ہے وہ اور اس کے ساتھ ساتھ
...کلام دالا شاعری کا غیر ضروری شہرہ ۔ یہ سب چیزیں
...نقادوں کی نظر میں مشکوک بنا دیتی ہیں ۔ یہی سبب ہے
...نقادوں کی نگاہیں آہستہ آہستہ اٹھیں ۔ مارکسی
...بعد میں اُسے بے حد نجی اور ذاتی قسم کا شاعر قرار
...از کرنا شروع کر دیا اور جدید نقادوں نے اسے
...قسم کا شاعر سمجھ کر اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لینے
...عافیت جانی ۔ غرضکہ بے چارہ شاعر جس کے دو پاٹے
...مجروح ہوتا رہا ۔ آڈن کی نظموں میں نغمگی اور موسیقیت
...ملتی ہے ۔ اس کے بارے میں بھی نقادوں کی بڑی
...غفل ہی برتتی رہی ۔ اس کی طرف بہت آخر میں دھیان
...لانکہ آج اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ آڈن
BALLAD اور گائی جانے والی دوسری اصناف سخن
...سے اہم شاعر ہے ۔

آڈن کے امریکہ جانے اور وہاں کی شہریت اختیار
...ذکر پہلے ہی آ چکا ہے ۔ کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ
...ن سے اپنے تعلقات منقطع کر لینے کے باعث اس نے اپنی
...کھو دی ہے جو اس کی شاعرانہ کامیابی کے لئے نہایت ضروری
... اس کی شاعرانہ کاوشوں میں انگلستان کے مزاج اور
...کی جو بنیادی خصوصیات ملتی ہیں ان کے پیش نظر یہ بات
...حد تک ٹھیک معلوم ہوتی ہے مگر اس کا ایک دوسرا پہلو بھی
...وہ یہ کہ آڈن بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے نمائندہ
...شہروں میں کہیں اجنبی یا ناموزوں نظر نہیں آتا ۔ ان
...بڑے صنعتی شہروں کو اس کی شاعری کی علامت کہہ
...سکتا ہے ۔

آڈن نے کچھ منتخب مفکروں سے برابر فیضان حاصل کیا
... مارکس اور فرائڈ کے علاوہ ۱۹۵۰ تک کرکیگارڈ اور

NIEBUHR کا اثر اس کے یہاں شدت کے ساتھ محسوس
کیا جا سکتا ہے ۔ کرکیگارڈ کے فلسفۂ وجودیت میں انسان کے
عدم تحفظ کا جو بنیادی احساس ملتا ہے اور جس میں اس کی زبوں
حالی اور امکانی نجات کا عکس نظر آتا ہے آڈن کے لئے باعث کشش
رہا ہے ۔ NIEBUHR کے خیالات نے متصوفانہ راہوں سے
آڈن کو متاثر نہیں کیا ہے ۔ بلکہ اخلاقی تذبذب ، زمان و مکان
کے اندر بسنے والے انسان کی سماجی آلودگیوں اور محدود آزادی
کے واسطے سے متاثر کیا ہے ۔ ایسے اور اسی طرح کے دوسرے موضوعات
اس کی آخری دور کی نظموں میں برابر آتے رہے ہیں ۔ مثال کے طور
پر اس کی نظم OUR BIAS پیش کی جا سکتی ہے ۔

آڈن کو انگلستان کے بری مناظر سے بڑی گہری وابستگی
ہے ۔ یہ بات بظاہر کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن آڈن کے یہاں
یہ اس لئے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اسے ان مناظر سے
بس یونہی دلچسپی نہیں ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ اسے کس طرح
کے مناظر سے لگاؤ اور وابستگی ہے اور اس گہری وابستگی کی
وجہ کیا ہے ۔ اس کے یہاں جن بری مناظر کی تصویریں ملتی ہیں ،
وہ عام طور پر صنعتی قسم کے ہیں جن میں انسانی جد و جہد اور ہما ہمی
کی جھلکیاں اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں ۔ ان
میں ملوں ، کانوں اور کارخانوں کی ایک جیتی جاگتی اور پر شور
دنیا آباد ہے ۔ اس کے لئے کائنات کے مناظر انسانی سرگرمیوں
سے علیحدہ کوئی کشش اور اہمیت نہیں رکھتے ۔ ان مناظر میں وہ
انسانی جد و جہد اور کشمکش کی تصویر دیکھتا ہے ۔ بری مناظر کی
ان ہی تصویروں کے ذریعہ وہ سوچتا ہے ۔ اس کے یہاں " دل
کے گاؤں " ، " خوف کے نواح شہر " اور " درد کے بری مناظر "
جیسی تصویریں کثرت کے ساتھ نظر آتی ہیں اور ان پیکروں میں
بڑی آمد اور بے ساختگی پائی جاتی ہے ۔ رچرڈ ہوگرٹ
(RICHARD HOGGERT) نے ٹھیک ہی کہا ہے
کہ اگر آڈن کی صرف ایک ہی تصویر کے لئے جگہ ہو تو وہ تصویر کچھ اس

طرح کی ہوگی۔ ایک بڑی منظر اور ایک آوارہ گرد۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک تنہا اور متجسس آوارہ گرد کی تصویر آڈن کی شاعری میں کثرت کے ساتھ ملتی ہے۔ ان تصویروں میں وہ جسمانی طور پر الگ ہو کر بڑی بلندیوں سے ان مناظر پر نگاہ ڈالتا ہے اور اس کہا گہمی، کشمکش، ہنگامہ اور شور و شغب میں نظم و ترتیب تلاش کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ آڈن کی شاعری میں بڑی مناظر اور آوارہ گرد کی تصویریں ایک دوسرے سے گہرے طور پر وابستہ ہیں اور اس کی شاعری کے بڑے حصہ پر چھائی ہوئی ہیں۔ انھیں یہ کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا کہ ان میں فطرت کا حسن ملتا ہے۔ یہ دراصل رمزیہ نظمیں ہیں، اور آڈن نے ان کو پیش کرنے میں اپنے پیکر تراش ذہن سے اس طرح کام لیا ہے کہ یہ بری مناظر درحقیقت انسانی ارادہ کی کشمکش اور جدوجہد کی تصویر بن گئے ہیں مثال کے طور پر اس کی نظم : IN PRAISE OF LIMESTONE دیکھی جا سکتی ہے۔

آڈن کا مجموعہ POEMS ۱۹۳۰ میں چھپ کر منظر عام پر آیا۔ یہ وہ دور تھا جسے خود آڈن نے "خوف اور بحران کا دور" کہا ہے۔ انگلستان میں بے روزگاری کا دیو سر اُٹھائے کھڑا تھا اور چاروں طرف بے چینی اور سراسیمگی کے آثار نمایاں تھے۔ بین الاقوامی سطح پر یہ زمانہ اور بھی بھیانک تھا۔ یورپ میں میسولنی اقتدار حاصل کر کے ڈکٹیٹر بن چکا تھا اور ۱۹۳۳ میں ہٹلر نے جرمنی کا چانسلر بن کر اسے بھی طاقت اور اقتدار کے معاملہ میں پیچھے چھوڑ دیا۔ اسپین کی خانہ جنگی ایک بڑی جنگ کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ بہت سے لوگ جو ان حالات کو دیکھ رہے تھے ایک نئی جنگ کے خوف سے ہراساں اور چوکنے تھے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو جان بوجھ کر خطرہ کی نوعیت کو گھٹا کر پیش کر رہے تھے اور خوشامد کی پالیسی کو راہ دے رہے تھے۔ ایسے لوگوں میں برطانوی حکومت کے ارکان پیش پیش تھے۔ آڈن ان لوگوں کو پرانا گروہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں قومی اور بین الاقوامی سیاست کا اثر حساس اور ذہین نوجوانوں کے دل و دماغ پر پڑنا لازمی تھا۔ آڈن کا تعلق دانشوروں کے اس طبقہ سے تھا جن کی حیثیت پیشہ ورانہ اور علمی طور پر تربیت یافتہ جیسی ہوتی ہے۔ آڈن اور اس کے گروہ کے معاصر شعرا اپنا زیادہ وقت جلسوں اور پمفلٹ بازیوں میں صرف کرتے تھے۔ وہ پرانے گروہ (THE OLD GANG) والوں کو ہمیشہ غلط اور اپنے گروہ کو ہمیشہ صحیح اور ایماندار سمجھتے تھے۔ ان سرگرمیوں اور دلچسپیوں میں جو ڈرامائی کیفیت اور جذباتیت پائی جاتی ہے اس کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی تہ میں ایک ایسا بنیادی جذبہ کارفرما تھا جو انسان دوستی اور فراخ دلی کی آغوش میں پروان چڑھا تھا۔

آڈن کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت اس کی سیاسی وابستگی کو غیر ضروری اہمیت دینا غلط اور گمراہ کن طریقہ کار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سیاسی طور پر نہایت سرگرم عمل شخص تھا۔ خانہ جنگی کے زمانہ میں اسپین بھی صورتحال دیکھنے کے لئے گیا تھا، چین اور جاپان کی جنگ کا ذاتی مشاہدہ کرنے کے لئے چین بھی گیا تھا، لیکن اس کی سیاسی دلچسپی ہمیشہ اس کی اُس گہری دلچسپی کے تحت رہی جو آڈن کو خود انسانی فطرت میں تھی۔ وہ انسان کے انفرادی اور سماجی مسائل کی بنیادوں اور گہرائیوں میں اُتر کر فطرت انسانی کی بصیرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ شروع میں اس نے نفسیات کی طرف بہت دھیان دیا جیسا کہ PETITION اور A FREE ONE سے ظاہر ہے اس کے یہاں فرائڈ اور دوسرے ماہرین نفسیات کا کافی ذکر ملتا ہے۔ اس کی اس دلچسپی کا خاص موضوع تنہائی، پریشانی اور خوف وغیرہ تھے۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ ان سب کے پیچھے دراصل مذہبی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔

آڈن کے یہاں ایک منفرد خصوصیت یہ نظر آتی ہے کہ وہ تفصیلات پر نظر رکھنے کا ماہر ہے۔ اس کی نظموں میں

جزوی تفصیلات بھی مل جاتی ہیں۔ جب ایسی نظمیں شاعرانہ طور پر کامیاب ہوتی ہیں تو ہم انھیں آسانی سے بھلا نہیں سکتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آڈن اس قسم کی بصیرت اور گرفت کو برابر قائم نہیں رکھ پاتا۔ وہ اکثر فسطائیت اور غیر ضروری تفصیل کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ اس کے شروع کے دور کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کی مثالیں اس کی مشہور نظم DONER 1937 میں مل جاتی ہیں۔

جہاں تک آڈن کی فن کارانہ مہارت اور حسن آفرینی کا تعلق ہے ان کے بارے میں دو رائیں نہیں پائی جاتیں۔ اس نے اپنے فن پر گرفت حاصل کرنے کے لئے بڑا زبردست ریاض کیا اور کبھی سکون اور اطمینان سے نہیں بیٹھا۔ اس نے "فن کارانہ سلیقہ" (ARTISTIC DECORUM) اور 'صحیح اسلوب' (CORRECT STYLE) جیسے تصورات کی ہمیشہ سخت مخالفت کی اور یہی وجہ ہے کہ ہم اس کی نظموں میں بڑی لچک اور وسعت پاتے ہیں اس کے یہاں فنی تجربات کی کمی نہیں اگرچہ SONNET اور LYRIC اس کے محبوب اور پسندیدہ اصناف FORMS ہیں۔ ان دونوں اصناف کے ساتھ گہرے طور پر وابستہ رہنے کے باوجود وہ برابر ہیئتوں کے تجربہ میں دلچسپی لیتا رہا چنانچہ نئے فن کاروں اور شاعروں کو وہ ہمیشہ یہی مشورہ دیتا رہا کہ وہ دنیا کو سنوارنے کی بجائے الفاظ کو نت نئی شکلوں میں ڈھالنے کا گر سیکھیں۔ آڈن کے خیال میں نئے اور ابھرتے ہوئے شاعروں کی سب سے پہلی خصوصیت الفاظ کے ساتھ کھیلنا اور ان کا ماہرانہ استعمال ہے

آڈن صرف تاریخی معنوں میں ہی نہیں بلکہ روحانی اور ذہنی معنوں میں بھی اپنے عصر کا شاعر ہے۔ بیسویں صدی کا خمیر اور ذہن اپنے سارے پیچ و خم کے ساتھ اس کی شعری تخلیقات میں عکس ریز ہے۔ یہ خصوصیت نہ صرف یہ کہ اپنے دور کا سب سے اہم اور قابل ذکر شاعر بنا دیتی ہے بلکہ اس کی شاعرانہ شخصیت کو ایسا سیال اور رواں دواں بنا دیتی ہے کہ اسے کسی فارمولا کے تحت لانا غیر ممکن ہے۔ POEMS سے THE SHIELD OF ACHILLES اور پھر HOMAGE TO CLIO تک ایک طویل ذہنی اور فنی سفر ہے جس سے ایک سچے شاعر کی زندہ اور بے چین روح کا اندازہ ہوتا ہے۔

شعور کی رَو کیا ہے؟

محمد وسیم

ادبی تنقید میں شعور کی رَو یا STREAM OF CONSCIOUSNESS سے ناول کی وہ ٹکنیک مراد ہے جو اس صدی کے شروع میں مارسل پروست، مسز ڈوروتھی رچرڈسن اور جیمز جوائس نے اپنائی۔ یہ ٹکنیک اس دور کے واقعہ پرست (REALIST) ناولوں کے خلاف کھلی بغاوت تھی۔ یہاں اس تحریک کے، میں اسے منظم تحریک نہیں کہوں گا کیوں کہ یہ تینوں ناولسٹ ایک دوسرے سے بے خبر فن میں نئی کوششیں کر رہے تھے اس نئے طرز کے پس منظر کے متعلق کچھ عرض کرنا مناسب سمجھوں گا۔

ہر ادب کے پشت پر کچھ سماجی معاشی مفروضے ہوتے ہیں اور یہی مفروضے اس کے صنف اور مواد کا تشکیل کرتے ہیں۔ مگر سماجی معاشی تغیر کا ایک اسٹیج ایسا بھی آتا ہے جب یہ مفروضے بے کار اور HOSTILE معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اور ساتھ ہی فن کی صنف، انداز بیان اور زبان میں تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کی جانے لگتی ہے۔ انیسویں صدی کے اخیر میں کچھ اسی طرح کی تبدیلیاں ہونے لگیں اور اس کا احساس کرنے والوں میں ولیم جیمز اور برگساں کے نام بھی شامل ہیں۔ مشہور امریکی ماہر نفسیات اور ہنری جیمز کا بھائی ولیم جیمز نے ہی شعور کی رَو STREAM OF CONSCIOUSNESS کی اصطلاح کو رائج کیا۔ اس کا مسئلہ تھا انسانی شعور کی پیچیدگیاں، عام عقیدہ کے برخلاف، ایک مخصوص لمحہ میں ہمارے ذہن میں صرف ایک ہی خیال نہیں ہوتا۔ ہمارے حواسِ خمسہ کے پانچوں دروازے کھلے ہوتے ہیں اور ان کے ذریعہ پوری خارجی دنیا ہمارے ذہن میں آتی جاتی رہتی ہے ہر لمحہ، ہماری ذہنی کیفیت بھی بدلتی رہتی ہے اور اس کے ساتھ ہی خارجی دنیا میں بھی تبدیلی ہوتی ہے۔ جیمز کا خیال تھا کہ ذہن کی اس کیفیت کو، شعور کی اس رَو کو الفاظ کے جال میں گرفتار کرنا ناممکن ہے۔ کیا ہم گرم گرم ہاتھوں سے برف کے گالے کے باریک ذروں کو پکڑ سکتے ہیں؟ ہاتھ میں آتے ہی ذرے پگھل کر پانی کے قطرے بن جاتے ہیں۔

برگساں کے خیالات بھی ولیم جیمز کے خیالات سے ملتے جلتے تھے۔ اس کے مطابق ماضی، حال اور مستقبل کا قصہ ذلیل کم نظری ہے۔ یادوں کے ذریعہ ہمیشہ ماضی زندہ رہتا ہے۔ اور ایک ایک گھڑی مستقبل کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔ برگساں نے وقت کی تعریف ان دل چسپ الفاظ میں کی ہے:

"وقت ماضی کی اس مسلسل یورش کا نام ہے جو نوچتا کھسوٹتا مستقبل میں داخل ہوتا رہتا ہے۔ اور جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے موٹا تازہ ہوتا جاتا ہے۔"

ان فلسفیوں نے ایک طرف واقعہ پرست ناول کی غیر واقعہ پرستی کو بے نقاب کیا تو دوسری طرف ناولسٹوں کو نئی راہوں سے روشناس کیا۔ پرانے ناولسٹ کرداروں کے فوٹو پیش کرتے تھے اور ان کے ذہن اور ذہن کی فضا سے بے بہرہ۔ یہ لوگ وقت کا وہم بھی پیش کرتے تھے۔ کردار کے بچپن، لڑکپن اور جوانی میں وقتی تسلسل

نے کی کوشش کرتے تھے۔ دراصل ان کے ناولوں میں
ہی وقت ہوتا۔ وہ وقت جب کے ناولسٹ لکھنے بیٹھا
ہے۔ نئے ناولسٹوں کو وہ سماجی مفروضے بھی غلط معلوم
ہونے لگے جن پر ایمان لانا ہر پڑھنے والے کے لئے ضروری تھا
ناول میں کردار بھی ہیں، واقعات بھی ہیں، واقعہ پسندی
ہے، ناولسٹ کا نکتہ نگاہ بھی ہے مگر ہر طرح سے مختلف
یا۔ اور سب سے زیادہ نیا ان کا اسٹائل ہے۔
فرانسیسی ناولسٹ ایڈورڈ دوجارڈن نے، جس سے
تر ہو کر جیمز جوائس نے لکھنا شروع کیا۔ نئے اسٹائل کے
ے میں یہ کہا ہے:

"داخلی خود کلامی INTERNAL MONOLOGUE شاعری کی ایک صنف ہے۔ یہ ایک ایسا ناگفتہ اور غیر شنیدہ کلام ہے۔ جس کے ذریعہ کردار اپنے اندرونی خیالات۔ غیر شعور سے قریب ترین خیالات کو ان کی اصلی حالت میں بیان کرتا ہے۔ کلام میں نہ منطقی تنظیم ہوتی ہے اور نہ نحو کے اصولوں کی پابندی اور اظہار بیان ایسا ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو ایسا محسوس ہو کہ خیالات کو اسی تسلسل سے بیان کیا جا رہا ہے جس تسلسل کے ساتھ وہ کردار کے ذہن میں آرہے ہیں۔"

دوجارڈن نے STREAM OF CONSCIOUSNESS کے بجائے INTERNAL MONOLOGUE کی اصلاح کو زیادہ پسند کیا۔

مارسل پروست کا طویل ناول "ایام گم شدہ کی تلاش میں" انھیں فکری اور اسٹائلی اصولوں کے تحت لکھا گیا ہے ناول کا ہیرو ایک تاریک کمرے میں بند ہو کر دنیا و مافیہا سے بے خبر خیالات کی رَو میں اپنے ماضی کی سیر کرتا ہے۔ یہی سیر ناول ہے۔ اخیر میں وہ اپنے کمرے میں اداس اور مایوس لوٹ آتا ہے۔

ماضی سے اسے کچھ بھی نہیں ملا۔ وہ اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ دوسروں کی صحبت یا محبت کے ذریعہ اطمینان نہیں حاصل ہو سکتا۔ اصلی خوشی شعور کے اس رو میں بہتے رہنا ہے۔

جوائس شعور کی رو میں بہتے رہنے کا قائل نہیں ہے۔ وہ پروست کی طرح قنوطی اور رومانی نہیں ہے۔ اس نے شعور کی رَو کو اخلاقی اور ادبی مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے ULYSSES میں کئی کردار ہیں اور کوئی بھی کردار ادیب کا MOUTH PIECE نہیں۔ مختلف کرداروں کے آپس کے عمل اور ردعمل سے ایک کہانی بنتی ہے اور کہانی کی پیچیدہ تفصیلات کے ذریعہ جوائس ٹھوس اخلاقی مقاصد حاصل کرتا ہے۔

ULLYSSES 800 صفحوں پر مشتمل ایک ضخیم ناول ہے۔ جو دس سال کی مشقت کے بعد تیار ہوا۔ یورپ کے ایک دور افتادہ شہر ڈبلن کے تین معمولی، اور غیر معروف لوگوں کی غیر دلچسپ اور بور زندگی کے صرف ایک دن ۱۶ جون ۱۹۰۴ کا بیان ان آٹھ سو صفحوں میں ہے۔ مگر کردار زندہ ہیں کیوں کہ ان کے احساسات ان کی یادیں، ان کی امیدوں کی دنیا کو ضبط قلم کیا گیا ہے۔ پس منظر ڈبلن ہے۔ موجودہ یورپ ہے۔ ہومر کے رزمیہ ODESSEY کے ہیرو ULLYSSES کے کارناموں کی دنیا ہے۔ ۱۶ جون ۱۹۰۴ صرف ایک دن ہے مگر ODYSSEY کے چودہ سال اور پورا زمانہ ENTERNITY ہے۔

ناول کا ہیرو بلوم اپنی بیوی کی بے وفائی اور اپنی نامردی کے احساس سے پریشان، ایک قابل نفرت یہودی، اشتہاری کمپنی کا ایجنٹ ہے۔ مگر ہم آپ سب کا نمائندہ ہے۔ وہ پورے یورپ کا مسئلہ ہے کیونکہ وہ تنہا ہے۔ وہ ULYSSES ہے جو ٹراوے کی جنگ کے بعد چودہ سال تک بھٹکتا پریشانیوں اور دُکھوں سے بچتا نکلتا اپنی منتظر بیوی سے آملتا ہے اور اپنی بیوی کو اس کے عاشقوں سے نجات دلاتا ہے۔ ناول کے اخیر میں بلوم ایک

[بقیہ صہ ۳۲ پر]

اشکال

طغیان

حمید سہروردی

اشکال

یہ وہی لوگ تھے
جو خاموش پانی کے مانند بہتے تھے
وہی لوگ تھے
جن کا خون مری رگ و پے میں رچ بس گیا ہے
سُنا ہے کہ خاموش پانی
کہیں دور صحرا میں گم ہو گیا ہے
وہ کیا ہے ؟
مری رگ و پے میں رچ بس گیا ہے
دھواں تو نہیں ہے
اُڑتا ، بکھرتا مری سانسوں میں در آ گیا ہے
نہیں
کچھ بھی تو نہیں ہے
صرف ایک وہم ہے
یہ بھی نہیں ہے کہ
میں آرکاشس کا پُتر ہوں
تو پھر میرا وجود کہاں سے ہوا ہے
کیا میرا وجود نہیں ہے ؟
نہیں — ایسا بھی تو نہیں ہے
میں صدیوں سے چلا آ رہا ہوں
میں ہر جگہ بستا رہا ہوں
میں کیا ہوں

میں کیا ہوں

میں کیا ہوں ؟

●●

طغیان

ہم کسی کی اِتباع نہیں کرتے
کیوں کہ سارے مفروضے بے نیل و مرام فنا ہو چکے ہیں
ہماری اساس بھی خلا کی نظر ہو چکی ہے
آنکھیں عرش بریں کو نا دیدہ تکتی ہیں
ہم کسی ایک ابتلا کے شکار نہیں
سُنا ہے، ہمارے آبا و اجداد نے ہمارے ورثے سے
بے شمار ابتہاجوں کو چھین لیا ہے
اب وہ سنگھاسن بھی نہیں
جن پر، ہمارے پُرکھوں نے عیش و عشرت کے دن
گزارے تھے
ہمارے لئے تو صرف عُسرت اور مصیبت کا میدان کھلا
چھوڑا ہے

اے ہم عمرو :
ہماری طالعِ برگشتہ نے، ہم سے آبِ گلگوں کو بھی چھین لیا ہے
ہم ایل ایس ڈی کی گولیاں بنا کر، اپنے جسم کو مدہوش
کرتے ہیں

وہ جبلّتی افعال
انھوں نے دُشنام طرازی تک پہنچا دیا ہے
کیا ہم،
اپنے طغیان کو آبا و اجداد کی بھُول سمجھیں !

●●

پہچان

اکرام باگ

یہی ایک خمیازہ باقی رہا ہے
فجر کو جاگتے ہوئے کچھ مخصوص لوگ
عصر کی ساعتوں میں لٹتی ہوئی پوشاکوں کے بیچ
ٹکٹکی باندھے ہوئے میرے پاؤں
نہ کوئی یاد نہ چہرہ نہ روگ
یونہی کب تک کوئی یاد بنتا رہوں
بس اتنے ہی تھے پائداری نشاں!
ابھی اوک کی شاخِ آخر پہ
تم کھلی بھی نہ تھیں
کہ برفیلا شجر
مرے آنگن یہ کیسے دَر آیا؟
اب جو کھڑکھڑاتی دھوپ سے واپس بھی لوٹوں

تو دروازوں میں خواب مقفل
اجنبی راستوں میں ترا مکاں
جلتی بجھتی آنکھوں میں حدِ قفس
تمہارے پاس کوئی ورق باقی بچا ہے
تو آؤ
کسی مغرب میں دعا کے بہانے نکلو
دھندلکے پل پہ لیٹا ہوا
وہ کوئی اور نہیں
ایک بے مصرف انتظار ہے
تم جواب کے پہچان بھی جاؤ
وہ میں نہیں تمہارا خمیازہ ہے

سیڑھیاں

انور قمر

کالر بیل بجا کر میں نے اپنی ٹائی کی گرہ درست کی۔ کلف لگے ہوئے ادھڑے کالر کے پچھلے حصہ سے باہر جھانکتے ہوئے دھاگوں کو اندر دبایا۔ ایک نظر جوتے پر ڈالی جو پچھلے ساڑھے تین سال کی لگاتار خدمت کے بعد اب مجھے منہ چڑانے کی جسارت کرنے لگا تھا!

مسٹر بسین کے چہرے پر ناخوشگوار آثار تھے۔ دروازہ کھولنے سے پہلے شاید انھوں نے مجھے دروازہ کی آنکھ سے دیکھ لیا تھا

"نمستے!" میں نے ایسچی کیس سمیت دونوں ہتھیلیاں جوڑ لیں

اس کے باوجود اُن کے لبوں کو مسکرانا یاد نہ آیا۔ ایک کٹھ پتلی کی طرح وہ اپنی جگہ پہ گھومے اور مجھے غلام گردش میں بڑھ جانے کا اشارہ کیا۔ دروازہ کی چوکھٹ ایک دھماکے سے لرزی اور اپنے چہرے کو میں نے زیادہ بشاش بنا لیا۔

گندمی رنگ اور کھڑے ناک نقش کے پینتالیس سالہ مسٹر بسین صوفہ کی آرام دہ کرسی پر بیٹھے ٹائم میگزین پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اُن کے فلیٹ کی آرائش دیکھ کر میں اپنے آپ کو بڑا کم تر سمجھ رہا تھا۔ اُن کے قد کے آگے اپنے کو بالشتیہ سمجھنے لگا۔

انھوں نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

"شششی صاحب، میں نے آپ کو آج اس لئے بلایا تھا کہ......"

(صوفہ بڑا آرام دہ تھا۔ پنکھے کی ہوا جسم کو یادوں کی طرح چھو رہی تھی۔)

"......... میں اپنا اور اپنی بیوی کا ......"

(دیوار پر ٹنگی پینٹنگ پر مٹیالے رنگ سے تین جھونپڑے ایک قطار میں بنائے گئے تھے۔ ایک کے در پر ایک عورت بیٹھی چولہا سلگا رہی تھی۔ چار چوزے اُس کے قریب ہی دانے چگ رہے تھے عقب میں ایک سیاہ فام آدمی لنگوٹی باندھے، کاندھے پر ہل رکھے گھر لوٹ رہا تھا۔)

"......... جوائنٹ انشورنس کرانا چاہتا ہوں۔"

(میں سب کچھ بھول گیا۔ مسٹر بسین کی زبانی میں سب کچھ سننے کا متوقع تھا۔ لیکن یہ سننے کو وہ ابھی بھی نہیں رکھتا تھا۔)

میں نے اپنے خوشی سے اڑتے ہوئے حواس قابو میں کئے۔ خادم ایک کشتی میں نارنگی کے رس کے دو گلاس لے آیا، اور ٹی پائی پر رکھ گیا۔ میں نے بے اختیار ہو کر ایک گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ نارنگی کا عرق میرے کلیجہ کو ٹھنڈک پہنچاتا، دل و دماغ کو آسودگی بخشنے لگا۔

"کل میرے ہم عمر دوست کا انتقال ہو گیا۔"

ان کی آنکھیں سکڑ گئیں اور ان میں رنج و غم کی لکیریں دکھائی دینے لگی۔

"آپ نے اس سے قبل کئی مرتبہ کوشش کی پر مجھے انشورنس کرانے پر آمادہ نہ کر سکے۔"

نوبت ہی کسی کے مکان پر نہیں گیا تھا۔ اپنے دوست کے
...نہیں لگتا "دیودوت بلڈنگ" کے اس فلیٹ پر میری
...کا، وہ اصا صول بھی ٹوٹ چکا تھا۔

وہ جملے مجھے یاد ہیں۔

"ڈیڑھ ہزار میری تنخواہ، دو ہزار کی میری بیوی کی پریکٹس
دو ہزار کا ہمارا خرچ۔ ششی صاحب ڈیڑھ ہزار ہماری ماہانہ
...ت ہے۔ انشورنس کرا کر کیا فائدہ!"

مغربی جانب کی دونوں وسیع و عریض کھڑکیاں کھلی ہوئی
...ہیں۔ سمندر کی ہموار سطح پر موجیں دبا دبا جوش لئے بار بار کراکھڑ کر
...ردم ہو جاتی تھیں۔

"ڈیڑھ لاکھ کی بیس سالہ پالیسی کا سالانہ پریمیم کتنا ہو گا؟"
فاؤنٹین پین قمیض کے بٹن کے سوراخ سے نکل کر اتنی بڑی
...کا حساب کرنے سے جھجکنے لگا۔

"ساڑھے سات ہزار صاحب۔" کتنا وقت لگا حساب
...نے میں مجھے۔ کانپتے ہاتھ، بے قابو ذہن، پینڈولم کی طرح
...یشن کی لمبی ڈور پر جھولنے والا دل رکھنے والا شخص کیوں کر
...ساب جلدی سے کر سکے گا۔

"آرتی" مسٹر سین کی آواز کی بازگشت سنائی دی۔
...مجھے فلپس کمپنی کے اسٹیریو ساؤنڈ والے ریکارڈ پلیر کی قیمت
...دآئی۔ ۸۹۹ روپے۔

میاں بیوی کا طبی معائنہ ہو چکا۔ انشورنس کی کاغذی
...کارروائی بھی ہو چکی۔

بچوں کے سو جانے کے بعد میں اس رات اپنی بیوی کے
ساتھ بڑی دھیمی آواز میں اپنے ۳۵ فی صدی کمیشن کی ڈھائی
ہزار روپے کی رقم سے سپنے بننے لگا۔

...ہمیں خوش آیند ہوں تو نیند جلدی آتی ہے۔ میری بیوی
لبوں پر مسکراہٹ لئے سو گئی۔ اور میں حسب معمول دریچے سے رات کی
بدلتی ہوئی کیفیت دیکھتا رہا۔ اور ساتھ ہی ساتھ چھٹکتی ہوئی چاندنی میں

اپنی بیوی اور بچوں کے کمزور اجسام اور اپنے تنگ کمرے کے پرانے
ساز و سامان کو ان ڈھائی ہزار روپے کے غیر مرئی ہاتھوں سے
سنورتے دیکھتا رہا۔

صبح سویرے نہا دھو کر میں نے پھر وہی کلف لگا جوڑا
پہنا۔ جوتے پر برش پھیرا۔ ناشتہ کیا۔ سبق یاد کرتی ہوئی بچیوں کے
گال سہلائے اور بیوی کو پرنام کر کے مسٹر سین کے مکان کو چلا۔

نصف درجن مرغابیاں سمندر کے کنارے پڑے ہوئے
سیاہ پتھروں پر بیٹھیں مچھلیوں کے کنارے پر بہہ آنے کا انتظار کر رہی
تھیں۔ مشرقی ٹیلے پر اونچی نیچی عمارتوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ جس
کے پیچھے سے سینٹ میری چرچ کے مینار نظر آ رہے تھے۔ سمندر اور
ٹیلے کے درمیان بل کھاتی ہوئی سڑک پر میں چل رہا تھا، اور اکا دکا
لوگ بھی۔ ہیڈ اسٹینڈ اس وقت کو اکے کسی دور افتادہ جزیرہ
کی طرح نظر آ رہا تھا۔

چودہ منزلہ "دیودوت" کے نیپالی چوکیدار نے میرا
استقبال کیا۔ "شاب لفٹ خراب ہے۔" یہ کہہ کر وہ مسکرایا
اور اپنی آنکھیں لکیروں میں بدل گئیں۔

میں نے گردن ہلائی اور آگے بڑھ گیا۔

بیس سینٹ پارکنگ میں مسٹر سین کی گہری نیلی
امبیسیڈر کار دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ وہ گھر ہی پر ہیں۔ نومنزلوں
کی ایک سو اسّی سیڑھیاں میں آٹھ منٹ میں پھلانگ گیا۔ ان کے فلیٹ
کی کال بیل بجائی۔ مسز سین نے دروازہ کھولا۔ وہ مسکرا رہی تھیں۔

"آیئے ششی صاحب، ہم تو سمجھے تھے کہ آپ لفٹ
خراب ہونے کی وجہ سے نو منزلے چڑھنے کی زحمت نہ کریں گے۔"

نو منزلے..........
یہ کہتے کہتے مجھے اندازہ ہوا کہ میرا دم کتنا پھول گیا ہے
میں کہنا چاہتا تھا کہ نو منزلے تو کیا میں ان ڈھائی ہزار روپوں
کے لئے ننانوے منزلے بھی چڑھ سکتا ہوں۔

مسٹر سین اپنا سر پونچھتے، ریشم کا گون پہنے باتھ روم سے

ڈرائینگ روم میں آئے۔ ان کے جسم سے بڑی بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ شاید ٹیلکم پاؤڈر کی، شاید آفٹر شیو لوشن کی، شاید صابن کی۔

میں نے سوچا آفٹر شیو لوشن کی وہ شیشی کتنے کی ہوگی جس پر ایک بادبانی کشتی کی تصویر بنی ہے۔

"سوری مسٹر ششی آج ذرا دیر میں آنکھ کھلی۔"

وہ اسی کرسی پر بیٹھ گئے، جس پر وہ کل بیٹھے تھے۔

"کوئی بات نہیں صاحب، یہ نیند ہر کسی کو نصیب نہیں خوش قسمتوں ہی کو آتی ہے۔"

میں انھیں نیند سے عاری آنکھوں سے دیکھ کر بولا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ مجھے انسومنیا INSOMNIA کی شکایت ہے۔ لیکن نہ کہہ سکا۔

نوکر کشتی میں پھر نارنگی کا شربت لے آیا۔ اس کے پیچھے مسز بسین چلی آئیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں چیک بک اور دوسرے میں سنہرے کیپ کا فاؤنٹن پین تھا۔ شاید پارکر ہو۔

وہ میرے بازو میں آکر بیٹھ گئیں اور ٹی پائی اپنے قریب سرکا کر چیک لکھنے لگیں۔

"ٹو لائف انشورنس کارپوریشن آف انڈیا۔

روپیز سیون تھاؤزنڈ اینڈ فائیو ہنڈریڈ اونلی"

اس کے نیچے انہوں نے دستخط کر دیئے۔ چیک کراس کر دیا اور چیک بک میں سے پھاڑ کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اظہار تشکر سے بھیک لینے کے انداز میں اُسے دونوں ہاتھوں سے قبول کیا۔ اور اُسے اٹیچی کیس میں بڑی احتیاط سے اپنی ڈائری میں رکھ دیا۔

اس دوران میں مسٹر بسین کپڑے تبدیل کر چکے تھے۔ اور آفس جانے کو تیار تھے۔ انہوں نے نارنگی کے شربت کا گلاس اٹھا کر میری طرف بڑھایا۔ "تھینکس" کہہ کر میں نے اُسے لبوں سے لگا لیا۔ اور غٹا غٹ پی گیا۔

مسز بسین اپنی لانبی لانبی انگلیوں سے [illegible] کو بہ غور دیکھتی ہوئی بولیں۔ "ششی صاحب آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں......"

"جی فرمائیے۔" میں نے بڑی سعادت مندی سے سر جھکا دیا۔

"مجھے پتہ ہے کہ آپ کو ان ساڑھے سات ہزار روپیوں میں سے ڈھائی ہزار روپئے کمیشن ملے گا۔"

"جی...... جی ہاں......" میں ایک گھونگے کی طرح خول میں سمٹنے لگا۔

"اور اس کے بعد ہماری ہر قسط پر پانچ فیصدی۔"

"جی..... درست ہے..... بالکل سہی....."

میں اپنے خول سے منہ باہر نکالے بغیر بولا۔

"تو کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ اپنا کمیشن بطور ڈسکاؤنٹ ہمیں دے دیں۔"

کسی نے جیسے میرے خول کے دہانے پر پتھر کی سِل رکھ دی۔ میں اُس گنبد میں چیخا۔

"جی...... جی...... یہ کیسے ہو سکتا ہے...."

مجھے اپنی آواز کی بازگشت سنائی دی۔

ڈھائی ہزار کی رقم تو آپ کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی میں تو ان روپیوں سے اپنی دنیا سنوار سکتا ہوں۔ اپنی بیوی کے لئے وٹامن کے انجکشن، بچوں کے لئے دودھ، اپنے لئے قمیض۔ جوتا۔!

ایک چھوٹا سا ریڈیو اور پنکھا۔!

مسٹر بسین جو اب تک خاموش تھے، بولے۔

"مسٹر ششی، ٹرائے ٹو بی ریزنیبل (TRY TO BE REASONABLE) آپ کو تو دوسرے کلائنٹس سے بھی کمیشن مل جاتا ہوگا۔!"

میں تقریباً روہانسا ہو کر بولا

(بقیہ صفحہ ۳۳ پر)

غزل

سلطان اختر

جسم و جاں کے در و دیوار ہلائے گا بہت
اب کے طوفانِ طلب رنگ دکھائے گا بہت

مضحکہ میری ندامت کا اُڑائے گا بہت
دیکھتے ہی مجھے آئینہ رُلائے گا بہت

اپنے ہونے کا یقیں اس کے نہ ہونے کا گماں
یہی احساس تو دیوانہ بنائے گا بہت

یہ بھی اک طرفہ کرشمہ ہے اگر دیکھو تو
بند آنکھوں سے تماشا نظر آئے گا بہت

وہ تو اک خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں
ڈھونڈنے والا اُسے خود کو گنوائے گا بہت

ختم ہوتا ہی نہیں یہ سفرِ سوختہ جاں
ایسا لگتا ہے ابھی اور تھکائے گا بہت

ذہن میں بھر چکی اُجرت کی ہوس اب اختر
نشۂ دادِ ہنر ہوش اڑائے گا بہت

تناؤ

سعادت سعید

جب جسم پر ضرورتوں کا دباؤ بڑھ گیا تو آنے جانے لمحوں کے درمیان مفلوج زبان کانپنے لگی۔ لیکن جب زبان کانپنے لگی تو جسم کسی بھی سفر کے لئے تیار نہ ہوا۔ (حالانکہ ایسا ضروری تھا) لیکن وہ جو کب کا سوچ کے آنگن میں قدم جمائے کھڑا تھا کہنے لگا

"تمہیں ضرورتوں کی تکمیل کرنی ہی ہوگی۔"

"اچھائی اور برائی کا چکر چھوڑ دو۔"

"سب ٹھیک ہے۔"

"یہ بھی، وہ بھی، جو بھی۔"

لیکن صداؤں کی بازگشت ذہن کے اندر بنی ہوئی ساکت فضا سے آگے نہ بڑھ سکی اور تب ہی جسم پر ضرورتوں کا دباؤ حد سے بڑھ گیا۔ تو خیال آیا کہ اپنے اس رفیق کو خط لکھوں جو دوست کم اور دشمن زیادہ ہے یا دوست زیادہ اور دشمن کم ہے۔ (یہ فیصلہ کرنا ذرا مشکل بھی ہے)۔ بہرحال میں نے لکھا:

"۱۲ تاریخ کو رانچی ایکسپریس سے آ رہا ہوں۔"

دوست سے ملاقات ہوتی ہے اور پھر باتوں کا سلسلہ رات کا ڈیڑھ بج جاتا ہے۔ اور ابھی میں اصل موضوع سے بہت دور ہوتا ہوں کہ اچانک ضرورتوں کا دباؤ بڑھ جاتا ہے اور میں اصل موضوع پر آ جاتا ہوں۔

میں بہت دنوں سے پریشان ہوں۔ اس سلسلے میں تمہیں خط بھی لکھنے والا تھا۔ مگر اب میں ایسا مریض ہوں جو دن میں تو ٹھیک نظر آتا ہے۔ مگر رات کیسے آتی ہے اور کیسے جاتی ہے

یہ نہ پوچھو ———

"بات کیا ہے ———؟"

"ادھر مہینوں سے ایک ہی خواب برابر دیکھے جا رہا ہوں یہ کیسا COMPLEX ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ میری مدد کرو۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

"خواب بیان کرو تو شاید میں تمہاری مدد کر سکوں۔"

میں شروع ہو جاتا ہوں:

"کوئی پرندہ ہے جو مجھے اپنی چونچ میں پکڑ کر کافی دور بلندی میں اڑا لے جاتا ہے اور سنسان سمندر کے ساحل پر پھینک کر کہیں دور فضاؤں میں چلاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ پھر میں ساحل کے کنارے آ جاتا ہوں۔ کافی دیر تک کھڑا رہتا ہوں سمندر کا پانی کافی شفاف نظر آتا ہے۔ پانی کے اندر رقص کرتی مچھلیوں کو دیکھتا ہوں۔ ان کی چال اور چک پھیریوں میں گم ہو جاتا ہوں اور تب ہی وہ پرندہ آتا ہے اور مجھے اپنی چونچ میں اٹھا کر لے جاتا ہے۔ کہاں لے جاتا ہے کچھ پتہ نہیں۔ اور پھر میری آنکھ کھل جاتی ہے۔"

"مگر جب میں بیدار ہوتا ہوں تو اپنے ذہن اور دل کے [illegible] ایک عجیب سی جلن محسوس کرتا ہوں [illegible] اور یہ روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ [illegible] کیا کروں۔

دوست میری باتوں [illegible] پھر میرے مسئلے کا حل بتاتا ہے۔ میں [illegible] کرتا ہوں

اس کا احساس ہو جاتا ہے۔ اور ذہن کا خیال
[illegible] جاتا ہے ـــــــ

شام ہوتی ہو تو ہم دونوں گھر سے نکل پڑتے ہیں۔ اور مختلف راستوں پر مختلف زاویوں سے گھومتے ہیں۔ مگر منزل نظر نہیں آتی۔ تھک ہار کر گھر واپس آجاتے ہیں۔ تب ہی "وہ" پھر بڑبڑانے لگتا ہے۔

" تمہیں ضرورتوں کی تکمیل کرنی ہی ہوگی۔ "
" اچھائی اور برائی کے چکر میں نہ پڑو۔ "
سب ٹھیک ہے۔
" یہ بھی، وہ بھی، جو بھی "

میں اُسے سمجھانا چاہتا ہوں۔ اُس سے کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر زبان پر تالے پڑ جاتے ہیں۔ ہزار کوشش کے باوجود کچھ کہہ نہیں پاتا۔ پھر کچھ آہٹ ہوتی ہے۔ نظر اُٹھائی تو ایسا لگا جیسے دروازے میں کوئی جھانک گیا۔ میں دروازے کی طرف غور سے دیکھتا ہوں۔ پھر کمرے سے باہر آجاتا ہوں۔ مگر وہاں تو کوئی نہیں۔ پھر کچھ شور سنائی پڑتا ہے۔ مگر یہاں تو سناٹوں کی حکومت ہے۔

تب پھر یہ آوازیں کیسی ہیں۔ ؟

اچانک الفاظ کی قطاریں سامنے آتی دکھائی پڑتی ہیں۔ سبھوں کی زبان پر ببول کے کانٹے پھنسے ہیں۔ اور اپنی تمام تر خواہشوں کے باوجود بولنے سے مجبور ہیں۔ لیکن اُن میں سے ایک آگے بڑھتا ہے اور معنی کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ تب ہی یہ آواز آتی ہے۔ "MAN IS BORN FREE, BUT IS EVERY WHERE IN CHAIN" اور پھر ایسا ہوتا ہے کہ میں معنی کے جنگلوں میں بھٹکنے [illegible]تا ہوں۔

کسی بھی طرح اُلجھن کم نہیں ہوتی۔ ضرورتوں کا دباؤ بڑھتا جاتا ہے۔ پیاس سے حلق میں کانٹے پڑ جاتے ہیں۔ اور سمندر چنگھاڑتا رہتا ہے۔ اور مچھلیاں رقص کرتی رہتی ہیں۔

ہم دونوں پھر شہر کی بھیڑ بھاڑ میں اپنے آپ کو گم کر دیتے ہیں۔ کبھی پیدل کبھی بس کبھی ٹیکسی سے شہر بھر کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ انجانی مسرتوں کی تلاش یا پھر انجانی منزل کی تلاش میں جو پتہ نہیں کہیں ہے بھی یا نہیں، مارے مارے پھرتے ہیں۔ پھر ایسا ہوتا ہے کہ ہم مختلف راستوں پر مختلف زاویوں سے گھومتے ہیں۔ جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں تو بچے بچائے نوٹ کو محفوظ پاتا ہوں۔ انھیں وہیں چھوڑ دیتا ہوں اور جیب سے ہاتھ باہر نکال لیتا ہوں۔ لیکن وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ہر جگہ اور ہر وقت میرے ساتھ لگا رہتا ہے۔ اپنی رٹ پر اٹل اُسے مطمئن کرنا بھی بڑا مشکل کام ہے ـــــــ

یہاں آکر بھی میری پیاس کم نہیں ہوئی۔ حلق اُسی طرح خشک ہے۔ سوچتا ہوں کہ سمندر کی عمیق گہرائیوں میں اُتر جاؤں اور اپنی پیاس بجھاؤں کہ ضرورتوں کی تکمیل بہر حال کرنی ہی ہوگی۔ اور تب ہی احساس ہوا کہ ذہن سے ضرورتوں کا دباؤ کم ہو چلا ہے۔ ایک گونہ سکون کا احساس لئے آگے بڑھ جاتا ہوں سمندر اُسی طرح چنگھاڑتا رہتا ہے۔ پہلے سہم جاتا ہوں۔ پھر آگے بڑھتا ہوں۔ اور کودنے ہی والا ہوں کہ "وہ" پھر اُسی طرح بڑبڑانے لگتا ہے۔ اُسے یہاں پاکر میرا دماغ بھنّاتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور میں بنا کچھ سوچے سمجھے سمندر میں چھلانگ لگا دیتا ہوں۔ پہلے ہلکی سی ٹھنڈک محسوس کرتا ہوں۔ پھر ہلکی ہلکی نرم آنچ کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن نمی اور گیلاپن کے احساس سے ابھی بہت دور ہوں۔ میرا جسم اور کشادہ ہونا چاہتا ہے کیوں کہ PASSAGE کی کمی بھی نہیں۔ آج ہمیں معلوم ہوا کہ سمندر کے اندر بھی ایک لامحدود SPACE ہے۔ پھر دوریوں کا حساب کرتا ہوں کہ اس زیرِ آب SPACE میں کتنا لمبا سفر طے کر گیا جب جگہ کافی ہو تو کوئی بھی عمل کسی بھی پابندی کا شکار نہیں ہوتا میں ان گنت بار پانی کے لہروں کے [باقی صفحہ ۳۲ پر]

مدحت الاختر

غزل

پنبہ در گوش ہے ہر شخص یہاں کون سُنے گا
میں سناتا ہوں مگر قصۂ جاں کون سُنے گا

جشن کی رُت میں حکایاتِ گزشتہ کو نہ چھیڑو
مرگِ انبوہ کا فرسودہ بیاں کون سُنے گا

سب کو لے جائے گا آثارِ بلا خیز کا لاوا
نظر آتا ہے پہاڑوں پہ دھواں کون سنے گا

اپنی آواز سے بہرے ہوئے جلتے ہیں جہاں سب
ایسے عالم میں صدائے دگراں کون سُنے گا

ہر در و بام پہ آسیب کی تحریر لکھی ہے
میں سُناتا ہوں اسے پڑھ کے کہاں کون سُنے گا

میں بھی محدود، مرا ذہن بھی محدود ہے مدحت
میری آواز گراں تا بہ کراں کون سُنے گا

صفدر

غزل

ریتوں میں ہوگئی ہیں جذب اُڑتی بدلیاں
جی اُٹھیں گی نرم پتلی سبز کومل پتیاں

دسترس میں ہیں مگر میں جان کر چھوتا نہیں
رنگ بھرتی ہیں فضا میں خواہشوں کی تتلیاں

رات وہ سمجھی ہوا کے کان بہرے ہوگئے
اور جب انگڑائی ٹوٹی بج اُٹھی ہیں چوڑیاں

سطح پہ پڑتے پھسل جاتی ہیں کرنیں ان دنوں
روشنی سے کھیلتی ہیں چھپا تی کرسیاں

یوں سمجھ لو جیسے رستہ دیں ہوائیں تیر کو
مشکلوں میں یوں ہٹے احباب جو تھے درمیاں

ند پرکاش شاد

زل

بصد زعم آپس میں ٹکرائیں گے
جزیرے دھواں دھول بن جائیں گے

بہاریں سبھی عکس لے جائیں گے
کبھی جھیل جھرنے بھی کام آئیں گے

گزر جائیں گے سینکڑوں قافلے
اُفق پھر خمیدہ ہی رہ جائیں گے

کسی کرب کی دل میں صدیاں لئے
گپھا در گپھا ہم بکھر جائیں گے

یہ دیوار یہ فرش یہ دھوپ چھاؤں
یہ زینے کہاں ہم کو پہنچائیں گے

کسی ضد میں اَٹکے رہیں گے کہیں
ہم اپنی صدا کے نہ کام آئیں گے

نہ ہم ڈھونڈنے جائیں گے خود کو بھی
کہ یہ راستے ہم نہ دہرائیں گے

خود اپنے کو دیکھیں گے پانی میں ہم
تو گھبرا کے ننگے ہی لوٹ آئیں گے

نہ بیٹھے رہو تم اسی [illegible] د ہم میں
کہ اُڑتے پرندے خبر لائیں گے

احمد تبسم

غزل

مصیبتوں کا نہ ٹوٹے گا سلسلہ اب سے
پگھل چکی ہے مری شام گرمیٔ شب سے

برہنہ مورتی میں نے تراش لی جب سے
مرا خلوص بڑھا پتھروں کے مذہب سے

کسی اسیر پرندے کی بے بسی کی طرح
دبی ہیں سینے میں مجروح خواہشیں کب سے

مری صدا پہ مخاطب نہ ہو سکا کوئی
میں اپنی داستاں کہتا ہی رہ گیا سب سے

کبھی تو میرا تصور بھی روپ دھارے گا
لکیریں کھینچ رہا ہوں میں خاص مطلب سے

سڑک پہ روز نئی واردات ہوتی ہے
مسافروں کی بہت بھیڑ بڑھ گئی جب سے

پٹک دیا ہے کتابوں کو میز پر اس نے
بہت تھکا ہوا لوٹا ہے آج مکتب سے

کِس کی کہانی

کلام حیدری

ابھی ابھی اپنے مکان کے پھاٹک پر جس نوجوان آدمی سے ملاقات ہوئی ہے اور جیسے کہ میں گھر کے اندر آ گیا ہوں وہ ——!

وہ میری بہن تھی، میری باجی کہ جب گرمیوں میں آندھیاں چلتیں تو ہم کھلی چھت پر بچھی ہوئی چارپائیوں پر سے ہڑبڑا کر اُٹھتی ہوئی ماؤں، خالاؤں اور پھوپھیوں کو چھوڑ کر سیدھے بستی کے کنارے والے آم کے اس باغ میں بھاگ جاتے جس کے کنارے ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی ——

میں اُس نوجوان کو نے کر اپنے ڈرائنگ روم میں آ گیا ہوں اور اپنی بیوی کو آواز دی ہے، بھئی دیکھو، کون آیا ہے ——

اُس باغ کے ایک ایک پیڑ کو ہم پہچانتے تھے، اس زمانے سے پیڑ کی اموریاں میٹھی ہوتی ہیں۔ اس پیڑ کی، جس کی ڈال پانی میں جھکی ہوئی ہے، میٹھی ہوتی ہیں۔ آندھیوں میں مستی سے جھولتے ہوئے پیڑوں سے اموریاں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی رہتی ہیں اور میری بہن اپنے چھوٹے سے دوپٹے میں اموریاں جمع کرتی جاتی ہے۔ اور میں اپنی جیبوں میں اموریاں اڑستا رہتا ہوں۔

میری بیوی ڈرائنگ روم میں آ گئی ہے اور وہ نوجوان اُٹھ کر کھڑا ہو گیا ہے، پھر دونوں بیٹھ گئے ہیں اور ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں، مگر ان میں کوئی کسی کو پہچانتا نہیں ہے ——

آنگن میں جھلنگ چارپائی پر چنے کے ستو کی روٹی کھاتے کھاتے میری بہن جو ہر وقت محض ڈیڑھ سال بڑی ہونے کے گھمنڈ میں رہتی ہے، پہلے ڈانٹتی ہے پھر میرے ہاتھ سے میری رکابی چھین کر مجھے ایک تھپڑ مارتی ہے اور میں چیخنے لگتا ہوں ——

"دیکھو —— یہ تمہاری ——" وہ نوجوان میرا جملہ پورا کر دیتا ہے۔

میری بیوی اُٹھ کر نوکر کو کچھ کہنے چلی گئی ہے شاید کھانا لگانے کے لئے کیونکہ اب دو بج رہے ہیں۔

چاندنی چھٹکی ہوئی ہے، آسمان بالکل صاف ہے، میں ایک ہی چارپائی پر اپنی بہن کے ساتھ لیٹا ہوا ہوں مگر میرا مُنہ ایک طرف کو ہے اور میری بہن کا مُنہ دوسری طرف کیونکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے روٹھے ہوئے ہیں، میرے دل میں اس وقت غصّے سے زیادہ یہ غم ہے کہ باجی مجھ سے بات نہیں کر رہی ہیں اور مجھے لگتا ہے ... کا کوئی مطلب نہیں ہے، باجی اگر روٹھی رہیں تو پھر —— پھر میں کیا کروں گا؟

کہ اچانک ہماری بلّی اُچک کر ہم دونوں کے بیچ میں آ جاتی ہے، ہم نے کروٹ بدلی اور نگاہیں چار ہوئیں۔ باجی مسکرا کر مجھے دیکھتی ہیں۔ میں اُن میں لپٹ کر سسکنے لگتا ہوں ——

میرا بابو —— تم شرارت کیوں کرتے ہو اور باجی میرا سر سہلانے لگتی ہیں اور بہت زور سے لپٹا کر پیار کر رہی ہیں۔ مجھے لگتا ہے میرے اندر کا لاوا پھوٹ چکا ہے اور میں باجی کی گردن میں دونوں ہاتھ لپیٹ کر روئے چلا جا رہا ہوں، باجی کی آنکھوں میں بھی آنسو ہیں کیونکہ میں اپنی پیشانی پر نمی اور ٹھنڈک محسوس کر رہا ہوں۔

کھانا کھانے کے بعد وہ نوجوان میرے ساتھ اس کے ... میں

...بیٹے اُس کے آنے کے منتظر کیا ہے۔

وہ پلنگ پر بیٹھا تا ہے اور میں اس آرام کرسی پر جو بڑی آرام دہ
...تک میں کوئی بات کچھ نہیں پوچھ سکا ہوں۔ کیونکہ
...سال پہلے کی بات اس سے کیا پوچھوں جس کی عمر ہی بیس
ہو۔

تم آرام کرو۔ میں بھی سونے جا رہا ہوں۔"

اکمس کی چھٹیوں میں باجی کے بغیر جی نہیں لگتا اور جب
...کے پاس پہنچا ہوں تو باجی نے مجھے دبوچ لیا۔ سب لوگ
...پانچ پانچ دن پہلے آ گئے اور یہ بدمعاش اب آیا ہے۔ دو
...رسیادل بنایا اور مربا دیکھا۔

باجی نے دس دنوں میں کیا کیا نہیں پکایا۔ رسیادل،
...کی روٹی، پیٹھا، اور ——— اور ———

باجی رات میں اٹھ اٹھ کر میرا بخار دیکھتی رہیں۔ میرا بدن
جل رہا ہے۔ اور باجی کا ہاتھ پیشانی پر ایسا لگتا جیسے
...نے ٹھنڈی پٹی رکھ دی ہو۔

اور اس نوجوان کی اب آنکھ لگ رہی ہے اور اب پونے
...بج چکے ہیں، میں چھت کو دیکھنے لگا ہوں۔

...سیم بھات کھانے کی خواہش کو باجی نے پڑھ لیا ہے، اور
...کے پچھواڑے والے کھنڈر میں سیم کی لتوں سے باجی سیم توڑ رہی
اور میں اُنہیں جمع کر رہا ہوں، باجی کے بال منتشر ہو گئے ہیں۔
...دھوپ میں ان کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے، کبھی جھک کر، کبھی کھڑی ہو کر
...چن چن کر سیم توڑ رہی ہیں۔

" ہمایوں کا نمبر جو تم نے بھیجا تھا وہ بس چار دنوں میں ختم
گیا۔"

" آپ تو بس پرچہ ہاتھ میں لیتے ہی پڑ پڑتی ہیں۔"

یہ نوجوان جس کی آنکھیں سوتے ہوئے میں بھی خوبصورت
...دکھ رہی ہیں اب مکمل طور پر سو رہا ہے، کتنا مناسب قد، کتنا
...کھرا ہوا رنگ، کیسی خوبصورت پیشانی ———

کالج کے گیٹ پر گندم رنگ کا لمبا سا دبلا پتلا نوجوان
جو کھڑا ہے، یہ کون ہے، یہ کالج اور شہر ہی نہیں اس صوبے کا مشہور
کھلاڑی ہے۔ فٹ بال کی دنیا کا شہزادہ ہے۔ یہ مجھے دیکھ کر مسکرا
رہا ہے اور میری طرف بڑھ رہا ہے۔

" میں نے کل تمہارے پاس آنے کے لئے کہا تھا مگر مجھے ضروری
کام پڑ گیا، میں آج مونگیر جا رہا ہوں۔ ایک میچ ہے۔"

اس نوجوان کے ہونٹوں پر میں نے مسکراہٹ کے سوا
کچھ کبھی نہیں دیکھا، اسمارٹ، کھلا ہوا یہ نوجوان ———

اسے میں نے کئی بار کئی آدمیوں کے کندھے پر سوار دیکھا ہے
ادھر اسکور ہوا اور اسے لوگوں نے کندھوں پر اٹھا لیا۔ خوش پوش
خوش گفتار اور خوش مزاج یہ نوجوان کافی ہاؤس میں دوستوں
کے ساتھ بیٹھا ہوا ممتاز اور منفرد لگ رہا تھا۔

بیڈ پر سویا ہوا یہ گورا سا حسین نوجوان بڑا منفرد سا لگ
رہا تھا۔ ایک ہاتھ جو اس کے سینے پر پڑا ہوا ہے ———

یہ ہاتھ میں نے کہیں دیکھا ہے، یہ ہاتھ ——— ہاں
ایسا ہی جوان ہاتھ میں نے کہیں دیکھا ہے، اس ہاتھ کو میں نے
محسوس کیا تھا، اس ہاتھ کی مسیحائی دیکھی ہے، اس ہاتھ کو جھاڑیوں
سے الجھتے دیکھا۔ اس ہاتھ کا مردانہ پن ——— میں نے ہاتھ کے
اس مردانہ پن کو بھی دیکھا ہے مگر وہ ہات کی خوب صورتی کے ساتھ
یوں لپٹا ہوا نہ تھا۔ یہ نوجوان شاید بے حد تھکا ہوا ہے۔ اس
آرام کرسی پر مجھے نیند آ جائے گی۔ کیونکہ ——— کیونکہ ———
میں جس تانگے پر جا رہا ہوں، اچانک اس سے لڑھک کر
سڑک پہ جا پڑا ہوں اور میرے ساتھ تین اور آدمی بھی ——— میری
کہنیاں پھوٹ گئی ہیں اور داہنے پاؤں میں موچ آ گئی ہے، اور
ابھی ———

اور ابھی تین میل کا سفر باقی ہے۔

اور پچھلے تین دنوں کے اودھم اور ہنگامے میرے ذہن میں
بالکل تازہ ہیں۔ کالج کے گیٹ پہ غیر ملکی سفید فام سپاہی کے

نیز دو [illegible] ہلاک چار نوجوانوں کے چہرے میرے سامنے ہیں، شہر میں کرفیو ——— بھگدڑ، جدوجہد اور ———

میں آگیا ہوں باجی ۔ میں آگیا ———

باجی، جنھوں نے کئی دنوں سے کھایا نہیں تھا، کیوں کہ اُس کا بھائی نہیں آیا تھا، کیونکہ اُس کا بھائی ———

کیوں کہ اس کا بھائی اس کے پاس نہیں تھا اور ہزاروں قسم کی تشویش اس کے ذہن سے لپٹی ہوئی تھیں ۔

میں لنگڑاتا سہی ۔ مگر آگیا ہوں باجی ۔

کئی دنوں سے فاقہ کرتی ہوئی باجی نے تشویش کے سنپولوں کو اپنے ذہن سے نوچ نوچ کر پھینکا ۔ اور اٹھ کھڑی ہوئیں ———

میرا بابو ———

باجی زار وقطار رو رہی تھیں اور اس کے پاؤں گرم پانی سے بھرے کٹھوت میں رکھ کر دھو رہی تھیں اور ہلدی چونا لگا رہی تھیں اور اپنے کیا پر بڑبڑا رہی تھیں کہ وہ موچ ٹھیک کرنے والے حجام کو ابھی تک نہیں لایا تھا ۔

باجی آپ کھا لیجئے ———

چلو پہلے تم لیٹ جاؤ، میں گاؤں میں بھی کیا فاقہ کرتی رہتی ہوں ۔ کیا کھاؤ گے ؟ ستو کی روٹی ——— ؟ باقرخوانی ؟

"باجی ———" میں پتہ نہیں کیا کہنا چاہ رہا تھا ۔

سیلنگ فین پر نظریں گاڑے میں سوچ رہا ہوں ۔ یہ خوبصورت نوجوان کیسی میٹھی نیند سو رہا ہے، جانے کتنے مہینوں کے بعد اسے یہ نیند میسر آئی ہے کیونکہ ——— پچھلے کئی مہینوں ———

چند دنوں میں آدمی لُٹ جاتا ہے، آدمی ٹوٹ جاتا ہے آدمی اپنے اور پرا ور سبھوں پر اعتماد کھو دیتا ہے، خطروں میں گھرا ہوا آدمی مہینوں میں کیا ہو جائے گا ۔ مہینوں، اعصاب تنا ؤ سے تھک کر ٹوٹ جاتے ہیں، ذہن چٹک چٹک کر ———

کس پر بھروسہ کرو گے، [illegible] یقین پر، سامنے سے گزرتے ہوئے [illegible] لمحات پر چیختی پکارتی ہوئی نیم زندگی پر، [illegible] کس پر ———

کس پر بھروسہ کرو گے ؟

سرخ جوڑے میں ملبوس باجی کا چہرہ [illegible] گیا ہے، شہنائیوں کی لمبی تانوں کی ڈور پر [illegible] باجی کہاں جا رہی ہیں ؟

باجی ——— میرا دل بیٹھا جا رہا ہے، باجی میں تمہارا بھائی اس بار بھی کھیت پر کھڑا حیرانی سے تمہارا ڈولا جاتے ہوئے کھیت، آری کو دیکھ رہا ہوں ۔ کھیت کی آری، ٹیڑھی میڑھی سی لگتی ہے کوئی سانپ ہے، تمہارا ڈولا چھوٹا ہوتا جا رہا ہے، باجی راستے تمہیں تمہارے ڈولے سمیت نگل رہا ہے ———

اگر اس سوئے ہوئے نوجوان کو حالات نگل لیتے ۔ اگر یہ نوجوان حالات کے اژدہوں سے بچتا بچاتا یہاں تک نہ پہنچ پاتا ———

میرا جی چاہ رہا ہے میں اسے چوم لوں ۔ کیونکہ یہ پیشانی میری جانی پہچانی ہے، یہ بال میرے چھوئے ہوئے ہیں، یہ خوبصورت ناک میری دیکھی ہوئی ہے ۔

وہ تمہارا کون تھا باجی ۔ وہ مدھم رنگ کا لمبا سا خوبصورت اسمارٹ نوجوان وہ تمہیں لے گیا، کیونکہ مجھے ———

مجھ سے اس نے بہت پہلے ہی کہا تھا کہ میں تمہاری باجی کو لے جاؤں گا کیوں کہ میں تمہاری باجی کو بہت چاہتا ہوں ۔

مجھے بھی وہ نوجوان بہت چاہتا ہے باجی ۔ اُس نے مجھے کئی بار سینما دکھلایا ہے ۔ کئی بار چھیدی فالودے والے کے یہاں فالودہ کھلایا ہے اور باجی وہ ہمیشہ مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھتا رہتا تھا ۔

مخصوص یونیفارم میں کھڑا ہوا نوجوان مجھے بہت اچھا

وہ پیڑ کی طرح بہت تھا ——

مگر بہت پریشان ہوا ہوں اور مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔
بہت روئی تھی کہ جب پیڑ پر آندھی آ گئی ہے، اور
کے اس کنارے پر آ ہستہ کے پیڑوں سے کئی میٹھی امبوڑیاں گرتی ہیں

——

میرا جی چاہتا ہے تمہارا کا باغ میں جاؤں۔ مگر تمہارا
نہیں ہے، امبوڑیاں کہاں رکھوں گا۔
تمہارے سرخ جوڑے امبوڑیوں کو ترس رہے ہوں گے،
سے روٹھ کر اپنا منہ چارپائی کے ایک طرف کر لوں تو تم —
کہاں ہو، میں کس سے لپٹ کر روؤں ——
میرے تمہارے بیچ میں سرحد آ گئی — اس سرحد پر کوئی
یا کوئی کہ میں بھی کروٹ بدلوں اور تم بھی، اور تم مسکرا کر
کھیوا دو میں پھوٹ کر رو دوں اور پھر تمہاری دونوں بھیگی آنکھیں
پیشانی کو بھگونے لگیں اور میں تمہاری تھپکیوں سے سو جاؤں۔
اس آرام کرسی کے بازوؤں پر تکیہ کر کے میں سونا چاہ رہا ہوں
ری آنکھوں سے نیند جانے کہاں غائب ہو گئی ہے؟ کیوں کہ
نے یہ نوجوان میری آنکھوں کو بند نہیں ہونے دے رہا ہے —
نے کہاں دیکھا ہے؟ مجھے یاد نہیں پڑتا، اس کا کوئی زاویہ
ہے ایک دم سے میرا جانا پہچانا ہے، پھر —— پھر دوسرا
جاتا ہے، کہیں پر کچھ، کہیں پر کچھ ——
سرحدوں کی بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے، کیوں کہ آدمی
کی دوری محض سرحدوں سے نہیں ہوتی، کوئی ایک سرحد تو
— حدِ نظر تک لکیریں ہی لکیریں ہیں، کس کو سرحد کہیے
و بے معنی لکیر ——
ہم تو ان لکیروں کے بیچ گم ہو گئے، ہم کہاں ہیں —
میں اس بیڈروم میں ہوں جس میں یہ نوجوان سویا ہوا ہے
تم کہاں ہو؟
تمہارے خوابوں کا وہ شہزادہ کہاں ہے؟

تم گھر میں بند ہو کیوں کہ شہر کی سڑکیں اور گلیاں تمہارے لئے
اچانک اجنبی ہو گئی ہیں، کیوں کہ ——
تمہارے بال زیادہ تر پک گئے ہیں۔
کیوں کہ اچانک ایک نئی لکیر نے ان پر سفیدیاں مل دی
ہیں ——
تمہاری خوب صورت بڑی بڑی غلافی آنکھیں دھندلے
غار بن گئے ہیں۔
کیوں کہ بدلی ہوئی دنیا کو دیکھنے کے لئے وہ خوب صورت
آنکھیں تیار نہ تھیں۔
میری آنکھوں سے آنسو باہر نکل آئے ہیں اور اپنی بیتی پر
ماتم کر رہے ہیں کیونکہ ان کو تمہارا آنچل میسر نہیں ہے۔ ایسا کب ہوا ہے
کہ انہوں نے تمہارے آنچل میں جگہ نہ پائی۔
اس سوئے ہوئے نوجوان نے کروٹ بدل لی ہے اور
اب اس کی پیٹھ میرے سامنے ہے، سینڈو گنجی سے اس کا بدن
مجھے اپنی بناوٹ سمیت نظر آ رہا ہے۔ یہ پیٹھ میری دیکھی ہوئی ہے۔
کہیں دیکھی ہے۔ کسی فٹ بال کے میدان میں — کسی
کالج کے گیٹ پر —— کہیں دیکھا ہے۔ سڈول اور
خوب صورت شانوں کے ساتھ یہ پیٹھ میں نے بارہا دیکھی ہے —
کہاں ——؟
میرے آنسو میری گود میں گر رہے ہیں کیوں کہ ان کو پونچھنے
سے میری آنکھوں نے انکار کر دیا ہے۔ کیوں کہ ان آنکھوں میں نیند
بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ ان آنکھوں میں جو ماضی ہے وہ پکا ہوا پھوڑا
بن کر اب بہ گیا ہے، مگر کون جانے وہ ماضی ہے —— یا حال ہے
جو ان آنکھوں سے بہ نکلا ہے۔
کون جانے یہ سویا ہوا نوجوان ماضی ہے، یا حال ہے یا
مستقبل ہے۔ کیوں کہ کہیں پر سے یہ پہچانا ہوا جان پڑتا ہے کہیں
پر سے یہ اجنبی ہے، کہیں پر سے یہ مردانہ ہے، کہیں پر سے نسائیت
اور مردانہ پن دونوں پھوٹ رہا ہے۔

میں اب برداشت نہیں کر سکتا میں زور سے سسکیاں لینے لگتا ہوں۔ میں زور سے رونے لگا ہوں۔ میں اس نوجوان سے لپٹ کر رو رہا ہوں جو جاگ گیا ہے اور حیران نظروں سے دیکھ رہا ہے۔

تم ۔ میرے بیٹے ہو ۔ میرے بھانجے ہو ، میری باجی ہو ۔ میرے دولھا بھائی ہو ۔ تم ۔ اکیلے تم ۔ اکیلے تم میرے دولھا بھائی ہو ، میری باجی ہو۔ میرے بیٹے بھی ہو ، میرے بھانجے بھی ۔ تم ماضی بھی ہو ، تم حال بھی ہو ۔۔۔۔۔ تم مستقبل بھی ہو ۔۔۔۔۔ میں ۔ میں اب بے ہوش ہو رہا ہوں کیا ۔۔۔۔۔ ہائے

●●

بقیہ : شعور کی رو

نوجوان STEPHEN DEDALUS کو اپنے گھر لاتا ہے اور گھر میں اس نوجوان کی موجودگی ہی اس بات کا ضامن ہوتی ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات خصوصاً جنسی تعلقات بار آور ہو جائیں گے۔

[اپنی تلمیحات، اپنی مشکل پسندی، گرامر کے توڑ مروڑ اور الفاظ کی نئی بندشوں کی وجہ سے یہ ناول دقیق معلوم ہوتا ہے۔ پر اگر ہم کسی ایک کردار کی شعور کی رو میں داخل ہو جائیں تو پرواز اسی طرح آسان ہو جائے گی جیسے GLIDER ہوا کی رو میں داخل ہو کر خود بخود اڑتا رہتا ہے۔]

جوائس ایک عظیم فنکار ہے اس لئے نہیں کہ وہ شعور کی رو میں بہتا رہا بلکہ اس لئے کہ اس نے اس اسٹائل کو اپنی کٹھ پتلی بنایا۔ اور ایک مقبول دنیا رزمیہ (ODYSSEY) کے ٹھوس ڈھانچے پر ناول کی ظاہری بے راہ روی کو باندھا اس ٹھوس ڈھانچے کے پیچھے ایک ٹھوس مذہبی عقیدہ بھی ہے۔

تنہائی کا علاج ممکن ہے۔ عشق کی صلاحیت پیدا کیجئے۔

●●

بقیہ : سیڑھیاں

"ہاں صاحب ہر ماہ ساڑھے چار سو روپے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ کا گذر بسر تو ہو ہی جائے گا۔ آپ مہربانی فرما کر اپنا یہ کمیشن ہمیں دے دیں۔"

پتہ نہیں کتنی دیر تک میں سوچتا رہا۔

"ٹھیک ہے صاحب۔" میں صوفہ سے اٹھتا ہوا بولا "کمیشن ملتے ہی میں آپ کو لوٹا دوں گا۔"

"شکریہ شنشی صاحب۔" مسز ... مجھے دروازہ تک چھوڑنے آئیں۔ مجھے دروازہ بند ہونے کی آواز بھی سنائی نہ دی۔ میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔!

●●

بقیہ : تناؤ

دوش پر آتا رہا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ میرے اس عمل سے پانیوں میں خاصی تمازت پیدا ہو گئی۔ جس کے سبب کافی زوروں کا اُبال آیا۔ جیوں ہی اُبال آیا میں تھوڑا اچھل گیا پھر تھوڑا سکڑ گیا۔ مگر پانی گرم تھا اور برداشت سے باہر بھی۔ اس لئے جلد ہی ہمیں اپنا سفر ختم کر دینا پڑا۔ کیوں کہ سفر کی کوئی منزل بھی نہیں کہیں تھی۔

اور تب ہی آتے جاتے لمحوں کے درمیان کا بیچ زمان منقطع ہو گئی کہ بہر حال ایسا ہونا تھا اور پھر مردوں کا دباؤ جیسے بھی کم ہو گیا۔ کیونکہ احساسات کے CAPSULES بخرات کی بانبی میں سمٹے تھے۔

●●

غزلیں

سین

ان بستیوں سے دور کہیں جنگلوں کے بیچ
شاید وہیں سکون ملے جھاڑیوں کے بیچ

دھندلی وہ روشنی ہے ستاروں کی اب کہاں
اکتا گیا ہوں رہتے ہوئے گلشنوں کے بیچ

کوئی ہٹائے جسم کا جز دان دیکھ لے
سیپارۂ وجود ہے شیدائیوں کے بیچ

دنیا کی زندگی ہے کڑا امتحاں مگر
وہ گپ لڑا رہے ہیں کہیں دوستوں کے بیچ

اب آ چکو کہ جانے کا ہنگام آ گیا
اک شخص گھر گیا ہے کئی راستوں کے بیچ

نسیم چمن

چھوڑ آئے ہیں ابھی کچھ آگ میں جلتا ہوا
اب نہ آئے گی کسی کے دل دھڑکنے کی صدا

گھر مرا تنہائی میں روحوں کا مسکن بن گیا
اور میں نائٹ کلب میں کیبرے دیکھا کیا

سنگ مرمر کی زمیں پر چت پڑا میرا بدن
جیسے ہاتھوں میں کسی کے اک کھلونا کانچ کا

آگے بڑھتے ہیں نہ اب یہ پیچھے ہٹتے ہیں قدم
گھر سے نکلا تھا کہ اک دم دلدلوں میں پھنس گیا

اب کوئی کیسے سنے گا اس کی میری گفتگو
کاٹ ڈالا فون کے تاروں کا میں نے سلسلہ

میں مخاطب ہونے ہی والا تھا اس سے بھیڑ میں
جانے کس جانب سے اک پتھر مجھے آ کر لگا

اقبال اشہر

غزل

ہے سب کو دُھن شکار کی کس کو یہ دھیان ہے
وہ شاخ کھوکھلی ہے کہ جس پر مچان ہے

اک بار چوم لوں در و دیوار تو چلوں
جیسا بھی ہے یہ میرا پرانا مکان ہے

خود اپنا عکس دیکھ کے چکرا گیا ہوں میں
آئینہ دیکھنا بھی کڑا امتحان ہے

میں خود ہی زہر اس کے پیالے میں گھول دوں
اور خود ہی یہ کہوں وہ بہت بدزبان ہے

فی الحال تو زمیں پہ ہے اس بات کو نہ بھول
معلوم ہے تری بہت اونچی اُڑان ہے

مظفر النساء ناز

غزل

اک قافلہ منزل کے لئے اب بھی رواں ہے
لیکن تمہیں حالات کا اندازہ کہاں ہے

ہنگامہ پسندی ہے نئے دَور کی تقدیر
ہر لمحۂ خاموش مرے دل پہ گراں ہے

ٹھہرے ہوئے لوگوں کا کوئی ساتھ نہ دے گا
اے وقتِ گریزاں! ترے چہرے سے عیاں ہے

وہ چشمِ کرم، جو کبھی مانوسِ وفا تھی
سنتے رہیں کہ وہ آج تلک بھی نگراں ہے

رُکنا مرا مقصد نہیں میں چل تو رہی ہوں
وہ لغزشِ پا اب مرے ہمراہ کہاں ہے

کب تک کوئی احساس کی گرمی سے جلے ناز
یہ کیسی لگی آگ کہ شعلہ نہ دھواں ہے

ڈرامے

شہ مات ENDGAME

سیموئل بیکٹ

ترجمہ زاہدہ زیدی

سیموئل بیکٹ ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوا۔ لیکن اپنی شہرت کے لئے اسے ۱۹۵۳ء کا انتظار کرنا پڑا۔ جب اس کا ڈرامہ WAITING FOR GODOT اسٹیج کیا گیا۔ پھر وہ شہرت کی انتہائی منزلوں تک پہنچ گیا۔ اس سے پہلے لوگ اس کے نام تک سے واقف نہ تھے۔ شہرت کا یہ سلسلہ یہاں تک بڑھا کہ بیکٹ کو ۱۹۶۹ء کا نوبل پرائز ملا۔ جدید ڈرامے پر بیکٹ کے اثرات کافی گہرے ہیں۔ ایڈورڈ البی اور ہیرلڈ پنٹر نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ جدید اذہان پر بیکٹ کے اثرات دور رس ہیں۔ ناولوں میں بھی بیکٹ کا ایک خاص مقام ہے۔ جیمز جوائس کے بارے میں مشہور ہے کہ بیکٹ کے ناول MURPHY کا بڑا حصہ اسے زبانی یاد تھا۔ بیکٹ کے ناولوں میں WATT بھی بہت مشہور ہے MOLLY MALONE DIES اور THE UNNAMABLE بھی اسے بحیثیت ناول نگار اہم بناتے ہیں۔

بیکٹ کے ڈراموں میں "ویٹنگ فور گودو" کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔ "انڈگیم" کا ترجمہ "شہ مات" محترمہ زاہدہ زیدی نے کیا ہے۔ ترجمہ نہ صرف رواں دواں ہے بلکہ اصل ڈرامے کی حقیقی اسپرٹ بھی رکھتا ہے۔

لایعنی ڈراموں (ABSURD DRAMAS) میں "ویٹنگ فور گودو" کی اہمیت نمایاں ہے۔ "شہ مات" ان کی عظمت میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ یہ بیکٹ کے نقطۂ نظر کی وضاحت میں بھی معاون ثابت ہوا۔

ادارہ محترمہ زاہدہ زیدی کا ممنون ہے کہ انہوں نے اپنے ترجمہ کی اشاعت کے لئے "آہنگ" کو منتخب کیا۔ ہم اُن سے مزید تعاون کے متوقع ہیں۔

(ادارہ)

اقبال اشہر

غزل

ہے سب کو دُھن شکار کی کس کو یہ دھیان ہے
وہ شاخ کھوکھلی ہے کہ جس پر مچان ہے

اک بار چوم لوں در و دیوار تو چلوں
جیسا بھی ہے یہ میرا پُرانا مکان ہے

خود اپنا عکس دیکھ کے چکرا گیا ہوں میں
آئینہ دیکھنا بھی کڑا امتحان ہے

میں خود ہی زہر اس کے پیالے میں گھول دوں
اور خود ہی یہ کہوں وہ بہت بد زبان ہے

فی الحال تو زمیں پہ ہے اس بات کو نہ بھول
معلوم ہے تری بہت اُونچی اُڑان ہے

مظفر النساء ناز

غزل

اک قافلہ منزل کے لئے اب بھی رواں ہے
لیکن تمہیں حالات کا اندازہ کہاں ہے

ہنگامہ پسندی ہے نئے دَور کی تقدیر
ہر لمحۂ خاموش مرے دل پہ گراں ہے

ٹھہرے ہوئے لوگوں کا کوئی ساتھ نہ دے گا
اے وقتِ گریزاں! ترے چہرے سے عیاں ہے

وہ چشمِ کرم، جو کبھی مانوسِ وفا تھی
سنتے ہیں کہ وہ آج تلک بھی نگراں ہے

رُکنا مرا مقصد نہیں میں چل تو رہی ہوں
وہ لغزشِ پا اب مرے ہمراہ کہاں ہے

کب تک کوئی احساس کی گرمی سے جلے ناز
یہ کیسی لگی آگ کہ شعلہ نہ دھواں ہے

ڈرامے

شہ مات ENDGAME

سیموئل بیکٹ

زاہدہ زیدی

سیمول بیکٹ ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوا، لیکن اپنی شہرت کے لئے اسے ۱۹۵۳ء کا انتظار کرنا پڑا۔ جب اس کا ڈرامہ WAITING FOR GODOT اسٹیج کیا گیا۔ پھر وہ شہرت کی انتہائی منزلوں تک پہنچ گیا۔ اس سے پہلے لوگ اس کے نام تک سے واقف نہ تھے۔ شہرت کا یہ سلسلہ یہاں تک بڑھا کہ بیکٹ کو ۱۹۶۹ء کا نوبل پرائز ملا۔ جدید ڈرامے پر بیکٹ کے اثرات کافی گہرے ہیں۔ ایڈورڈ البی اور ہیرلڈ پنٹر نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ جدید اذہان پر بیکٹ کے اثرات دُور رس ہیں۔ ناولوں میں بھی بیکٹ کا ایک خاص مقام ہے۔ جیمز جوائس کے بارے میں مشہور ہے کہ بیکٹ کے ناول MURPHY کا بڑا حصہ اسے زبانی یاد تھا۔ بیکٹ کے ناولوں میں WATT بھی بہت مشہور ہے THE UNNAMABLE اور MOLLY MALONE DIES بھی اسے بحیثیت ناول نگار اہم بناتے ہیں۔

بیکٹ کے ڈراموں میں " ویٹنگ فور گودو " کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔ " انڈگیم " کا ترجمہ " شہ مات " محترمہ زاہدہ زیدی نے کیا ہے۔ ترجمہ نہ صرف رواں دواں ہے بلکہ اصل ڈرامے کی حقیقی اسپرٹ بھی رکھتا ہے۔ لایعنی ڈراموں (ABSURD DRAMAS) میں " ویٹنگ فور گودو " کی اہمیت نمایاں ہے۔ "شہ مات" ان کی عظمت میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ یہ بیکٹ کے نقطۂ نظر کی وضاحت میں بھی معاون ثابت ہوا۔

ادارہ محترمہ زاہدہ زیدی کا ممنون ہے کہ انہوں نے اپنے ترجمہ کی اشاعت کے لئے " آہنگ " کو منتخب کیا۔ ہم اُن سے مزید تعاون کے متوقع ہیں۔

(ادارہ)

کردار

۱ —— ہیم
۲ —— کلو
۳ —— نیگ
۴ —— نیل

سین :

ایک خالی کمرہ
سرمئی روشنی

پیچھے کی طرف دائیں اور بائیں کافی اونچائی پر دو کھڑکیاں جن پر پردے پڑے ہیں۔
سامنے دائیں طرف دروازے کے قریب لٹکی ہوئی تصویر، جس کا رخ دیوار کی جانب ہے۔
سامنے بائیں طرف، کوڑا ڈالنے کے دو بڑے کنستر، جو ایک دوسرے سے بالکل ملے ہوئے رکھے ہیں، اور ایک چادر سے ڈھکے ہوئے ہیں۔

سٹیج کے وسط میں ایک پہیوں والی کرسی پر ہیم بیٹھا ہے، اس پر ایک پرانی چادر پڑی ہوئی ہے — دروازے کے قریب کلو ساکت کھڑا ہے، اس کا چہرہ بالکل سرخ ہے اور نظریں ہیم پر گڑی ہوئی ہیں۔ تھوڑی دیر تک یہ ساکت منظر پیش نظر رہتا ہے۔

اس کے بعد کلو اپنی جگہ سے حرکت کرتا ہے اور بائیں طرف کی کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کی چال سخت مگر لڑکھڑائی ہوئی ہے۔ وہ سر اٹھا کر بائیں کھڑکی کو دیکھتا ہے۔ پھر مڑ کر دائیں کھڑکی کی طرف دیکھتا ہے۔ اس کے بعد وہ دائیں کھڑکی کے نیچے جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ سر اٹھا کر دائیں کھڑکی کو دیکھتا ہے اس کے بعد ہیم کو دیکھتا ہے۔ اس کے بعد دروازے سے باہر جاتا ہے۔ اور فوراً ہی ایک چھوٹی سی سیڑھی لیکر آتا ہے اور اسے لے کر بائیں کھڑکی کی طرف جاتا ہے۔ سیڑھی کو سٹینڈ کے سہارے، جو اسی میں لگا ہوا ہے

کھڑا کرتاہے اور اس پر چڑھتا ہے، کھڑکی کا پردہ ہٹاتا ہے، اور نیچے اُترتا ہے، اور دائیں کھڑکی کی طرف چھ قدم جاتا ہے اور پھر سیڑھی لینے کے لئے واپس آتا ہے۔ اسے لے کر پھر دائیں کھڑکی کی طرف آتا ہے۔ اور اس کے نیچے سیڑھی لگاتا ہے اس کے اوپر چڑھتا ہے۔ کھڑکی کا پردہ ہٹاتا ہے، اور نیچے اُترتا ہے، پھر تین قدم بائیں کھڑکی کی طرف جاتا ہے۔ اور پھر سیڑھی لینے کے لئے واپس آتا ہے، اسے لے کر پھر بائیں کھڑکی کی طرف جاتا ہے۔ اسے لگا کر اوپر چڑھتا ہے، اور کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھتا ہے، ہنستا ہے، نیچے اترتا ہے، اور ایک قدم دائیں کھڑکی کی طرف جاتا ہے۔ سیڑھی لینے واپس لوٹتا ہے، اسے لے کر دائیں کھڑکی کی طرف جاتا ہے، اور اسی طرح لگاتا ہے، اور اوپر چڑھتا ہے، دائیں کھڑکی سے باہر دیکھتا ہے، ہنستا ہے۔ نیچے اُترتا ہے، سیڑھی لے کر کوڑے کے کنستروں کی طرف جاتا ہے۔ رُکتا ہے، مُڑ کر واپس آتا ہے اور سیڑھی دائیں کھڑکی کے نیچے لگا دیتا ہے، اور کوڑے کے کنستروں کی طرف واپس جاتا ہے۔ ان پر پڑی ہوئی چادر ہٹاتا ہے اور اسے اپنے بازو پر لپیٹتا ہے، ایک کنستر کا ڈھکنا اُٹھاتا ہے، جھک کر دیکھتا ہے۔ ہنستا ہے۔ ڈھکنا بند کرتا ہے، دوسرے کنستر کا ڈھکنا اُٹھاتا ہے، جھک کر دیکھتا ہے۔ ہنستا ہے۔ ڈھکنا بند کرتا ہے، ہیم کی طرف جاتا ہے، اس کے اوپر پڑی ہوئی چادر اُٹھاتا ہے۔ اور اسے اپنے بازو پر لپیٹتا ہے، ہیم ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس ہے اس کے سر پر ایک چھوٹی سی سخت ٹوپی ہے، اور اس کے چہرے پر ایک بڑا سا رومال پڑا ہے، جس پر خون کے دھبے پڑے ہوئے ہیں، اس کی گردن سے ایک سیٹی لٹکی ہوئی ہے، اور گھٹنوں پر ایک چھوٹا سا کمبل پڑا ہے، وہ موزے پہنے ہوئے ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سو رہا ہے، کلو اس کی طرف دیکھتا ہے ہنستا ہے۔ دروازے کی طرف جاتا ہے۔ رکتا ہے۔ اور پھر حاضرین کی طرف مڑتا ہے

کلو [اس کی نظریں ایک طرف گڑی ہوئی ہیں اور لہجے میں یکسانیت ہے]

ختم ہوا۔ ختم ہو چکا۔ تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ یقیناً تقریباً، ختم ہو چکا ہو گا۔ (وقفہ) غلے کا ایک ایک دانہ، ایک کے اوپر ایک، اور پھر یکایک ایک ڈھیر۔ ایک چھوٹا سا ڈھیر۔ ناممکن۔ (وقفہ) اب مجھے اس سے زیادہ سزا نہیں مل سکتی۔ (وقفہ) اب میں باورچی خانے میں چلا جاؤں گا۔ جو دس فیٹ لمبا، دس فیٹ چوڑا اور دس فیٹ اونچا ہے۔ اور وہاں اس کے سیٹی بجانے کا انتظار کروں گا۔ (وقفہ) موزوں ہیں میں میز پر ٹیک لگا کر بیٹھوں گا، دیوار کی طرف دیکھوں گا اور اپنی سیٹی کے لئے سیٹی بجنے کا انتظار کروں گا۔

[وہ ایک لمحہ ساکت رہتا ہے، پھر باہر جاتا ہے، مگر فوراً ہی واپس آجاتا ہے، اور سیڑھی اُٹھا کر باہر جاتا ہے، (وقفہ)۔ ہیم حرکت کرتا ہے اور جمائی لیتا ہے، رومال اس کے چہرے پر پڑا ہوا ہے، چہرے سے رومال ہٹاتا ہے اس کا چہرہ بہت سرخ ہے اور وہ سیاہ رنگ کی عینک لگائے ہوئے ہے]

ہیم میں ...... (جمائی لیتا ہے) کھیل جاری ہے (رومال اُٹھاتا ہے) پرانے لہو روکنے والے! ..... [عینک اُتارتا ہے، آنکھیں اور منہ پونچھتا ہے، عینک صاف کرتا ہے، اور اسے دوبارہ لگا لیتا ہے، رومال کو احتیاط سے تہ کر کے اسے ڈریسنگ گاؤن کی اوپر کی جیب میں رکھتا ہے، اپنا گلا صاف کرتا ہے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے سرے ایک دوسرے سے ملاتا ہے] ۔ کیا کوئی مصیبت۔ (جمائی لیتا ہے)

میری مصیبتوں سے زیادہ بلند اور پاکیزہ ہو سکتی ہے؟
اس میں کوئی شک نہیں۔ اس سے پہلے۔ لیکن اب؟
(وقفہ)۔ میرا باپ؟ (وقفہ)۔ میری ماں؟ (وقفہ)
میرا کتا۔؟ (وقفہ) میں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ یہ
سب بھی غم اٹھاتے ہیں۔ جس حد تک اس قسم کی مخلوق
اٹھا سکتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان لوگوں
کے غم اور تکلیفیں میری مصیبت کے مقابل آ سکتی ہیں۔
اس میں کوئی شک نہیں (وقفہ)۔ نہیں۔ (جماہی لیتا
ہے) ہر چیز قطعی ہے۔ (فخر سے) انسان جتنا عظیم ہوتا
ہے (وقفہ)۔ (مایوسی سے) اور اتنی ہی کھوکھلا بھی
(آہ سے لمبا سانس لیتا ہے) کلوو۔ (وقفہ) نہیں
میں اکیلا ہوں (وقفہ)۔ کیا خواب تھے! وہ جنگل!
(وقفہ) لیکن بہت ہو چکا۔ اب یہ ختم ہونا چاہئے۔ اس
پناہ گاہ میں بھی .... (وقفہ) لیکن میں ڈرتا ہوں
اسے ختم کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ہاں تو یہ صورت حال
ہے۔ اب اسے ختم ہونا چاہئے۔ لیکن میں اسے ختم کرتے
ہوئے (جماہی لیتا ہے) اے خدا میں تھک چکا ہوں
میرے لئے بستر پر آرام کرنا بہتر ہوگا۔ (سیٹی بجاتا ہے
کلوو فوراً داخل ہوتا ہے اور کرسی کے قریب آ کر رکتا ہے)

کلوو میں نے ابھی ابھی تمہیں جگایا ہے۔

ہیم اس سے کیا ہوتا ہے؟

کلوو میں ہر منٹ تمہیں جگا اور سلا نہیں سکتا۔ مجھے اور بھی
کام ہیں۔ (وقفہ)

ہیم تم نے کبھی میری آنکھیں دیکھی ہیں

کلوو نہیں

ہیم کیا تمہارے دل میں کبھی یہ خواہش پیدا نہیں ہوئی کہ
جب میں سو رہا ہوں تو عینک اتار کر میری آنکھوں کو
دیکھو۔

کلوو پپوٹے پلٹ کر؟ ۔ (وقفہ) نہیں

ہیم کسی دن میں تمہیں اپنی آنکھیں دکھاؤں گا (وقفہ)
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالکل سفید ہو چکی ہیں۔ (وقفہ)
کیا وقت ہوگا۔

کلوو وہی جو ہمیشہ رہتا ہے۔

ہیم (دائیں جانب، کی کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)
کیا تم نے دیکھا ہے؟

کلوو ہاں

ہیم تو پھر؟

کلوو صفر

ہیم بارش ہونی ہی ہوگی

کلوو بارش نہیں ہوگی (وقفہ)

ہیم اس بات سے قطع نظر۔ تم کیسے ہو؟

کلوو میں شکایت نہیں کرتا۔

ہیم تم ٹھیک محسوس کر رہے ہو؟

کلوو (چڑھ کر) میں نے تم سے کہہ دیا، میں شکایت نہیں

ہیم میں کچھ عجیب سا محسوس کر رہا ہوں (وقفہ) کلوو

کلوو ہاں

ہیم کیا تمہارا دل نہیں بھرا

کلوو ہاں (وقفہ) کس چیز سے؟

ہیم اس سے — اس — اس چیز سے

کلوو میں تو ہمیشہ سے بیزار ہوں۔ (وقفہ)۔ کیا تم نہیں

ہیم (اداسی سے) اس صورت میں تو یہ کبھی نہیں بدلے گا۔

کلوو یہ ختم ہو سکتا ہے۔ (وقفہ)۔ تمام زندگی وہی سوال
وہی جواب!

ہیم مجھے تیار کرو۔ (کلوو اپنی جگہ سے نہیں ہلتا) جاؤ،
جا کر چادر لے آؤ۔
(کلوو حرکت نہیں کرتا)۔ کلوو

ہاں
میں اب تمہیں کھانے کے لئے کچھ نہیں دوں گا۔
تو پھر ہم مرجائیں گے
میں بس اتنا کھانے کو دوں گا کہ تم مر نہ سکو لیکن تمہیں
ہر وقت بھوک لگتی رہے۔
تو ہم نہیں مریں گے۔ (وقفہ) میں جاکر چادر لاتا ہوں
(دروازے کی طرف جاتا ہے)
نہیں (کلو و رکتا ہے) میں تمہیں ہر روز ایک بسکٹ
دیا کروں گا۔ (وقفہ) ایک اور آدھا (وقفہ) تم
میرے پاس کیوں رہتے ہو؟
تم مجھے کیوں رکھتے ہو؟
کیونکہ کوئی اور نہیں ہے
کیونکہ کوئی اور جگہ نہیں ہے
(وقفہ)
لیکن پھر بھی تم مجھے چھوڑنے والے ہو۔
کلو و میں کوشش کر رہا ہوں
ہیم تم مجھ سے محبت نہیں کرتے
کلو و نہیں
ہیم کسی زمانے میں تم مجھے چاہتے تھے
کلو و کسی زمانے میں
ہیم میں نے تمہیں بہت دکھ دئیے ہیں (وقفہ) کیا یہ ٹھیک
نہیں؟
کلو و یہ بات نہیں ہے۔
ہیم (انتہائی تعجب سے) کیا میں نے تمہیں دکھ نہیں دئیے؟
کلو و ہاں دئیے ہیں۔
ہیم (قدرے اطمینان سے) تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔
(وقفہ سرد مہری سے) معاف کرو۔
(وقفہ بلند آواز سے) میں نے کہا معاف کرو۔

کلو و میں نے سن لیا (وقفہ) کیا پھر خون نکلا ہے؟
ہیم پہلے سے کم (وقفہ) کیا ابھی سکون کی گولی کا وقت
نہیں ہوا؟
کلو و نہیں
(وقفہ)
ہیم تمہاری آنکھوں کی کیا حالت ہے؟
کلو و خراب
ہیم تمہاری ٹانگوں کا کیا حال ہے؟
کلو و خراب
ہیم لیکن تم چل پھر سکتے ہو؟
کلو و ہاں
ہیم تو پھر چلتے کیوں نہیں (کلو و پیچھے کی طرف جاتا
ہے اور اپنے ہاتھ اور ماتھا دیوار سے ٹکاتا ہے)۔
تم کہاں ہو؟
کلو و یہاں
ہیم واپس آجاؤ (کلو و واپس آتا ہے اور کرسی کے پاس
کھڑا ہو جاتا ہے) تم کہاں ہو؟
کلو و یہاں
ہیم تم مجھے قتل کیوں نہیں کر دیتے ہو؟
کلو و میرے پاس قتل گاہ کی کنجی نہیں ہے
ہیم جاؤ۔ جاکر بائیسکل کے دو پہئے لے آؤ
کلو و بائیسکل کے پہئے ختم ہو چکے ہیں۔
ہیم تمہاری بائیسکل کیا ہوئی
کلو و میرے پاس کبھی کوئی بائیسکل نہیں تھی
ہیم یہ ناممکن ہے
کلو و جب بائیسکلیں باقی تھیں تو میں بائیسکل لینے کے لئے
بہت رویا تھا۔ میں نے تمہارے پاؤں پر گر کر خوشامد
کی تھی۔ اور تم نے مجھ سے کہہ دیا تھا، جہنم میں جاؤ

اور اب بائیسکلیں ختم ہو چکی ہیں ۔

ہیم اور تمہارے وہ چکر ۔ ؟ جب تم میرے فلسوں کے معائنے کے لئے جاتے تھے تو کیا تم پیدل جایا کرتے تھے

کلوو کبھی کبھی گھوڑے پر بھی جاتا تھا ۔

[ایک کنستر کا ڈھکنا اٹھتا ہے اور نیگ کے ہاتھ نظر آتے ہیں جو کنستر کے کنارے کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے ۔ اس کے بعد اس کا سر نمودار ہوتا ہے وہ رات کی ٹوپی پہنے ہے اور اس کا چہرہ بالکل سفید ہے ۔ نیگ پہلے جمائی لیتا ہے اور پھر غور سے سنتا ہے]

کلوو اچھا اب میں جاتا ہوں ۔ مجھے اور بھی کام کرنے ہیں ۔

ہیم کیا باورچی خانے میں ؟

کلوو ہاں

ہیم اس گھر کے باہر موت کی راج دھانی ہے (وقفہ) اچھا ٹھیک ہے ۔ دفع ہو جاؤ (کلوو دروازے سے جاتا ہے) کام چل رہا ہے ۔

نیگ میرا حلوہ

ہیم منحوس باپ

نیگ میرا حلوہ

ہیم بوڑھے لوگ گھر پر پڑے ہیں ۔ شرافت کا کوئی وجود نہیں ؛ ہاں ہر وقت پیٹ پوجا ۔ ہر گھڑی چٹورا پن اس کے علاوہ تو یہ کچھ سوچ بھی نہیں سکتے ۔

(سیٹی بجاتا ہے کلوو داخل ہوتا ہے اور کرسی کے قریب آ کر رکتا ہے)

ہیم اچھا تم یہیں ہو ۔ میرا خیال تھا تم مجھے چھوڑ کر جا رہے ہو

کلوو نہیں ، نہیں ، ابھی تو اس کا کوئی سوال نہیں ۔

نیگ میرا حلوہ ۔

اسے حلوہ دے دو

حلوہ ختم ہو چکا ہے ۔

ہیم (نیگ سے) سن رہے ہو ، حلوہ ختم ہو چکا ہے تمہیں کبھی حلوہ نہیں ملے گا ۔

نیگ نہیں ۔ نہیں مجھے حلوہ چاہئے ۔

ہیم اسے ایک بسکٹ دے دو (کلوو جاتا ہے) منحوس! آوارہ! ۔ تمہاری مفلوج ٹانگیں کیسی ہیں ؟

نیگ میری ٹانگوں کی بات چھوڑو ۔ (کلوو بسکٹ لے کر داخل ہوتا ہے)

کلوو میں بسکٹ لے کر واپس آ گیا ۔

(کلوو نیگ کو بسکٹ دیتا ہے وہ اسے پکڑ کر سونگھتا ہے)

نیگ (رونی آواز میں) کس قسم کے بسکٹ ہیں ؟

کلوو سپارٹ درمیانی سائز کے ۔

نیگ (اسی طرح) بہت سخت ہیں ۔ مجھ سے نہیں چبائے جاتے ۔

ہیم اسے بند کرو

[کلوو نیگ کو کنستر میں دھکیلتا ہے اور ڈھکنا بند کر دیتا ہے]

کلوو (کرسی کے قریب آ کر) کاش کہ بڈھے سمجھ سکتے ۔

ہیم اس کے اوپر چڑھ کر بیٹھ جاؤ ۔

کلوو میں بیٹھ نہیں سکتا

ہیم اور میں کھڑا نہیں ہو سکتا

کلوو اس میں کوئی شک نہیں

ہیم ہر شخص کی ایک خصوصیت ہوتی ہے ۔ کوئی ٹیلی فون تو نہیں آیا (وقفہ) کیا ہم ہنس نہیں سکتے ؟

کلوو (کچھ سوچنے کے بعد) میرا دل نہیں چاہتا ۔

ہیم (کچھ سوچ کر) اور میرا بھی نہیں ۔ (وقفہ) کلوو

کلوو ہاں

ہیم فطرت ہمیں بھلا چکی ہے

کلوو اب فطرت نہیں ہے ۔

فطرت نہیں ہے ۔ ! نہیں تم مبالغے سے کام لے رہے ہو ۔

میرا مطلب ہے قرب و جوار میں ۔

ہم سانس لیتے، ہم میں تبدیلیاں ہوتی ہیں، ہمارے بال، ہمارے دانت، ہماری نوجوانی، ہمارے آئیڈیل، سب چیزیں ایک ایک کرکے ہمارا ساتھ چھوڑتی ہیں ۔

اس کا مطلب ہے کہ فطرت نے ہمیں نہیں بھلایا ۔

لیکن تم تو کہتے ہو فطرت نہیں ہے ۔

کسی ذی روح نے کبھی ہماری طرح ٹیڑھی میڑھی باتیں نہیں سوچیں ۔

جو ہم سے بن پڑتا ہے، ہم کرتے ہیں ۔

لیکن ہمیں یہ نہ کرنا چاہئے ۔ (وقفہ)

ویسے تو تم ٹھیک ٹھاک ہو ۔ ہیں نا

برادہ بن رہا ہوں

یہ کام تو بڑا سست رفتار ہے (وقفہ) کیا میری سکون کی گولی کا وقت نہیں ہوا ؟

نہیں ۔ اب میں جاتا ہوں ۔ مجھے اور کام کرنے ہیں

باورچی خانے میں ؟

ہاں

وہاں کیا کرتے ہو ؟ کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے

دیوار کی طرف تکتا ہوں

دیوار کی طرف ! اور تمہیں دیوار پر کیا نظر آتا ہے ؟

برہنہ بدن ؟

وہاں مجھے اپنی روشنی دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہے

تمہاری روشنی ؟ ۔ دم توڑتی ہوئی ؟ خوب ! بہت خوب !! تمہاری روشنی تو یہاں بھی دم توڑ سکتی ہے مجھے ذرا اچھی طرح دیکھو ۔ اور پھر واپس آکر بتاؤ کہ اپنی روشنی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے ۔

(وقفہ)

کلو: تمہیں مجھ سے اس قسم کی باتیں نہیں کرنا چاہئیں ۔

ہیم: (سرد مہری سے) معاف کرو (وقفہ ۔ بلند آواز میں) میں کہہ رہا ہوں معاف کرو ۔

کلو: میں نے سن لیا ۔

[نیگ کے کنستر کا ڈھکنا اوپر اٹھتا ہے اس کے ہاتھ دکھائی دیتے ہیں جن سے اس نے کنستر کا کنارہ پکڑ رکھا ہے اس کے بعد اس کا سر نمودار ہوتا ہے ۔ اس کے منہ میں بسکٹ ہے ۔ وہ غور سے سنتا ہے ۔]

ہیم: تم نے جو بیج بوئے تھے ۔ کیا وہ پھوٹ نکلے ہیں ۔؟

کلو: نہیں

ہیم: تم نے ان کے چاروں طرف کھرچ کر بھی دیکھا، شاید پھوٹ نکلے ہوں ۔

کلو: نہیں وہ نہیں پھوٹے

ہیم: غالباً ابھی اس کا وقت نہیں آیا ۔

کلو: اگر انھیں پھوٹنا ہوتا تو پھوٹ چکے ہوتے (غصہ سے) وہ کبھی نہیں پھوٹیں گے

(وقفہ) [نیگ ۔ بسکٹ ہاتھ میں پکڑتا ہے]

ہیم: ان باتوں میں بالکل لطف نہیں آ رہا ہے لیکن شاید دن کا ڈھلنا ہمیشہ سے ایک المیہ ہے "کیوں ٹھیک ہے نا، کلو؟

کلو: کیا اس وقت بھی ہمیشہ کی طرح سے دن ڈھل رہا ہے؟

ہیم: ہاں معلوم تو یہی ہوتا ہے ۔

(وقفہ)

(انتہائی پریشانی سے) یہ کیا ہو رہا ہے ؟ یہ کیا ہو رہا ہے ؟

کوئی چیز اپنے راستے پر جا رہی ہے ۔

بہت اچھا دفع ہو جاؤ ۔ (اپنی کرسی کی پشت سے کمر لگاتا ہے اور کچھ دیر تک ساکت رہتا ہے ۔ کلو

حرکت نہیں کرتا اور ایک بڑی دردناک آہ بھرتا ہے
ہیم اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔] میرا خیال تھا کہ میں
نے تم سے کہا تھا " دفع ہو جاؤ "۔

کلو میں کوشش کر رہا ہوں۔ (دروازے کی طرف جاتا ہے اس کے قریب رکتا ہے) جب میں جا گیا تھا۔ اس وقت سے۔ [باہر جاتا ہے]

ہیم کام چل رہا ہے۔ [کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتا ہے اور کچھ دیر ساکت رہتا ہے]

(نیگ دوسرے کنستر کے ڈھکنے کو کھٹکھٹاتا ہے (وقفہ) نیگ اور زور سے کھٹکھٹاتا ہے۔ ڈھکنا اٹھتا ہے۔ اور نیل کے ہاتھ نظر آتے ہیں۔ جن سے اس نے کنستر کا کنارہ پکڑ رکھا ہے۔ اس کے بعد اس کا سر نمودار ہوتا ہے۔ اس نے جالی کی ٹوپی پہن رکھی ہے۔ اس کا چہرہ بہت سفید ہے۔)

نیل کیا بات ہے میرے لاڈلے؟ (وقفہ) کیا یہ محبت کرنے کا وقت ہے۔

نیگ کیا تم سوگئی تھیں۔

نیل نہیں اس کا کیا سوال ہے۔

نیگ مجھے پیار کرو۔

نیل یہ ممکن نہیں۔

نیگ کوشش کرو

[وہ ایک دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں لیکن قریب نہیں آسکتے۔ ہاتھ نیچے گر جاتے ہیں]

نیل روزانہ اس مضحکہ خیز ڈرامے کی کیا ضرورت ہے۔

(وقفہ)

نیگ میرا دانت ٹوٹ گیا۔

نیل کب

نیگ کل تک تو موجود تھا۔

نیل (المناک انداز میں) اچھا کل تک!

[دردناک انداز میں ایک دوسرے کی طرف مڑتے ہیں۔]

نیگ تم مجھے دیکھ سکتی ہو۔

نیل بہت کم۔ اور تم؟

نیگ کیا؟

نیل کیا تم مجھے دیکھ سکتے ہو؟

نیگ بہت کم!

نیل یہ بھی اچھا ہی ہے۔ یہ بھی اچھا ہی ہے۔

نیگ یہ نہ کہو۔ (وقفہ) ہماری بینائی جواب دے رہی ہے۔

نیل ہاں

[وقفہ، ایک دوسرے کی طرف پیٹھ پھیر لیتے ہیں]

نیگ کیا تم میری آواز سن سکتی ہو۔

نیل ہاں، اور تم

نیگ ہاں، (وقفہ) ہماری سماعت ابھی ٹھیک ہے۔

نیل ہماری کیا؟

نیگ ہماری سماعت

نیل نہیں۔ (وقفہ) کیا تم مجھ سے اور کچھ کہنا چاہتے ہو۔

نیگ کیا تمہیں یاد ہے کہ ——

نیل نہیں

نیگ کہ کس طرح ہماری دوسیٹوں والی سائیکل ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی اور گر کر ہماری ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں۔

[دونوں بہت جوش سے ہنستے ہیں]

نیل یہ آرڈین کا واقعہ ہے

[وہ دونوں ہنستے ہیں مگر بڑی بے دلی سے]

نیگ کیا تمہیں سردی لگ رہی ہے۔

نیل ہاں، بالکل اکڑ چکی ہوں۔ اور تم

میری بھی قلفی جم گئی ہے۔ (وقفہ) کیا تم اندر جانا
چاہتی ہو؟
ہاں۔
تو پھر چلی جاؤ (نیل حرکت نہیں کرتی) تم اندر
کیوں نہیں جاتیں۔
معلوم نہیں! (وقفہ)
کیا اس نے تمہارا برادہ بدل دیا ہے؟
یہ برادہ نہیں ہے۔ (تھکے ہوئے انداز میں)
کیا تم زیادہ صحیح لفظ استعمال نہیں کر سکتے نیگ۔
خیر برادہ نہ سہی، ریت سہی، اس سے کیا
فرق پڑتا ہے۔
اس سے بہت فرق پڑتا ہے۔
(وقفہ)
، کسی زمانے میں تو یہ برادہ ہی تھا۔
کسی زمانے میں۔
، اور اب یہ ریت ہے۔ (وقفہ) سمندری
ریت (وقفہ۔ بے صبری سے) اور اب
یہ ریت ہے جو وہ سمندر کے کنارے سے لاتا ہے
اور اب یہ ریت ہے۔
کیا اس نے تمہاری ریت بدلی ہے؟
نہیں
میری بھی نہیں بدلی (وقفہ) یہ مجھے نہیں چاہئے
(بسکٹ دکھا کر) تمہیں چاہئے تھوڑا سا۔
نہیں (وقفہ) کیا چیز ہے؟
، بسکٹ۔ میں نے تمہارے لئے آدھا بچا لیا ہے
(بسکٹ کو دیکھتا ہے فخر سے) بلکہ تین چوتھائی
ہے۔ تمہارے لئے۔ لو یہ لو (بسکٹ بڑھاتا ہے)
نہیں چاہئے؟ (وقفہ) کیا تمہاری طبیعت ٹھیک

نہیں ہے۔

ہیم (بے دلی سے) خاموش رہو۔ خاموش رہو۔
تم لوگ مجھے سونے کیوں نہیں دیتے (وقفہ)
ذرا آہستہ بولو (وقفہ) اگر میں سو سکتا تو
شاید محبت بھی کر سکتا۔ میں جنگلوں میں چلا
جاتا۔ میری آنکھوں کی بینائی واپس آ جاتی۔
میری آنکھیں آسمان کو دیکھ سکتیں، اور زمین
کو، اور میں خوب دوڑتا۔ خوب دوڑتا۔ کوئی
مجھے پکڑ نہ پاتا۔ (وقفہ) فطرت! (وقفہ)
میرے سر میں کوئی چیز ٹپ ٹپ گر رہی ہے (وقفہ)
ایک دل! میرے سر میں ایک دل ہے۔
(وقفہ)

نیگ (نرم آواز میں) سن رہی ہو؟ اس کے سر میں
ایک دل ہے! (آہستہ آہستہ قہقہہ لگاتا ہے)

نیل ایسی باتوں پر ہنسنا نہیں چاہئے۔ نیگ تم کیوں
ہمیشہ اس قسم کی باتوں پر ہنستے ہو۔

نیگ اتنے زور سے نہ بولو۔

نیل (آواز نیچی کئے بغیر) میں مانتی ہوں کہ غم، دنیا
میں سب سے زیادہ مضحکہ خیز چیز ہے۔ لیکن پھر بھی

نیگ (گھبرا کر) اُف خدا۔

نیل ہاں۔ ہاں۔ یہی دنیا میں سب سے زیادہ مضحکہ
خیز چیز ہے اور شروع میں تو ہم دل کھول کر
اس پر ہنستے ہیں۔ لیکن پھر بار بار وہی ہوتا ہے تو
جیسے کوئی مزاحیہ کہانی ہو، جسے ہم بار بار سن
چکے ہوں۔ کہانی ہمیشہ مزاحیہ ہی رہتی ہے۔ لیکن
کچھ عرصہ بعد اس پر ہنسی نہیں آتی۔ (وقفہ) تمہیں
مجھ سے اور کچھ کہنا ہے۔

نیگ نہیں۔

نیل خوب اچھی طرح سوچ لو۔ (وقفہ) اچھا تو پھر اب میں چلی۔

نیگ تمہیں یہ بسکٹ چاہیئے؟ (وقفہ) میں اسے تمہارے لئے رکھوں گا۔ (وقفہ) میں جانتا تھا کہ تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی۔

نیل ہاں میں جا رہی ہوں۔

نیگ جانے سے پہلے ذرا مجھے کھجا دو گی؟

نیل نہیں (وقفہ) کس جگہ کو

نیگ پیٹھ کو کھجا دو

نیل نہیں اسے کنستر کے کنارے سے رگڑ لو۔

نیگ یہ ممکن نہیں۔ کھجلی نیچے کی طرف اٹھ رہی ہے۔ دبے ہوئے حصے میں۔

نیل کونسا دبا ہوا حصہ؟

نیگ دبا ہوا حصہ (وقفہ) ذرا کوشش کرو۔ (وقفہ) کل تم نے اس جگہ کھجایا تھا۔

نیل (المیہ انداز میں) آہ کل

نیگ کھجا سکتی ہو؟ (وقفہ) تم کہو تو میں تمہیں کھجا دوں۔ (وقفہ) کیا تم پھر رو رہی ہو؟

نیل کوشش کر رہی تھی۔

(وقفہ)

ہیم شاید یہ صرف خوش فہمی ہو

نیگ اس نے ابھی ابھی...... (وقفہ)

نیگ اس نے ابھی ابھی کیا کہا؟

نیل شاید یہ صرف خوش فہمی ہو۔

نیگ اس کے کیا معنی ہیں؟ (وقفہ) اس کے کوئی معنی نہیں (وقفہ) میں تمہیں درزی کی کہانی سناؤں گا۔

نیل کس لئے؟

نیگ تمہارا دل خوش کرنے کے لئے۔

نیل وہ کہانی بالکل دلچسپ نہیں ہے۔

نیگ لیکن تم تو ہمیشہ اس پر ہنستی رہو۔ (وقفہ) پہلی بار تو مجھے لگ رہا تھا کہ تم ہنستے ہنستے مر جاؤ گی۔

نیل یہ کوموجھیل کا واقعہ (وقفہ) اپریل کی ایک سہ پہر تھی (وقفہ) کیا تم یقین کر سکتے ہو۔

نیگ کیا؟

نیل کہ ایک بار ہم کشتی میں کوموجھیل کی سیر کرنے گئے تھے (وقفہ) اپریل کی ایک سہ پہر میں۔

نیگ اس سے ایک دن پہلے ہماری منگنی ہوئی تھی۔

نیل منگنی ہوئی تھی؟

نیگ تمہاری ہنسی کے دوسرے کے طفیل ہم بچ گئے۔ ورنہ قاعدے سے، تو ہمیں ڈوب جانا چاہیئے تھا۔

نیل نہیں! اس لئے کہ اس وقت میں بہت خوش تھی

نیگ نہیں۔ نہیں۔ یہ بات نہیں تھی۔ تم میری کہانی پر ہنس رہی تھیں اور کوئی بات نہیں تھی۔ خوشی کی بھی ایک ہی رہی۔

نیل جھیل بہت گہری تھی، اور شفاف۔ اس کی تہ تک صاف دکھائی دیتی تھی۔ وہ کتنی صاف شفاف تھی کتنی سفید تھی۔

نیگ اچھا تو میں پھر وہی کہانی سناتا ہوں (قصہ گو کے انداز میں) ایک انگریز جسے نئے سال کی پارٹیوں میں شرکت کرنے کے لئے دھاری دار پتلون کی ضرورت تھی۔ اپنے درزی کے پاس گیا۔ درزی نے اس کا ناپ لیا۔ (درزی کی آواز میں) یہ تو ہو گیا اب چار دن بعد آیئے گا۔ پتلون تیار رکھوں گا۔ ٹھیک! چار دن بعد (درزی کی آواز میں) معاف کیجئے گا ایک ہفتہ بعد آکر لے جایئے گا۔ رومالی کا ستیاناس ہو گیا

خیر کوئی بات نہیں ــــ رومال پھٹی ہوئی ہو تو ہنسی روکے نہیں رکتی۔ ایک ہفتے بعد (درزی کی آواز میں) "معاف کیجئے گا جناب۔ دس دن بعد آئیے گا بند ٹھیک سے نہیں لگے۔"

"خیر یہ بھی ٹھیک ہے۔ بند تو ٹھیک ہی لگنے چاہئیں۔ ورنہ ہر وقت پریشانی رہے گی۔" دس دن بعد (درزی کی آواز میں) ارے جناب معاف فرمایئے۔ پندرہ دن بعد آئیے گا۔ سیون ٹھیک نہیں بیٹھی۔ " خیر تو یہ بھی کرنا ہی ہوگا۔ سیون بغیر کیسے کام چلے گا۔ (وقفہ)۔ (اپنی آواز میں) اتنی بری طرح میں نے کبھی یہ کہانی نہیں سنائی تھی۔ (وقفہ) اداسی سے) ہر بار میں اسے پچھلی بار سے بری طرح سناتا ہوں۔ (وقفہ) قصہ گو کے انداز میں) مختصر قصہ یوں ہے کہ نیلے پھول کھل رہے ہیں۔ اور کاج گو تھے جا رہے ہیں۔ اور بٹن ٹنک رہے ہیں (گاہک کی آواز میں) یہ ماجرا کیا ہے بے ایمانی کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے۔ خدا تمہیں دوزخ کا کندہ بنائے گا۔ خدا نے تمام کائنات کو چھ دن میں تخلیق کیا سن رہے ہو۔ چھ دن میں تخلیق کیا۔ اور وہ بھی کیا؟ کائنات! اور تم تین مہینے میں مجھے ایک پتلون تیار کر کے نہیں دے سکتے ہو۔

حرام زادے! بدمعاش! (درزی کی آواز، تعجب سے) " ارے جناب، ارے جناب، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ذرا دیکھئے آپ خود ہی دیکھئے (نفرت اور حقارت سے اشارہ کرتے ہوئے) پہلے تو آپ اس دنیا کو دیکھئے۔ (وقفہ) نیگ نیل کی طرف دیکھتا ہے۔ جو ہر قسم کے جذبات سے عاری نظر آ رہی ہے۔ اس کی آنکھیں خلاء میں گھور رہی ہیں۔ پھر وہ یکایک بلند آواز میں ہنستا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اسے ہنسنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ پھر ایک دم ہنسنا بند کر دیتا ہے۔ اپنا سر نیل کی طرف بڑھاتا ہے۔ اور پھر ہنسنا شروع کر دیتا ہے۔

ہیم خاموش رہو۔

[نیگ ہنسنا شروع کرتا ہے اور پھر ایک دم بند کر دیتا ہے۔]

نیل اس کی تہہ تک صاف نظر آتی تھی۔

ہیم (غصہ سے) کیا اب بھی ختم نہیں کیا۔ کیا کبھی ختم نہیں کرو گے۔ (شدید غصہ سے) کیا یہ بھی ختم نہیں کیا یہ بھی ختم نہیں ہوگا۔ (نیگ اپنے کنستر میں گھس جاتا ہے۔ نیل حرکت نہیں کرتی۔)

ہیم (شدید غصے سے) میری حکومت اور رات کے باسی کے لئے (سیٹی بجاتا ہے۔ کلو داخل ہوتا ہے) اس کچرے کو یہاں سے اٹھا لے جاؤ۔ اور اسے سمندر میں پھینک دو۔ (کلو کنستروں کی طرف بڑھتا ہے۔ اور رکتا ہے)

نیل وہ کتنی سفید تھی۔

ہیم یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے۔

[کلو جھکتا ہے۔ اور نیل کی کلائی پکڑ کر اس کی نبض دیکھتا ہے۔]

نیل (کلو سے) صحرا

[کلو اس کی کلائی چھوڑ دیتا ہے اور اسے کنستر کے اندر ڈھکیل کر اس کا ڈھکنا بند کرتا ہے]

کلو (کرسی کے پاس اپنی جگہ پر آ کر) اس کی نبض چل نہیں رہی ہے۔

ہیم یہ کیا بڑبڑا رہی تھی۔

کلو مجھ سے کہہ رہی تھی کہ صحرا کو چلے جاؤ۔

ہیم (دخل انداز) بڑھیا! کیا بس یہی بات تھی؟

کلو نہیں

ہیم اور کیا بات تھی

کلو میری سمجھ میں نہیں آئی

ہیم تم نے اسے بند کر دیا؟

کلو ہاں۔

ہیم ڈھکنوں کے پیچ اچھی طرح کس دو (کلو دروازے کی طرف جاتا ہے) میرا غصہ ٹھنڈا پڑ رہا ہے میں پیشاب کرنا چاہتا ہوں۔

کلو (تیزی سے جاتے ہوئے) میں ابھی پیشاب کرانے کا ٹیوب لاتا ہوں۔

[دروازے کی طرف جاتا ہے]

ہیم کافی وقت گزر چکا ہے اب مجھے سکون کی گولی دیدو

کلو ابھی بہت وقت باقی ہے۔ تھوڑی ہی دیر پہلے تم نے طاقت کی دوا پی تھی۔ ابھی سکون کی گولی کا اثر نہیں ہوگا۔

ہیم ہر صبح نقلی طاقت پیدا کی جاتی ہے اور ہر شب نقلی سکون کا انتظام کیا جاتا ہے۔ یا پھر اس کے برعکس ہوتا ہے۔ (وقفہ) وہ بوڑھا ڈاکٹر۔ ظاہر ہے کہ وہ مر چکا ہے۔

کلو وہ بوڑھا نہیں تھا

ہیم لیکن وہ مر تو چکا ہے؟

کلو ظاہر ہے۔ (وقفہ) تم یہ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟

(وقفہ)

ہیم ذرا مجھے ایک چکر کھلاؤ۔ (کلو کرسی کے پیچھے جاتا ہے اور اسے سامنے کی طرف دھکیلتا ہے۔) اتنے زور سے نہیں (کلو کرسی دھکیلتا ہے) دنیا کے گرد ایک چکر۔ (کلو کرسی دھکیلتا ہے) دیواروں کے پاس لے جاؤ۔ اور پھر واپس درمیان میں لے آؤ۔ میں بالکل بیچوں بیچ تھا نا۔ کیا خیال ہے تمہارا۔

کلو ہاں ٹھیک ہے (دھکیلتا ہے)

ہیم ہمیں ایک باقاعدہ پہیوں والی کرسی کی ضرورت پڑے گی۔ جس میں سائیکل کے پہیے لگے ہوں۔ بڑے بڑے۔ (وقفہ) دیوار سے دیوار ملا کر چلا رہے ہو نا؟

کلو (دھکیلتے ہوئے) ہاں۔

ہیم (اپنے ہاتھوں سے دیوار کو ٹٹولتے ہوئے) بالکل جھوٹ۔ مجھ سے جھوٹ کیوں بولتے ہو؟

کلو (دیوار کے قریب لے جاتے ہوئے) دیکھو یہ رہی۔ یہ رہی۔

ہیم روک دو۔ (کلو پچھلی دیوار کے قریب کرسی روک دیتا ہے۔ ہیم دیوار پر ہاتھ رکھتا ہے) پرانی رفیق دیوار۔ (وقفہ) اس کے دوسری طرف ایک اور جہنم ہے۔ (وقفہ) [غصے سے] اور قریب لاؤ بالکل ملا دو۔

کلو اپنے ہاتھ ہٹاؤ (ہیم دیوار پر سے ہاتھ ہٹاتا ہے۔ کلو کرسی کو دیوار سے ٹکراتا ہے) لو اب تو خوش ہو۔

[ہیم دیوار کی طرف جھکتا ہے اور کان لگا کر سنتا ہے۔]

ہیم سنائی دے رہا ہے۔ (اپنے پوروں سے دیوار کھٹکھٹاتا ہے) سنائی دے رہا ہے؟ کھوکھلی اینٹیں! یہ سب کھوکھلا۔ (وقفہ) [سیدھا ہوتا ہے۔ غصہ سے] بس بہت ہو چکا واپس لے چلو۔

کلو ابھی چکر پورا نہیں ہوا۔

ہیم مجھے اپنی جگہ واپس لے جاؤ۔ (کلو کرسی درمیان میں لاتا ہے) کیا یہی میری جگہ ہے۔؟

ہاں یہی تمہاری جگہ ہے۔
کیا میں بالکل بیچوں بیچ ہوں؟
میں ابھی ناپتا ہوں۔
کم و بیش! کم و بیش
(کرسی کو تھوڑا سا سرکاتے ہوئے) اب ٹھیک ہے
میں کم و بیش بیچ میں ہوں؟
ہاں میرا تو یہی خیال ہے۔
تمہارا یہ خیال ہے! میں کہتا ہوں کرسی کو بالکل بیچ
میں ہونا چاہئے۔
میں ابھی جاکر ٹیپ لاتا ہوں۔
اندازے سے۔ اندازے سے (کلو و کرسی کو تھوڑا سا
سرکاتا ہے) بس بس اب بیچ میں آگئی۔
اب تو مطمئن ہو۔

(وقفہ)

میں اسے ذرا بائیں طرف محسوس کر رہا ہوں (کلو و
کرسی کو تھوڑا سا سرکاتا ہے]
اب ذرا دائیں طرف محسوس کر رہا ہوں۔
[کلو و کرسی کو تھوڑا سا سرکاتا ہے۔]
اب ذرا آگے کی طرف محسوس کر رہا ہوں۔
[کلو و کرسی کو ذرا سا سرکاتا ہے]
اب ذرا پیچھے کی طرف محسوس کر رہا ہوں۔
[کلو و کرسی سرکاتا ہے۔]
وہاں کیوں کھڑے ہو۔ (یعنی کرسی کے پیچھے)۔
اس سے مجھے جھرجھری آتی ہے۔
[کلو و کرسی کے برابر اپنی مخصوص جگہ پر واپس آتا ہے]

و — اگر میں اسے قتل کردوں۔ تو سکون کی موت مرسکوں گا

(وقفہ)

م — موسم کا کیا حال ہے؟

کلو و — وہی جو ہمیشہ رہتا ہے۔
ہیم — زمین کی طرف دیکھو۔
کلو و — دیکھ لیا۔
ہیم — دوربین سے دیکھو
کلو و — دوربین کی ضرورت نہیں
ہیم — پھر بھی دوربین سے دیکھو
کلو و — اچھا تو میں جاکر دوربین لاتا ہوں۔ (جاتا ہے)
ہیم — دوربین کی ضرورت نہیں!

[کلو و دوربین لے کر داخل ہوتا ہے۔]

کلو و — میں دوربین لے کر واپس آگیا ہوں۔ (دائیں طرف کی کھڑکی کے قریب جاتا ہے۔ سر اٹھا کر اسے دیکھتا ہے۔) سیڑھی کی ضرورت پڑے گی۔
ہیم — کیوں کیا تم سکڑ گئے ہو۔ (کلو و دوربین لے کر واپس جاتا ہے) میں یہ پسند نہیں کرتا۔ میں یہ برداشت نہیں کرسکتا۔
کلو و — میں یہ سیڑھی لے آیا ہوں۔ (دائیں طرف کی کھڑکی کے نیچے سیڑھی لگاتا ہے۔ اوپر چڑھتا ہے۔ اور اب اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے پاس دوربین نہیں ہے۔ نیچے اترتا ہے) دوربین کی ضرورت پڑے گی

[دروازے کی طرف جاتا ہے]

ہیم — (غصہ سے) دوربین تو تمہارے پاس ہے۔
کلو و — (غصہ سے، رکتے ہوئے) نہیں میرے پاس دوربین نہیں ہے۔ (باہر جاتا ہے)
ہیم — یہ سب ناقابل برداشت ہے۔

(کلو و دوربین لئے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ اور سیڑھی کی طرف جاتا ہے۔)

کچھ زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ (سیڑھی کے اوپر چڑھتا ہے۔ دوربین اٹھاتا ہے۔ اور پھر اسے نیچے

گرا دیتا ہے۔) میں نے جان کر گرائی ہے۔ (نیچے اُترتا ہے۔ دوربین اُٹھاتا ہے۔ اور اسے اپنی آنکھوں کے قریب لا کر حاضرین کی طرف مڑتا ہے۔ اور ان کا معائنہ کرتا ہے) [illegible] اپنے سامنے ایک بڑا مجمع دیکھ رہا ہوں۔ جو خوشی سے سرشار ہے (وقفہ) یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر چیز بہت بڑی نظر آتی ہے۔ (دوربین ہٹاتا ہے۔ اور ہیم کی طرف دیکھتا ہے۔) کیوں؟ ہم ہنس نہیں سکتے؟

ہیم (کچھ سوچنے کے بعد) میں تو۔ نہیں ہنستا۔

کلوو (کچھ سوچنے کے بعد) میں بھی نہیں ہنستا (سیڑھی پر چڑھتا ہے۔ اور دوربین لگا کر باہر کی طرف دیکھتا ہے) صفر۔ (دوسری طرف دیکھتا ہے) صفر —— (اور ایک طرف دیکھتا ہے) اور صفر۔

ہیم کسی چیز میں حرکت نہیں۔ ہر چیز۔

کلوو صفر۔

ہیم (غصہ سے) بات کاٹنے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں مخاطب نہیں کیا گیا ہے ... ہر چیز —— ہر چیز —— ہر چیز کیا ہے۔ (غصہ سے) ہر چیز کیا ہے۔

کلوو ہر چیز کیا ہے؟ تم ایک لفظ میں اس کا جواب چاہتے ہو یہی نا؟ ایک منٹ ٹھہرو (دوربین لگا کر باہر دیکھتا ہے اور پھر اسے ہٹا کر ہیم کی طرف دیکھتا ہے۔) ہر چیز مردہ ہے۔ ٹھیک ہے نا؟۔ مطمئن ہو!

ہیم سمندر کو دیکھو۔

کلوو وہی حال ہے

ہیم بحر اعظم کو دیکھو

[کلوو نیچے اُترتا ہے۔ بائیں جانب کی کھڑکی کی طرف چند قدم چلتا ہے۔ واپس مڑ کر سیڑھی اٹھاتا ہے اور اسے لے کر بائیں جانب کی کھڑکی کے نیچے لگاتا ہے۔

اس کے اوپر چڑھتا ہے۔ دوربین سے باہر دیکھتا۔ اور دیر تک دیکھتا رہتا ہے۔ پھر یکایک گھبرا کر دوربین ہٹاتا ہے۔ اس کا اچھی طرح معائنہ کرتا ہے۔ اور لگا کر دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔)

کلوو کبھی کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی تھی!

ہیم (فکر مندی سے) کیا ہے؟ کوئی جہاز؟ بڑی مچھلی دھواں؟

کلوو روشنی ڈوب چکی ہے۔

ہیم (اطمینان کا سانس لیتے ہوئے) یہ تو پہلے بھی معلوم تھا

کلوو (دیکھتے ہوئے) ابھی تک تھوڑی سی باقی تھی۔

ہیم نہیں؟

کلوو ہاں

ہیم اور اب

کلوو (دیکھتے ہوئے) ختم ہو گئی۔

ہیم اور سمندری چڑیاں

کلوو (دیکھتے ہوئے) سمندری چڑیاں

ہیم اور افق۔ افق پر کیا ہے؟ کیا کچھ نہیں؟

کلوو (دوربین ہٹا کر، ہیم کی طرف مڑتے ہوئے غصہ اور بیزاری سے) اور افق پر ہو بھی کیا سکتا تھا۔؟ کیا میں پوچھ سکتا ہوں۔

(وقفہ)

ہیم اور موجیں؟ موجوں کا کیا حال ہے؟

کلوو موجیں۔؟ (دوربین گھما کر دیکھتا ہے) فولادی ہیں

ہیم اور سورج

کلوو (دیکھتے ہوئے) صفر

ہیم لیکن اسے ڈوبتا ہوا ہونا چاہیئے تھا۔ ذرا پھر سے دیکھو اچھی طرح

کلوو (دیکھتے ہوئے) سورج پر لعنت بھیجو۔

تو کیا رات ہو چکی ہے ۔

نہیں

تو پھر یہ کیا ہے۔

(دیکھتے ہوئے) ہر چیز سرمئی ہے ۔ دوربین ہٹ کر ہیم کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں) سرمئی !

(وقفہ ـــ زیادہ بلند آواز میں) سرمئی ۔ (وقفہ ۔ نیچے اتر ہے ۔ پیچھے سے ہیم کے قریب آتا ہے اور اس کے کان میں کچھ کہتا ہے ۔

(گھبرا کر سنتے ہوئے) سرمئی ! تم سرمئی ہی کر رہے ہو !! سیاہ روشنی ...... ایک سرے سے دوسرے سرے تک ۔

تم مبالغہ کر رہے ہو ۔ (وقفہ) وہاں سے ہٹ جاؤ مجھے جھرجھری آ رہی ہے ۔

[کلو و پیچھے سے ہٹ کر کرسی کے برابر کھڑا ہو جاتا ہے]

روزانہ اس مضحکہ خیز ڈرامے کی کیا ضرورت ہے ؟

یہ روزانہ کا معمول ہے ۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا ۔ رات میں نے اپنے سینے کے اندر جھانک کر دیکھا ۔ وہاں ایک بڑا زخم ہے ۔

اچھا تو تم نے اپنا دل دیکھا ۔

ہاں ۔ وہ زندہ ہے ۔ (وقفہ) انتہائی پریشانی سے) کلو و ۔

ہاں ۔

یہ کیا ہو رہا ہے ۔

کوئی چیز اپنے راستے پر جا رہی ہے ۔

(وقفہ)

کلو و

(بے صبری سے) کیا بات ہے ۔

کیا یہ سچ ہے کہ ہماری باتوں میں ...... کچھ ......

کچھ ..... معنی پیدا ہو چلے ہیں ۔

کلو و معنی پیدا ہو چلے ہیں ! میری اور تمہاری باتوں میں (ہنستا ہے) یہ بھی اچھا مذاق رہا ۔

ہیم میں کبھی کبھی سوچتا ہوں ..... (وقفہ) فرض کرو کہ ایک سوچنے سمجھنے والا [illegible] اس [illegible] آ جائے اور کافی عرصہ تک ہم لوگوں کے حالات کو غور سے دیکھتا رہے ، تو یہ کیا ممکن نہیں کہ اس کے ذہن میں کچھ خیالات ابھرنے لگیں ۔ (ایک اہل خرد ۔ (اسٹلکچول) کے انداز میں) ٹھیک ہے ۔ اب میں سمجھا کیا صورت حال ہے .... واقعی ۔ تو یہ ہیں ان لوگوں کے مقاصد !

[کلو و گھبرا کر ساکت کھڑا ہو جاتا ہے اس [illegible] سے دوربین گر جاتی ہے ۔ [illegible] اپنا پیٹ کھجانے لگتا ہے [illegible]]

اور پھر اتنی دور جانے کی [illegible] ہو سکتا ہے کہ ہم خود (آواز میں جذبات کی جھلک ہے) ہم خود ـــ کبھی کبھی ـــ (شدت سے) یہ سوچ سکیں کہ یہ سب کچھ بالکل بے معنی نہیں تھا ۔

کلو و (کھجاتے ہوئے انتہائی پریشانی سے) میرے کپڑوں میں کوئی مکھی گھس گئی ہے ۔

ہیم مکھی ! تو کیا ابھی تک مکھیاں باقی ہیں ؟

کلو و میرے کپڑوں میں ایک مکھی اس وقت ضرور ہے ! (کھجاتے ہوئے) یا پھر ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی سمندری کیڑا ہو ۔

ہیم (ہیجانی انداز میں) ہو سکتا ہے کہ اسی سے ایک بار پھر نسل انسانیت کی ابتدا ہو جائے ۔ اسے جلدی پکڑو ۔ خدا کے لئے جلدی کرو ۔

کلو و میں ابھی جا کر پاؤڈر لاتا ہوں

[کلو و [illegible]]

ہیم ایک مکھی ! کتنی عجیب [illegible] ذات ہے !

[کلوو پاؤڈر چھڑکنے کا ڈبہ لے کر واپس آتا ہے]

کلوو میں کیڑے مارنے کا پاؤڈر لے کر واپس آگیا ہوں۔

ہیم اس پر پاؤڈر چھڑکو۔

[کلوو اپنی پتلون کو ڈھیلا کرتا ہے۔ اسے آگے کر کے اندر کی طرف دیکھتا ہے اور ڈبے کو اندر لے جاکر پاؤڈر چھڑکتا ہے۔ پھر جھکتا ہے۔ جھانک کر دیکھتا ہے۔ انتظار کرتا ہے۔]

کلوو حرام زادی

ہیم مر گئی ؟

کلوو معلوم تو یہی ہوتا ہے۔ (پاؤڈر کا ڈبہ نیچے پھینکتا ہے اور اپنی پتلون ٹھیک کرتا ہے) یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جھوٹ موٹ بنی بیٹھی ہو۔ انڈے سے رہی ہو۔

ہیم کیا کہا ؟ انڈے سے رہی ہو ؟ لیکن تمہارا مطلب تو جھوٹ موٹ ہے۔ ہے نا۔

کلوو ہاں، ہاں، مطلب تو یہی ہے۔ انڈے سینا تو محاورہ ہے۔

ہیم اپنی عقل کا استعمال کرو۔ جھوٹ موٹ کی حد تک تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر وہ انڈے سے رہی ہے، تو یہی ہماری تباہی کا اعلان ہے۔

کلوو اچھا سمجھا۔ ہاں تم تو پیشاب کرنا چاہتے تھے۔

ہیم ہیں کر رہا ہوں۔

کلوو تمہاری جرأت کی داد دیتا ہوں۔

(وقفہ)

ہیم (جوش سے) کلوو چلو، ہم دونوں یہاں سے چلیں جنوب کی طرف۔ تم لکڑی کا ایک ڈھانچہ بنا لو۔ اور پانی کا دھارا۔ ہمیں کہیں دور بہا کر لے جائے گا۔ بہت دور، دوسرے جانوروں کے پاس۔

کلوو خدا نہ کرے۔

ہیم اکیلا۔ ہاں میں اکیلا ہی اس بحری سفر پر روانہ ہو جاؤں گا بس تم فوراً ڈھانچہ تیار کرنا شروع کر دو۔ کل میں ہمیشہ کے لئے چلا جاؤں گا۔

کلوو (دروازے کی طرف تیزی سے جاتے ہوئے)۔ میں ابھی کام شروع کرتا ہوں۔

ہیم ٹھہرو (کلوو ٹھہرتا ہے) کیا ابھی میری سکون کی گولی کا وقت نہیں ہوا۔

کلوو (غصے سے) نہیں (دروازے کی طرف جاتا ہے)

ہیم ٹھہرو (کلوو ٹھہرتا ہے) تمہاری آنکھوں کا کیا حال ہے ؟

کلوو خراب

ہیم لیکن تم تو دیکھ سکتے ہو۔

کلوو ہاں ضرورت کے مطابق

ہیم تمہاری ٹانگوں کا کیا حال ہے

کلوو خراب

ہیم لیکن تم چل تو سکتے ہو

کلوو ہاں آتا ہوں، اور جاتا ہوں

ہیم میرے گھر میں۔ (وقفہ۔ پیشین گوئی کے انداز میں لطف لیتے ہوئے) ایک دن ایسا آئے گا جب تم میری طرح اندھے ہو چکے ہو گے۔ اور ایک ذرہ کی مانند خلاء میں معلق ہو گے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ اور پھر ایک ایسا دن آئے گا جب تم اپنے آپ سے کہو گے بیٹھنا نہیں چاہئے تھا۔ لیکن اب تو خیر بیٹھ ہی گیا ہوں اس لئے کچھ دیر، اور اسی طرح بیٹھا رہوں گا۔ اس کے بعد اٹھ کر کچھ کھانے کے لئے لاؤں گا۔ لیکن کچھ دیر بعد بھی تم اٹھ کر کھانا نہیں لاؤ گے۔ (وقفہ) تم کچھ دیر تک دیوار کو تکتے رہو گے۔ اور پھر تم کہو گے۔" میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ شاید مجھے تھوڑی سی نیند آجائے

اس سے میری طبیعت بہتر ہو جائے گی ۔ اور پھر تم آنکھیں بند کر لوگے ۔ اور پھر جب تم آنکھیں کھولو گے تو وہ دیوار غائب ہو چکی ہو گی ۔ (وقفہ) تمہارے ہر طرف لیک لامتناہی خلاء ہو گا ۔ اور اگر ہر زمانے کے تمام مردوں کو قبروں سے نکال کر بھی اس خلاء کو پُر کرنے کی کوشش کی جائے گی ۔ تب بھی وہ پُر نہ ہو سکے گا ۔ اور تم وسیع صحرا کے ایک ذرے کی مانند وہاں پڑے رہو گے ۔ ہاں اس وقت تمہیں معلوم ہو سکے گا کہ اس کا کیا مطلب ہے کیونکہ تم بھی بالکل میری طرح ہو جاؤ گے ۔ سوا اس کے کہ تمہارے پاس کوئی نہ ہو گا ۔ کیونکہ تم نے کبھی کسی پر ترس نہ کھایا ہو گا ۔ کیونکہ ترس کھانے کو کوئی نہ ہو گا ۔

(وقفہ)

اس کا یقین نہیں کیا جا سکتا ۔ (وقفہ) اور ہاں تم ایک بات بھول گئے ۔

کیا بات ؟

میں بیٹھ نہیں سکتا ۔

(بے صبری سے) ٹھیک ہے تو تم لیٹ جاؤ گے یا تم چلتے چلتے رک جاؤ گے اور رک کر ہمیشہ کے لئے ساکت ہو جاؤ گے ۔ جیسے کہ اس وقت کھڑے ہو ۔ ایک دن تم اپنے آپ سے کہو گے ، میں تھک چکا ہوں مجھے رک جانا چاہئے ۔ اس کے بعد تم بیٹھو ، لیٹو یا کھڑے رہو ۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے ۔

(وقفہ)

و اچھا تو تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں

ظاہر ہے ۔

ر تو پھر میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا ۔

تم ہمیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے ۔

و تو پھر میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا ۔ (وقفہ)

ہیم تم ہمیں ختم کیوں نہیں کر دیتے ۔ اگر تم مجھے قتل کرنے کا وعدہ کرو تو میں تمہیں قتل گاہ کا قفل کھولنے کا گر بتا دوں گا ۔

کلو و میں تمہیں ختم نہیں کر سکتا

ہیم اس کا مطلب ہے کہ نہیں کرو گے ۔

کلو و اچھا اب میں جاتا ہوں مجھے اور بھی کام کرنے ہیں ۔

ہیم تمہیں یاد ہے تم یہاں کب آئے تھے ۔

کلو و نہیں ۔ تم نے بتایا تھا کہ اس وقت میں بہت چھوٹا سا تھا

ہیم تمہیں اپنے باپ یاد ہیں

کلو و (تھکے ہوئے لہجے میں) میرا جواب وہی ہے (وقفہ) یہ سوال تم مجھ سے لاکھوں بار پوچھ سکتے ہو ۔

ہیم مجھے پرانے سوالوں سے عشق ہے ۔ (شوق سے) پرانے سوال اور پرانے جواب ان سے بہتر کیا ہو سکتا ہے (وقفہ) وہ میں ہی تھا جو تمہارے باپ کی جگہ تھا ۔

کلو و ہاں ۔ (ہیم کو تکتے ہوئے) تم میرے باپ کی جگہ تھے ۔

ہیم اور میرا مکان تمہارا اپنا گھر تھا ۔

کلو و ہاں کبھی یہ میرا گھر تھا ۔

ہیم (فخر سے) لیکن میرا کوئی باپ نہیں ہے ۔ میرا کوئی باپ نہیں ۔ (چاروں طرف ہاتھ سے اشارہ کرتا ہے) ہیم کا کوئی گھر نہیں ہے ۔ (وقفہ)

کلو و میں تمہیں چھوڑ دوں گا ۔

ہیم تم نے کبھی ایک بات پر غور کیا ہے ۔ ؟

کلو کبھی نہیں

ہیم ہم یہاں ایک بل میں اکیلے پڑے ہیں ۔ (وقفہ) لیکن پہاڑوں کے اس پار ..... ہاں پہاڑوں کے اس طرف ۔ ہو سکتا ہے اب بھی زمین سرسبز ہو ۔ کیوں کیا خیال ہے ؟ — ہو سکتا ہے وہاں ، ایک سرسبز جنگل ہو ، جہاں پھولوں پھلوں اور چڑیوں کی دیویاں

چہل قدمی کر رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں بہت دور بھی جانا نہ پڑے۔

کلو میں تو زیادہ دور نہیں جا سکتا۔

ہیم کیا میرا کتا تیار ہے

کلو ابھی اس کی ایک ٹانگ کم ہے

ہیم کیا اس کی کھال ریشمی ہے

کلو ہاں اچھی نسل کا کتا ہے

ہیم اسے لے آؤ۔ [کلو باہر جاتا ہے] کام چل رہا ہے۔

[کلو داخل ہوتا ہے، وہ کھلونے کا ایک کالا کتا ایک ٹانگ سے پکڑے ہے۔ اس کتے کی صرف تین ٹانگیں ہیں]

کلو لو یہ ہے تمہارا کتا

[کتا ہیم کو دیتا ہے۔ وہ اسے چھو کر دیکھتا ہے اور گود میں لے کر پیار کرتا ہے]

ہیم کیا یہ سفید ہے — ہیں نا؟

کلو سفید نہیں ہے۔ (وقفہ)

ہیم اس کی جنس کیا ہے۔ (ہاتھ سے چھو کر دیکھتا ہے۔)

کلو (چڑ کر) ابھی یہ ختم نہیں ہوا ..... جنس تو آخر میں بتائی جاتی ہے۔ (وقفہ)

ہیم تم نے اس کے گلے میں ربن نہیں باندھا۔

کلو (غصہ سے) کہہ تو دیا یہ ابھی ختم نہیں ہوا۔ پہلے کتے کو مکمل کیا جاتا ہے۔ پھر اس کے گلے میں ربن باندھا جاتا ہے ......

(وقفہ)

ہیم کیا یہ کھڑا ہو سکتا ہے؟

کلو مجھے معلوم نہیں

ہیم کوشش کرو۔ (کتا کلو کے ہاتھ میں دیتا ہے۔ وہ اسے زمین پر ٹکاتا ہے) ہاں تو کیا رہا۔

کلو ذرا صبر کرو۔

[زمین پر کتے کو تین ٹانگوں پر کھڑا کرنے کی کوشش کرتا ہے ناکامی ہوتی ہے کتے کو چھوڑ دیتا ہے۔ کتا ایک طرف گر جاتا ہے]

ہیم (بے صبری سے) ہاں تو کیا ہوا۔

کلو کھڑا ہو گیا۔

ہیم (کتے کو ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے) کہاں ہے؟ کہاں ہے وہ؟

[کلو کتے کو کھڑا کرتا ہے]

کلو یہ ہے (ہیم کا ہاتھ پکڑ کر کتے کی طرف لے جاتا ہے)

ہیم (اب اس کا ہاتھ کتے کے سر پر ہے) کیا یہ مجھے تک رہا ہے؟

کلو ہاں۔

ہیم (فخر سے) شاید میرے ساتھ سیر کو جانے کی فرمائش کر رہا ہے۔

کلو اب تم جو بھی سمجھو۔

ہیم (اسی لہجے میں) یا ہو سکتا ہے مجھ سے ایک ہڈی کی بھیک مانگ رہا ہو۔ (کتے پر سے ہاتھ ہٹاتا ہے) اسی طرح کھڑے کھڑے مجھ سے بھیک مانگنے دو۔

[کلو کمر سیدھی کرتا ہے، کتا گر جاتا ہے]

کلو اب میں جاتا ہوں۔

ہیم کیا تمہیں اپنے خواب نظر آئے تھے۔

کلو بہت کم

ہیم کیا بوڑھی پیگ کی شمع جل رہی ہے۔

کلو شمع، کسی کی شمع کیسے جل سکتی ہے

ہیم تو کیا وہ ختم ہو گئی۔

کلو ظاہر ہے۔ اگر وہ جل نہیں رہی تو ظاہر ہے کہ ختم ہو چکی ہے،

نہیں میرا مطلب تھا، بوڑھی بیگ
ظاہر ہے کہ وہ بھی ختم ہو چکی ہے۔ (وقفہ) آج نہیں
کیا ہو رہا ہے۔
میں اپنے راستے پر جا رہا ہوں۔ (وقفہ) کیا اسے
دفن کر دیا گیا تھا۔
دفن، اسے کون دفن کرتا۔
تم کر سکتے تھے
میں، میرے پاس ویسے ہی کیا کم کام ہے۔ مجھے اتنی
فرصت کہاں کہ لوگوں کو دفن کرتا پھروں۔
لیکن تم مجھے تو دفن کرو گے؟
نہیں، میں تمہیں دفن نہیں کروں گا۔ (وقفہ)
کسی زمانے میں تمہیں دفن نہیں کروں گا۔ (وقفہ)
کسی زمانے میں وہ بہت خوبصورت تھی۔ ایک جنگلی
پھول کی طرح۔
(کچھ یاد کر کے مزا لیتے ہوئے) مزے دار چھوکری تھی
کسی زمانے میں ہم بھی خوب صورت تھے۔ کسی زمانے
میں تو سب ہی خوب صورت ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ
تو خال، خال ہوں گے۔ جو کسی زمانے میں خوب
صورت نہ رہے ہوں۔ (وقفہ)
جاؤ جا کر مچھلی پکڑنے کا کانٹا لاؤ۔
[کلو دروازے کی طرف جاتا ہے۔ پھر رکتا ہے۔
رکتا ہے]
"یہ کرو، وہ کرو" اور میں کبھی انکار نہیں کرتا۔
لیکن کیوں؟
کیونکہ تم انکار نہیں کر سکتے۔
کچھ دن اور گزر نے دو۔ پھر میں یہ قصہ ہی پاک
کر دوں گا۔
اس وقت تم کچھ کرنے کے قابل ہی نہ رہو گے۔

(کلو جاتا ہے) اُف یہ جاہل لوگ۔ اُف یہ جاہل
لوگ۔ خیر، سمجھانے تو کوئی بات ان کے دماغ میں
گھستی ہی نہیں۔
[کلو مچھلی پکڑنے کا کانٹا لے کر داخل ہوتا ہے]
کلو لو یہ رہا مچھلی پکڑنے کا کانٹا۔
[کلو، کانٹے کی چھڑی ہیم کو دیتا ہے۔ ہیم اسے کرسی
پر اٹکا کر اس کی مدد سے کرسی سرکانے کی کوشش
کرتا ہے۔]
ہیم کچھ سرکی کرسی؟
کلو نہیں۔ (ہیم چھڑی پھینک دیتا ہے)
ہیم جاؤ، جا کر تیل کا ڈبہ لاؤ۔
کلو کیوں۔
ہیم کرسی کے پہیوں میں تیل ڈالنے کی ضرورت ہے۔
کلو میں نے کل ہی ان میں تیل ڈالا تھا۔
ہیم کل؟۔ کل کا کیا مطلب ہے؟
کلو کل۔ اس کا مطلب ہے وہ منحوس دن۔ جو اس منحوس
دن سے پہلے تھا۔ اور ایک زمانہ ہوا گزر چکا ہے۔ میں وہی
الفاظ استعمال کرتا ہوں۔ جو تم نے مجھے سکھائے تھے۔ اب
اگر ان میں کوئی معنی باقی نہیں رہے۔ تو مجھے اور الفاظ
سکھاؤ۔ یا پھر مجھے خاموش رہنے دو۔ (وقفہ)
ہیم ایک زمانے میں میں ایک دیوانے کو جانتا تھا۔ اس کا
خیال تھا کہ دنیا ختم ہو چکی ہے۔ وہ ایک مصور اور نقاش
تھا۔ اور مجھے بہت عزیز تھا۔ میں اکثر اس سے ملنے
پاگل خانہ جایا کرتا تھا۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے
کھڑکی کے پاس لاتا اور کہتا۔ دیکھو وہ سرسبز کھیت اور
دیکھو وہ شاندار جہاز جو بحری سفر پر روانہ ہونے والے ہیں
اور یہ دیکھو فطرت کا حسن ہر طرف بکھرا ہوا ہے۔ (وقفہ)
وہ سختی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیتا۔ اور تعجب اور غصے کے

عالم میں وہ پھر اپنے کونے میں جا بیٹھتا۔ اسے ہر طرف راکھ ہی راکھ نظر آئی۔ (وقفہ) اس کو محسوس ہوتا تھا کہ تمام کائنات ختم ہو چکی ہے۔ اور صرف وہی اتفاق سے بچ گیا ہے (وقفہ) تخریب کے فرشتے شاید اس کو ختم کرنا بھول گئے تھے۔ (وقفہ) لیکن اب مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ صورت حال۔ اتنی غیر معمولی اور عجیب و غریب نہیں ہے۔ اور شاید اس وقت بھی نہیں تھی۔

کلوو ایک دیوانہ۔ یہ کس زمانے کی بات ہے۔

ہیم اسے ایک زمانہ گذر گیا۔ اس وقت تم زندہ لوگوں کی دنیا کے باسی نہیں تھے۔

کلوو خدا اس زمانے پر اپنی رحمت بھیجے۔

[وقفہ۔ ہیم اظہار عقیدت کے طور پر اپنی ٹوپی اتار لیتا ہے]

ہیم وہ مجھے بہت عزیز تھا۔ (وقفہ، ہیم ٹوپی سر پر رکھتا ہے۔) وہ ایک مصور اور نقاش تھا۔

کلوو دنیا میں ہیبت ناک چیزوں کی کمی نہیں۔

ہیم نہیں اب تو بہت کم ہو چکی ہیں۔ (وقفہ)۔ کلوو

کلوو ہاں

ہیم تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا ابھی یہ کافی نہیں ہوا۔

کلوو ہاں (وقفہ) کیا؟

ہیم یہ — یہ — یہی۔

کلوو میرا تو ہمیشہ سے یہی خیال تھا۔ تمہارا نہیں تھا؟

ہیم (غم آمیز لہجے میں) اس کا مطلب ہے کہ آج کا دن بھی اور سب دنوں کی مانند ہے۔

کلوو جب تک یہ ختم نہ ہو، (وقفہ) تمام زندگی وہی کھوکھلی باتیں (وقفہ)

ہیم میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتا۔

کلوو مجھے معلوم ہے اور تم میرا پیچھا نہیں کر سکتے۔

ہیم اگر تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے تو مجھے کیسے معلوم ہوگا۔

کلوو (تیزی سے) اگر تم مجھے بلانے کے لئے سیٹی بجاؤ اور میں فوراً دوڑتا ہوا نہ آؤں تو بس سمجھ لینا کہ میں تمہیں چھوڑ کر چلا گیا ہوں۔

(وقفہ)

ہیم کیا تم رخصتی پیار کرنے بھی نہ آؤ گے۔

کلوو نہیں اس قسم کا ارادہ تو نہیں۔ (وقفہ)

ہیم لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم باورچی خانے میں مر جاؤ اور میرے بلانے پر نہ آسکو۔

کلوو بہرحال نتیجہ تو وہی ہوگا۔

ہیم ہاں لیکن اس صورت میں مجھے یہ کیسے معلوم ہوگا کہ تم گئے نہیں بلکہ صرف مر گئے ہو۔

کلوو کچھ عرصے بعد میرے جسم سے بو آنے لگے گی۔

ہیم بو تو تمہارے جسم سے اب بھی آتی ہے۔ یہاں ہر چیز سے لاش کی سی بو آتی ہے۔

کلوو تمام کائنات کا یہی حال ہے۔

ہیم (غصے سے) کائنات کو جہنم میں ڈالو۔ (وقفہ) کوئی اور بات سوچو۔

کلوو کیا؟

ہیم کوئی خیال — کوئی خیال پیش کرو۔ (غصہ سے) کوئی بہت اچھا خیال۔

کلوو بہت اچھا (اسٹیج پر تیزی سے ٹہلنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے ہیں۔ رکتا ہے۔) میری ٹانگوں میں کتنی تکلیف ہے یقین آنا مشکل ہے۔ لیکن بہت جلد میں سوچنے کے قابل بھی نہیں رہوں گا۔

ہیم اور تم مجھے چھوڑنے کے قابل بھی نہیں رہو گے (کلوو پھر ٹہلنا شروع کر دیتا ہے) یہ تم کیا کر رہے ہو۔

کلوو سوچ رہا ہوں — (چلتا ہے)۔ بہت خوب

ک جاتا ہے)

دماغ پایا ہے ۔ (وقفہ) ہاں ارشاد ہو۔

ٹھہرو (سو رہا ہے مطمئن معلوم نہیں ہوتا)۔ ہاں

کچھ مطمئن ہے) ٹھیک ہے ۔ (سر اوپر اُٹھاتا ہے)

ج بیا ۔ میں الارم لگا دوں گا ۔ (وقفہ)

ج کے دن میرا دماغ بھی کچھ زیادہ کام نہیں کر رہا ہے

ن سچی بات یہ ہے ......

مجھے بلانے کو سیٹی بجانا ۔ اگر الارم بجنے لگے تو سمجھ

نا کہ میں چلا گیا ہوں ۔ اگر الارم نہ بجے تو سمجھ لینا کہ

ں مر گیا ہوں ۔ (وقفہ)

یادہ کام کر رہا ہے ۔ (وقفہ) ۔ (بے صبری سے) میرا

طلب ہے الارم ۔ کیا وہ کام کر رہا ہے ۔

ں ہاں کام نہ کرنے کا کیا سوال ہے ۔

س لئے کہ وہ بہت زیادہ استعمال ہو چکا ہے ۔

وہ تو شاید ہی کبھی استعمال ہوا ہو

یں جا کر دیکھتا ہوں ۔

[کلوو باہر جاتا ہے الارم کی آواز آنا
شروع ہوتی ہے ۔ کلوو الارم کی گھڑی
لئے داخل ہوتا ہے ۔ اور اسے ہیم کے
کان کے قریب لا کر الارم بجانا شروع
کرتا ہے ۔ دونوں آخر تک اس گھنٹی کو
سنتے رہتے ہیں ۔

(وقفہ)

سنا تم نے ، اس کو سن کر تو مردے بھی اٹھ کھڑے ہوں ۔

مجھ کچھ سنا ۔

اختتام کتنا زوردار تھا ۔

مجھے تو درمیانی حصہ زیادہ پسند آیا ۔ (وقفہ) کیا ابھی

میری سکون کی گولی کا وقت نہیں ہوا ۔

کلوو نہیں ۔ (دروازے کی طرف مڑتا ہے) میں چھوڑ کر چلا جاؤں گا ۔

ہیم میرے کہانی سنانے کا وقت ہو گیا ہے ۔ تم میری کہانی سننا چاہتے ہو؟

کلوو نہیں ۔

ہیم میرے باپ سے پوچھو وہ میری کہانی سننا چاہتا ہے یا نہیں ؟

[کلوو کنستروں کے قریب جاتا ہے ۔ نیگ کے
کنستر کا ڈھکن اٹھاتا ہے جھک کر اس کے اندر
دیکھتا ہے ۔ (وقفہ) سیدھا ہو جاتا ہے]

کلوو یہ تو سو رہا ہے

ہیم اسے جگا دو

[کلوو جھکتا ہے اور الارم بجا کر نیگ کو اٹھا دیتا
ہے ۔ کچھ بے معنی لفظ سنائی دیتے ہیں ۔ نیگ
سیدھا ہو جاتا ہے ۔]

کلوو وہ تمہاری کہانی سننا نہیں چاہتا ۔

ہیم میں اسے بون بون دوں گا ۔

کلوو وہ کہتا ہے کہ اسے شکر پلم چاہیئے ۔

ہیم اسے شکر پلم ہی مل جائے گا ۔ (کلوو پھر جھکتا ہے)

کلوو اس پر معاملہ طے ہو سکتا ہے (دروازے کی طرف جاتا ہے)

[نیگ کے ہاتھ نظر آتے ہیں جس سے اس نے
کنستر کے کنارے کو پکڑ رکھا ہے ۔ پھر اس
کا سر نظر آتا ہے ۔ کلوو دروازے کے قریب
پہنچ کر مڑ کر دیکھتا ہے ۔]

کلوو کیا تمہیں مستقبل کی زندگی پر یقین ہے ۔

ہیم میری زندگی تو ہمیشہ مستقبل کی زندگی رہی ہے ۔ (کلوو جاتا ہے)

کچھ اس کی بات سمجھ میں آئی ۔

نیگ میں سن رہا ہوں ۔

ہیم بدمعاش تو نے مجھے کیوں پیدا کیا ۔

نیگ مجھے معلوم نہیں تھا ۔

ہیم کیا؟ — نہیں کیا معلوم نہیں تھا ؟

نیگ کہ میں جسے پیدا کر رہا تھا، وہ تم تھے۔ (وقفہ) تم [illegible] زندگ نا!

ہیم [illegible] (وقفہ۔ دونوں بڑے جوش سے ہنستے ہیں)

نیگ دونوں کا

ہیم نہیں ایک

نیگ [illegible] ۔ اور ایک۔

ہیم [illegible] خاموش رہو۔ (وقفہ) ہاں تو میں [illegible] (وقفہ اداسی سے) ہاں تو وہ ختم [illegible] ختم ہو چکے ہیں۔ (وقفہ) تقریباً ختم ہو چلے ہیں۔ (وقفہ)۔ الفاظ ختم ہو چکے ہیں (وقفہ) میرے دماغ میں میری پیدائش کے وقت سے کوئی چیز ٹپک رہی ہے۔ (نیگ ہنسی روکنے کی کوشش کرتا ہے) [illegible] ہمیشہ۔ عین اسی جگہ۔ (وقفہ) ہو سکتا ہے یہ کوئی رگ ہو۔ (وقفہ) یا کوئی شریان۔ (وقفہ۔ زیادہ جاندار آواز میں) اس بات کو چھوڑو یہ کہانی سنانے کا وقت ہے۔ ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا۔ (وقفہ۔ کہانی سنانے کے انداز میں) وہ شخص پیٹ کے بل گھسٹتا ہوا میری طرف آیا۔ اس کا چہرہ [illegible] تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ...... (وقفہ۔ بول چال کے انداز میں) میں نے بڑے اطمینان سے ایک نفیس مومی دیا سلائی سے اپنا سمندری پائپ [illegible] گئے بہت خوب (وقفہ [illegible] رہو۔ (وقفہ) وہ بے انتہا سرد دن تھی۔ درجہ حرارت [illegible]

پہنچ چکا تھا۔ لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ اگلا دن کرسمس تھا یہ کوئی خاص بات نہ تھی۔ بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ موسم خوشگوار تھا۔ (وقفہ) ہاں تو تمہیں کونسی نحوست یہ پاس کھینچ لائی ہے۔؟ اس نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا جو آنسوؤں اور دھول سے سیاہ ہو رہا تھا۔ (وقفہ بول چال کے انداز میں) اس سے کام چل سکتا ہے۔ (کہانی سنانے کے انداز میں) نہیں نہیں۔ میری طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے اپنی نظریں جھکا لیں اور کچھ بڑبڑانے لگا۔ شاید وہ معافی مانگ رہا تھا۔ (وقفہ) تم جانتے ہو میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ تہوار کی تیاریوں کا سلسلہ چل رہا ہے۔ اور آخر وقت تک چیزوں کی نوک پلک درست کرنا ہوتی ہے (وقفہ) ہاں تو فوراً بتاؤ۔ اس وقت کیوں مجھ پر نازل ہوئے (وقفہ) وہ بہت خوشگوار دن تھا۔ بہت حسین دھوپ چمک رہی تھی، سورج پچاس ڈگری پر تھا۔ لیکن سورج اب ڈوبتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بہت دور مُردوں کی بستی میں ڈوب رہا تھا۔ (معمولی لہجے میں) اچھا استعارہ ہے۔ (داستان گوئی کے انداز میں) ہاں تو جلدی کرو ...... وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں جلدی اپنی درخواست پیش کرو۔ تاکہ پھر میں دوسرے کاموں کی طرف توجہ کر سکوں (وقفہ۔ بول چال کے انداز میں) زبان کا صحیح استعمال اس کو کہتے ہیں۔ ہاں تو (داستان گوئی کے انداز میں آخر کار وہ اپنے مطلب پر آیا۔ "میں اپنی اولاد کے سلسلے میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ معاف کیجئے گا مجھے کچھ کہنا چاہئے تھا کہ اپنے لڑکے کے سلسلے میں گویا اس کے لڑکا یا لڑکی ہونے سے کچھ فرق پڑ سکتا تھا۔ اور تم آئے کہاں سے ہو؟ اس نے اس مل کا نام بتایا جہاں سے وہ آیا تھا۔ اور

یہ بھی بتایا کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر تقریباً آدھے دن
میں وہاں تک پہنچا تھا۔ کیا مطلب ہے تمہارا کیا
تم یہ جھوٹ تراشنا چاہتے ہو کہ وہ جگہ اب تک آباد ہے
"نہیں جناب وہاں تو میرے اور میرے بیٹے کے علاوہ کسی
ذی روح کا وجود نہیں۔ تو گویا اس کے وجود میں تو
کوئی شک ہی نہیں تھا۔ بہت خوب تو گھاٹی کے اس
پار کیا صورت حال ہے" وہاں اب کوئی گنہگار
باقی نہیں ہے۔" خوب تو تم چاہتے ہو کہ میں اس جھوٹ
پر یقین کر لوں کہ تم وہاں اپنے لڑکے کو اکیلا چھوڑ کر
آئے ہو۔ اور وہ بھی جیتا جاگتا۔ بس بہت ہو چکا۔
اب زیادہ جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔ (وقفہ)
بڑا وحشت ناک دن تھا۔ ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے
ہوا کا دباؤ ایک سو ڈگری تھا۔ ہوا چیڑ کے مردہ درختوں
کو اکھاڑ اکھاڑ کر پھینک رہی تھی۔ اور انھیں اڑائے
لئے جا رہی تھی۔ (وقفہ۔ معمولی لہجے میں) یہ حصہ ذرا
گڑ بڑ رہا۔ (داستان گوئی کے انداز میں) ہاں تو جلدی
بتاؤ، تم چاہتے کیا ہو۔ پھر مجھے کرسمس کا درخت سجانا
ہے۔" قصہ مختصر یہ کہ اسے اپنے بچے کے لئے روٹی کی ضرورت
تھی۔ روٹی؟ لیکن میرے پاس روٹی کا کیا کام؟
میں روٹی ہضم نہیں کر سکتا۔ خیر تو پھر تھوڑا سا غلہ ہی
سہی۔ (وقفہ۔ معمولی انداز میں) ٹھیک چل رہا ہے۔
(قصہ گو کے انداز میں) غلہ ٹھیک ہے میرے گوداموں میں
غلہ بھرا ہوا ہے۔ لیکن ذرا اپنی عقل استعمال کرو۔ فرض
کرو، میں تمہیں تھوڑا سا غلہ دے دیتا ہوں۔ اور تم اسے
لے کر اپنے بچے کے پاس جاتے ہو اور اگر وہ زندہ ملتا
ہے تو تم اس کے لئے دلیہ بناتے ہو۔ (نیگ حرکت
کرتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے منہ میں پانی
بھر آیا ہے) ایک بڑا سا پیالہ دلیہ کا خوب بھر کر، جو کافی
مقوی ہوتا ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ تمہارے لڑکے کے
چہرے پر سرخی دوڑنے لگتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے
اور پھر۔ اور پھر؟ ۔ (وقفہ) مجھے غصہ آگیا۔
(غصے سے) عقل استعمال کرو۔ کیا تم اپنی عقل استعمال
نہیں کر سکتے۔ ابھی تم اس زمین پر ہو۔ اور اس کا کوئی
علاج ممکن نہیں۔ (وقفہ)۔ وہ بہت خشک دن تھا
ہوا میں بخارات کی مقدار صفر تھی۔ میری گٹھیا کے
لئے ایسا موسم ہی سب سے بہتر ہوتا ہے۔ (وقفہ۔ غصے
سے) لیکن میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کیا تصور کر رہے تھے
کیا تمہارا خیال ہے کہ بہار کے موسم میں زمین جاگ اٹھے گی
اور دریاؤں اور سمندروں میں ایک بار پھر، مچھلیاں
پیدا ہوں گی۔ اور تم جیسے احمق اپاہجوں کے لئے
آسمان سے من و سلویٰ اترے گا۔ (وقفہ) رفتہ رفتہ
میرا غصہ ٹھنڈا پڑنے لگا۔ کم سے کم میں اس قابل ہو گیا کہ
اس سے پوچھ سکوں کہ کتنے عرصے میں اس نے وہ راستہ
طے کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ پورے تین دن میں۔ "خوب
تو تم نے اپنے بچے کو کس حالت میں چھوڑا تھا؟" وہ بے خبر
سو رہا تھا۔ (زور دے کر) ہاں ہاں بے خبر سو رہا تھا۔
مگر سوال یہ ہے کہ وہ کس قسم کی نیند تھی؟ ۔ وہ کون سی
نیند تھی؟ ۔ (وقفہ) قصہ مختصر یہ کہ میں نے اسے اپنے
یہاں نوکر رکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے مجھے متاثر
کیا تھا۔ گویا میرے وجود کا کوئی تار چھیڑ دیا تھا۔ اور پھر
مجھے یہ بھی خیال تھا کہ مجھے زیادہ دن تو اس دنیا میں
رہنا نہیں تھا (ہنستا ہے۔ وقفہ) ہوں تو؟ (وقفہ)
ہوں! ۔ اگر تم قاعدے سے رہو تو تم آرام و سکون سے
ایک قدرتی موت مر سکتے ہو۔ (وقفہ) ہاں تو؟
(وقفہ) آخر کار اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اس بچے کو
رکھنے کو تیار ہوں۔ اگر وہ زندہ بچا ہو۔ (وقفہ) میں

اسی لمحے کا انتظار کر رہا تھا ۔ مجھے یقین تھا کہ وہ یہ درخواست ضرور کرے گا ۔ (وقفہ) مگر یہی تو اصل سوال تھا ۔ کیا میں اس کے بچے کو رکھنے کے لئے تیار تھا ۔ وہ زمین پر گھٹنے ٹیک کر گڑگڑانے لگا ۔ اس کے ہاتھ زمین پر ٹکے تھے اور وہ وحشت زدہ آنکھوں سے میری طرف تک رہا تھا ۔ گویا مجھے اپنی خواہش کے خلاف مجبور کرنا چاہتا ہو ۔ (بول چال کے انداز میں) بس اب میں یہ کہانی ختم کرنے والا ہوں ۔ ویسے اگر میں اس کہانی میں کچھ اور کردار شامل کرلوں تو اور بات ہے ۔ (وقفہ) لیکن سوال یہ ہے کہ اور کردار کہاں سے ملیں گے ۔ (وقفہ) اب میں کہاں انھیں ڈھونڈنے جاؤں گا ۔ (وقفہ) سیٹی بجاتا ہے ۔ کلوو داخل ہوتا ہے)

نیگ میرا شگر پلم

کلوو باورچی خانے میں ایک چوہا ہے

ہیم چوہا ۔ کیا ابھی تک چوہے باقی ہیں ۔

کلوو ہاں باورچی خانے میں ایک چوہا تو ہے

ہیم اور تم نے ابھی تک اس کا خاتمہ نہیں کیا ۔

کلوو ابھی نیم مردہ کیا ہے ۔ تم نے مجھے بیچ میں بُلا لیا

ہیم وہ بھاگ تو نہیں سکتا ۔

کلوو نہیں

ہیم تو پھر بعد میں اس کا خاتمہ کردینا ۔ خدا سے دعا کرو

کلوو پھر !

نیگ میرا شگر پلم

ہیم اول خدا ۔ (وقفہ) تم ٹھیک ہونا ؟

کلوو (جھکے ہوئے انداز میں) ہاں ۔ شروع ہوجائے ۔

ہیم (نیگ سے) اور تم

نیگ (ہاتھ باندھ کر آنکھیں بند کرلیتا ہے اور گڑگڑا کر کہتا ہے) اے ہمارے باپ ۔ جو کہ ۔

ہیم خاموش رہو ۔ خاموش ۔ کیا تہذیب بھول گئے ہو ۔ (وقفہ) ہاں تو شروع کیا جائے ۔ (دعا مانگنے کے انداز میں ہاتھ اُٹھاتا ہے ۔ خاموشی) کچھ دیر میں ہمت ہار دیتا ہے ۔ ہاتھ نیچے گر جاتے ہیں ۔) ہوں ۔ تو ؟

کلوو (دعا کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھ گراتا ہے ۔) کوئی امید نہیں ـــ اور تم ؟

ہیم خدا سب پر لعنت بھیجے ۔ (نیگ سے) اور تم ؟

نیگ ذرا ٹھہرو ۔ (دعا کے لئے اُٹھے ہوئے ہاتھ نیچے گراتے ہوئے) کچھ نہیں ہوسکتا ۔

ہیم بدمعاش ۔ اس کا وجود ہی کہاں ہے

کلوو ابھی تک نہیں ہے ۔

نیگ میرا شگر پلم

ہیم شگر پلم ختم ہوچکے ہیں ۔ (وقفہ)

نیگ یہ قدرتی بات ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں تمہارا باپ ہوں ۔ یہ ضرور ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو کوئی اور ہوتا لیکن یہ کوئی معقول عذر نہیں ہے (وقفہ) اب ٹرکش ڈیلایٹ ہی کو لے لیجئے ۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اس کا کوئی وجود نہیں ۔ لیکن مجھے اس سے عشق ہے ۔ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ ۔ اور ایک نہ ایک دن میں اس کی فرمائش کروں گا ۔ کسی احسان کے بدلے میں اور تم دینے کا وعدہ کروگے ۔ ہر انسان کو وقت کے ساتھ ساتھ چلنا چاہیے (وقفہ) اور ہاں یہ بتاؤ کہ جب تم ننھے سے بچے تھے ، تو اندھیرے سے ڈر کر کسے پکارتے تھے ؟ ۔ اپنی ماں کو ؟ ۔ جی نہیں مجھے اور ہم تمہیں رونے دیتے ۔ اور پھر تمہیں اُٹھا کر کہیں دور لٹا دیتے ، تاکہ تمہاری آواز ہمارے کانوں تک نہ پہنچے اور ہم سکون سے سوسکیں ۔ (وقفہ) جب

میں ایک سرد رباد شاہ کی طرح محو خواب ہوتا تو تم زدوکو مجھے اُٹھا دیتے۔ اور اپنی آواز سننے کے لئے مجبور کرتے حالانکہ تمہیں اس کی خاص ضرورت نہ تھی کہ میں تمہاری آواز سنوں۔ اور تم میری آواز سنو (وقفہ) ہاں مجھے امید ہے کہ میں اس دن تک زندہ رہوں گا۔ جب تم مجھے اس طرح پکاروگے۔ جیسے اس وقت اندھیرے سے ڈرکر پکارتے تھے۔ جب تم ننھے سے بچے تھے۔ اور میں تمہارا واحد سہارا تھا۔ (وقفہ۔ نیگ، نیل کے کنستر کا ڈھکن کھٹکھٹاتا ہے۔ (وقفہ)۔ نیل۔ (وقفہ۔ اور زور سے کھٹکھٹاتا ہے (وقفہ) اور زیادہ زور سے کھٹکھٹاتا ہے۔) نیل!۔ (وقفہ۔ نیگ اپنے کنستر کے اندر دھنس جاتا ہے۔ اور ڈھکنا بند کرلیتا ہے۔ وقفہ)

ہیم تماشہ ختم ہوا۔ (کتے کو ٹٹولتا ہے) کتا چلا گیا

کلو کتا کیسے جا سکتا ہے۔ وہ اصلی کتا نہیں ہے۔

ہیم (ٹٹولتے ہوئے) لیکن وہ یہاں نہیں ہے

کلو نیچے پڑا ہوا ہے۔

ہیم اسے اٹھا کر مجھے دے دو۔ (کلو کتا اٹھا کر ہیم کو دیتا ہے) ہیم اسے گود میں لیتا ہے۔ (وقفہ، ہیم کتے کو پھینک دیتا ہے۔ گندہ جانور! کلو جھک کر زمین پر پڑی ہوئی چیزیں اٹھانا شروع کرتا ہے) تم کیا کر رہے ہو؟

کلو چیزوں کو قاعدے سے رکھ رہا ہوں۔ سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے۔ جوش سے) آج میں ہر چیز باقاعدگی سے رکھوں گا۔

ہیم باقاعدگی۔

کلو مجھے باقاعدگی سے عشق ہے۔ میں ایک ایسی دنیا کے خواب دیکھتا ہوں جہاں مکمل خاموشی اور سکوت ہو اور ہر چیز اپنی آخری جگہ پر ہو۔ اور گرد کے آخری ذرات سے اٹی ہوئی ہو (چیزیں اٹھانا شروع کرتا)

ہیم (انتہائی غصہ سے) آخر تم کیا کر رہے ہو۔ خدا کے لئے بتاؤ۔

کلو تھوڑی سی باقاعدگی پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں۔

ہیم انھیں پھینک دو۔

کلو (جو چیزیں جمع کی ہیں انھیں گرا دیتا ہے) بہرحال یہاں یا کہیں اور!

[دروازے کی طرف جاتا ہے]

ہیم (چڑ کر) تمہارے پاؤں کو کیا ہو گیا ہے۔؟

کلو میرے پاؤں کو؟

ہیم ہاں تمہارے قدم بھاری پڑ رہے ہیں۔

کلو شاید اس لئے کہ میں نے بند جوتے پہن لئے ہیں۔

ہیم کیا تمہارے چپل تمہیں کاٹ رہے تھے۔ (وقفہ)

کلو میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔

ہیم نہیں

کلو کیوں؟ ۔ میرے لئے یہاں کونسی کشش ہے

ہیم بات چیت۔ (وقفہ) میں کہانی سنا رہا تھا۔ (وقفہ) میری کہانی اچھی چل رہی ہے نا (وقفہ۔ چڑ کر) آخر تم یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ کہاں تک پہنچا ہوں؟

کلو ہاں ٹھیک ہے۔ یاد آیا۔ تمہاری کہانی کا کیا رنگ ہے؟

ہیم (تعجب سے) کونسی کہانی؟

کلو وہی جو تم روز خود کو سناتے رہتے ہو۔

ہیم اچھا تو تمہارا مطلب ہے تمہاری تاریخی داستان

کلو ہاں ہاں وہی۔ (وقفہ)

ہیم (غصہ سے) اپنا کام جاری رکھو۔ کیا تم اتنا بھی نہیں

کر سکے۔

کلو ہاں تو کچھ آگے بڑھی تمہاری تاریخی داستان۔

ہیم (خاکساری سے) نہیں کوئی خاص نہیں۔ کوئی خاص نہیں۔ (آہ بھرتا ہے) بعض دن ایسے ہوتے ہیں کہ ذہن پر الہامی کیفیت طاری ہی نہیں ہوتی (وقفہ) اور اس کے لئے کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا۔ سوا اس کے اس لمحے کا انتظار کیا جائے۔ (وقفہ) اس کے لئے اپنے آپ کو مجبور کرنا ممکن نہیں۔ اپنے پر جبر کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ بات زہر قاتل ہے (وقفہ) بہرحال وہ کہانی تھوڑی بہت آگے بڑھی ہے۔ (وقفہ) اور پھر ٹیکنک کا سوال ہے (وقفہ۔ چڑ کر) ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں نے اپنی کہانی کو، تھوڑا بہت آگے تو بڑھایا ہے۔

کلو (تعریفی جذبات کے ساتھ) بہت خوب، بہت خوب گویا سب باتوں کے باوجود بھی تم اسے آگے بڑھا سکے

ہیم (خاکساری سے) نہیں نہیں، زیادہ نہیں۔ بس بہت معمولی سا۔ بہرحال نہ ہونے سے تو یہ بھی بہتر ہے۔

کلو نہ ہونے سے بہتر ہے! کیا یہ ممکن ہے؟

ہیم اچھا تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کیسی چل رہی ہے۔ وہ اپنے پیٹ کے بل گھسٹتا ہوا آتا ہے۔

کلو کون؟

ہیم کیا؟

کلو وہ سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

ہیم میرا کیا مطلب ہے؟ یعنی ایک اور ......

کلو اچھا سمجھا۔ مجھے ذرا شک تھا۔

ہیم (اپنے پیٹ کے بل گھسٹتا ہوا آتا ہے۔ اور اپنے پیٹ کے لئے روٹی کی بھیک مانگتا ہے) اس کو مالی کی نوکری دے دی جاتی ہے۔ اور اس سے پہلے کہ۔ (کلو قہقہہ لگاتا ہے) اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے

کلو مالی کی نوکری!

ہیم کیا تمہیں اس بات پر ہنسی آرہی ہے

کلو ہاں شاید اسی بات پر آرہی ہے

ہیم روٹی پر تو نہیں؟

کلو یا پھر پیٹ پر (وقفہ)

ہیم اصل میں پوری بات ہی مضحکہ خیز ہے۔ میں تم سے اتفاق کرتا ہوں ...... تو کیوں نہ اسی بات پر ہم دونوں جی کھول کر ہنسیں۔

کلو (کچھ سوچنے کے بعد) میں تو آج کے دن دوبارہ ہنس نہیں سکتا

ہیم (کچھ سوچ کر) اور میں بھی نہیں۔ (وقفہ) اچھا تو پھر جاری رکھتا ہوں۔
شکریہ کے ساتھ نوکری قبول کرنے سے پہلے وہ پوچھتا ہے کہ کیا وہ اپنے چھوٹے سے بچے کو اپنے ساتھ رکھ سکتا ہے۔

کلو کس عمر کا بچہ؟

ہیم بس چھوٹا سا

کلو درختوں پر چڑھنے کے قابل؟

ہیم ہاں اس قسم کی اور حرکتیں بھی کر سکتا تھا؟

کلو اور پھر وہ بڑا بھی ہو سکتا تھا

ہیم اس کا بھی امکان تھا۔ (وقفہ)

کلو کہانی جاری رکھو۔ یا نہیں رکھ سکتے؟

ہیم بس ابھی اتنی ہی ہوئی ہے۔ میں نے یہیں چھوڑی تھی۔ (وقفہ)

کلو تم نے کچھ غور کیا کیسی چل رہی ہے۔

ہیم ہاں کچھ کیا تو ہے۔

کلو کیا بہت جلد اس کا اختتام ہو جائے گا؟

ہیم ہاں، یہی خطرہ ہے۔

خیر چھوڑو۔ تم ایک اور کہانی گھڑ لینا۔
ر نہیں سکتا۔ (وقفہ) ایسا لگتا ہے کہ ذہن کے سوتے
خشک ہو رہے ہیں۔ (وقفہ) مسلسل تخلیقی کاوش!
(کاش کہ میں اپنے کو گھسیٹ کر سمندر تک لے جاتا
میں ریت کے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ جاتا ہے۔ اور
پھر موجوں کا ریلا میرے پاس آتا
اب موجیں نہیں اٹھتیں۔ (وقفہ)
جاؤ جا کر دیکھو ۔ وہ مر تو نہیں گئی۔
[کلو کنستروں کی طرف جاتا ہے۔ نیل کے کنستر کا
ڈھکنا اٹھاتا ہے۔ جھک کر دیکھتا ہے۔ وقفہ]
معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے
[کنستر کا ڈھکنا بند کرتا ہے اور سیدھا کھڑا ہو جاتا
ہے۔ ہیم سر سے ٹوپی اٹھاتا ہے۔ (وقفہ) ہیم ٹوپی
سر پر رکھتا ہے]
(اس کا ہاتھ ابھی ٹوپی پر ہے) اور نیگ؟
[کلو نیگ کے کنستر کا ڈھکنا اٹھاتا ہے اور اسے
جھک کر دیکھتا ہے] (وقفہ)
یہ تو زندہ معلوم ہوتا ہے (کنستر بند کر کے سیدھا
کھڑا ہو جاتا ہے)
(ٹوپی پر سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے) کیا کر رہا ہے؟
[کلو دوبارہ ڈھکنا اٹھاتا ہے۔
جھکتا ہے۔ دیکھتا ہے۔] (وقفہ)
رو رہا ہے۔ (ڈھکنا بند کر کے سیدھا کھڑا
ہو جاتا ہے)
اس کا مطلب ہے کہ یہ زندہ ہے۔ (وقفہ) کیا
تمہیں خوشی کا کوئی لمحہ نصیب ہوا ہے۔
یاد نہیں پڑتا۔ (وقفہ)
مجھے کھڑکی کے نیچے لے چلو۔ (کلو ہیم کی کرسی
کی طرف بڑھتا ہے) میں اپنے چہرے پر روشنی کی کرنیں
محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ (کلو کرسی کو دھکا دیتا
ہے) تمہیں یاد ہے کہ جب تم شروع شروع میں مجھے
دھکا دیتے تھے تو کرسی کو بہت اوپر اٹھا دیا کرتے تھے
ہر ہر قدم پر گرتے گرتے بچتا۔ (بوڑھوں کے لہجے میں)
کتنا مزا آتا تھا۔ ہم دونوں کتنے مزے کرتے تھے۔
(غم آمیز لہجے میں) اور پھر ہمیں رفتہ رفتہ اس کی عادت
پڑ گئی (کلو دائیں جانب کی کھڑکی کے نیچے کرسی روکتا
ہے) کیا ہم پہنچ گئے۔ (سر پیچھے کی طرف جھٹکتا ہے)
کیا یہاں روشنی ہے۔

کلو اندھیرا نہیں ہے۔
ہیم (غصے سے) میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ کیا یہاں روشنی
ہے؟
کلو ہاں (وقفہ)
ہیم کیا پردے پڑے ہوئے ہیں
کلو نہیں
ہیم کونسی کھڑکی ہے؟
کلو زمین والی
ہیم مجھے معلوم تھا۔ (غصے سے) لیکن یہاں بالکل روشنی
نہیں ہے۔ مجھے دوسری کھڑکی کے پاس لے چلو۔ (کلو
کرسی کو بائیں طرف کی کھڑکی کے پاس لاتا ہے) زمین!
[کلو بائیں طرف کی کھڑکی کے نیچے کرسی روکتا
ہے۔ ہیم سر پیچھے کرتا ہے۔]
ہاں یہ ہے روشنی۔ (وقفہ) اب میں اپنے چہرے پر
سورج کی کرن محسوس کر سکتا ہوں۔ (وقفہ) ہے نا؟
کلو نہیں۔ (وقفہ)
ہیم کیا میرا چہرہ بہت سفید ہو رہا ہے۔
کلو معمول سے زیادہ سفید تو نہیں ہے۔ (وقفہ)

ہیم کھڑکی کھول دو

کلو کس لئے؟

ہیم میں سمندر کی آواز سننا چاہتا ہوں۔

کلو تم سمندر کی آواز نہیں سن سکتے۔

ہیم اگر تم کھڑکی کھول دو تب بھی نہیں۔

کلو نہیں۔

ہیم اس کا مطلب ہے کہ اسے کھولنے سے کچھ فائدہ نہیں۔

کلو نہیں۔

ہیم تو پھر کھول دو۔ (کلو سیڑھی کے اوپر چڑھ کر کھڑکی کھول دیتا ہے۔ (وقفہ) ۔ کیا تم نے کھڑکی کھول دی؟

کلو ہاں۔ (وقفہ)

ہیم کیا تم قسم کھا کر کہہ سکتے ہو کہ کھول دی ہے

کلو ہاں

ہیم ہوں۔ ! (وقفہ) سمندر بہت پرسکون معلوم ہوتا ہے۔ (وقفہ) (غصہ سے) میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ کیا سمندر بہت پرسکون ہے؟

ہاں۔

یہ اس لئے کہ اب جہاز اور کشتیاں نہیں ہیں (وقفہ) تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ منہ کو گوند کیوں لگا رکھا ہے۔ کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے

مجھے سردی لگ رہی ہے۔

یہ کونسا مہینہ ہے؟ (وقفہ) کھڑکی بند کرو۔ اب واپس چلتے ہیں۔ (کلو کھڑکی بند کر کے نیچے اترتا ہے اور کرسی کو دھکیلتا ہوا اس کی جگہ پر واپس لاتا ہے اور اس کے پیچھے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کا سر جھکا ہوا ہے)

یہاں سے ہٹ جاؤ۔ مجھے جھرجھری آتی ہے۔
کلو کرسی کے ایک طرف اپنی مخصوص جگہ پر واپس آ جاتا ہے)

ابا! (وقفہ) بلند آواز میں) ابا (وقفہ) جاؤ جا کر دیکھو اس نے میری آواز سنی یا نہیں۔
(کلو نیگ کے کنستر کے پاس جاتا ہے۔ ڈھکنا اٹھا جھک کر دیکھتا ہے۔ کچھ بے معنی سے الفاظ سنائی دیتے ہیں۔ کلو سیدھا ہو جاتا ہے۔)

کلو ہاں سنی۔

ہیم دونوں بار؟ (کلو پہلے کی طرح جھکتا ہے)

کلو صرف ایک بار

ہیم پہلی بار یا دوسری بار؟ (کلو اسی طرح جھکتا ہے)

کلو یہ وہ نہیں بتا سکتا ہے۔

ہیم یقیناً دوسری بار سنی ہوگی۔

کلو یہ ہمیں کبھی معلوم نہیں ہوگا۔ (ڈھکنا بند کرتا ہے)

ہیم کیا وہ اب تک رو رہا ہے۔

کلو نہیں۔

ہیم مردے بہت تیز رفتار ہوتے ہیں (وقفہ) وہ کیا کر رہا ہے۔

کلو اپنا بسکٹ چوس رہا ہے۔

ہیم زندگی چل رہی ہے۔ (کلو کرسی کے قریب آتا ہے) مجھے ایک کمبل دے دو۔ سردی کے مارے میں مرا جا رہا ہوں۔

کلو کمبل ختم ہو چکے ہیں۔ (وقفہ)

ہیم مجھے پیار کرو۔ (وقفہ) کیا تم مجھے پیار نہیں کرو گے؟

کلو نہیں

ہیم پیشانی پر

کلو میں تمہیں کبھی پیار نہیں کروں گا۔ (وقفہ)

ہیم (اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے) اچھا تو کم سے کم ہاتھ ہی ملاؤ۔ کیا تم ہاتھ بھی نہیں ملاؤ گے؟

کلو نہیں، میں تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ (وقفہ)

ہم: اچھا تو مجھے کتا دے دو۔ (کلو دکتے کو ادھر ادھر ڈھونڈتا ہے۔) نہیں!

وو: کیا تمہیں اپنا کتا نہیں چاہیے۔

ہم: نہیں

وو: اچھا تو میں جاتا ہوں۔

ہم: (سر جھکائے ہوئے کھوئے انداز میں) ٹھیک ہے
[کلو دروازے تک جاتا ہے پھر واپس آتا ہے]

وو: اگر میں نے اس چوہے کو نہ مارا تو وہ خود مر جائے گا۔

ہم: (پہلے کی طرح) ٹھیک ہے۔ (کلو و جاتا ہے) —
(وقفہ) یہ میرے کھیلنے کا وقت (اپنا رومال نکالتا ہے اسے کھول کر اپنے سامنے تان لیتا ہے) کام چل رہا ہے۔ (وقفہ) یہ جگہ ایسے لوگوں سے پٹی پڑی ہے (وقفہ۔ غصے سے) اپنی عقل استعمال کرو۔ کیا تم اپنی عقل استعمال نہیں کر سکتے؟ تم زمین پر ہو۔ اور اس کا کوئی علاج ممکن نہیں۔! (وقفہ) یہاں سے نکل چلو اور ایک دوسرے سے محبت کرو۔ اپنے ہمسایہ کو اپنی طرح چاہو! (وقفہ)۔ (قدرے سکون سے) اگر وہ کبھی روٹی کی فرمائش نہ کرتے تو کلچوں کی کرتے (وقفہ غصے سے) میرے سامنے سے دفع ہو جاؤ۔ ان پارٹیوں میں جاؤ جن میں تم ایک دوسرے کی کمر ٹھپکتے ہو (وقفہ) ہاں وہی سب، ہاں وہی سب! (وقفہ) ایک کتا بھی اصل نہیں! (کچھ سکون سے) انجام آغاز میں موجود ہے۔ لیکن ہم آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ (وقفہ) شاید اب میں اپنی کہانی جاری رکھ سکتا ہوں اور اسے ختم کر کے ایک دوسری کہانی شروع کر سکتا ہوں (وقفہ) شاید میں اپنے آپ کو زمین پر گرا سکتا ہوں۔ (کرسی سے بڑی مشکل سے اٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور پھر اسی پر گر جاتا ہے) شاید میں ریخوں میں اپنے ناخن اڑا کر اپنی انگلیوں کی مدد سے آگے بڑھ سکتا ہوں۔ (وقفہ) انجام شاید وہی ہوگا۔ اور میں حیرت سے سوچوں گا کہ یہ کیسے ظہور پذیر ہوا۔ پھر حیرت سے سوچوں گا کہ (جھجکتا ہے) اتنی دیر میں کیوں ہوا۔ اور اس وقت میں اس پرانی تباہ گاہ میں ہوں گا۔ تنہا۔ خاموشی کے مقابل۔ اور (جھجکتا ہے) سکوت کی گود میں۔ اگر میں کچھ عرصہ اور انتظار کروں۔ اور چپ بیٹھا رہوں گا، تو ایک دن آواز اور حرکت کا طلسم ٹوٹ جائے گا۔ ہر چیز ختم ہو جائے گی۔ جب میں اپنے باپ کو پکاروں گا۔ اور (جھجکتا ہے) اپنے بیٹے کو۔ اور پھر دوسری بار۔ اور پھر تیسری بار۔ یہ سوچ کر کہ شاید پہلی اور دوسری بار انھوں نے نہ سنا ہو (وقفہ) پھر میں اپنے آپ سے کہوں گا۔ وہ واپس آ جائے گا (وقفہ) اور پھر۔ (وقفہ) اور پھر (وقفہ) نہیں وہ واپس نہیں آ سکتا۔ وہ بہت دور جا چکا ہے (وقفہ) اور پھر (وقفہ) بہت پریشان ہے) طرح طرح کے تصورات اور خطرات جیسے مجھ پر کوئی نظریں گاڑے ہوئے ہو۔ یا کوئی چوہا ہو...... سانس روکے ہوئے اور پھر..... (گہری سانس لیتا ہے) اور پھر...... الفاظ کا ابلتا ہوا چشمہ۔ ایک تنہا بچے کی طرح، جو اپنے آپ کو ایک۔ دو۔ تین بلکہ بہت سے بچے تصور کر لیتا ہے۔ تاکہ اوروں کے ساتھ ساتھ رہے اور پھر اندھیرے میں کانا پھوسی کر سکے۔ (وقفہ) لمحے ایک دوسرے پر پٹاپٹ گرتے ہوئے جیسے کہ غلے کے دانے ایک دوسرے پر گرتے ہیں۔ (جھجکتا ہے) وہ بوڑھا یونانی۔ اور تمام زندگی آپ یہ تصور کرتے رہیے کہ وہ شاید سیڑھی لگا کر زندگی تک پہنچ جائے۔ (وقفہ۔ کچھ اور کہنے کے لئے منہ کھولتا ہے) لیکن پھر

ارادہ ترک کردیتا ہے) آہ اب جو کچھ ہونا ہو جلد ہو جائے۔ (سیٹی بجاتا ہے) کلو الارم کی گھڑی لئے ہوئے داخل ہوتا ہے۔ اور کرسی کے قریب آکر رکتا ہے) ۔ کیا ۔ ؟ ۔ کیا تم ابھی مرے نہیں۔ اور نہ چھوڑ کر گئے۔

کلو صرف ۔ جان طور پر

ہیم کیا ؟

کلو دونوں

ہیم اگر تم مجھے چھوڑ کر جاؤ گے تو مر جاؤ گے۔

کلو یا پھر اس کے برعکس

ہیم اس گھر کے باہر موت کی راج دھانی ہے۔ (وقفہ) اور چوہے کا کیا ہوا ؟

کلو وہ چلا گیا

ہیم وہ زیادہ دور تک نہیں جا سکتا۔ (وقفہ پریشانی سے) کیوں ؟

کلو اسے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ (وقفہ)

ہیم کیا میری سکون کی گولی کا وقت ہو گیا ؟

کلو ہاں ؟

ہیم خدا خدا کر کے۔ اچھا تو جلدی سے مجھے دے دو (وقفہ)

کلو سکون کی گولیاں ختم ہو گئی ہیں۔

ہیم (حیرت سے) اچھا ۔۔ (وقفہ) سکون کی گولیاں ختم ہو گئیں۔

کلو ہاں سکون کی گولیاں ختم ہو گئیں۔ اب تمہیں سکون کی گولیاں کبھی نہیں ملیں گی۔ (وقفہ)

ہیم لیکن وہ چھوٹا سا گول ڈبہ کیا ہوا ؟ ۔ وہ گولیوں سے بھرا ہوا تھا۔

کلو ہاں تھا لیکن اب وہ خالی ہو چکا ہے۔

(وقفہ۔ کلو کمرے میں ادھر ادھر چکر لگاتا ہے۔

[illegible] کی تلاش میں ہے جہاں [illegible]

[illegible])

ہیم ([illegible]) [illegible]

[illegible]

([illegible])

[illegible]

اس کا [illegible] دیوار کی [illegible]

جگہ وہ الارم کا گھنٹہ لگا دیتا ہے۔

ہیم یہ تم کیا کر رہے ہو ؟

کلو اختتام

ہیم زمین کو دیکھو

کلو پھر

ہیم کیونکہ وہ تمہیں پکار رہی ہے۔

کلو کیا تمہارا گلا خراب ہے ؟ [illegible] چاہئے ؟ (وقفہ) نہیں ؟ [illegible]

(کلو گنگناتا ہوا۔ دائیں طرف کی [illegible] اس کے قریب جا کر رکتا ہے۔ اور [illegible]

ہیم گانے کی ضرورت نہیں۔

کلو (ہیم کی طرف مڑ کر) کیوں ؟ ۔ کیا اب [illegible] کا حق باقی نہیں رہا ؟

ہیم نہیں۔

کلو تو پھر اس کا اختتام کیسے ہوگا

ہیم کیا تم چاہتے ہو کہ یہ ختم ہو جائے !

کلو میں گانا چاہتا ہوں

ہیم میں تمہیں روک نہیں سکتا۔

(وقفہ۔ کلو بائیں کھڑکی کی طرف مڑتا ہے)

کلو میں نے وہ سیڑھی کہاں رکھ دی (ادھر ادھر نظر دوڑاتا ہے) تم نے تو وہ سیڑھی نہیں دیکھی۔ [illegible]

...رق ہے) اوہ ۔ وقت ہونے والا ہے ،
...یں کھڑکی کے پاس جاتا ہے) کبھی کبھی مجھے اس
...ت پر شبہ ہونے لگتا ہے کہ میں اپنے ہوش و حواس
...ں ہوں یا نہیں ؟ اور پھر یہ کیفیت گذر جاتی ہے
...ر میرا ذہن پہلے کی طرح صاف ہو جاتا ہے ۔ سیڑھی
...چڑھ کر باہر کی طرف دیکھتا ہے ۔ اے خدا ۔ وہ تو
...نی کے اندر جا چکی ہے ۔ (اچھی طرح دیکھتا ہے)
...کیسے ہو سکتا ہے ؟ سر باہر نکالتا ہے ۔ ہاتھ آنکھوں
...کے قریب لاتا ہے ۔ (اور اچھی طرح دیکھتا ہے) بارش
...تو نہیں ہوئی ۔ (شیشہ صاف کرتا ہے اور پھر دیکھتا ہے)
...ارے میں کتنا احمق ہوں ۔ غلط طرف سے دیکھ رہا ہوں
(چند قدم دائیں کھڑکی کی طرف بڑھتا ہے ۔) پانی کے
نیچے (سیڑھی لینے واپس جاتا ہے ۔) میں بھی کتنا احمق
ہوں ۔ (سیڑھی لے کر دائیں کھڑکی کے پاس آتا ہے)
کبھی کبھی تو مجھے شبہ ہونے لگتا ہے ۔ کہ میں ہوش و
حواس میں ہوں بھی یا نہیں ۔ پھر یہ کیفیت گذر جاتی
ہے ۔ اور میں اپنے آپ کو پہلے کی طرح ذہین محسوس
کرنے لگتا ہوں ۔ (سیڑھی کو دائیں کھڑکی کے نیچے
لگاتا ہے) اور اس پر چڑھ کر کھڑکی سے باہر دیکھتا ہے
پھر ہیم کی طرف دیکھتا ہے) کیا تم چاہتے ہو کہ میں کسی
خاص چیز کا معائنہ کروں ۔ یا بس پورے منظر پر
ایک عام نظر ڈالوں ؟
پورے منظر کو دیکھو ۔
مجموعی طور پر ؟ ۔ ایک منٹ ٹھہرو ۔ (کھڑکی کے
باہر دیکھتا ہے) (وقفہ)
کلوو
(محو ہے) ہوں !
کچھ پتہ چلا کہ کیا بات ہے ؟

کلوو   (پہلے کی طرح) ہوں ! ....
ہیم   میں ، کبھی وہاں نہیں رہا ۔
کلوو   تم بہت خوش قسمت ہو (کھڑکی سے باہر دیکھتا ہے)
ہیم   میں ہمیشہ غیر حاضر رہا ۔ ہر بات میرے بغیر ہی ہوتی رہی ۔
اور مجھے یہ معلوم نہیں کہ کیا ہوا ۔ (وقفہ) تمہیں معلوم ہے
کیا ہوا ہے ۔ (وقفہ) کلوو ۔
کلوو   (ہیم کی طرف مڑتے ہوئے بہت چڑ کر) کیا تم چاہتے
ہو کہ میں اس کوڑے کے ڈھیر کو دیکھوں ؟ جلدی بتاؤ
ہاں یا نہیں ؟
ہیم   پہلے میری بات کا جواب دو ۔
کلوو   کس بات کا ؟
ہیم   کیا تمہیں معلوم ہے کہ کیا ہوا ہے ۔
کلوو   کب ؟ ۔ کہاں ؟
ہیم   (غصے سے) کب کیا ہوا ۔ اپنی عقل استعمال کرو ۔
کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے ۔ کیا ہوا ہے ؟
کلوو   اور میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے
ہیم   یہ تو میں نہیں جانتا ۔
[کلوو ، ہیم کی طرف مڑتا ہے ۔ وقفہ]
کلوو   جب بوڑھی پیگ نے تم سے اپنے لیمپ کے لئے تیل
مانگا تھا تو تم نے انکار کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ جہنم
میں جاؤ ۔ اس وقت تمہیں خوب اچھی طرح معلوم تھا
کہ کیا ہو رہا ہے ۔ کیوں کیا تمہیں معلوم نہیں تھا ؟ تم کو
خوب معلوم ہے کہ وہ کیسے ختم ہوئی ۔ تاریکی سے ۔
ہیم   (کمزور آواز میں) میرے پاس تیل نہیں تھا ۔
کلوو   (سختی سے) تمہارے پاس تیل موجود تھا ۔
ہیم   کیا تمہارے پاس دوربین ہے
کلوو   نہیں اس کے بغیر بھی کافی صاف نظر آ رہا ہے ۔
ہیم   جاؤ دوربین لے آؤ ۔

[وقفہ ۔ کلو غصہ سے مٹھیاں بھینچتا ہے ۔ اور اوپر کی طرف دیکھتا ہے ۔ اس کا توازن بگڑ جاتا ہے ۔ اور وہ سیڑھی پر سے گرنے لگتا ہے گھبرا کر وہ سیڑھی پکڑ لیتا ہے اور نیچے اترنا شروع کر دیتا ہے ۔ ۔ رکتا ہے]

ایک بات میں کبھی نہیں سمجھ سکتا ۔ (نیچے اترتا ہے) میں کیوں ہمیشہ تمہارا حکم مانتا ہوں ۔ کیا تم مجھے بتا سکتے ہو ؟

ہیم نہیں ...... شاید اس کا سبب ہمدردی کا جذبہ ہو (وقفہ) بہت گہری ہمدردی کا جذبہ ۔ (وقفہ) یہ کوئی آسان بات نہیں ۔ یہ کوئی آسان بات نہیں (وقفہ ۔ کلو کمرے میں دوربین ڈھونڈتا ہے)

کلو میں اپنی اور تمہاری زندگی سے تنگ آ چکا ہوں (دوربین ڈھونڈتا ہے) تم اس پر بیٹھے ہوئے تو نہیں ہو ۔

[کرسی کھسکاتا ، اس کے نیچے دوربین دیکھتا ہے ، پھر دوسری جگہ اس کی تلاش جاری رکھتا ہے]

ہیم (انتہائی پریشانی سے) مجھے یہاں چھوڑ کر نہ جاؤ ۔ (کلو غصے سے کرسی کو اس کی مخصوص جگہ واپس لاتا ہے) کیا میں بالکل بیچوں بیچ ہوں ؟

کلو اس دوربین کو ڈھونڈنے کے لئے تو ایک خوردبین کی ضرورت پڑے گی ۔ (دوربین پر نظر پڑتی ہے ۔) او وہ وقت ہونے والا ہے ۔ (دوربین اٹھا کر سیڑھی پر چڑھتا ہے ۔ دوربین سے باہر دیکھتا ہے)

ہیم مجھے کتا دو

[کلو دوربین گرا دیتا ہے ۔ اور ہاتھ سر کے اوپر کر کے غصے سے مٹھیاں بھینچتا ہے تیزی سے نیچے اترتا ہے ، کتا تلاش کرتا ہے ۔ اس پر نظر پڑتی ہے کتا اٹھا کر تیزی سے ہیم کی طرف جاتا ہے ۔ اور غصے سے کتا اس کے سر پر دے مارتا ہے]

کلو لیجیے تمہارا کتا ۔ (کتا زمین پر [illegible]

ہیم تم نے مجھے مارا ۔

کلو تم نے مجھے پاگل کر دیا ۔ میں پاگل [illegible]

ہیم اگر تمہیں مارنا ہی تھا تو کلہاڑی سے [illegible] نوکیلی چھڑی سے مارو ۔ [illegible] سے مارو ۔ کتے سے کیوں مارتے ہو ۔ [illegible] مارو یا نوکیلی چھڑی سے مارو ۔

[کلو کتا اٹھا کر ہیم کو دیتا ہے ۔ [illegible] لے لیتا ہے]

کلو (منت سے) آداب یہ کھیل ختم کر [illegible]

ہیم یہ کبھی نہیں ہو سکتا ۔ (وقفہ) [illegible] رکھ دو ۔

کلو تابوت ختم ہو چکے ہیں ۔

ہیم تو پھر یہ سب بھی ختم کر دو ۔ لیکن [illegible]

[کلو سیڑھی پر چڑھتا ہے ، پھر اترتا ہے [illegible] پھر چڑھتا ہے اور دوربین اوپر اٹھاتا ہے [illegible]

ہیم تاریکی سے ۔ ! اور میں ؟ ۔ کیا کبھی کسی نے [illegible] کھایا ہے ؟

کلو (دوربین ہٹا کر ، ہیم کی طرف مڑتے ہوئے [illegible] تمہارا اشارہ میری طرف ہے ۔ ؟

ہیم نہیں احمق ۔ یہ تو خود کلامی تھی کیا تم نے کبھی خود [illegible] نہیں سنی ؟ ۔ میں ۔ میں آخری خود کلام [illegible] اپنے آپ کو تیار کر رہا ہوں ۔

کلو میں تم سے صاف صاف کہے دیتا ہوں [illegible] بار اس گندگی کے ڈھیر کو دیکھ رہا ہوں ۔ اور وہ [illegible] اس لئے کہ تم نے حکم دیا ہے ۔ لیکن یہ بالکل آخری [illegible] ہے ۔ (دوربین لگا کر باہر دیکھتا ہے) اچھا تو [illegible] دیکھا جائے ۔ دوربین گھما کر دیکھتا ہے) کچھ [illegible]

کچھ نہیں ۔ ٹھیک ہے ۔ ٹھیک ہے ۔ کچھ نہیں ۔
ٹھیک ہے ۔ ٹھیک ہے ۔ کچھ نہیں ٹھیک ۔۔۔
(ٹھٹھکتا ہے ۔ دوربین اٹھا کر اس کا اچھی طرح
جائزہ کرتا ہے ۔ اسے دوبارہ لگا کر دیکھتا ہے ۔
وقفہ) قسمت خراب معلوم ہوتی ہے ۔
کیوں ۔ کیا کوئی نئی آفت آنے والی ہے ۔ کوئی خفیہ
سازش تو نہیں کی ؟
[کلو سیڑھی کو کھڑکی کے بالکل قریب لے آتا ہے ۔ اس پر
چڑھ کر دوربین سے دیکھتا ہے]

و (پریشانی سے) کوئی چھوٹا سا لڑکا معلوم ہوتا ہے
(طنزیہ انداز میں) ایک چھوٹا سا !

و میں جا کر دیکھتا ہوں ۔ (نیچے اترتا ہے ۔ دوربین گرا
دیتا ہے ۔ دروازے کی طرف جاتا ہے ۔ پھر مڑ کر
دیکھتا ہے) میں نوکیلی چھری ساتھ لئے جاتا ہوں ۔
(چھری تلاش کرتا ہے ۔ اسے اٹھا کر دروازے کی طرف
جاتا ہے)
نہیں ! ۔۔۔ (کلو ٹھہر جاتا ہے)

و نہیں ؟ یہ بچہ بڑا ہو کر اور بچے پیدا کر سکتا ہے ۔
اگر واقعی اس کا وجود ہے تو وہ وہیں مر جائے گا ۔ یا پھر
یہاں آ جائے گا ۔ اور اگر اس کا وجود نہیں ۔ (وقفہ)

و تمہیں میری بات کا یقین نہیں ۔ تمہارا خیال ہے کہ میں
ایک افسانہ تراش رہا ہوں ۔ (وقفہ)

ا یہ آخری بازی ہے ۔ اب ہم اختتام پر پہنچ گئے ہیں ۔
اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی ۔ (وقفہ)

و تو تم خوش قسمت ہو ۔ (دروازے کی طرف جاتا ہے)

ا میرے لئے چھری چھوڑتے جاؤ ۔
[کلو اسے چھری دیتا ہے اور دروازے کی طرف بڑھتا
ہے ۔ رک کر الارم کے گھنٹے کی طرف دیکھتا ہے ۔ اس
کے لئے کوئی بہتر جگہ متعین کرنا چاہتا ہے ۔ آخر اسے
اتار کر کنستروں کی طرف لے جاتا ہے ۔ اور اسے نیگ
کے کنستر کے ڈھکنے پر رکھ دیتا ہے) (وقفہ)

کلو میں تمہیں چھوڑ جاؤں گا ۔ (دروازے کی طرف جاتا ہے)

ہیم جانے سے پہلے (کلو رکتا ہے) ۔ کچھ تو کہو ۔

کلو کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے ۔

ہیم صرف چند لفظ ۔ جن پر میں دل ہی دل میں غور کر سکوں

کلو دل میں !

ہیم ہاں (وقفہ ۔ پُر زور انداز میں) ہاں (وقفہ) اور
جب سب چیزیں اختتام پر ہوں گی ۔ سائے (زیر
لب آواز میں) ۔ اور تمام دوسری پریشانیاں (وقفہ)
کلو نے کبھی مجھ سے بات نہیں کی ۔ لیکن آخر میں ۔
جانے سے پہلے میرے پوچھے بغیر ہی اس نے مجھ سے
بات کی ۔ اس نے کہا ۔

کلو (مایوسی سے) آہ

ہیم کوئی بات جو تمہارے دل سے نکلی ہو

کلو میرے دل سے !

ہیم چند لفظ ۔ تمہارے دل سے نکلے ہوئے ۔

کلو (اب اس کا رُخ حاضرین کی طرف ہے ۔ وہ ایک طرف
تک رہا ہے ۔ اس کے لہجے میں یکسانیت ہے ۔ اور وہ
ہر قسم کے جذبات سے خالی ہے ۔) انھوں نے مجھ سے کہا
یہ محبت ہے ۔ ہاں ۔۔۔ ہاں اس میں کوئی شک
نہیں اور دیکھو کہ یہ کس قدر ۔۔۔۔۔۔

ہیم خوب ! تو تم اپنے خیالات کو الفاظ میں ڈھال
سکتے ہو ۔ !

کلو (پہلے کی طرح) اور دیکھو یہ کس قدر آسان ہے ۔
انھوں نے مجھ سے کہا یہ دوستی ہے ۔ ہاں ہاں ۔
اس میں کوئی شک نہیں ۔ تم نے اسے پا لیا ہے ۔۔

انھوں نے مجھ سے کہا۔ ہاں یہی وہ جگہ ہے۔ رک جاؤ اور سر اٹھا کر اس نظام حسن اور نظم کو دیکھو۔ انھوں نے مجھ سے کہا۔ دیکھو تم کوئی جنگلی جانور نہیں ہو۔ ان چیزوں پر غور کرو۔ اور دیکھو کس طرح ہر چیز تم پر واضح ہوتی ہے۔ ہر بات صاف ہو جاتی ہے۔ انھوں نے مجھ سے کہا۔ ان سب نے جو زخموں سے مر رہے تھے، کہ ان کی دیکھ بھال کتنی مہارت سے کی جاتی ہے۔

ہیم بس کافی ہے۔

کلوو (پہلے کی طرح) کبھی کبھی میں اپنے آپ سے کہتا ہوں، کلوو اگر تم چاہتے ہو، کہ وہ لوگ ایک نہ ایک دن تمھیں سزا دیتے دیتے تھک جائیں تو تم زیادہ اچھی طرح برداشت کرنا سیکھو۔ پھر میں اپنے آپ سے کہتا ہوں، کلوو اگر تم چاہتے ہو کہ ایک دن وہ تمھیں جانے دیں۔ تو تمھیں زیادہ اچھی طرح رہنا چاہئے۔ لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اب کوئی نئی عادت اختیار نہیں کر سکتا کیونکہ میں کافی بڑا ہو گیا ہوں۔ اور بہت دور جا چکا ہوں۔ ٹھیک ہے تو پھر میں کبھی نہیں جاؤں گا۔ اور یہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ (وقفہ) اور پھر ایک دن یکایک وہ سب ختم ہو جاتا ہے، بدل جاتا ہے، میں کچھ سمجھ نہیں سکتا میں ان الفاظ سے پوچھتا ہوں جو ابھی باقی ہیں سونا جاگنا۔ صبح۔ شام لیکن وہ بھی کچھ نہیں بتا سکتے۔ (وقفہ) میں تہہ خانے کا دروازہ کھولتا ہوں۔ اور اس میں جاتا ہوں۔ میں اتنا جھکا ہوا ہوں کہ اگر میں اپنی آنکھیں کھولتا ہوں تو مجھے صرف اپنے پاؤں نظر آتے ہیں۔ اور اپنی ٹانگوں کے درمیان گرد کی ایک سیاہ لکیر۔ میں اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ دنیا بجھ چکی ہے۔ گو کہ میں نے اسے کبھی روشن نہیں دیکھا تھا۔ (وقفہ) آسان بات ہے۔ (وقفہ) جب میں گر پڑوں گا تو خوشی سے رونا شروع کر دوں گا۔

(وقفہ۔ دروازے کی طرف جاتا ہے)

ہیم کلوو۔ (کلوو رکتا ہے لیکن مڑ کر نہیں دیکھتا) کچھ نہیں۔ (کلوو آگے بڑھتا ہے) کلوو۔ (کلوو رکتا ہے لیکن مڑ کر نہیں دیکھتا)

کلوو اس کو کہتے ہیں ڈرامائی رخصت

ہیم کلوو میں تمہاری خدمات کے لئے تمہارا ممنون ہوں۔

کلوو (تیزی سے مڑتے ہوئے) اوہ۔ معاف کرنا، میں تمہارا ممنون ہوں۔

ہیم اس کا مطلب ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ممنون ہیں۔ (وقفہ کلوو دروازے کی طرف جاتا ہے) بس ایک بات اور (کلوو رکتا ہے) ایک آخری عنایت۔ (کلوو جاتا ہے) مجھے میری چادر اڑھا دو (طویل وقفہ) نہیں؟ ٹھیک ہے۔ اب مجھے کھیل میں لگ جانا چاہئے۔ (وقفہ تھکے ہوئے انداز میں) پرانا کھیل ختم ہو گیا۔ اور بازی ہاری جا چکی ہے۔ کھیلو۔ ہارو۔ اور قصہ پاک کرو۔ (وقفہ زیادہ جوش سے) ذرا دیکھا جائے۔ (وقفہ) ہاں ٹھیک ہے (اپنی کرسی سرکانے کی کوشش کرتا ہے چھڑی کی مدد سے) کلوو داخل ہوتا ہے۔ اس نے باہر جانے کا لباس پہن رکھا ہے۔ اس کے سر پر ایک پناما ہیٹ لگا ہوا ہے۔ اور اس نے ایک ٹوئیڈ کا کوٹ پہن رکھا ہے۔ اس کے بازو پر برساتی اور ہاتھ میں چھتری اور بیگ ہے۔ وہ دروازے کے قریب رکتا ہے۔ اور وہیں ساکت کھڑا رہتا ہے۔ اس کی نظریں ہیم پر گڑی ہیں۔ پردہ گرنے تک وہ اسی طرح کھڑا رہتا ہے۔ ہیم کرسی سرکانے کی کوشش ترک کر دیتا ہے۔)

ٹھیک ہے (وقفہ) اسے پھینکو۔ (چھڑی پھینک دیتا ہے۔ کتا پھینکنے کے لئے بڑھاتا ہے۔ لیکن، پھر ارادہ بدل دیتا ہے۔) ٹھہرانے کی ضرورت نہیں۔ (وقفہ)

نواب (وقفہ) اپنا ہیٹ اٹھاؤ۔ (ٹوپی اٹھاتا ہے) ہماری داڑھیوں کو چین نصیب ہو۔ (وقفہ) اپنا ہیٹ لگالو (ٹوپی لگاتا ہے) لعنت خدا کی۔ (وقفہ۔ چشمہ اتارتا ہے) انھیں صاف کرو۔ (رومال نکالتا ہے اور اسے بغیر کھولے اس سے چشمہ صاف کرتا ہے) اب اسے پھر لگالو۔ (چشمہ لگاتا ہے اور رومال جیب میں رکھتا ہے) وقت آرہا ہے۔ اس قسم کے ایک دو تماشے اور ہوجائیں تو پھر میں آواز دوں۔ (وقفہ) شاعری کیسی رہے گی۔ (وقفہ) تم نے دعا مانگی۔ (وقفہ) تم نے رات کے لئے التجا کی اور وہ آگئی۔ (وقفہ۔ غلطی درست کرتا ہے) اور وہ قطرہ قطرہ ٹپکنے لگی۔ اب تم اندھیرے میں آنسو بہاتے رہو۔ (وقفہ) خوب صورت الفاظ ہیں (وقفہ) اب کیا کیا جائے (وقفہ) ان لمحات کا موضوع ہے۔ "نہیں نہیں — نہیں۔" وقت کبھی نہیں تھا۔ لیکن وقت ختم ہوچکا ہے۔ حساب لیا جاچکا ہے۔ اور کہانی ختم ہوگئی ہے۔ (وقفہ۔ داستان گوئی کے انداز میں) کیا میں اپنے لڑکے کو اپنے پاس رکھ سکتا ہوں۔ (وقفہ) مجھے اسی لمحہ کا انتظار تھا۔ تم اسے اس کے حال پر چھوڑنے کو تیار نہیں ہو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ جس وقت تم مرجھانے لگو، وہ پھول کی طرح کھل جائے اور تمہارے آخری وقت میں، آخری لمحے میں تمہیں تسکین دے۔ (وقفہ) ان باتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ وہ بس ایک بات سمجھ سکتا ہے۔ بھوک! سردی اور آخر میں موت — لیکن تم؟ — تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ آج کل دنیا کا کیا حال ہے۔ اس طرح میں نے اس کے سامنے اس کی ذمہ داریوں کا ذکر کیا۔ (وقفہ۔ معمولی انداز میں) ہاں تو یہ بات ہوئی۔ یہ بات ہوئی۔ یہ کافی ہے — (سیٹی منہ سے قریب لاتا ہے۔ جھجکتا ہے۔ اسے نیچے ڈال دیتا ہے۔ (وقفہ) ہاں ٹھیک ہے۔ (سیٹی بجاتا ہے۔ وقفہ زور سے بجاتا ہے۔ وقفہ) ٹھیک ہے۔ (وقفہ) ابّا (وقفہ۔ بلند آواز میں) ابا (وقفہ) ٹھیک ہے۔ ابھی آتے ہیں۔ (وقفہ) اور انجام کیا ہوگا۔ (وقفہ) پھینک دو۔ کتا پھینک دیتا ہے اور گلے میں بندھی ہوئی سیٹی کی ڈوری توڑ دیتا ہے) بہترین دعاؤں کے ساتھ (سیٹی حاضرین کی طرف پھینکتا ہے (وقفہ) چھینکتا ہے۔ (نرم آواز میں) کلوو (طویل وقفہ) نہیں؟ — ٹھیک ہے۔ (رومال باہر نکالتا ہے) اگر کھیل کا یہی رنگ ہے تو پھر۔ (رومال کھولنا شروع کرتا ہے) تو پھر کھیل اسی طرح کھیلا جائے گا۔ (رومال کھولتا ہے) اور اب اس سلسلے میں کچھ نہ کہو۔ (رومال پورا کھل گیا ہے) کچھ نہ کہو۔ (رومال کھول کر پھیلاتا ہے) زخموں کو خشک کرنے والے پرانے ساتھی۔ (وقفہ) [illegible] موجود ہو۔ (وقفہ — رومال سے اپنا چہرہ ڈھکتا ہے اور بازو کرسی کے ہتھے پر پھیلاتا ہے۔ بالکل ساکت ہے)

[چند لمحے یہ ساکت منظر پیش نظر رہتا ہے]

پردہ گرتا ہے

نظموں کا عنوان ملاحظہ ہو جن کی مزید تفصیل ضروری نہیں ۔
"صبح جو برا، شامِ تلسی پور، فاتح اعظم (دگ گارن)،
دو آلین مینا، روحِ تشنہ کام (کٹک) وغیرہ۔ دوسرے
قسم کے عنوانات بھی کچھ امید افزا نہیں مثلاً شبِ طولِ الم،
وہ نہیں آئے، جیون کی ندی وغیرہ۔ عنوانات سے قطع نظر ان نظموں
کے محتویات بھی کچھ اہم نہیں۔ نظم "پیاسا" جسے کامیاب جدید
نظم کہا گیا ہے اس کے ابتدائی اور آخری بند ملاحظہ ہوں ؎

ابھی باقی ہے وہی رنجِ فراق
وہی وحشت وہی آشفتہ سری
وہی افکارِ پریشاں، وہی یاس و حرماں
وہی دھوکا وہی یاس و حرماں
آہ محروم اثر
دردِ محروم علاج
ابھی باقی ہے شبِ تارِ حیات
ابھی باقی ہے وہی رنجِ فراق

جا کے دریا پہ بھی پیاسا آیا
سوزشِ تشنہ لبی
بڑھتی جاتی تھی مگر
ایک قطرہ نہ لبوں تک پہنچا
موجِ سیلاب بنی میرے لئے موجِ سراب
چشمۂ نہر میں تبدیل ہوا چشمۂ آب
چار سو کتنی گھٹائیں چھائیں
لیکن اک بوند نہ دھرتی پہ گری
تلخیٔ کام و دہن اور بڑھی۔ اور بڑھی
ساحلِ خشک سے کچھ بھی نہ ملا
جا کے دریا پہ بھی پیاسا آیا

درمیانی بند میں آٹھ عدد پھولوں کے نام ہیں اور آٹھ ہی رنگوں
کے نام۔ اب نظم کے متعلق آپ خود فیصلہ کریں۔ مرتب کے
الفاظ میں "دیا" علامتی نظم ہے اسے بغیر تبصرہ پیش کر رہا
ہوں ؎

پھر یہ اچانک
بجلی بتی فیل ہوئی
ہر سو ظلمت پھیل گئی
بازاروں میں دکانوں میں
گھر کے اندر گھر کے باہر
گھور اندھیرا لہرایا
جانے کب تک روشنی یہ پھر آئے گی؟
ماچس لاؤ
دیا جلاؤ
وہی دیا
بجلی کے بل بوتے پر
جس کو ہم نے ٹھکرایا
وہی دیا
پھر کام آیا

"شبِ طولِ الم" اور "روشنی کہتے ہیں" میں فیض اور ساحر کی باز گشت صاف سنائی دیتی ہے اس پر ستم یہ کہ مرتب انہیں تکنیک کے لحاظ سے جدید کہنے پر مصر ہیں۔ "تم اگر چاہو تو" کو "پیکریت کے علاوہ نیورومانویت کا پرتو" بتایا گیا ہے حالانکہ اس میں جمیل مظہری کا آہنگ ملتا ہے اور بس یہاں یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ مرتب رومانویت کے صحیح مفہوم سے آشنا نہیں۔ ان باتوں سے قطع نظر اس حصہ کی ایک نظم "مرثیہ" اپنے اندر ایک اچھی نظم بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

"متاعِ فکر" کے تحت ۱۹۲۲ء سے ۱۹۵۷ء تک کی تخلیقات شامل ہیں جن کی تعداد دس ہے۔ گویا ہم شاعر کے دورِ گزشتہ کے کلام کی طرف رجوع ہوں۔ مرتب کا خیال ہے یہ

…سفیانہ اور متصوفانہ نظمیں" ہیں کیونکہ ان میں شاعر "مربوط
…ر کو مشکل جذبات کی سطح تک لانے میں کامیاب ہوا ہے۔" یہ خیال
…س قدر تضاد بیانی کا شکار ہے اسے سمجھنے کے لئے کسی بڑی
…دش کی ضرورت نہیں صرف "عرض مرتب" ہی پڑھ لینا کافی ہے۔
…صوف کی واقفیت کے لئے چند باتیں عرض کرنی پڑتی ہیں۔
نمبر ایک : یہ کوئی حساب کا سوال نہیں جسے سیدھے حل
…ریا جائے۔ کوئی فن پارہ فی نفسہٖ فلسفیانہ یا متصوفانہ نہیں ہوتا
…لکہ فلسفہ یا تصوف محض آتی جاتی لہروں کی طرح خیال کے سمندر
…میں شامل ہو جاتے ہیں۔ نمبر دو : مربوط فکر کا فلسفہ یا تصوف
…ں بنانا قطعی ضروری نہیں۔

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے :——

"یہ تخلیقات بجا طور پر ادب عالیہ کا درجہ پا سکتی ہیں۔"

مزید ستم ملاحظہ ہو :——

"مثنوی جیسی کلاسیکل صنفِ سخن کو قومی اور وطنی موضوعات
کے لئے استعمال کر کے ایک نئی روح عطا کرنے کے سلسلے میں امجد
نجمی کی یہ کوشش غالباً اردو ادب میں اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے۔"

ایک اور انوکھا خیال پیش کرتے ہیں :——

"بادی النظر میں ان کی ایسی نظموں پر ترقی پسند تحریک کے
اثرات کا گمان گزرتا ہے لیکن دراصل ان کی وطنی اور سماجی شاعری
کا آغاز ۱۹۲۰ء سے ہو چکا تھا ...... ظاہر ہے اس وقت ترقی پسند
تحریک کا وجود ہی نہیں تھا۔"

آپ کو اختیار ہے ان "خیالاتِ عالیہ" سے جو نتائج چاہیں
اخذ کریں۔ یہاں پر اس سلسلہ کی چند نظموں کا جائزہ لینا
ضروری ہے۔ "ماتم وہاب" اور "زندگی اور اجل" کو حیات و
ممات پر موثر نظمیں کہا گیا ہے۔ لیکن ان میں غالب کے "ماتم عارف"
کی نقل سے زیادہ کچھ نہیں۔ "زندگی" اور "زندگی اور کارواں"
فلسفیانہ افتادِ طبع کی زائیدہ کہی گئی ہیں مگر ان میں اقبال کے
تتبع کی جھلکیاں ملتی ہیں بلکہ "کرمکِ شب تاب" میں تو لفظی
ترکیب اور موضوع کی یکسانیت کے علاوہ اقبال بننے کی سعی لاحاصل
نظر آتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ نظم "زندگی" مختصر ہے
اس لئے پوری نقل کرتا ہوں ؎

دنیا میں تجھ کو ہے اگر ارمانِ زندگی
تدبیر سے تو باندھ لے پیمانِ زندگی

تابِ تب عمل، خلش کوششِ دوام
ان سے بہم پہنچتا ہے سامانِ زندگی

کرے رفو تو جوششِ کردار سے
کیوں کر رہا ہے چاک گریبانِ زندگی

جس زندگی میں جوشِ خودی کا نہ ہو خیال
وہ زندگی نہیں کبھی شایانِ زندگی

کر نوح بن کے اس کا تو ہر دم مقابلہ
طوفانِ زندگی ہے یہ طوفانِ زندگی

محدود تو سمجھنے لگا ہے اسے مگر
بے انتہا وسیع ہے میدانِ زندگی

"زندگی کا کارواں" مندرجہ بالا نظم کی توسیع ہے۔ "کرمکِ
شب تاب" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کس قدر پُر نور ہے اے کرمکِ شب تاب تو
دامنِ دریا کا ہے اک گوہرِ نایاب تو

تو کسی آتش نفس کا شعلۂ جوالہ ہے
یا کسی تفتہ جگر کا تو شرارِ نالہ ہے

حسنِ عالم سوز کی کیا کوئی چنگاری ہے تو
سچ بتا ننھی سی جاں نوری ہے یا ناری ہے تو

تو سراپا نور ہو کر دید سے محروم ہے
تیرا اندازِ نظر بھی کس قدر معصوم ہے

اس حصہ کی دوسری نظمیں اوسط درجہ کی ہیں اور بقول "نمک
سک سے درست" ہیں۔

"دانش و دل" کا حصہ چھ وطنی نظموں پر مشتمل ہے اور
ان کی تخلیق کا عرصہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۹ء تک ہے۔ اس میں
بھی بہ حیثیت مجموعی اقبال کے وطنی شاعری کے اثرات نمایاں ہیں
اور جو نئے خیالات ہیں ان کا اظہار محض رسمی ہے۔ مرتب کے
عرض کردہ بیانات "نئی روح" اور "ترقی پسند خیالات" ڈھونڈے
سے نہیں ملتے۔

"وادی وادی" ۱۹۲۰ء سے ۱۹۶۰ء تک کی ۴۰ غزلوں
پر مشتمل ہے۔ یہاں مرتب نے سب سے پہلے علامہ نیاز کی سند پیش
کی ہے : "امجد نجمی کی میں بڑی عزت کرتا ہوں اور اس دور کا
سب سے بڑا غزل گو شاعر سمجھتا ہوں۔" اگر یہ کلمات واقعی نیاز کے
قلم سے ادا ہوئے ہیں تو سب سے پہلے ان کا ذوقِ شعری محلِ نظر ہے۔

اب رہی بات نجمی صاحب کی غزل گوئی اور ان کے مقام کے تعین کی بات تو اِس سلسلہ میں مَیں جو کچھ عرض کروں گا اس کے قبل حضرت مرتب یعنی کرامت صاحب کے خیالات پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ جن اشعار کو وہ "صنفِ غزل کے امکانات کو نئی صلابت و توانائی بخشنے" کا سبب جانتے ہیں وہ اوسط درجہ کے اشعار بھی نہیں چہ جائیکہ ان میں اعلیٰ تخلیقی صلاحیت کی تلاش فضول کی جائے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مرتب اپنے ممدوح کو زیر کرنے کی سازش کر کے اپنے لئے زمین ہموار کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں۔ بہت کا حال تو اللہ جانے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

جھکتا ہی نہ تھا، پھر ایسا جھکا نام اُٹھنے کا لیتا ہی نہیں
معلوم نہیں اس سر نے کیا اس سنگِ در میں دیکھ لیا

تقدیر کے ہم قائل ہی نہ تھے پر اتنا کہنا پڑتا ہے
تدبیر کا دامن ہاتھ میں اپنے آکر اکثر چھوٹ گیا

مجھ کو نہ شمس کی نہ قمر کی تلاش ہے
دنیائے آب و گِل میں بشر کی تلاش ہے

میں سمجھتا ہوں کرامت صاحب نے کوئی ایک صدی قبل کا مرزا نوشہ کا یہ شکوہ غالباً نہیں سنا ع

آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

یا ماضی قریب میں شاد، اصغر اور جگر کے اس مضمون کے اشعار نہیں پڑھے۔ اردو غزل میں عمومی طور سے یہ مضمون اس قدر پیش پا افتادہ ہے کہ اس میں نئی بات پیدا کرتی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اوپر کے دوسرے شعر کے سلسلہ میں بھی کم و بیش یہی بات صادق آتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ کرامت صاحب اچھا شعر اور بُرا شعر میں فرق نہیں سمجھتے پھر اچھا شعر بھی انتخاب کے لئے ایسا حسنِ نظر چاہتا ہے جو بقول غالب دانا آدمی کو رسوا کردے۔ فی الحال سہولت کے لئے کچھ اس قسم کے انتخاب پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے ؎

ہر شکستِ آرزو ہے تازہ تر تمہیدِ شوق
اور کچھ اب اپنی ہمت کو جواں پاتا ہوں میں

حسن کو میں خدا سمجھتا ہوں
ہائے میرا خیال کیا کہئے

اُمید کی شمعیں رہ رہ کر ہیں دل میں جلاتا جاتا ہوں
جب جل چکتی ہیں یہ شمعیں پھر سب کو بجھاتا جاتا ہوں

لب بستہ ہے جو بھی ہے مرا حرفِ تمنا
جو نالہ ہے وہ بھی ابھی محرومِ اثر ہے

آخر میں مَیں کہوں گا کہ نجمی صاحب کے اس خیال سے بہر حال اتفاق کیا جا سکتا ہے (کاش مرتب بھی انصاف کرتے) ع

مجھ کو تو اک جہانِ دگر کی تلاش ہے

ــــ قارئین ـــــــــــــــــــــــــ سواد و صوت

ـــ امت علی کرامت ، شندر گڑھ ــــــــــ

اس دفعہ آپ نے مزامیر میں ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ کے
...ن کا ترجمہ پیش کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ بھی اسی
نظریے کی تبلیغ کرتے ہیں جس کی بنا ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ نے ڈالی
تھی ۔ ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ کے ان جملوں سے متعلق کہ :

"شاعری جذبات کے آزادانہ اظہار کا نام
نہیں بلکہ جذبات سے فرار کا نام ہے ۔
شاعری شخصیت کے اظہار کا نام نہیں بلکہ
شخصیت سے فرار کا نام ہے ۔"

مغربی مفکروں کے درمیان کافی بحثیں ہو چکی ہیں اور ایلیٹ کا یہ
قول اتنا فرسودہ ہو چکا ہے کہ سوائے ہم ہندوستانی ادیبوں کے
اس کا گُن غالباً اب کوئی نہیں گاتا ۔

فرانس کے مشہور فلسفی ژاک مارتیں نے شعر کے تخلیقی عوامل
پر بحث کرتے ہوئے شاعر کی تعمیری خودی (CREATIVE
SELF) اور ذات پہ مرکوز انا [SELF
CENTRED EGO] کے درمیان فرق واضح کیا
ہے ۔ اس کا کہنا ہے کہ تعمیری خودی خود کو ظاہر بھی کرتی ہے اور
خود کو قربان بھی کرتی ہے ۔ یہ عالم انبساط میں خود سے باہر کو آتی
ہے (جسے تخلیقی عمل کہہ سکتے ہیں) اور خود بخود مٹ بھی جاتی ہے
تاکہ تخلیق کے درمیان اسے ابدی زندگی حاصل ہو ۔ ظاہر ہے کہ
یہ عمل ذات پہ مرکوز انا کے مزاج کے منافی ہے ۔ اسی ضمن میں
ژاک مارتیں نے ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ پہ یہ اعتراض کیا ہے کہ
ایلیٹ نے تعمیری خودی اور ذات پہ مرکوز انا کے فرق کو نہیں پہچانا
ورنہ وہ یہ نہ کہتا کہ شاعری جذبات سے فرار کا نام ہے یا شاعری
شخصیت سے فرار کا نام ہے ۔ شاعر اگر اپنے تعمیری جذبات سے
فرار حاصل کرے تو اس کی شاعری شاعری ہو کے نہیں رہ سکتی ۔

ٹی ایس ایلیٹ کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ایک
طرف وہ شاعری کے لئے جذبات سے فرار کو ضروری سمجھتا ہے تو
دوسری طرف شاعری میں "معنی خیز جذبات" کے اظہار کو
جائز قرار دیتا ہے ۔ اس تضاد کا جواب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ
"جذبات سے فرار" سے مراد ایلیٹ "شخصی جذبات سے فرار"
لیتا ہے ۔ لیکن میری رائے میں "شخصی جذبات سے فرار" کو بھی لازمۂ
شعری کا درجہ نہیں دیا جا سکتا ۔ شاعر کے شخصی جذبات آفاقی بھی
ہو سکتے ہیں بشرطیکہ جذباتی کیفیات کی موجیں زندگی کے لامتناہی
تجربات کی وسعت اپنے دامن میں جذب کئے ہوں ، غالب جس وقت
کہتا ہے کہ :

نومیدئ ما گردشِ ایام ندارد
روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد

تو اس وقت شاعر کی شخصی ناامیدی کا جذبہ پوری کائنات پر
چھا جاتا ہے اور اس شعر کو ایک آفاقی شکل عطا کرتا ہے ۔ مزید
وضاحت کے لئے غالب کے ذیل کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیے :

(۱) سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

(۲) بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

پہلے شعر میں شاعر کا رُخ " شخصیت سے فرار " کی طرف ہے تو دوسرے شعر میں اس کی خود بیں و خود آرا شخصیت پورے حسن و جمال کے ساتھ جلوہ فرما نظر آتی ہے۔ پہلے شعر کو دوسرے شعر پر محض اس لئے فوقیت نہیں دی جا سکتی کہ اس " شخصیت سے فرار " ہے یا اس میں " معنی خیز جذبات " کی کارفرمائی ہے ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں اشعار کی اثر آفرینی کے ذریعے مختلف ہیں اور یہ دونوں اشعار دو مختلف زاویوں سے ہمیں جمالیاتی نشاط عطا کرتے ہیں۔

یُنگ جیسے مفکروں کا خیال ہے کہ شاعر کی شخصی زندگی کو اس کے فن پارے کے لئے ضروری قرار نہیں دیا جا سکتا ہے، کیونکہ شاعر شعر کے اندر " فرد " نہیں ہوتا بلکہ " اجتماعی انسان " ہوتا ہے۔ جو تمام نوعِ انسان کی وجدانی زندگی (PSYCHIC LIFE) کی تعمیر میں حصہ لیتا ہے۔ یُنگ نے گیٹے سے متعلق بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ " گیٹے نے فاؤسٹ کی تخلیق نہیں کی ہے، بلکہ فاؤسٹ نے گیٹے کی تخلیق کی ہے .... ہر جرمن کی روح میں جو شے پل رہی تھی، گیٹے نے اسے جنم دینے میں محض مدد دی ہے اور بس۔ " کہنے کی غرض یہ ہے کہ شعر کی قدروں کا تعین شاعر کے شخصی کردار یا شخصی جذبات کو مدنظر رکھ کر نہ کیا جانا چاہئے بلکہ جمالیاتی نشاط کے نقطۂ نظر سے اس کا تعین ہونا چاہئے۔

یہاں ایک ضروری بات یاد دلاتا چلوں کہ " شخصیت سے فرار " کو ضروری قرار دیتے ہوئے خود ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کو اس امر کا بخوبی احساس تھا کہ " ایک سچے فن کار کو معلوم ہے کہ یہ فرار کس قدر مشکل ہے۔ " آخر یہ فرار کیوں مشکل ہے؟ اس لئے کہ شاعر " زندگی " کا (تمام تکمیلیت کے ساتھ) پابند ہوتا ہے۔ فن کار بذاتِ خود " زندگی " کے اندر رہتا ہے، لیکن اس کے باوجود " زندگی " کو باہر سے معروضی طور پر برتنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر فن کار کا " ایک طرف " زندگی کے ٹھوس حقائق سے وابستگی ہوتی ہے تو دوسری طرف

اس کی انا [illegible] یا نیم شعوری [illegible] اس کے ذہن میں کارفرما نظر آتی ہے اور ایک سچا فن [illegible] کسی بھی ایک سمت میں زیادہ دیر تک بہ جانا پسند نہیں [illegible] غالباً اسی کشمکش کی وجہ سے [illegible] سو نے اپنی مصوری کو " HORDE OF DESTRUCTIONS " کے لقب سے یاد کیا ہے۔ اور ایٹیر [illegible] نے تمام فنونِ لطیفہ کے بارے میں کہا ہے کہ " IT IS THE ACTIVITY THAT EXALTS AND DENIES SIMULTANEOUSLY " کہنے کی غرض یہ ہے اگر کچھ دیر کے لئے " شخصیت سے فرار " یا " جذبات سے فرار " کو شاعری کے لئے ضروری قرار دیا جائے تو ایک سچا فن کار زیادہ دیر تک اس اصول پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور کوئی فن کار اگر زبردستی قائم رہنے کی کوشش کرے، تو اسے سچے فن کار کا [illegible] عطا نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے بعض جدید شعرا میں آج کل جو ANTI COMMITMENT کی ہوا چل رہی ہے، وہ بھی [illegible] شاعر کی " شخصیت سے فرار " یا " جذبات سے فرار " کی شعوری [illegible] کی دوسری شکل ہے جسے یقیناً مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ [illegible] وجہ ہے میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ANTI COMMITMENT کی شعوری کوشش بھی میری نظر میں ایک طرح کا COMMITMENT ہے۔ جدید شاعر کسی بھی طرح COMMITMENT کے جال سے باہر خود کو نکال نہیں سکتا۔

اختر یوسف، رانچی

تازہ شمارہ پڑھ چکا ہوں۔

اکرام باگ کی نظموں کے بعد عتیق اللہ کی یہ نظمیں بہت اچھی لگی ہیں۔ عتیق اب نظموں کے معاملے میں ایک نئی دنیا کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آج کے SITUATIONS کو یہ نظمیں بخوبی پکڑتی ہیں اس کی اور بھی نظمیں شائع کیجئے۔

…اس میں کوئی شک نہیں کہ اب غزل کے معاملے میں لطف
… اپنے کئی ہم عصروں سے آگے ہیں۔ ان کی یہ غزلیں بہت
…جاتی ہیں۔ ٹوٹنے کا عمل آج کا خاص المیہ ہے۔ لطف الرحمٰن
… پر گرفت رکھتے ہیں۔
… تخلیقات میں دانش کی نظمیں اور فسکری کا "آخری سفر"
… کابل ہیں۔

…م صدیقی، الہ آباد

… میر کے حسن انتخاب کے پیچھے کارفرما شخصیت کی
…ستی ، ذہنی سلامت روی اور وسیع المشربی عصری تنقید
… تنگ نظری اور سطحی پن کے لئے نیک فال ثابت ہو سکتی ہے
… محمد مثنی کا آرٹیکل گو کہ خاصا تشنہ اور مورخانہ
…یت کا حامل ہے۔ اس میں عارف کے گہرے نشاطِ عرفان کا تو
… ایک سنجیدہ متجسس ذہن کے کرب جستجو کا پتہ ضرور چلتا ہے
…ان کے ذہنی سفر مدام سفر کا غماز ہے۔
… یہ اپنے بنیادی اسپرٹ میں اردو کے خاصان ادب
… بھی بصیرت افروز ہے جن کی ذوقی بے حسی اور کج بیانی
… ناک ہوتی ہے۔ اس نوعیت کے مزید معلوماتی مضامین شائع
… اشد ضرورت ہے جو ہمیں عالمی فکر و ادب کے سیل رواں
…ہم آہنگ کر سکے۔
… مہا گرو" لارنس اسٹرن پر ایک سیر حاصل مضمون کی
…رورت ہے۔ نظر صاحب کے ترجمہ سے اس کی محبوبیت پر تو
…روشنی پڑتی ہے۔ لیکن اس کے فکر و فن پر ہیں۔
عتیق اللہ اور علیم اللہ حالی کی منظومات اور مغنی تبسم،
…ارش انصاری اور سلطان اختر اور منصور سبزواری کی غزلیں خصوصی
…اور پر جاذب توجہ ہیں۔ لطف الرحمٰن کی قادر الکلامی اور تاثر آفرینی
…س تخلیق "بچہ پرستی" اور منی شعری اور نثری ستر پوشی کے دور
… مصنف ت روزگار ہیں ہے جبکہ آج ہر قطرہ گہر ہونے کے سخت

جانگسل کرب سے گریزاں خواہ مخواہ نرگسی واہموں کے سمندر
ہونے کا مدعی ہے حالانکہ اس کی کوکھ میں چند سنگریزوں کے سوا
کچھ نہیں۔ نیل منی کے مانند وش پائی ہونا تو دور کی بات ہے۔

نصر قریشی، الہ آباد

"آہنگ" کا تازہ شمارہ (۲۵۔۲۶) مرزا میر سے
لے کر پرکاش فکری کے انگیز آخری صفحہ تک زیر مطالعہ ہے۔
ڈاکٹر محمد مثنی نے اپنے مقالے کے خاتمے پر استفادہ حاصل
کرنے والی کتاب کا حوالہ دے کر ادبی دیانت داری کا ثبوت دیا
ہے جبکہ اکثر "دانشورانِ کرام" مقالہ در مقالہ ہمکل شدہ خیالات
اور تحریروں کو اپنے اعلیٰ پے جدید افکار کے نام سے پیش … کے
فخر سے سر بلند کرتے رہتے ہیں اور دوسروں کے تصور پر قارئین کے
سامنے ایک واضح تصویر پیش کرتا ہے۔
علیم اللہ حالی کی نظم "آخری الزام" بنگلہ دیش
بننے کے بعد پیش آنے والے واقعات کا تاثراتی خاکہ سمونے میں
پوری طرح کامیاب ہے اور جدید شعراء کو عصری مسائل کی ترجمانی
کی روگردانی کے الزام سے بری کرتی ہے اور شاعری میں صالح
روایات کی برتری کا احساس دلاتی ہے۔ عتیق اللہ کی نظم
"گریزپا" شدتِ احساس اور تاثراتی پیکر کا حسین نمونہ ہے۔
غزلوں میں مغنی تبسم اور سلطان اختر کی غزلیں بہت پسند آئیں۔
خصوصی مطالعہ کا سلسلہ دلچسپ اور توجہ کا مرکز ہے۔
حسین الحق کے افسانے عصری حسیت کو گرفت میں رکھنے کے ساتھ
بلندیوں کو چھونے میں کامیاب ہیں۔ پیکروں کی تلاش میں
تشنگی، تیرگی، غمِ ذات اور غمِ دل فن کار کو خانوں میں بانٹ
دیتے ہیں اور کبھی کبھی یہی سب کچھ فن کار کا خدا بن جاتا ہے
لیکن جوئے شیر کے لئے کوہکن کو نہر خوں سے گذرنا ہی پڑتا ہے۔ حسین
الحق بھی پیکر تراشیوں کے لئے پتھر سے جسم کو موم بنانے کا عزم رکھتے
ہیں۔ شوکت حیات کے "بن کا تعارف" پڑھنے کے بعد نہ جانے

کیوں اُسی لب و لہجے اور انداز بیان میں ہر تعارف پڑھنے کو جی
چاہتا ہے۔ پرکاش فکری صاحب آخری صفحہ کا سلسلہ جاری
رکھیں تو قارئین کے لیے ایک سودمند سلسلہ ہوگا۔

طارق ندیم، کراچی

آہنگ کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ آپ نے
نئے افسانہ نگاروں کی تخلیقات شائع کرکے ایک اچھا کام کیا
ہے۔ شوکت حیات اور حسین الحق بلاشبہ سراہے جانے کے قابل
ہیں۔ لمحات حاضرہ کی تمام تر حسیات اپنی مکمل تیزی کے ساتھ
ان کی کہانیوں میں موجود ہیں۔ زمانہ آج اتنا تیز ہوگیا ہے کہ اب
زمانہ کو ادوار میں تقسیم کرنے کا سوال نہیں اُٹھتا۔ اب تو ایک ایک
لمحہ ایک ایک دور ہوگیا ہے۔ VALUES اتنی تیزی سے بدلتے ہیں
اور بدل رہے ہیں کہ نگاہ ٹھیک طور سے کسی شے پر مرکوز نہیں ہو پاتی
کہ دوسری شے پہلی سے زیادہ جاذب اور خوب صورت مقابل میں
آن کھڑی ہوتی ہے اور یوں شے بدل بدل کر آتی جاتی ہیں نگاہیں
ٹھہر نہیں پاتیں۔ ان حالات میں "انداز" کی جستجو اور ان کو یقین
ممکن نہیں۔ آج سے دس برس پہلے (کچھ اتنی بڑی مدت تو نہیں)
کے LITERARY HEROES جانے کہاں گم ہوگئے۔ آج
نئے ہیروز ہیں اور بلاشبہ یہ سابق ہیروز سے زیادہ ذہین اور فطین
ہیں اور صاحب! ان کی کہانیوں میں موجودہ حسیات کے علاوہ
ایک بڑی بات یہ پائی جاتی ہے کہ ان کے یہاں بے پناہ خلوص نظر
آتا ہے۔ ان کی کہانیاں پڑھئے۔ کسی بھی طور ان پر ARTIFICIALITY کا الزام نہیں تھوپا جاسکتا۔ ہاں ابہام ہے مگر شکر ہے
شوکت حیات اور حسین الحق کے یہاں ابہام کے کیڑے ادروں کی
طرح گلے سڑے اور گڈ مڈ نظر نہیں آتے۔ حسین الحق اور شوکت
حیات اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ لمحات کے نمائندے ہیں اور
ان کی تخلیقات پر انھیں بھرپور ENCONRAGEMENT
ملنا ہی چاہئے۔

تازہ شمارہ میں [illegible]
بہار کے نئے شاعروں (خصوصاً [illegible] شاعروں
الرحمٰن سے زیادہ IMPRESSIVE اور کوئی نہ
غزلوں اور نظموں میں وہی "ٹھہراؤ" اور [illegible]
فیض کے یہاں ہے۔

وہاب دانش کی دونوں نظمیں اچھی نظموں میں
علی حیدر ملک سے کوئی بھرپور مضمون لکھوایئے
TALENTED شخص کو صرف تبصرہ نگاری کے لئے مخصوص
چاہئے۔ اسی طرح ظہیر صدیقی سے بھی تنقیدی مضامین لکھو
نثری صلاحیت ان کی شعری صلاحیت سے کسی بھی طور
کتنی عجب بات ہے کہ کلیم الدین احمد کے علاوہ بہار سے
کوئی بھی نقاد ایسا نہیں جو تذکرہ کے بھی قابل ہو [یہ
کس نے کہا؟ ۔ ادارہ] تنقیدی صلاحیت
افراد کی کمی نہیں ہے مگر جسے دیکھئے وہ یا تو افسانہ نگار
یا شاعر بن بیٹھتا ہے۔ وہاب اشرفی نے اُدھر کچھ
مضامین لکھے تھے، اب سُست نظر آرہے ہیں۔؟
اُردو کی ترویج و ترقی کے لئے آپ جو کچھ کر رہے
کم از کم مجھ میں یہ ہمت نہیں کہ جھٹلا سکوں۔

شورش کریمی، پٹنہ

جولائی، اگست کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ حسین الحق
مطالعہ اپنا اَمٹ نقش چھوڑتا ہے۔ "بند مٹھی کا [illegible]
دشاؤں کے سائے" اور "شکستیدہ" نئے ادب
اچھی کہانیاں ہیں جن سے ایک خوش آئند باب کا اضافہ
غیاث احمد گدی، جوگندر پال، سریندر پرکاش، احمد
کلام حیدری اور ظفر اوگانوی کے بعد جو افسانہ نگار بہت
طور پر سامنے آئے ہیں ان میں شبیر احمد، اکرام باگ، حمید
اور حسین الحق کا نام شوکت حیات سے پہلے لیا جائے گا۔

...د شعیب، رانچی

...یا شمارہ دیکھا۔ حسین الحق کی خصوصی پیش کش پیش نظر ...ان کی کہانی "اندھی وشاؤں کے سائے" حاصل پیش کش ...گذشتہ دنوں ان کی اس کہانی سے متعلق جو ہنگامہ ہوا اب ...اس ہنگامے کا فیصلہ ہو جائے اور اس کہانی کو اس کا صحیح ...مل سکے۔ بقیہ پانچ کہانیوں میں "بلبلہ" اور "بند مٹھی کا ...چھی کہانیاں ہیں۔ ابھرتے ہوئے نئے افسانہ نگاروں میں ...سانہ نگاروں نے اپنا مقام بنا لیا ہے ان میں حسین الحق کو ...یت حاصل ہے۔

...زلوں میں سلطان اختر اور مغنی تبسم پسند آئے اور ...وں میں وہاب دانش۔

...سین، کلکتہ

"آہنگ" کے شمارہ ۲۱-۲۲ میں شوکت حیات کی چھ ...نیاں بہ غور پڑھیں اور بعض مقامات پر ابہام کے باوجود ...سے محظوظ ہوا اور نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے کئی نتیجوں پر ...پہنچا ہوں۔

(۱) ان کے یہاں دراڑ، شگاف، ہوا، اننت، ...، سائیں سائیں، فلکچوئشن، نہیں، بھنور، سایہ ...ڈل، شاید، تڑپھڑاہٹ، سُن سُن، اننت وغیرہ ...فاظ کا کثرت سے استعمال ہوتا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس ...ن کار نے اپنی جدوجہد میں بہت کچھ کھویا ہے۔

(۲) ان کی دو کہانیوں "پنڈولم" اور "قطبین کے بیچ ...راؤں کی زد میں" سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جھنجھلاہٹ اور ...شتگی کے شکار ہیں۔

(۳) "میں/تم/وہ/میں" سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ...پنے اندر اننت آدمیوں کی موجودگی دریافت کر لی ہے جو انھیں ...ب میں مبتلا کر رہی ہے۔

(۴) "دائرے کے کنارے" میں وہ ڈبل پرسنلٹی کی گتھیوں کو پیش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک پرسنلٹی وہ ہے جو بہت ہی منظم اور ریگولر ہے۔ یہاں تک کہ دروازے پر دستک بھی دیتی ہے تو بہت ریگولر طریقے سے۔ دوسری شخصیت وہ ہے جو بالکل ٹوٹی ہوئی ہے اور سب کچھ بھول جانے میں گم ہے۔ اور اپنے حرارت کے نقطۂ ابال سے دوچار ہے۔

(۵) "بسوں سے دبا آدمی" میں اس ازلی کرب کو پیش کیا گیا ہے جس سے نجات کا آج تک کوئی حل نہیں نکل سکا ہے

(۶) "سبز منڈیر پر سیاہ کبوتر" میں شوکت حیات داخلی کیفیات کے عجیب موڑ سے گزرتے ہیں۔ جہاں ویرانیاں ہی سب کچھ ہوئی ہیں اور جہاں آبادیوں کا گزر ویرانیوں میں تبدیل ہو جانے کے لئے ہوتا ہے۔

(۷) اردو افسانوں میں بے نام نسل کی ابتدا کرنے والے شوکت حیات کی ساری کہانیوں میں انتشار، برگشتگی، جھنجھلاہٹ، چڑچڑاپن ان کے اپنے TREATMENT کے ساتھ کارفرما ہے، جو انھیں اپنے ہم عصروں میں منفرد مقام عطا کرتا ہے۔

قیصر رضا، بھاگل پور

"میں" کا تعارف حسین الحق نے بہت ہی سادے ڈھنگ سے کیا ہے اور اسی سادگی و پرکاری نے اس تعارف کو کامیاب کر دیا۔ اس نے نہ بے نام نسل کے نام اپنی کہانی کو معنون کیا اور نہ ہی جدید و قدیم ادبی قبرگاہوں سے بہت آگے اپنے اننت سفر کا اعلان کیا۔

آج کے اس دور جدید میں رہتے ہوئے "میں" کی جو اس نے کہانی سنائی ہے۔ وہ نئے فن کاروں کی بکھرتی سمتوں کی اسیری کی کہانی سناتی ہے کہ آج کا فن کار کس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہا ہے اور اسی ٹوٹ کر بکھرنے کے عمل سے اس کی لافانیت ظاہر ہوتی ہے ●●

فون: ۴۴۳

اعتماد اور بھروسہ کے لئے صرف

جنتا سمنٹ پائپ

قائم شدہ ۱۹۵۶ء

کا نام یاد رکھنا کافی ہے

پانی کی نکاسی ہو ——— آب پاشی کا مرحلہ ہو

یا ——— ——— کلورٹس سیوریج

آپ کو جنتا سمنٹ پائپ ہی استعمال کرنا چاہئے

ہمارے پائپ کی گورنمنٹ کے محکموں سے جانچ ہو چکی ہے اور منظوری کی سند مل چ

زیادہ خریدنے پر حوصلہ افزا رعایتیں

ریلوے یا ٹرک کے ذریعہ آرڈر کی فوری تکمیل اب ہم بہتر طور پر کر سکتے ہیں کیوں کہ

۳۰ اگست ۱۹۷۱ء کو ہماری دوسری نئی فیکٹری بھی شروع ہو گ

جنتا سمنٹ پائپ کمپنی، بیراگی گیا اور جنتا سمنٹ پائپ کمپنی، بھرتولی

آہنگ

[illegible] اکادمی، مینا ہاؤس، [illegible] جیون روڈ، گیا

شمارہ: ۳۲ - ۳۳

فروری، مارچ ۱۹۷۳

دفتر : [illegible]، گیا	فی کاپی	۱ سال کے لئے : ۱۲ روپے
مطبع : [illegible]	ایک روپیہ	۲ سال کے لئے : ۲۲ روپے
کتابت : قمر نظامی		۳ سال کے لئے : ۳۰ روپے

فون

دفتر : ۶۶۲

رہائش : ۵۳

مرتبین

کلام حیدری   پرکاش فکری

...یات

اُردو اکیڈمی

ایک سال سے زیادہ ہونے کو آیا مگر بہار اُردو اکیڈمی کی جنرل باڈی کا ایک بھی جلسہ نہیں بلایا گیا ہے۔ اس بات کے پیچھے کیا مقصد پوشیدہ ہے اسے وہی جانے جو اِس "مملکت" کا "خسرو" بنا بیٹھا ہے اور اس اکیڈمی کے اُمور کو صرف اپنی ذات سے وابستہ سمجھتا ہے مگر اس جمہوریت میں ایسے سوالات اُٹھیں گے اور اُس وقت تک اُٹھتے رہیں گے جب تک اکیڈمی کسی "خسروی" کی تابع رہے گی۔

اِس ملک میں ایسا بھی نہیں ہے کہ بہار اُردو اکیڈمی کوئی تنہا چیز ہو۔ پڑوس ہی میں اُتر پردیش اردو اکیڈمی ہے، اُس کا ایک خبرنامہ بھی نکلتا ہے، اس نے درجنوں ادیبوں اور شاعروں کو ان کی مطبوعہ کتابوں پر دو ہزار، ڈیڑھ ہزار کے انعامات بھی دئے ہیں۔ مختلف سب کمیٹیاں بھی بنی ہوئی ہیں اور ان کے زیر اہتمام قابل قدر کام بھی ہو رہے ہیں۔ ہمارے معیار اور توقعات کے مطابق تو یہ سب کام بھی نہیں ہیں مگر ان کاموں کا مقابلہ بہار اُردو اکیڈمی کی کاہلی، نا اہلی اور دانستہ تساہل سے کیا جائے تو اُتر پردیش اردو اکیڈمی کے کارناموں سے کم از کم اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کی نیت کام کرنے کی ہے جب کہ بہار اُردو اکیڈمی صرف ایک دو اراکین کی خود غرضی اور خود نمائی کے علاوہ اب تک کچھ نہیں کر سکی ہے۔

بہار اردو اکیڈمی نے پچھلے دنوں بہار کے چند اداروں کو پانچ پانچ سو روپے کے عطیات (گراں قدر!) کے تحفے تقسیم کئے ہیں۔ چند اشخاص کو بھی عطیات سے نوازا گیا ہے۔ ہمیں فی الحال اس سے بحث نہیں ہے کہ اِن میں مستحق کون تھا اور کون نہیں تھا۔ ہم تو اس غریب زبان کے ہر ادارے کو مستحق سمجھتے ہیں۔

بہار اُردو اکیڈمی اب تک یہ بھی فیصلہ نہیں کر سکی ہے کہ اُسے اپنے لئے ایک خبرنامے کی ضرورت ہے رسالہ شائع کرنا بھی اکیڈمی کے مقاصد میں سے ایک مقصد ہے مگر یہ کاغذ اور روشنائی سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے کیونکہ اس سے آگے بڑھے گا تو شاید معاملہ مخصوص ہاتھوں سے نکل جائے۔

جنرل باڈی کا جلسہ اس لئے نہیں بلایا جاتا کہ اس باڈی میں چند ایسے ادیب بھی ہیں جو "افسروں" اور "افسر زدہ" پروفیسروں کی جی ہاں حضوری نہیں کرسکتے۔ ان سے یہ خوف ہوتا ہے شاید خسروی جبین پر پڑی ہوئی اُن شکنوں کی بھی پرواہ نہ کریں جو سوائے تابع داری کے اور کسی چیز کو برداشت نہیں کرسکتی۔

ایسی صورت حال میں جنرل باڈی کے بہت سے ممبر یہ سوچ رہے ہیں کہ گورنر بہادر سے ملاقات کرکے ایک ساتھ ہی اِس اکیڈمی کی ممبری سے استعفے دے دیں، تاکہ موجودہ اراکین کی نا اہلی، بے پرواہی اور تساہلی کی ذمہ داری اُن پر نہ عائد ہو۔ اِن ممبروں کی شخصیت کے پیچھے ایک ادبی وقار اور شخصی اعتبار ہے۔ انہوں نے اُردو اکیڈمی کی ممبری اس لئے قبول کی تھی کہ اکیڈمی نے اُن کی ضرورت محسوس کی تھی۔ اکیڈمی کی ممبری اُن کے لئے "ذریعۂ عزت" نہیں ہے۔ اُنہیں "سواری بھتہ" اور مقررہ تنخواہ نہیں چاہیئے۔

جو سرکار کے وظیفہ خوار ہیں وہ دُعائیں کریں، ایسے ممبران نے تو کام کرنے کے لئے اکیڈمی کی ممبری قبول کی تھی۔ باجماعت دعا میں شریک ہونے کے لئے نہیں۔

—— کلام حیدری ——

●●

کے

احتشام حسین نمبر

کے ـــــ لئے

اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ ان تمام حضرات سے مضامین، نظموں اور خاکوں کی درخواست ہے جو جناب احتشام حسین مرحوم کی زندگی کے کسی گوشے سے واقف ہوں۔

اس نمبر میں شائع ہونے والی تمام غیر مطبوعہ تخلیقات پر ادارہ مناسب معاوضہ نذر کرے گا۔

ـــــ کلام حیدری

ہمارے فن کار......

احمد یوسف ———

اردو افسانہ نگاری کی دنیا میں قابل قدر نام ہے۔ متین، خاموش مگر ذہین ——
نگاہ رکھنے والے اس افسانہ نگار کے یہاں اسلوب میں جو ... ہے جو فنکارانہ
حکیمانہ انڈر ٹون ہے وہ بے حد منفرد اور ممتاز ہے۔
کہتا ہے ناول لکھ رہا ہوں مگر مال کی ...EN DELIVERY
لینے میں وقت بہت لگ جاتا ہے اس لئے......

شرون کمار ورما ———

امرتسر میں ہیں۔ افسانہ نگاری کے لئے جانے جاتے ہیں۔ شاعر ہونے ...
اصرار ہے۔ چاہے دنیا کی بات یہ مان لیں گے، یا دنیا ان کی بات ما...
لے گی۔ فی الحال دنیا کا پلڑا بھاری ہے گ

علی حمّاد عباسی ———

اعظم گڑھ میں انگریزی ادب کے لکچرر ہیں۔ علی گڑھ میں جب ... کر...
تھے تو اپنی ذہانت کے لئے مشہور تھے۔ ڈاکٹر ... الرحمن اعظمی
ڈاکٹر محمد مثنیٰ وغیرہ کے ہم عصر ہیں۔ افسانہ پڑھئے اور انہیں ...
تلاش کیجئے۔

ڈاکٹر نریش

یہ چنڈی گڑھ میں ہیں اور پنجاب یونیورسٹی کے ... سٹاف میں شا...
ہیں۔ اُردو کے لئے ہندی رسم الخط کی وکالت کرتے ہوئے مشہور ہو...
ہیں۔ یہ افسانہ اُردو رسم الخط ہی میں ہمیں موصول ہوا ہے۔ اُرد...

افسانہ نگار ہیں۔ رسم الخط کی بابت اپنا ایک اسٹینڈ رکھتے ہیں۔ اور کون وکیل ہے جو اپنے حق میں چند دلائل نہ رکھتا ہو۔

انیس رفیع

پالیٹیکل سائنس کے لکچرر ہیں۔ اُردو افسانہ نگاروں میں ان کی نئی نئی آمد ہے مستقبل کے بارے میں افسانہ خود بتائے گا۔ ہم نے تو توقعات کے ساتھ ہی تعارف کرایا ہے۔

نشرت ظہیر

کئی افسانے قابل ذکر ماہناموں میں آچکے ہیں۔ ادبی مباحث میں آجاتے ہیں تو بعض لوگ انہیں فرضی سمجھ لیتے ہیں اس لئے افسانے لکھنے پڑ گئے ہیں۔ ادب کی کسوٹی پر پرکھیں گے تو جوہر کھلیں گے۔ دیکھیں کیا گذرے ہے ......

سلام مچھلی شہری

پدم شری ہو گئے ہیں۔ بہت لکھا ہے۔ اُردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ ان کے بڑے ذخیرے سے قدرِ اوّل کی شاعری کا کوئی انتخاب نہیں شائع ہو سکا ہے۔ پچھلے تیس سالوں پر پھیلی ہوئی ان کی شاعری کے اندر اتنا کچھ مل جاتا ہے کہ ان کا نام اور کام اردو شاعری کے مرتبے کو بڑھاتا رہے گا۔

صادق

رنگ اور لکیروں کا فن کار لفظوں سے بھی کام لیتا ہے۔ بہار شریف کے باشی ہیں اور ادبی دنیا میں دونوں حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

لطف الرحمن

لکچرر ہیں۔ جسامت اور ظاہری روپ ریکھا سے نہ شاعر لگتے ہیں نہ لکچرر۔ لیکن دونوں حیثیت سے نمایاں اور ہر لحظہ نئی آن نئی شان سے آتے ہیں۔ آہنگ کو ان کا افسانہ شائع کرنے کا بھی موقع ملا ہے۔ دواوین کے اندر بند ہونے سے گھبراتے ہیں اسکلیمیشن کو پسند کرتے ہیں۔

کرشن موہن

شاعر کی حیثیت سے مانے جاتے ہیں لیکن بعض لوگ انہیں انکم ٹیکس کے بڑے افسر کی حیثیت سے بھی جانتے ہیں۔ کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ خوب لکھتے ہیں۔ آہنگ اپنی بزم میں انہیں خوش آمدید کہتا ہے۔

●●

کمار شِو
ترجمہ: عقیل شاداب

تعارف

کمار شِو، ۲۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو کوٹہ (راجستھان) میں جنمے۔ امتیازی حیثیت سے بی کام۔ ایل ایل بی اور ایم اے کی ڈگریاں لیں۔ ہندی کے بلند پایہ رسائل میں چھپ رہے ہیں۔ کوی سمیلنوں اور ریڈیو اسٹیشن سے بھی نشر و اشاعت کا سلسلہ جاری ہے ویسے ان تمام باتوں سے قطع نظر کمار شِو کے گیتوں کی یہ خصوصیت ہے کہ ان کے ہاں جدید حسیت کا گہرا احساس موجود ہے۔ امیجری میں تازگی، نئی علامتیں اور زبان کا غیر متعصب اور تخلیقی استعمال ہوا ہے۔ مختلف رنگوں کا ان کے ہاں خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ آگے جا کر یہ ہندی شاعری کے ایک بڑے گیت کار کی حیثیت سے پہچانے جائیں گے۔ اس کا مجھے یقین ہے میں نے ان کے گیتوں کے ترجمے میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ جہاں بے حد ضروری ہو وہیں کسی لفظ کو بدلا جائے ورنہ، ان کی ORIGINALITY کو قائم رکھتے ہوئے ان کے لہجے کو غیر ضروری ترجمے کے بوجھ سے بوجھل نہیں کیا جائے۔

ایک بات اور ضروری ہے وہ یہ کہ اوزان کے بارے میں اردو عروض کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے بلکہ جیسا کچھ ان کے گیت میں آہنگ تھا ہندی لے اور ماتراؤں کا اسے جیوں کا تیوں رہنے دیا ہے۔ یہ گیت اردو قارئین کو بھی ضرور متاثر کریں گے۔ اور یہ سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ ہندی اور اردو کے فن کار ایک ہی طرح سے سوچ رہے ہیں اور ان کا شاعری سے قریب قریب ایک سا ہی سلوک ہے۔

یہ گیت ان کی ۱۹۷۳ء کی شائع شدہ کتاب "شنکھ...... ریت کے چہرے" سے لئے گئے ہیں۔

عقیل شاداب

...فر کا ایک آزاد گیت

...ی
...ں ۔ اجنبی بھی
...ہونے والے سفر کے
...وں کی طرح
...سان گلیوں میں
...وئے ہاتھوں سے
...ڈھونڈ رہے ہیں راہ
...نظروں سے میری نظروں تک
...ایک سمت
...شوں سے چھن چھن کر
...تا ہے دھوپ
...پنی کلائی سے
...کن اتار کر
...سکاتی ہے
—— شام
...کن کو
...اس پار
...ن پہاڑوں کی گپھاؤں میں
چھپا آتی ہے
...سیاہ فریم میں
...پکڑ کو
...تا ہے — بوسیدہ آکاش
...ن میں پڑی ہوئی کرسیاں
...ب گھل جاتی ہیں

ایک ایسا ہی اندھیرا،
ہماری روحوں میں
ہمارے منہ کے ذریعے اُترنے
لگتا ہے — اور
الفاظ، اب
آنکھوں کی راہ باہر نکلتے ہیں
جن کے کئی ارتھ ہوتے ہیں
کہ ہم ہیں
خدا سا بھی — اجنبی بھی

●●

شکستہ وشواس کا المیہ

جیسے کسی نے
توڑ کر شہتیروں کی طرح
ندی میں ڈال دیا ہو
ہم.....
جیتے رہیں!!
جیتے ہی چلے جاتے ہیں ...

وشواس کو مرت

کترن ہی رہنے دیا جاتا ۔ تو
کیا برا تھا
اُسے حنائی ہتھیلی پر رکھ کر
پھونک کیوں مار دی ؟

چہرے کو بھیانک کرنے والے
اس شکستہ آئینے سے
دُور ہی رہا جاتا — تو
کیا بُرا تھا
اُس کے آگے ....
خوف سے چیخ کر
گرد کیوں جھاڑ دی

اب لگتا ہے جیسے
قبروں پر
گھاس نہیں، سگریٹیں اُگائی ہیں !
اور لوگ چپ چاپ رات میں جا کر
اُنہیں جلا آتے ہیں
ہم !
جیتے ہیں
جیتے ہی چلے جاتے ہیں

●●

بونے ہیں لیکن ....

برتاؤ کا تیکھا پن .....
کہنا ہم کو بھی آتا ہے
بونے ہیں ——— لیکن !
سڑکوں کو
سہنا ہم کو بھی آتا ہے
اندھے پیڑوں کے جنگل میں
گم شدہ دھوپ ہی ڈھونڈو
لہروں کی انگلی چٹخا کر
لہراؤ — ناچو — جھومو !
جھرنے ہیں...... لیکن

پربت پر —
بہنا ہم کو بھی آتا ہے
اب تک بنجرا کی ہری فصل
پلکوں سے ہم نے کاٹی ہے
خود چاہے سسکا کئے مگر
مسکان نگر کو بانٹی ہے
دھندلے ہیں ——— لیکن
درپن سا
رہنا ہم کو بھی آتا ہے۔

●●

نیلے آنسو

دن — جو آنکھوں کے کارن
لال اور پیلے ہو گئے
اُس ہری دُوب پر
دھوپ میں کئی چھٹی
تمہاری اور میری — پرچھائیں۔
پلکوں کے آس پاس
پانی میں ہلتی ہوئی
ست رنگی کائی
آنسو — جو سیاہی سے مل کر
خشک اور نیلے ہو گئے ......
البم سے چپکی ہوئی
کچھ صاف — کچھ دھندلی سی
تصویریں
اُس کالے پل اور دور کی، وہ شرمیلی لکیریں
لفظ — جو سمے کے ساتھ
ہرے ... اور نیلے ہو گئے

●

...یورتن

پھر یہ
یگ بدل گیا ہے
اب پلکوں پہ مہندی رچاؤ
نیلی روشنائی سے
کورتا لکھو
یگ پھر بدلے گا
مہندی بالوں میں چلی جائے گی
اور......
کورتا — پلکوں پر آگ آئے گی

●●

...ن کا وداعی گیت

سر جھکائے
دوار پالوں سے کھڑے
سورج مکھی پودے
رات شاید
کھول دے دروازہ
ڈیٹ کر۔ چھین لے عہدے!
آگہی — لے کر رجسٹر حاضری کا
یہ چاندنی کمسن۔
دھوپ کے پردے اٹھا کر
جا رہا — اسٹیج پر سے دن

●●

دراڑیں

جب میری یاد میں
دراڑیں پڑ جائیں
تب...
تم انہیں۔ کھوکھلے لفظوں سے بھر دینا
ایسا ہوتا ہے —— کہ
آدمی سمجھ دار ہوتے ہی
ٹوٹ جاتا ہے
اسے آل پن لگاکر
فائل کر دیا جاتا ہے
اور پھر! حسب معمول
اُس فائل پر
سفید بالوں کی گرد جم جاتی ہے
منظر! یا تو سِیل جاتے ہیں
یا۔ انھیں دیمک چاٹ جاتی ہے
جب کناروں کے بیچ، دوریاں آ جائیں تو
تم، انہیں لہروں سے
ہموار کر دینا
جب میری یاد میں دراڑیں پڑ جائیں
تب!!!
تم انہیں کھوکھلے لفظوں سے بھر دینا۔

●●

عصری افکار

ڈاکٹر حسین مجید

سترہویں صدی کے مشہور فرانسیسی مفکر ڈیکارٹ نے جب اعلان کیا "میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں" تو اس وقت انسانی فکر نئی شاہراہ پر چل کھڑی ہوئی تھی۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ فرد بھی سوچ سکتا ہے۔ اور اپنی تلاش و فکر کے ذریعہ حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔ جدید سائنسی طرزِ فکر کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ اس سے پہلے فرد کو اس بات کا حق حاصل نہیں تھا کہ وہ مذہب کے دائرے سے نکل کر حق کی تلاش کرے۔ دائمی اور ابدی حقائق صحیفے یا مذہبی روایات کے جز و تھے۔ مذہب کے تسلط نے انسانی ذہن کو مفلوج کر دیا تھا۔ گرچہ ڈیکارٹ بھی دلائل کے ذریعہ گھوم پھر کر خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر سائنس اور منطق کی ترقی نے رفتہ رفتہ مذہبی اعتقادات کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا اور انیسویں صدی میں کچھ ایسی سائنسی دریافتیں ہوئیں کہ مذہبی عقائد کی سراسر تردید ہوگئی۔ مثلاً ڈارون کے نظریۂ ارتقا نے آدم اور حوا کی بجائے بندر کو نسلِ انسانی کی پہلی کڑی بتایا۔

مذہبی اعتقادات کی گم شدگی نے یورپ میں NIHILISM کی تحریک کو جنم دیا۔ NIHILISM کا فلسفہ اعتقادات اور روایات کے انحراف پر مبنی ہے۔ ترگنیف کا ناول "باپ اور بیٹا" نہلزم کی تحریک کا جیتا جاگتا نقشہ پیش کرتا ہے۔ اس کا کردار بزاروف نہلزم سے پیدا شدہ روحانی خلا کا شکار ہے اور نتیجے کے طور پر وہ زندگی سے اپنا تعلق توڑ لیتا ہے۔ مذہب کے منظرِ عام سے ہٹ جانے کے بعد دراصل انسان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہی درپیش ہے کہ نہلزم کے دلدل سے کس طرح نکلا جائے اور کس طرح انسانی زندگی کو متحرک اور معنی خیز بنایا جائے۔ کارل مارکس کا فلسفۂ اشتراکیت اور کرک گارڈ کا فلسفۂ وجودیت اور اس طرح کی بہتری تحریکیں، نہلزم سے نکلنے کی مختلف کوششیں ہیں، مگر آج بھی ایقان کی کمی انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ کیونکہ نہلزم کے خلاف یہ ساری تحریکیں وقت کے ساتھ اپنا اثر کھوتی چلی گئی ہیں اور انسان کا اعتماد یہاں تک ڈگمگا چکا ہے کہ اسے اپنی ذات بھی اجنبی معلوم ہوتی ہے۔

آج کے عہد کا سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ "میں کون ہوں؟" اپنے وجود سے متعلق اس سوال کی جڑیں شکوک کی گہری تہوں تک پہنچ گئی ہیں۔ جہاں انسانی ذہن ہستی اور نیستی کے مسائل سے دوچار ہو جاتا ہے۔ انسان اگرچہ فطرت کا ایک جزو ہے مگر فطرت اسے قطعی اجنبی نظر آتی ہے اور حیات و کائنات اسے کبھی سمجھ میں نہ آنے والی پہیلی نظر آتے ہیں۔ ایسے قوانین اور نصب العین جو اس کے وجود کو معنویت بخشتے، عنقا ہو چکے ہیں۔ چنانچہ آج کے فن کار کے سامنے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ایک ایسی ذات کی تعمیر نو کس طرح

...نے اپنی ہستی کو کھو دیا ہے ۔ اسی لئے ژاں پال
سارتر کے کردار وجود کے انتہائی کھوکھلے پن اور بے معنویت
کے احساس کے شکار لوگ ہیں ۔ البرٹو موراویا کے ناول خالی
...ن کا ہیرو ڈینو (DINO) حقیقت کے اوجھل
...ے اکتاہٹ اور بے حسی کا شکار ہو جاتا ہے ۔
...ناول (ANTI NOVEL) کا موجد
ALAIN ROBBE ایک قدم
...جھا جاتا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ کردار پیش کرنے والے
...ب ماضی کی داستان ہیں ۔ آج کے دور میں ایسے
...پیش کرتا جن کی اپنی شخصیت یا انفرادیت ہو ممکن نہیں
...ریئے کے ناولوں میں کردار کا کام محض کیمرے کی طرح
...اور انسانوں کی نقل و حرکت محفوظ کرنا ہے ، بغیر
...کی مداخلت کے ۔ کافکا ، ژید (GIDE) مالرو ،
...رتر ، بیکٹ ، آئینسکو اور کامو کے ناولوں کے ہیرو
...کا تجربہ وجود کی بے معنویت کے احساس سے شروع
...ہے ۔ اور اپنے اپنے طور پر زندگی کی بے معنویت سے
...وت کرتے نظر آتے ہیں ۔

بیسویں صدی کے ادب میں ہر جگہ چاہے وہ کہانی
...یا شاعری ، زیادہ زور انسان کی داخلی زندگی پر ہے ۔
...انسانی شعور کی گہرائی کی تفتیش کے پس پردہ یہ خیال بھی
...رما ہے کہ شخصیت کا ایک اندرونی مرکز ہے جو ٹوٹتا ہے
اور جو مشاہدات کو محفوظ کرتا ہے ، تجربات کو پرکھتا ہے اور
...یات و کائنات کی بے معنویت پر متفکر ہوتا ہے ۔ سموئل بیکٹ
کی کہانی THE UN NAMEABLE کا ہیرو ایک
جگہ چیخ اٹھتا ہے ۔ " تمہیں چلتے ہی رہنا ہے ، میں نہیں
چل سکتا ، میں چلتا رہوں گا ۔ " شخصیت کا یہ مرکز
اگرچہ ٹوٹ نہیں سکتا لیکن ثابت و سالمت بھی نہیں رہ سکتا
انسانی شعور ہر لمحہ رواں دواں ہے ۔ امریکی مفکر ولیم جیمس
شعور کو ایک بہتی ہوئی دھارا کہتا ہے ۔ فرانسیسی مفکر
ہنری برگساں انسانی شعور کو ہر لمحہ ارتقاپذیر بتاتا ہے
چنانچہ برگساں کے یہاں وقت کی دو قسمیں ہو گئی ہیں ۔ ایک
خارجی وقت یا CLOCK TIME اور دوسرا داخلی
وقت یا INNER TIME ۔ داخلی وقت کا تعلق
انسان کے شعور سے ہے ۔ انسانی شعور ہر لمحہ بدلتا رہتا
ہے ۔ اور تبدیلی کی رفتار گھڑی کی رفتار سے مختلف ہے
کیونکہ انسان کی زندگی کے بعض لمحے اس کی شخصیت
اور مطمح نظر میں اتنی دوررس تبدیلیاں پیدا کر دیتے ہیں جو
مہینوں اور سالوں میں نہیں ہوتیں ۔ وقت کے اس تصور
کا اثر جیمس جوائس ، ورجینا وولف ، سموئل بیکیٹ اور
دیگر ناول نگاروں کی تصانیف میں ظہور پذیر ہوتا ہے ۔

انسانی شعور سے یہ غیر معمولی دلچسپی اس خوف کا بھی
رد عمل ہے کہ جدید تکنیکی اور سرمایہ پرست تمدن کہیں
انسان کی داخلی زندگی کا خاتمہ نہ کر دے اور انسان
ایک چلتی پھرتی مشین ہو کر نہ رہ جائے ۔ سائنسی نقطۂ
نظر کی نمود اور مذہبی عقائد کی موت کے ساتھ یہ تصور بھی
باقی نہیں رہا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور دنیا
کائنات کا مرکز ہے ۔ انسان عام جانوروں اور کیڑے
مکوڑوں کی طرح ایک جاندار شے ہے جس کی حرکات و
سکنات عقل سے زیادہ جبلت کے زیر اثر ہوتی ہیں ۔
ANIMAL IMAGERY کافکا کے حیوانی پیکر
خاص طور پر انسان کے اس روحانی زوال کو پیش کرتے ہیں
مشینی اور تجارتی تمدن سے پیدا ہونے والے اثرات کا
بڑا ہی دلچسپ نقشہ ڈکنس کے ناول HARD TIMES
میں ملتا ہے ۔ بعد میں آلڈس ہکسلے کا ناول BRAVE
NEW WORLD اور جارج آرول کا ناول 1984
(NINETEEN EIGHTY FOUR) انہی اثرات کو

اور زور دار انداز میں پیش کرتا ہے۔ مگر انسان کی داخلی تنزلی کی سب سے زیادہ باضابطہ مخالفت وجودی مفکروں اور ناول نگاروں نے کی ہے۔

فلسفہ وجودیت کا بانی اور عظیم ترین مفکر سورن کرک گارڈ وجود کو ایک ایسا مرض بتاتا ہے جس کا انجام موت ہے۔ انسان کی شخصیت کا سفر اس کے شعوری اقدام کی وہ کوشش ہے جو اُسے ہر لمحہ منزل کی تلاش میں سرگرداں رکھتا ہے۔ مگر اس سفر کے ہر موڑ پر نفسیاتی دہشت اور ہر قدم پر جذباتی ہیجان کا سامنا رہتا ہے اور منزل پر پہنچنا ناممکن۔ اس خوف اور غیر یقینی صورت حال سے نجات پانے کے لئے کرک گارڈ کو ایمان میں چھلانگ لگانے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اور وہ مذہب کی طرف مراجعت کرجاتا ہے۔ اس طرح بالآخر کرک گارڈ کے یہاں شعور کے ارتقا کی آخری منزل مذہبی اعتقاد کی دُنیا ہو جاتی ہے۔ لیکن سارتر اور کامو اس کے برخلاف مذہب کی طرف مراجعت کو نہ صرف ناممکن بلکہ مضر تصور کرتے ہیں، کامو مذہب کو انسانی ذہن کی موت سمجھتا ہے اور قوت فکر کی بقا کے لئے خدا کی بجائے شیطان کی پیروی کو ناگزیر سمجھتا ہے۔

انسانی وجود کی اہمیت کا مسئلہ یا انسان اور کائنات کے تعلق کی نوعیت کا مسئلہ نیا نہیں۔ مگر دورِ جدید میں اس نے بے حد اہمیت اختیار کرلی ہے۔ ہر روز نت نئے نظریات وجود میں آتے ہیں جو پرانے نظریات کو مسترد کردیتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ سائنس جس نے افکار کی دنیا میں انتہائی اتھل پتھل پیدا کردی ہے اور پرانے حقائق کو ردکردیا ہے، خود انسانی ذہن کو اس منزل پر لاکھڑا کیا ہے جہاں انسان اپنے علم سے زیادہ اپنی لاعلمی سے واقف ہوگیا ہے۔ کائنات اس قدر وسیع ہے اور ہمارے علم حاصل کرنے کے آلات [illegible] ہیں کہ حقیقت کا خفیف حصہ [illegible] سکتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ حقیقت کو [illegible] سکتے۔ پھر بھی [illegible] کی فطرت ہے کہ وہ [illegible] سے اور کی تلاش کرے۔ چنانچہ ہم ایک عجیب صورت حال سے دوچار ہیں۔ ہم حقیقت [illegible] کرتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ حقیقت تک پہنچنا ناممکن ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم اس بات کا دعویٰ کرسکتے ہیں کہ یہ بات وقت کے لئے صحیح ہے۔ کل یہ بات صحیح رہے گی نہیں معلوم۔ اسے ہم فلسفے کی اصطلاح میں

EPISTEMOLOGICAL [illegible]

یعنی حقیقت کا علم ہمیشہ اضافی ہوتا ہے۔ اس پہلو

[illegible]EMOLOGICAL [illegible]SM

ہے یعنی ابدی حقیقت ہماری دسترس سے باہر ہے ہمارا علم ناقص ہے اور ہمیشہ ناقص رہے گا۔ آئن سٹائن کا عظیم ترین مرحلہ [illegible] بڑھتے ہوئے افکار ہوتا ہے۔ لیکن ابدی قدروں کی غیر موجودگی میں افکار کی دنیا میں انتشار کا عالم ہے۔ سارتر اور کامو کچھ مصنفین نے اس انتشار کو منطقی تسلسل کے رنگ ادب میں پیش کیا ہے۔ اور [illegible] مصنفین نے اس کو اظہار میں [illegible] ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اس طور پر ABSURD DRAMA بہترین مثال ہے جس میں وجود کی بے معنویت کو فن ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو ادب میں چند جدید افسانہ نگار اور شعرا نے [illegible] کے [illegible] کو کچھ اسی میں ڈھالنے کی سعی کی ہے۔

حال میں [illegible] سے [illegible] اٹھی ہے [illegible] اپنی اشتراکیت [illegible] MOVEMENT

…ہے۔ اس تحریک نے اشتراکیت کو چند ترمیموں کے ساتھ اپنایا ہے۔ اشتراکی نظام میں پرولتاری آمریت کی جدلیاتی مادیت یا جمالیاتی رجحان پر پابندی وغیرہ سے انحراف کرتے ہوئے اور یورپ کے جمہوری نظام سے ہم آہنگ ہو کر اشتراکیت کی انسانیت پسند شکل پیش کرنا اس نئی اشتراکیت کے بنیادی پہلو ہیں۔ اس طرف انگلینڈ اور امریکہ میں بہترے ادیب پھر مذہب کی طرف لوٹ گئے ہیں اور پھر ایک بار روایتی اصناف کو اپنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مگر یہ ساری کوششیں ابھی روح کی گہرائیوں کو نہیں چھو سکی ہیں اور محض کوشش کی حد تک رہ گئی ہیں۔ اس لئے یہ تحریکیں اب تک کوئی عظیم تخلیق پیش کرنے سے قاصر رہی ہیں۔

ہمارے عہد کی اہم ترین خصوصیت ماورائی تشکیک اور مایوسی ہے مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ زندگی کی بے معنویت پر اتنی گہری تشویش اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ آج کا انسان حق کی ابدی تلاش میں کس قدر سرگرداں ہے اور زندگی کا پُر معنی اور بامقصد ہونا اس کے لئے کتنا اہم ہے۔

• •

سلام مچھلی شہری

ابوالحسام کی یاد میں

مرا قصبہ[۱] کا، کچا اور شکستہ سا مکاں اب تک
سحر ہوتی ہے، لیکن روشنی آنے نہیں پاتی
سنہرے خواب پلتے ہیں مگر پورے نہیں ہوتے
بہن[۲] کی آرزو، بھولے ہی سے کوئی خوشی آئے
مگر اس گھر سے برہم ہے مزاجِ آسماں اب تک

اسی عالم میں ہے اک مرکزِ دردِ جہاں اب تک
کلی آنگن میں کھل جاتی ہے مسکانے نہیں پاتی
جھنکتے ہیں رباب اکثر مگر نغمے نہیں ہوتے
کبھی بے ساختہ "ماں" کے لبوں پہ بھی ہنسی آئے
وہی گیتوں سے محرومی، وہی شورِ فغاں اب تک

حسام[۳]۔ اک اور بھائی چل بسا دنیائے فانی سے
گلِ تازہ تھا اور اس کو ابھی شاداب رہنا تھا
اسے کیوں اتنی بے دردی سے تو نے کر دیا رخصت
کوئی بھی شام ہو تیری، کوئی بھی ہو سحر تیری
خفا کیوں میرے گھر سے ہے خدائے مہرباں اب تک
نہ ہو پایا ابھی تک ایک خوابِ معتبر حاصل
مرا ہمدرد آخر میرا فن بھی کیوں نہیں یارب
مری صحت کی تو نے لی ہے اک بھائی سے قربانی
اب آگے کیا کہوں، قابو میں سیلِ درد لاتا ہوں

اجل! کیوں اتنی نفرت ہے تجھے ہر نوجوانی سے[۴]
اندھیرے میں مثالِ جلوۂ مہتاب رہنا تھا
مہِ عید[۵] اس طرف نکلا، ادھر وہ ہو گیا رخصت
مرے بچھڑے ہوئے گھر پہ ہے مسلسل کیوں نظر تیری
نہ مل پایا مسرت کا کوئی نام و نشاں اب تک
سلام مچھلی شہری بنتا پھرتا ہوں مگر حاصل؟
مرے بس میں خوشی کی اک کرن بھی کیوں نہیں یارب!
الٰہی! تو بھی رکھتا کاش احساساتِ انسانی
ترا بندہ ہوں، ہر عالم میں اپنا سر جھکاتا ہوں

مرے گھر میں ہے رقصندہ کوئی روحِ جواں اب تک
کبھی تیز اور کبھی آہستہ اٹھتا ہے دھواں اب تک

---

[۱] مولوی پانہ۔ مچھلی شہر ضلع جون پور (یو۔پی) [۲] باجرہ [۳] ابوالحسام [۴] چھوٹے بھائی وہاب اور کلا... عین شباب میں چل بسے تھے [۵] ۳۰ رمضان المبارک [۶] یعنی اپریل کے آخر سے اگست کے [illegible] اچانک

صادق

گیت

چھوٹ گئی رات
اَدھ کچی داستاں کی ٹوٹی اُمنگ
رِل مِل ہلور لیتے، اک دوسرے سے ملے
ندیا کے رنگ
میٹھی کردنا بھرے
جو رتیے انگ

گیت چلے، گیت چلے گیت دبے پانو
میت چلے، میت چلے دھوپ کبھی چھانو
پانو چلے، چھانو چلے
شہر چلے، گانو چلے
چھوٹ گئی رات

سارے بھرم ساتھ ہوئے
موہ ملا، سپنے بھی
ندیا بہاؤ پہ کشتی
میں اَناتھ ——— اپنے بھی
سپنے بھی، اپنے بھی، دیکھ رہے، دیکھ رہے
ڈوب گئے منصوبے ٹوٹ گئی رات
چھوٹ گئی رات

• •

اُردو میں فارسی، عربی کے فقرات کا استعمال

ناصر جلالی

اظہارِ خیال کے مختلف ذریعے ہیں۔ فنونِ لطیفہ انسانی فکر و خیال کی بوقلمونیوں کا مظہر ہے۔ مصور اپنے خیالات کو جامۂ تصویر پر پیش کرتا ہے۔ سنگ تراش پتھر کو زبان دیتا ہے۔ نقاش حسین و جمیل نقوش سے اپنے خیالات کو واضح کرتا ہے۔ سنگ تراشی، مصوری اور نقاشی زبانِ حال ترجمانِ دلِ بے قرار بنتی ہیں۔ لیکن یہ مکمل ترین ذریعۂ اظہار نہیں۔ دلی خیالات کا بہترین لفظی اظہار ادب ہے۔

میں اردو ادب کی باتیں کرنے جا رہا ہوں جسے 'خونِ جگر' سے 'معجزہ فن' کی شکل عطا کی گئی اور جو جلال و جمال سے عبارت ہے۔ ذہن و دماغ "عہدِ کہن" کے تراکیب میں پراگندہ تھا۔ یک بیک خیالات ادب سے 'زبان' کی طرف منتقل ہو گئے اور ادب کے 'نغمہ' 'تارِ حیات' چھیڑنے کے بجائے زبان کا حسن نکھارنے کو جی چاہا۔ اُردو زبان کی عمر گرچہ دوسری زبانوں سے بہت کم ہے لیکن جو لطف اس میں ہے وہ عجیب ہے کیونکہ ؎

ہے زبان ایک، بے شمار مزے — اس کی ہر بات میں ہزار مزے

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق ایک جگہ لکھتے ہیں؛

"عربی فارسی الفاظ کے اضافے نے مختلف صورتوں میں اس کی اصل خوبی میں اضافہ کر دیا ہے۔ ہندی الفاظ میں دل نشینی کا خاص اثر ہے۔ اور عربی فارسی الفاظ میں شان و شوکت، اردو زبان کے لئے ان دونوں عنصروں کا ہونا ضروری ہے۔ عربی فارسی الفاظ نے نہ صرف لغت میں بلکہ خیالات میں وسعت پیدا کر دی ہے جس سے اس کا حسن دوبالا ہو گیا ہے

اور وہ زیادہ وسیع اور کارآمد بن گئی ۔ "

مکنڈائیر (سال دوم) کی کلاس لے رہا تھا فارسی اور عربی کے محاورے اور شعر اردو نصاب کی کتاب میں آئے
۔ طالب علم نے پوچھا " سر! اُردو کے اکثر مضامین میں عربی فارسی کے فقرے ، محاورے ، اشعار لوگ استعمال کرتے ہیں
شہور مشہور فقرے آپ بتا سکتے ہیں ؟ تاکہ اُسے میں حفظ کر لوں " ۔ بر وقت ذہن نے جہاں تک کام کیا ، بتا دیا ۔ ڈیرہ آیا
ام ہوئی اور پھر لیلائے شب نے چادر اوڑھی ۔ اقبال کی نظم پڑھ رہا تھا ۔ جب اس شعر پر پہنچا ؎

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگانی

چانک دماغ ع پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی کا آماج گاہ بن گیا ۔ سوچنے لگا کیوں نہ
ناہیر ادیب کی کتابیں تلاش کی جائیں جن میں دوسری زبانوں کی ایسی ترکیبیں ، فقرے ، جملے ، مصرعے اور اشعار جو اردو میں مستعمل ہیں
ن کی ایک فہرست تیار کی جائے ، ظاہر ہے اس کے لئے محنت کی ضرورت تھی ۔ یہ زندگی محنت ، خلوص اور دیدہ ریزی سے عبارت ہے
ں دنیا میں وہی شخص کامیاب رہتا ہے جو مسلسل محنت کرتا ہے ۔ جب انسان اپنے دل میں سچا ارادہ لے کر مسلسل محنت کرتا ہے تو اللہ کی
ت بھی اس کے شاملِ حال ہو جایا کرتی ہے ۔ چنانچہ فارسی عربی کے تراکیب ، فقرات ، جملے ، مصرعہ اور اشعار اردو شاعروں اور نثر
ادوں کے یہاں سے پیش خدمت ہیں ۔ یہ نذیر احمد ، رتن ناتھ سرشار ، شبلی ، محمد حسین آزاد ، سرسید ، عبدالحلیم شرر ، میر حسن ،
ا السلام آزاد ، اقبال ، غالب اور نیاز فتح پوری کی تصنیفات سے ماخوذ ہیں ۔
پہلے فارسی پھر عربی کے فقرے وغیرہ معنی کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں اُمید کہ ناظرین کو میری کاوش پسند آئے گی ۔

فارسی

	فارسی	معنی
۱ ۔	بزرگی بہ علم است نہ کہ بہ سال	بزرگی علم سے حاصل ہوتی ہے ، عمر سے نہیں (بعض جگہ بزرگی بعقل ست)
۲ ۔	دیوار ہم گوش دارد	دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں ۔
۳ ۔	امورِ مملکتِ خویش ، خسرواں دانند	مملکت کے معاملات کو کچھ بادشاہ ہی سمجھ سکتا ہے ۔
۴ ۔	تنگ آمد ، بجنگ آمد	انسان مجبور ہو کر لڑنے کو تیار ہو جاتا ہے ۔
۵ ۔	تونگری بہ دل است نہ بہ مال	تونگری دل سے ہوتی ہے ، مال سے نہیں ۔
۶ ۔	توانا بود ، ہر کہ دانا بود	جو عقل مند ہوتا ہے طاقت ور ہوتا ہے ۔ علم ایک طاقت ہے ۔
۷ ۔	چوں قضا آید ، طبیب ابلہ شود	جب قضا آتی ہے تو طبیب کی عقل جاتی رہتی ہے ۔
۸ ۔	راستی موجب رضائے خداست	خدا کی خوشنودی کا سبب ، راستی ہے ۔
۹ ۔	یک انار و صد بیمار	ایک انار اور سو بیمار ۔
۱۰ ۔	سنگ آمد و سخت آمد	پتھر ملا اور بہت سخت پتھر ملا ۔ بہت مشکل آپڑی ۔
۱۱ ۔	جواب جاہلاں باشد خموشی	جاہلوں کا جواب خاموشی ہی ہوتی ہے ۔
۱۲ ۔	فکر ہر کس بقدر ہمت اوست	ہر شخص اپنی ہمت (اور صلاحیت) ہی کے مطابق سوچتا ہے ۔

۱۳- چاہ کن را چاہ درپیش	دوسروں کے لئے کنواں کھودنے والا، خود بھی اس میں گرتا
۱۴- آب آمد تیمم برخاست	پانی ملنے کے بعد تیمم ختم ہو جاتا ہے اصل چیز کے ملنے کے بعد قائم مقام کی ضرورت
۱۵- دیوانہ بکارِ خویش ہوشیار	دیوانہ اپنے مطلب کے لئے ہوشیار ہوتا ہے۔
۱۶- ہم چنیں (یا ہم چو من) دیگرے نیست	میرے جیسا کوئی دوسرا نہیں (غرور و تکبر کے وقت اس کا استعمال) (یا تعلی کے لئے)
۱۷- دیر آید درست آید	جو چیز تاخیر سے ہوتی ہے وہ بہتر ہی ہوتی ہے۔
۱۸- این سعادت بزور بازو نیست	یہ سعادت قوت سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔
۱۹- نہ دید نہ شنید	ایسا تو کسی نے دیکھا نہ سنا۔
۲۰- نگاہِ واپسیں	آخری نگاہ، دم آخر۔
۲۱- نگاہ روبرو	نظر سامنے اٹھائیے۔ نظر ملائیے۔
۲۲- خوب شد اسباب خودبینی شکست	اچھا ہوا، خودبینی کا ایک ذریعہ ختم ہو گیا۔
۲۳- سوال از آسمان، جواب از ریسمان	بے محل اور غیر متعلق بات۔ سوال آسمان کے متعلق اور جواب رسی کے بارے
۲۴- کجا می نماید، کجا می زند	کدھر اظہار خیال کرتا ہے اور کدھر ضرب لگاتا ہے۔
۲۵- شنیدہ کے بود مانند دیدہ	سنی سنائی چیز، دیکھی ہوئی چیز کے برابر کب ہو سکتی ہے۔
۲۶- دریں چہ شک	اس میں کیا شک ہے۔
۲۷- سلام روستائی بے غرض نیست	میہ (دیہاتی) سلام کبھی غرض سے خالی نہیں ہوتا۔
۲۸- عیاں راچہ بیاں۔	جو چیز خود ظاہر ہو اس کو بیان کرنے کی کیا حاجت۔
۲۹- رسیدہ بود بلائی ولی بخیر گذشت	مصیبت آئی تو تھی لیکن خیریت سے گذری۔
۳۰- ہرچہ بادا باد	جو کچھ بھی ہو، ہو۔
۳۱- ہرچہ بادا باد، من کشتی را در آب انداختم	جو بھی ہو، ہو۔ میں نے تو کشتی دریا میں ڈال ہی دی۔
۳۲- مُہر بہ لب	(ہونٹوں پر مُہر لگائے) متحیر، خاموش۔
۳۳- قفل در دہان	(ہونٹوں پر قفل لگائے) خاموش۔
۳۴- کند ہم جنس با ہم جنس پرواز	لوگ اپنے ہی جیسے لوگوں کے ساتھ رہتے ہیں۔
۳۵- بسر و چشم	سر آنکھوں پر
۳۶- نہ غم دزد نہ فکر مالکہ	نہ مال کی پروا، نہ چوروں کا ڈر۔
۳۷- راضی بہ رضا	خدا کی مرضی پر راضی رہنا۔
۳۸- سوختہ جاں	دل جلا۔ مصیبت کا مارا۔
۳۹- سربکف	ہتھیلی پر سر رکھے۔

۴۰۔ خنجر بکف — ہاتھ میں خنجر لئے۔

۴۱۔ شمشیر بکف — تلوار ہاتھ میں لئے۔

۴۲۔ جاں بکف — جان ہتھیلی پر لئے۔

۴۳۔ سینہ چاکانِ وطن — وطن کے ستم رسیدہ لوگ۔

۴۴۔ از قضا آئینہ چینی شکست — اتفاق سے چینی آئینہ ٹوٹ گیا۔

۴۵۔ غوغائے سگاں، کم نہ کند رزقِ گدا را — کتوں کا شور غل فقیر کی روزی میں کمی نہیں کرتا۔

۴۶۔ بلا رسیدہ چہ داند، بلا کجا خفتست — بلا رسیدہ کو کیا معلوم کہ بلا کہاں سوئی ہوئی ہے۔

۴۷۔ طوقِ زریں ہمہ در گردنِ خری بینم — سونے کا طوق گدھوں کے گلے میں نظر آتا ہے۔

۴۸۔ کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی — کمال حاصل کرو، دنیا عزت کرے گی۔

۴۹۔ آب از سر گذشت — پانی سر سے اونچا ہوگیا، بات حد سے بڑھ گئی۔

۵۰۔ یک سر و ہزار سودا — ایک سر اور ہزار سودا۔

۵۱۔ دل را بدل راہ بود — دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔

۵۲۔ آتشِ زیرِ پا — (انگاروں پر چلنا) بھڑک اٹھنا، بے چین ہونا۔

۵۳۔ ہر چہ آید بر سرِ اولادِ آدم بگذرد — انسان کے سر پر جو کچھ پڑتی ہے گذر ہی جاتی ہے۔

۵۴۔ ہر چہ بر خود ناپسندی بر دیگراں ہم مپسند — جو کچھ اپنے لئے پسند نہیں کرتا، دوسروں کے لئے بھی پسند نہ کرو۔

۵۵۔ کفن بر دوش — کفن کاندھے پر رکھے ہوئے، مرنے کے لئے تیار۔

۵۶۔ بانگِ بے ہنگام — بے موقع چیخ پکار۔

۵۷۔ سوختہ ساماں — بدنصیب، پریشان حال۔

۵۸۔ ناز بر آں کن کہ خریدارِ تست — ناز اُسے دکھاؤ جو تمہارا خریدار (طلب گار) ہو۔

۵۹۔ پنبہ در گوش — کان میں روئی ڈالے، بے توجہ۔ لاپروا۔

۶۰۔ کف در دہاں — منہ میں جھاگ بھرے، غضب ناک۔

۶۱۔ ایں گلِ دیگر شگفت — لو، یہ ایک اور بات ہوئی۔

۶۲۔ نقصانِ مایہ و شماتتِ ہمسایہ — مال کا نقصان سہنا اور لوگوں کے طعنے بھی سننا۔

۶۳۔ نقلِ کفر، کفر نباشد — کفر کو بیان کرنا کفر نہیں ہوتا۔

۶۴۔ حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم — قصہ کبھی ختم نہ ہونے والا تھا، لہٰذا خاموشی کے ذریعہ بیان کیا۔

۶۵۔ جنگ دو سر دارد — جنگ میں فتح و شکست دونوں کا امکان ہوتا ہے۔

۶۶۔ خفتہ را خفتہ کے کند بیدار — سویا ہوا آدمی دوسرے سونے والے کو نہیں جگا سکتا۔

۶۷۔ مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست — انجام پر نگاہ رکھنے والا شخص بڑا خوش نصیب ہے۔

نمبر	فارسی	اردو
۶۸ -	نشستند و گفتند و برخاستند	بیٹھے، باتیں کیں اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔
۶۹ -	دہن سگ را بہ لقمہ دوختہ بہ	کتے کے منھ کو لقمہ سے بند کر دینا چاہیے۔
۷۰ -	ہمیں گوئے و ہمیں میداں	یہی گیند بھی ہے اور یہی میدان بھی۔
۷۱ -	چوں سر نداری، سودا چرا میداری	جب ہمت ہی نہیں ہے تو کسی چیز کا شوق ہی کیوں کرتے ہو۔
۷۲ -	ہر چہ ندانی در پرسیدنش عار مدار	جو کچھ نہیں جانتے اس کے پوچھنے میں شرم نہ کرو۔
۷۳ -	غم نداری بز بخر	اگر کوئی فکر نہ ہو تو ایک بکری لے لو۔ فکریں خود بخود پیدا ہوں گی
۷۴ -	آنرا کہ حساب پاک است از محاسبہ چہ باک	جن کا حساب صاف ہوتا ہے، انھیں محاسبہ کا کیا ڈر۔
۷۵ -	پنبہ بہ دہاں	خاموش، منہ میں روئی رکھے ہوئے۔
۷۶ -	آں قدح بشکست و آں ساقی نماند	وہ پیالہ بھی ٹوٹ گیا اور وہ ساقی بھی نہیں رہا۔
۷۷ -	این ہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر	عشق میں، دوسرے غموں پر، یہ ایک اور سہی۔
۷۸ -	چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد	وہ چور کتنا دلیر ہے، جو ہاتھ میں چراغ لئے ہوئے ہے۔
۷۹ -	بیک تاختن تا کجا تاختم	ایک حملہ میں، میں کہاں تک جا پہنچا۔
۸۰ -	کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست	اس راہ میں فلاں ابن فلاں کوئی چیز نہیں۔
۸۱ -	کے آمدی و کے پیر شدی	تم کب پیدا ہوئے اور کب بڈھے ہوگئے، بے وقوفی، ناتجربہ کاری
۸۲ -	پیراں نمی پرند، مریداں می پرانند	پیر خود نہیں اُڑتے، اُنھیں مُرید اڑاتے ہیں۔
۸۳ -	ہزار شمع بکشتند و انجمن باقیست	ہزاروں چراغ بجھ چکے لیکن انجمن اپنی جگہ باقی ہے۔
۸۴ -	زر بر سر فولاد نہی، نرم شود	سونا، فولاد پر بھی رکھ دو، تو وہ نرم ہو جائے گا۔
۸۵ -	بہر زمیں کہ روم، آنجا آسماں پیداست	میں جہاں بھی جاؤں، آسمان موجود ملتا ہے۔
۸۶ -	لذیذ بود حکایت، دراز تر گفتم	قصہ دلچسپ تھا، اس وجہ سے پوری تفصیل سے بیان کیا۔
۸۷ -	چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی	جب کعبہ ہی سے کفر اُٹھے گا تو اسلام کہاں رہ جائے گا۔
۸۸ -	عشق آساں نمود اول، ولے افتاد مشکلہا	عشق ابتدا میں آسان نظر آتا تھا، لیکن اب مشکل آ پڑی ہے۔
۸۹ -	گر قبول افتد زہے عز و شرف	اگر آپ قبول کرلیں تو ہمارے لئے عزت کا باعث ہو۔
۹۰ -	دیدہ خواہد شد	دیکھا جائے گا۔
۹۱ -	از دل خیزد، بر دل ریزد	دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔
۹۲ -	صدائے بر نخواست	کوئی جواب نہ ملا، کوئی آواز نہ آئی۔
۹۳ -	چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی	عقل مند ایسا کام کیوں کرے، جس کا انجام پشیمانی ہو۔
۹۴ -	بازی بازی باریش بابا ہم بازی	کھیلتے کھیلتے تم بابا کی داڑھی کے ساتھ بھی کھیلنے لگے۔
۹۵ -	سر در گریباں	گریباں میں سر ڈالے، متفکر، پریشان۔

۹۶- جست کناں — اچھلتا کودتا۔

۹۷- چہ دانند حال زار ما سبکساران ساحلہا — جو لوگ ساحل پر پہنچ چکے انھیں میرے حال زار کی کیا خبر۔

۹۸- بیک بینی و دو گوش — ایک ناک اور دو کانوں کے ساتھ، بغیر ساز و سامان کے، خالی۔

۹۹- کوہ کندن و کاہ برآوردن — پہاڑ کھودنا اور گھاس باہر نکالنا۔ لاحاصل اور بے نتیجہ کام

۱۰۰- شکر خند — مسکراہٹ، خوش گوار ہنسی۔

۱۰۱- ریشخند — مسکراہٹ، تمسخر انگیز ہنسی۔

۱۰۲- زہر خند — غم کی ہنسی، مجبوری کی ہنسی، حقارت کی ہنسی۔

۱۰۳- قحبہ چون پیر شود پیشہ کند دلالی — فاحشہ عورت جب بوڑھی ہو جاتی ہے تو دلالہ کا پیشہ کرنے لگتی ہے

۱۰۴- زمانہ باتو نہ سازد تو بہ زمانہ بساز — زمانہ تمہارا ساتھ نہیں دیتا تو تم زمانہ کا ساتھ دو۔

۱۰۵- عدو شود سبب خیر، گر خدا خواہد — اگر خدا چاہتا ہے تو دشمن بھی بھلائی کا سبب بن جاتا ہے۔

۱۰۶- راہ راست برو گرچہ دور است — سیدھی راہ پر چلو، اگرچہ وہ دور ہی کیوں نہ ہو۔

۱۰۷- سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی — تیری خنجر آزمائی کے لئے دوستوں کے سر حاضر ہیں۔

۱۰۸- گربہ کشتن روز اول — فتنہ کو پہلے ہی دن ختم کر دینا چاہیے۔

۱۰۹- تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد — تجھے کیا پتہ؟ ممکن ہے کہ اس گرد میں کوئی سوار ہی ہو۔

۱۱۰- کہ آب چشمۂ حیواں درون تاریکی ست — آب حیات کا چشمہ تاریکی ہی میں ہے۔

۱۱۱- ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ — اس بے معنی دفتر کا شراب میں ڈبو دینا ہی بہتر ہے

۱۱۲- سرود بہ مستاں یاد دہانیدن — مستوں کو گانا یاد دلا دینا۔

۱۱۳- دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم — جب جسم پر لباس ہی نہیں تو دامن کہاں سے آئے۔

۱۱۴- چناں نماند، چنیں نیز نخواہد ماند — جب ویسا نہیں رہا تو ایسا بھی نہ رہے گا۔

۱۱۵- ص ایں سعادت بزور بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ۔
یہ سعادت کوئی زور اور طاقت سے نہیں ہے جب تک خداوند قدوس نہ بخشے۔

۱۱۶- ص آن نہ من باشم کہ روز جنگ بینی پشت من — آن منم کاندر میاں خاک و خون بینی سرے۔
میں وہ نہیں ہوں کہ جنگ کے دن پیٹھ دکھاؤں، میں وہ ہوں جس کا سر خاک و خون میں بھرا نظر آئے۔

۱۱۷- ص اے زر، تو خدا نہ ولیکن بخدا — ستار العیوب و قاضی الحاجاتی
اے زر! تو خدا نہیں ہے، لیکن خدا کی قسم، تو پردہ پوش بھی ہے اور حاجت روا بھی

۱۱۸- ص بس قامت خوش کہ زیر چادر باشد — چوں باز کنی مادر مادر باشد
بعض خوش نما جسم پر سے چادر ہٹائی جائے تو وہ نانی کی ہم عمر ہوگی۔

۱۱۹۔ سہ بہر جامہ کہ میخواہی بپوش من انداز قدت رامی شناسم

جو لباس بھی چاہو پہن لو، میں تمہاری قامت کے انداز کو جانتا ہوں۔

۱۲۰۔ سہ بوقت تنگدستی آشنا بیگانہ می گردد صراحی چوں شود خالی، جدا پیمانہ می گردد

تنگدستی کے وقت اپنے بھی بیگانہ بن جاتے ہیں جیسے کہ صراحی جب خالی ہو جاتی ہے تو پیالے اس سے دُور ہو جاتے ہیں۔

۱۲۱۔ سہ بسفر رفتنت مبارک باد بسلامت روی و باز آئی

سفر میں جانا مبارک ہو، سلامتی کے ساتھ جائیے اور واپس آئیے۔

۱۲۲۔ سہ تیمار غریباں سبب ذکر جمیل است جاناں! مگر ایں دایہ در شہر شما نیست۔

مسافروں کی خبر گیری نیک نامی کا سبب ہے، مگر، میری جان یہ دستور تمہارے شہر میں نہیں ہے۔

۱۲۳۔ سہ جمال ہمنشیں در من اثر کرد وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

میرے ہمنشیں کے جمال نے مجھ پر اثر کیا ہے، ورنہ میں تو وہی خاک ہوں، جو تھی۔

۱۲۴۔ سہ چوں آب از سر گذشت چہ یک نیزہ چہ یک دست

جب پانی سر سے اونچا ہو ہی گیا تو چاہے ایک ہاتھ اونچا ہو چاہے ایک نیزہ (دونوں برابر ہے)

۱۲۵۔ سہ چون نہ بیند بروز شپّرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

چمگادڑ کو اگر دن کے اجالے میں دکھائی نہیں دیتا، تو اس میں آفتاب کا کیا گناہ۔

۱۲۶۔ سہ حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

میں نے اپنا حاصلِ زندگی ایک دوست کی راہ میں نچھاور کر دیا اور اپنی زندگی پر نازاں ہوں کہ میں نے بھی کچھ کام کیا۔

۱۲۷۔ سہ خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

خاکساروں کو حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھو، تمہیں کیا معلوم کہ اس گرد میں سوار ہی چھپا ہو۔

۱۲۸۔ سہ خویش را بر نوک مژگان ستم کیشاں زدم آں قدر زخمے کہ دل میخواست در خنجر نبود

میرا دل جس قدر زخم کا طلب گار تھا وہ خنجر میں نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے آپ کو ستم کیشوں کی پلکوں کی نوک سے ٹکرا دیا۔

۱۲۹۔ سہ خر عیسیٰ اگر بمکّہ رود چوں باز آید ہنوز خر باشد

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گدھا مکہ بھی چلا جائے، لیکن جب واپس آئے گا تو گدھا ہی رہے گا۔

۱۳۰۔ سہ ز دست غیر من ہرگز ننالم سعدیا! ز دست خویشتن فریاد

میں غیروں کی وجہ سے ہرگز نالہ نہیں کرتا۔ سعدی! میں تو اپنوں کے دستِ کرم کا ستایا ہوا ہوں۔

۱۳۱۔ ھ رفتن بہ پائے مردیِ ہمسایہ در بہشت — حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است

دوسروں کی مدد سے جنت میں جانا ، خدا کی قسم عذاب جہنم سے کم نہیں

۱۳۲۔ ھ سگ را بدریائے ہفتگانہ بشوئے — چوں تر گردد پلید تر گردد

کتے کو سات دریا میں نہلاؤ ، جیسے جیسے وہ بھیگتا جائے گا زیادہ نجس ہوتا جائے گا۔

۱۳۳۔ ھ شمع گر باؤ کند دعوئ نازک بدنی — کشتنی ، سوختنی باشد و گردن زدنی

شمع اگر تیرے سامنے نازک بدنی کا دعوئ کرے تو وہ کشتنی، سوختنی اور گردن زدنی قرار پائے۔

۱۳۴۔ ھ عجب دردیست اندر دل اگر گویم زبان سوزد — وگر دم درکشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

دل میں وہ درد ہے کہ بیان کروں تو زبان جل جائے ، اور چپ رہوں تو ڈر ہے کہ ہڈیاں نہ سلگ اٹھیں۔

۱۳۵۔ ھ گر لاکھ گنج و گوہر و زر میدہی چہ سود — دل را شکستہ نہ کہ گوہر شکستہ

اب لاکھوں خزانے دے ڈالو ، جب بھی کچھ حاصل نہیں ، تم نے دل توڑا ہے موتی نہیں توڑا ہے

۱۳۶۔ ھ مرا عمریست چون زلف دوتا در پیچ و خم ہردم — سیہ بختم ، پریشاں روزگارم ، خانہ بردوشم

میں ، مدتوں سے ، زلف دوتا کی طرح ہر وقت پیچ و تاب میں رہتا ہوں ، اسی کی طرح ، سیہ بخت ہوں ، پریشان روزگار ہوں اور خانہ بدوش ہوں۔

۱۳۷۔ ھ نہ محقق بود نہ دانش مند — چارپائے برو کتابے چند

جس جانور پر کچھ کتابیں لاد دی جائیں وہ محقق اور دانش مند نہیں بن جائے گا۔

۱۳۸۔ ھ نیش عقرب نہ از پئے کین است — مقتضائے طبیعتش این است

بچھو کسی دشمنی کی وجہ سے ڈنک نہیں مارتا ، یہ تو اس کی فطرت کا تقاضا ہے۔

۱۳۹۔ ھ وفا آموختی از من ، بہ کار دیگراں کردی — ربودی گوہرے از من ، نثار دیگراں کردی

وفا تم نے مجھ سے سیکھی اور دوسروں کے لئے وقف کردی ، جو موتی تم نے مجھ سے چھینا وہ دوسروں پر نچھاور کر دیا۔

۱۴۰۔ ھ ہر کس کہ نداند و بداند کہ بداند — در جہل مرکب ابدالدہر بماند

جو شخص نہیں جانتا اور سمجھتا ہے کہ جانتا ہے ، وہ ہمیشہ جہل مرکب میں پڑا رہتا ہے۔

۱۴۱۔ ھ اگر یک سر موئے برتر پرم — فروغ تجلّی بسوزد پرم

ذرہ برابر بھی آگے اوپر جاؤں تو تجلّی کے فروغ سے جل کر خاک ہو جاؤں۔

۱۴۲۔ روئے گل سیر نہ دیدیم و بہار آخر شد — پھول کا چہرہ سیر ہو کر نہیں دیکھا اور بہار ختم ہو گیا۔

۱۴۳۔ یک نہ شد دو شد — ابھی تو ایک ہی کا ذکر تھا دوسرا بھی آ گیا۔

۱۴۴۔ دیر آید درست آید — جو چیز دیر سے وقوع پذیر ہوتی ہے بہتر ہوتا ہے۔

۱۴۵۔ بر آہو سوار شدن — تیز دوڑنا۔

۱۴۶-	بخیہ از روئے کار افتادن	راز فاش ہونا
۱۴۷-	بدست گرداں گرفتن	قرض لینا۔
۱۴۸-	از نظر افتاد	بے اعتبار ہوگیا۔
۱۴۹-	گرفتہ زدن	طعن کرنا، ڈینگ مارنا۔
۱۵۰-	یونس در دہان ماہی شدن	رات ہونا۔

عربی کے فقرے اور محاورات

جو اردو میں مستعمل رہیں ملاحظہ فرمائیں

۱۵۱-	اَلسَّفرُ سَقَرٌ	سفر جہنم ہے
۱۵۲-	طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ علٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَۃٍ	ہر مسلمان مرد و عورت پر علم کا حاصل کرنا فرض ہے
۱۵۳-	اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ کَانَ بِالصِّیْنِ	علم طلب کرو، اگرچہ چین ہی میں کیوں نہ ہو۔ [علم حاصل کرنے کے لئے دور کی مسافت مانع نہ ہو
۱۵۴-	صَاحِبُ الْغَرَضِ مَجْنُوْنٌ	ضرورت مند دیوانہ ہوتا ہے۔
۱۵۵-	اَلْحَیَاءُ مِنْ شُعْبَۃِ الْاِیْمَانِ	حیا ایمان کا ایک حصہ ہے، حیا ایمان کی نشانی ہے
۱۵۶-	اَلْبَادِیْ اَظْلَمُ	سب سے بڑا ظالم وہ ہے جو ظلم کی ابتدا کرتا ہے
۱۵۷-	اَلْفِتْنَۃُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ	فتنہ برپا کرنا، کسی کو قتل کرنے سے بھی زیادہ سخت ہے
۱۵۸-	اَلْحَقُّ مُرٌّ	حق بات کڑوی ہوتی ہے
۱۵۹-	کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ	دنیا کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے
۱۶۰-	اَلْاِنْسَانُ حَرِیْصٌ عَلٰی مَا مُنِعَ	انسان کو جس سے روکا جاتا ہے، وہ اس پر حریص ہو جاتا ہے
۱۶۱-	وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ	ہمارے اوپر صرف اتنی ذمہ داری ہے کہ ہم حقیقت بیان کر دیں۔
۱۶۲-	اَلسَّفَرُ مِفْتَاحُ الظَّفَرِ	سفر کامیابی کی کنجی ہے
۱۶۳-	اَلصَّبْرُ مِفْتَاحُ الظَّفَرِ	صبر کامیابی کی کنجی ہے
۱۶۴-	قَتْلَ الْمُوْذِیْ قَبْلَ الْاِیْذَا	موذی کو ایذا پہنچانے سے پہلے ہی قتل کر دینا چاہیے۔
۱۶۵-	الصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْن	نماز، مومنوں کی معراج ہے
۱۶۶-	اَلصَّلٰوۃُ مِفْتَاحُ الْجَنَّۃِ	نماز، جنت کی کنجی ہے
۱۶۷-	اَلْعِلْمُ فِی الصِّغَرِ کَالنَّقْشِ فِی الْحَجَرِ	بچپن کی تعلیم پتھر کی لکیر ہوتی ہے
۱۶۸-	اَلْاِنْتِظَارُ اَشَدُّ مِنَ الْمَوْتِ	انتظار، موت سے بھی زیادہ سخت اور مشکل ہے۔

مَضٰی مَا مَضٰی	جو گذر گیا سو گذر گیا
حُسْنُ الْكَلَامِ فِي قِصَرِ الْكَلَامِ	کلام جتنا مختصر ہو، اتنا ہی عمدہ ہے۔ (بات جتنی مختصر ہو اتنی ہی اچھی ہے)
اُطْلُبُوا الْعِلْمَ مِنَ الْمَهْدِ اِلَى اللَّحَدِ	گہوارے سے لے کر قبر تک۔ علم حاصل کرو
اَهْلًا وَّ سَهْلًا	مرحبا، خوش آمدید
كَلَامُ الْمُلُوْكِ مُلُوْكُ الْكَلَامِ	بادشاہوں کا کلام، کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے
مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ	ایک عالِم کی موت سارے عالَم کی موت ہے
اَلْقَيْدُ مَوْتُ الْاَكْبَرُ	قید، سب سے بڑی موت ہے
اَلْمَوْتُ فِي الْعِزِّ خَيْرٌ مِّنَ الْحَيَاةِ فِي الذِّلِّ	عزت کی موت، ذلت کی زندگی سے بہتر ہے
اَلْعَقْلُ مَا يَدُلُّ اِلَى الْخَيْرِ	عقل وہی ہے جو نیکی کا راستہ دکھلائے
لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ	تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے
اَلْغِنَاءُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا	گانا، بجانا، زنا سے بھی زیادہ خراب ہے
اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ	جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے
لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ	سوائے خدا کے نہ کوئی قوت ہے نہ کوئی پناہ گاہ (اظہار نفرت اور بیزاری کے لئے استعمال)
اَلْقَتْلُ مَوْتُ الْاَحْمَرُ	قتل، تو بڑی رنگین موت ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ	اللہ اس وقت تک کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا، جب تک وہ خود اپنے آپ کو نہ بدل لیں۔
اَلْكِبْرُ مَعَ الْمُتَكَبِّرِ صَدَقَةٌ	مغرور کے ساتھ غرور سے پیش آنا نیکی ہے
اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ النَّاسُ مِنْ يَدِهٖ وَلِسَانِهٖ	مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے لوگ محفوظ رہیں۔
اَلْاَقَارِبُ كَالْعَقَارِبِ	قریب والوں سے ہمیشہ نقصان پہنچتا ہے (رشتہ دار بچھو کے مانند ہوتے ہیں)
اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ	جو زیادہ قریب ہوتا ہے، اس کا حق مقدم ہوتا ہے
لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا حَيَاءَ لَهٗ	جو حیا سے عاری ہے، اُس میں ایمان نہیں
اَلْجَنَّةُ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ	جنت تلواروں کے سایہ میں ہے
بِنَاءُ الْفَاسِدِ عَلَى الْفَاسِدِ	ایک فاسد چیز جس کی بنیاد بھی فاسد ہی چیز پر ہو
اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ	گزشتہ زمانہ کے لوگوں کے واقعات
فَرَّ مِنَ الْمَطَرِ وَقَامَ تَحْتَ الْمِيْزَابِ	بارش سے گریز کیا اور پرنالے کے نیچے کھڑا ہو گیا

۱۹۳- اَسْفَلَ السَّافِلِیْنَ — انتہائی ذلت اور پستی

۱۹۴- اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ — بیٹا ہمیشہ باپ ہی پر جاتا ہے

۱۹۵- اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَتُ حَیَاۃُ الدُّنْیَا — مال اور اولاد دنیاوی زندگی کی زینت ہیں

۱۹۶- جَاءَ الْحَقُّ وَزَھَقَ الْبَاطِلُ، اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا — حق آگیا اور باطل چلا گیا، باطل کو تو ختم ہونا ہی تھا

۱۹۷- اِنَّ بِاَضْدَادِھَا تَتَبَیَّنُ الْاَشْیَاءُ — چیزیں اپنی ضدوں ہی کی بدولت نمایاں ہوتی ہیں
یہ اس طرح بھی لکھا گیا ہے

۱۹۸- تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا — چیزیں اپنی ضدوں سے پہچانی جاتی ہیں

۱۹۹- قَحْطُ الرِّجَالُ — انسانوں کی نایابی

۲۰۰- اَلضِّحْکُ بِلَا سَبَبٍ مِنْ قِلَّۃِ الْاَدَبِ — بلاوجہ ہنسنا بدتمیزی ہے

۲۰۱- خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُھَا — بہترین راستہ، درمیانی راستہ ہے

۲۰۲- کُلُّ قَصِیْرٍ فِتْنَۃٌ — ہر پست قد (ناٹا) فتنہ ہوتا ہے

۲۰۳- کُلُّ طَوِیْلٍ اَحْمَقٌ — ہر طویل شخص (لمبے قد کا آدمی) بے وقوف ہوتا ہے

۲۰۴- اَلْحَبْلُ الْمَتِیْنُ — مضبوط رسی، وسیلۂ اتفاق، اتحاد

۲۰۵- بُنْیَانٌ مَرْصُوْصٌ — ثابت قدمی، سیسہ پلائی ہوئی دیوار

۲۰۶- قُلِ الْحَقَّ وَلَوْ خِلَافَكَ (یا وَلَوْ عَلَیْكَ) — سچی بات کہو، اگرچہ وہ تمہارے خلاف ہی ہو

۲۰۷- مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَمْ یَشْکُرِ اللہَ — جو لوگوں کا شکریہ نہیں ادا کرسکتا وہ خدا کا بھی شکریہ نہیں ادا کر

۲۰۸- اَلْحَائِكُ فَالْحَائِكُ — جلاہا، جلاہا ہی ہوتا ہے (بے وقوف سے عقلمندی کی توقع بے کار)

۲۰۹- اَلْکِنَایَۃُ اَبْلَغُ مِنَ التَّصْرِیْحِ — کنایہ، تصریح و وضاحت سے زیادہ بلیغ ہوتا ہے

۲۱۰- قَلَّ وَدَلَّ — بات مختصر لیکن مکمل اور پُرمعنی ہونی چاہیے

۲۱۱- اَلْخَیْطُ الْاَبْیَضُ — سپیدۂ سحر، صبح کی پہلی کرن

۲۱۲- ضُحْکَۃُ الصِّبْیَان — مضحکہ خیز (بچوں کو ہنسا دینے والا)

۲۱۳- کَلِمَۃُ الْحَقِّ یُرَادُوْنَ بِہِ الْبَاطِلِ — کلمۂ حق ہے، جس سے وہ لوگ باطل مراد لے رہے ہیں

۲۱۴- اَلْعَوَامُ کَالْاَنْعَامِ — عام لوگ چوپایوں کے مانند (بے عقل ہوتے) ہیں

۲۱۵- اَلْقَرْضُ مِقْرَاضُ الْمَحَبَّۃِ — قرض، محبت کی قینچی ہے

۲۱۶- اِیْصَالُ اِلَی الْمَطْلُوْبِ — منزل مقصود تک پہنچا دیا

۲۱۷- کَبَّرَنَا مَوْتُ الْکُبَرَاءِ — بڑوں کی موت نے ہمیں بڑا بنا دیا

۲۱۸- اَللہُ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ — اللہ جمیل ہے خوب صورتی کو پسند کرتا ہے

- صَبَّحَكَ اللّٰهُ بِالْخَيْرِ — آپ کی صبح بخیر
- اَنْعَمَ صَبَاحًا — صبح بخیر
- اِبْنُ الْوَقْتِ — وقت کے ساتھ بدلنے والا
- اَحْلٰى مِنَ الْعَسَلِ — (شہد سے زیادہ شیریں) خوش گوار، پسندیدہ
- اَرِنِیْ — خدایا! مجھے اپنا جلوہ دکھا (قرآن پاک کی آیت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے معبودِ حقیقی سے گزارش کی تھی) اُردو میں تمنا اور شوق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے

- لَنْ تَرَانِیْ — تم ہرگز نہیں دیکھ سکتے، اللہ تعالیٰ کا جواب، موسیٰ علیہ السلام کو (ارنی کے جواب میں) اُردو میں فخر وغرور اور لاف و گزاف کے معنی میں مستعمل)

- اَوَّلُ مَنْ قَاسَ . قَاسَ اِبْلِیْسَ — سب سے پہلا قیاس کرنے والا شیطان ہے
- وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَآءُ — فضل وہی ہے، اچھا وہی ہے جس کی دشمن بھی گواہی دیں
- مَنْ طَلَبَ الْعُلٰى سَهِرَ اللَّيَالِیْ — جو بلندیوں کا طلب گار ہوتا ہے، رات رات بھر جاگتا ہے
- اَلْحِصْنُ الْحَصِيْنُ — مضبوط قلعہ (پناہ گاہ)
- هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ؟ — کیا کچھ اور اضافہ ممکن ہے ؟
- هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ — احسان کا بدلہ احسان ہی سے ہو سکتا ہے
- اٰخِرُ الدَّوَاءِ الْكَیُّ — آخری علاج، داغ دینا ہے
- اِبْطَالُ الْبَاطِلِ — باطل کو باطل کرنا۔ حق گوئی، ناحق بات کو ثابت کر دینا کہ وہ ناحق ہے۔

- عَدَمُ الْعِلْمِ لَا يَدُلُّ عَلٰى عَدَمِ الشَّیْءِ — عدم علم، عدم شے کی دلیل نہیں ہے
- اَلَا يَا اَيُّهَا السَّاقِیْ اَدِرْ كَاْسًا وَّ نَاوِلْهَا — اے ساقی، جام شراب کو گردش دے اور ایک پیالہ مجھے بھی دے
- جَرَاحَاتُ السِّنَانِ لَهَا الْتِيَامُ — نیزے کا زخم تو بھر جاتا ہے
- وَمَا يَلْتَامُ مَا جَرَحَ اللِّسَانُ — لیکن زبان کا زخم کبھی نہیں بھرتا
- خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ — اللہ نے ان کے دلوں پر مُہر لگا دی ہے
- اَلَسْتُ بِرَبِّكُمُ الْاَعْلٰى — کیا میں تمہارا رب اعلیٰ نہیں ہوں؟ قرآن کی مشہور آیت، جس میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے روزِ اول، عالمِ ارواح میں لوگوں سے اپنی ربوبیت اور معرفت و محبت کا اقرار لیا تھا۔ بستِ الست، اور

۲۳۸- قَالُوا بَلٰى

۲۳۹- لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ

۲۴۰- دَنٰى فَتَدَلّٰى كَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى

[illegible] مصاف [illegible]، ا[illegible] ہمیشہ خدا کی محبت [illegible] مراد [illegible] ہے سب سے پہلا [illegible] اس سے خدا کی [illegible] وحدانیت کا اقرار (اللہ تعالیٰ [illegible]) [illegible] اگر آپ نہ [illegible] میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ [illegible] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قریب ہوئے، اور قریب ہوئے یہاں تک کہ دو کمانوں یا اس سے کم کا فاصلہ باقی رہا۔ معراج کا ذکر قرآن پاک کے ذریعہ بیان کیا گیا۔

۲۴۱- بَلَغَ الْعُلٰى بِكَمَالِهٖ كَشَفَ الدُّجٰى بِجَمَالِهٖ
حَسُنَتْ جَمِيْعُ خِصَالِهٖ صَلُّوْا عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کمالوں کی بدولت بلندیوں [illegible]
آپ کے حسن سے تاریکیاں دور ہوگئیں
آپ کے تمام عادات وخصائل پسندیدہ ہیں
اُن پر اوران کی اولاد پر درود وسلام بھیجو

۲۴۲- اَظْهَرُ مِنَ الشَّمْسِ — آفتاب سے زیادہ ظاہر اور باہر ہے یا بالکل و[illegible]

۲۴۳- لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ — اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو

۲۴۵- سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ — سلامتی ہے تم پر، خوش خبری ہے تمہارے لیے اس [illegible] (جنت) داخل ہو جاؤ، وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہو گے

۲۴۶- وَلَا تَجَسَّسُوْا — جستجو نہ کرو، چھان بین نہ کرو

۲۴۷- هٰذَا الَّذِيْ وَعَدَنِيْ اَبِيْ — یہ وہی چیز ہے جس کا وعدہ میرے والد نے کیا تھا

۲۴۸- فَنَا فِي اللّٰهِ — اللہ کی راہ میں فنا ہو جانا

۲۴۹- لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ — تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے

۲۵۰- مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ — جس شخص نے کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کیا وہ کافر ہوگا

۲۵۱- لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ — اس کے مانند کوئی چیز نہیں۔

۲۵۲- اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ — بعض بدگمانی گناہ ہے

۲۵۳- اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ — اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ بزرگ وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے

۲۵۴- لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ — ظالموں پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے

۲۵۵- لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ — جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے

[بقیہ [illegible]]

حنفی

گمراہی میں فرد بھی نہیں ہے
وہ صحرا نورد بھی نہیں ہے

کب تک وہ ہوا سے لڑ سکے گا
میدانِ نبرد بھی نہیں ہے

کس منہ سے کسی کے پاس جائیں
سینے میں تو درد بھی نہیں ہے

دھندلا سی گئی ہے اُس کی صورت
تصویر پہ گرد بھی نہیں ہے

بے صحن کا گھر یہ صنعتی شہر
اور رات کہ سرد بھی نہیں ہے

پت جھڑ ہے کہ آ گئی ہے سر پر
پتہ کوئی زرد بھی نہیں ہے

کہنے کو بہت ہے اور مصرع
اتنا پامرد بھی نہیں ہے

●●

غزلیں

اُچھال خون کہ بندِ حیات کٹ جائے
بلا سے سلسلۂ کائنات کٹ جائے

ہمیں غبار اُڑانا ہے راستے بھر میں
ہماری راہ سے ہر با صفات کٹ جائے

ہزار دِل کے صداؤں پہ آسمان اُٹھائیں
کسی کی جنبشِ ابرو سے بات کٹ جائے

کہا گیا کہ اگر بے گُناہ سر نہ کٹیں
تو کربلا کی حدوں سے فرات کٹ جائیں

اس آرزو کا ثمر ہے آگ اُگلتا دن
کہ تلخ و سرد و خطرناک رات کٹ جائے

خبر ملی کہ اُسی بات میں ہے لطفِ غزل
وہ ایک بات کہ لکھئے تو بات کٹ جائے

●●

آزاد گلاٹی

غزل

کٹے ہوئے جسموں کے خون سے پالی، بھولی بھالی کرچیں
خود کو سمجھ بیٹھی ہیں بھٹکی روحوں کی رکھوالی کرچیں

میرے چہرے کا آئینہ تجھ سے بچھڑ کر ٹوٹ چکا ہے
اب تجھ سے مل کر کیا لو گے، چبھ جائیں گی اپنی کرچیں

کیسے خواب تھے جو آنکھوں میں آنسو بن کر ٹھہر گئے ہیں
کیسی یادیں تھیں جو خون میں چھوڑ گئی ہیں چبھتی کرچیں

میرے بدن کی دیواریں کس دھوپ کے شیش محل سے الجھیں
چاروں اور نظر آتی ہیں اپنے ہی سایوں کی کرچیں

مجھے توڑنا سہل تھا لیکن مجھے جوڑنا سہل نہیں ہے
تم گھائل ہاتھوں والے ہو اور میں ہوں کرچیں ہی کرچیں

کس نے ہم کو توڑ پھوڑ کر سارے جگ میں بانٹ دیا ہے
اب جس سے ملتے ہیں اس میں پاتے ہیں ہم اپنی کرچیں

خاموشی کے سونے گنبد میں جب تک میں چپ تھا چپ تھی
اس کا نام لیا تو بکھریں ہر جانب آواز کی کرچیں

تجھے تیاگ کے جیسے ہم نے خود اپنے کو تیاگ دیا ہے
دن ٹوٹے پھوٹے ہیں، راتیں جیسے بھیانک کالی کرچیں

...ر سبزواری

غزل

دیکھو گے جو مجھ کو کوئی فن کار کہو گے
سوچو گے تو تنہائی کا معمار کہو گے

جھٹلاؤ گے یہ منظرِ پسپائی کہاں تک؟
گر جائے گی جب پانی کی دیوار کہو گے

مرمر کا کھلونا ہوں میں سنولاؤں گا جلدی
میلا مجھے کر دو گے تو بے کار کہو گے

رکھو گے جہاں گرد ہواؤں پہ بھی الزام
اُڑتی ہوئی خوشبو کو گنہگار کہو گے
چڑھتی ہوئی دھوپوں کی رفاقت تو ہوئی ختم
واماندگیٔ جاں پسِ اشجار کہو گے
پانی پہ کتھائیں ہیں کہ ناگفتنی ارمان
دریا سے اُترتے ہوئے اُس پار کہو گے

کس کس سے یہ آزار چھپاؤ گے مصوّر
گھر میں نہ کہو گے سرِ بازار کہو گے

●●

فارسی نثر کے جدید رجحانات

محمد توحید عالم

فارسی زبان و ادب کی تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ اس کی ادبی تاریخ میں ہندوستان کے فارسی ادیبوں اور شاعروں کا بھی نمایاں حصّہ ہے۔ قرون وسطیٰ کے مسلم حکمرانوں اور خاص طور پر مغلوں کے عہد کے ہندوستان میں فارسی زبان و ادب نے جو ترقی کی وہ اس عہد کی ایرانی ادبیات کو بھی شرماتی ہے۔ فارسی ادب کی اس قدامت کے باوجود فارسی نثر نویسی انیسویں صدی تک اپنے مخصوص طرز فکر، محدود موضوعات اور مقررہ فنی اصولوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس عہد تک نثر نگاری کی جو روش پسندیدہ تھی وہ عہد حاضر کے گوناگوں مسائل اور موضوعات کو اپنے دامن میں جگہ دینے سے عاری تھی اور اس دور کے ادبا اپنا سارا زور قلم اور اپنی ساری قابلیت عبارت آرائی اور صنع و پرکاری پر صرف کرتے رہے۔

بیسویں صدی میں مغربی سیاست نے جو کروٹ لی اور اس کے جو دور رس اثرات ظاہر ہوئے اس سے ایشیا کے دوسرے ممالک کے ساتھ ساتھ [illegible] خاص طور پر [illegible] ہوا اور اس کے جو نتیجے [illegible] انہوں نے ایران [illegible] ادبی مزاج کو نئے موڑ دئے۔ ایران کی جدید تاریخ اسی دور سے شروع ہوتی ہے جسے ایران کی سیاسی تاریخ میں دور مشروطیت کی ابتدا (۱۹۰۵ء) کہی جاتی ہے۔ اس عہد تک فارسی ادب کا دائرہ ایران اور ہندوستان پر حاوی تھا لیکن دور مشروطیت سے فارسی زبان و ادب اور خاص طور پر نثر نویسی کی ترقی کے لئے جو اقدامات کئے گئے ہندوستان اس میں اپنی سیاسی مجبوریوں سے قدم سے قدم نہ ملا سکا۔

ایران کی ادبیات کا جدید دَور دراصل فارسی نثر کا دَور ہے۔ جدید نثر کی تدریجی ارتقا میں جو عوامل کارفرما ہوئے ان میں انقلاب مشروطیت، ایران میں غیر ملکی سیاست کا نفوذ، مغربی ممالک کے ساتھ ایران کے سیاسی تعلقات، علمی اور عملی علوم کی ایران میں ترقی، ادبی اور تاریخی موضوعات پر تحقیق، مغربی ممالک میں ایرانیوں کی سیر و سیاحت اور ایرانی طلبا اور دانشوروں کے مغربی تعلیمی اداروں سے تعلقات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان عوامل کی کارفرمائی سے فارسی نثر کی جو حیرت انگیز ترقی ہوئی اس میں تین ابتدائی مراحل خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

۱۔ سفرناموں کی تصنیف و تالیف

۲۔ چھاپے خانے کی ایجاد اور

۳۔ مغربی ادبیات کے شاہکاروں کا فارسی زبان میں ترجمہ۔

ان تین مراحل کی تکمیل کے بعد فارسی نثر ترقی و تکامل کے ان حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔ جہاں اس کے لئے دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش چلنا آسان ہو جاتا ہے۔ پرانے ادیب اپنی معلومات کی کمی کو محسوس کرتے اور

حقیقی انداز نگارش میں چھپانے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ لیکن نئے لکھنے والوں کے سامنے ایک واضح مقصد تھا، انہیں قانون اور جمہوریت کی آواز دور دور تک پہنچانے کے لئے ایسی زبان اور بیان کا سہارا درکار تھا جو عوام و خواص کے لئے یکساں طور پر موثر ہو اور سماجی مسائل کا حل عوام کی بہبودی میں مضمر تھا۔ اس لئے ان لوگوں کو اپنے ساتھ لے کر چلنا ان کے لئے بیحد ضروری تھا۔

مندرجہ بالا عوامل کی کارفرمائی اور بامقصد اقدامات کے علاوہ فارسی نثر کی ترقی اور اس کو عوامی ادب بنانے میں سب سے زیادہ ہاتھ روزناموں اور رسالوں کا ہے۔ حالیہ ساٹھ ستر برسوں میں ایران میں اخبارات اور رسالوں کی اشاعت میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ روزناموں اور رسالوں کے رواج اور کثرت سے زبان بہت ہی سادہ اور رواں ہوگئی اور ان کے پڑھنے والوں اور ان سے دلچسپی لینے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔

فارسی نثر میں جدید رجحانات کے تدریجی ارتقا میں ایک اور عنصر جو بہت موثر ثابت ہوا وہ یہ تھا کہ یہاں کے اہل علم طبقہ کا رشتہ مغربی ممالک سے گہرا ہوتا گیا۔ مغربی ادبیات اور تمدن کے مطالعہ اور فکر کے بعد انہوں نے اپنی زبان اور اپنے ادب پر خصوصی توجہ دی ہے۔

نثری ادب کی جدید تاریخ میں اب صرف فلسفہ و حکمت، تاریخ، اخلاق اور پند و موعظت کی کتابیں ہی نہیں رہ گئی ہیں بلکہ اب ان میں جدید طرز کے ناول، افسانے، روزنامے، علمی، تاریخی اور ادبی رسالوں کے علاوہ سیاسی اقتصادی، معاشی اور جدید سائنسی ٹیکنولوجی موضوعات پر کتابیں لکھی جارہی ہیں۔ ان لکھنے والوں میں کچھ افراد مغربی علوم و فنون کے اس قدر گرویدہ ہوگئے کہ انہوں نے اپنی ادبیات کے صفحات کو بھی مغربی طرز نگارش سے رنگین بنا دیا۔ ان کا یہ اقدام فارسی نثر کے تدریجی ارتقا میں ضرر رساں ثابت ہو سکتا تھا چنانچہ ایران کے چند نامور محققوں اور اہل قلم نے جن میں علامہ محمد قزوینی، عباس اقبال، آشتیانی، علامہ دہخدا، ملک الشعراء بہار اور رشید یاسمی وغیرہ شامل ہیں، نے محض نقالی کو زبان و ادب کے زوال کا سبب بتایا

جدید فارسی نثر کے تدریجی ارتقا میں اس طرح کی روش پہلی عالمی جنگ تک قائم رہی جسے ہم عبوری دور کی تصانیف کہہ سکتے ہیں۔ لیکن پہلی عالمی جنگ کے بعد مغربی عقاید و افکار، اشتراکی نظریات اور خود ایران کی قدیم ادبی روایات کے امتزاج نے شاکی تصوریت کو معتوب قرار دے کر ایک ایسی حقیقت نگاری کو جنم دیا جس نے رفتہ رفتہ لکھنے والوں کے لئے بنیادی قدر کی حیثیت اختیار کرلی۔ ان ادیبوں میں تین قسم کے لوگ نظر آتے ہیں:

۱۔ رجعت پسند

۲۔ جدت پسند

اور ۳۔ انتہا پسند

رجعت پسند حقیقت نگاروں میں محمد حجازی کا نام سرفہرست ہے۔ ان کی مشہور تصانیف ہما، پری چہر، اندیشہ اور آئینہ شائع ہو چکے ہیں۔ حجازی کے کردار متوسط طبقے کے افراد ہوتے ہیں۔ جو عموماً شہری زندگی بسر کرنا پسند کرتے ہیں۔ وہ ایک ناصح کی صورت میں قاری کے سامنے آتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے واقعات کو نصیحت آموز پیرائے میں بیان کرتے جاتے ہیں۔ اسی گروہ کے ایک اور مشہور ادیب جمال زادہ ہیں جو جدید فارسی ادب میں مختصر افسانہ کے خالق ہیں۔ ان کے مختصر افسانوں کا پہلا مجموعہ "یکی بود و یکی نبود" ۱۹۲۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کے افسانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی میں خارجی زبانوں کے الفاظ کا استعمال اعتدال کی حد تک پسند کرتے ہیں اور پڑھے لکھے طبقہ کی فضل فروشی کا

نقشہ بڑے مزاحیہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ایک اور اہل قلم علی دشتی بھی اسی طبقہ سے متعلق ہیں اور ان کا پسندیدہ موضوع جدید ایرانی عورت ہے۔ ان کے کردار اونچے درجے کی سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور مغربی تعلیم اور طرز معاشرت کے دیوانے نظر آتے ہیں۔ دولت مند گھرانوں کی حسین عورتیں پیرس اور لندن کے پری جمالوں کی تقلید میں ہر جگہ مرد و زن مساوات کی طالب ہیں لیکن اپنی سماجی ذمہ داریوں سے گھبراتی ہیں وہ پارٹیوں اور جلسوں میں تو معشوقانہ برق پاشیاں کرتی نظر آتی ہیں لیکن جہاں اجتماعی اصلاحات کے لئے ایثار کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں ان سے کچھ نہیں بن پڑتا۔

دوسری قسم کے جدت پسند حقیقت نگار ادیبوں میں استاد سعید نفیسی ایک پل کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے نصف صدی سے زیادہ مدت فارسی ادب کی خدمت میں گذاری ہے اور بے شمار انشائیے، افسانے، ناول اور تحقیقی مقالے قلم بند کئے ہیں۔ ایرانی سماج کے منافع خور طبقے کے افراد کو وہ بہت اچھی طرح پہچانتے ہیں اور ان ہی لوگوں کو وہ اپنی تنقید اور طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ بزرگ علوی، جلال آل احمد، اعتماد زادہ، صادق چوبک اور اخوت اسی گروہ کے نامور اہل قلم ہیں۔

تیسری قسم کے ادیب جو انتہا پسند اور باغی ادیب کہلاتے ہیں ان میں مسعود دہاتی اور صادق ہدایت کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں غیر معمولی ذہن ہونے کی وجہ سے یہ لوگ بے حد حساس طبیعت کے مالک تھے۔ طبقاتی کشمکش میں پس کر انہوں نے ایرانی سماج کے گھناؤنے رُخ کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور سرمایہ داروں کی عیش کوشیاں ان کو بار بار بغاوت پر آمادہ کرتی ہیں۔ اپنے ماحول سے مایوسی اور سماج سے مخالفت نے ان کی تحریروں میں بجلیاں بھر دی ہیں۔

مسعود کی [illegible] [illegible] [illegible]، [illegible]
ان [illegible] سرگزیں [illegible] [illegible] پائی ہے
کے بعد [illegible] [illegible] آتی ہیں۔ اس
دوسری کتابوں میں [illegible] [illegible] اور بے کار [illegible]
تصویریں موجود ہیں۔

مندرجہ بالا رجحانات [illegible] [illegible] زیر اثر افسانے اور ناطک کے علاوہ اس دور میں اور تحقیقی نگارشات کی [illegible] بھی بہت سنجیدگی سے [illegible] دی گئی ہے۔ اس قسم کے مقالات کا آغاز مرحوم علامہ قزوینی نے کیا اور بعد میں درجنوں اہل قلم نے ان کی پیروی کی ان لوگوں میں سید جلال الدین کاشانی، میرزا جا[illegible] شیرازی، میرزا محمد حسین فروغی، ملک الشعراء بہار اور علامہ دہخدا کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لغت [illegible] کا کام بڑی مستعدی سے جاری ہے۔ لغت نامہ دہخدا ایک بے نظیر کتاب ہے جو ایک سو سے زائد جلدوں میں [illegible] ہو چکی ہے۔ تاریخ ادبیات لکھنے والوں میں جلال ہمائی، ڈاکٹر رضا زادہ شفق، ڈاکٹر معین، ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا، ڈاکٹر پرویز خانلری وغیرہ پیش پیش ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے ادیب ہیں جنھوں نے ایران کی سیاسی اور اجتماعی تاریخ مرتب کرنے میں دل چسپی لی ہے۔ ایسے لوگوں میں سید احمد کسروی، استاد فروزانفر، حسن پیرنیا، شیر الدولہ، عبد العظیم قریب، ابراہیم پور داؤد، سید عبد الرحیم خلخالی، ڈاکٹر محمد مقدم، ڈاکٹر صادق کیا، ڈاکٹر مجتبیٰ مینوی، عباس اقبال اور حسن تقی زادہ وغیرہ بین الملکی شہرت کے مالک ہیں۔

فارسی نثر کی موجودہ ترقی اور نشو و نما میں شہنشاہ آریا مہر ایران نے بڑی دل چسپی کا اظہار کیا ہے اور ان ہی کے فرمان کے مطابق ۱۳۴۲ ہجری شمسی میں فرہنگستان ایران

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

انہ بنے

احمد یوسف

ذہنی سوچوں کے تعاقب میں تھا۔ جسم و جان نڈھال ...ے ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ وہ اُترنا نہیں چاہ رہا تھا، مگر ...تر رہا تھا۔ ایک خوف کہ کہیں تلووں میں چیونٹے نہ لپٹ ...ا ہیں، ایک خوف کہ کہیں چیونٹے اجنبیوں کو پہچانتے نہ ہوں

سب کچھ پُرانا ـــــ سب کچھ بدل چکا
اسٹیشن وہی ہے ـــــ اسٹیشن بدل چکا ہے
قلی وہی ہیں ـــــ قلی بدل چکے ہیں
یکے وہی ہیں ـــــ یکے بدل چکے ہیں

اس نے تیزی سے نئے پرانے کی اسی گردان کو کئی ایک بار دل میں، کئی ایک بار لبوں میں اور کئی بار خاص بلند آواز میں دُہرایا۔

اٹیچی اُٹھائے وہ دھیرے دھیرے پلیٹ فارم پر چل رہا تھا۔ کوئی ارادہ ؟ ـ کوئی سمت ؟ ـ دراصل کوئی دوٹوک بات کہنے کی پوزیشن میں تھا ہی نہیں۔

اسٹیشن سے باہر اُس نے ایک جگہ کھڑے ہو کر کچھ دیر خود کو سمیٹا، لیکن بکھراؤ اتنا تھا کہ سمیٹنا ممکن ہی نہیں دکھائی دیا پھر بھی اس نے اپنے طور پر کوشش ضرور کی لیکن اس کوشش میں پھر وہی دو باتیں ٹکرانے لگیں کہ بکھراؤ کم ہو گیا ہے کہ بکھراؤ بڑھ گیا ہے۔

وہ چاہتا تھا کہ سانس کو زینہ بہ زینہ نیچے اُتارے لیکن سانس تھی کہ دوسری ہی ساعت دوڑتے بھاگتے ان ہی زینوں سے اُوپر چڑھ جاتی تھی۔

بڑی عجیب سی کیفیت تھی۔

کیا ہو گا ؟

کیا نہیں ہو گا ؟

یہ جو سامنے ہے پچھلی رات کا خواب ہے۔ یا کل کے دن کا اُجالا ہے۔ پھر وہی جان لیوا تھا کہ کوئی بات قطعی اور فیصلہ کن کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔

رکشے کو اُس نے اشارے سے بُلایا، آگے اشارہ نہیں چلا تو اُس نے اُسے بتایا۔

میرا لہجہ مانوس تھا۔؟
میرا لہجہ نامانوس تھا ؟
رکشے والا گھور کیوں رہا تھا ؟
وہ تو ہر ایک کو گھورتا ہے۔
وہ جانے پہچانوں کو کب گھورتا ہے ؟
رکشا چل پڑا۔
یہ عمارت تھی ؟۔
کوئی اندر چیخنے لگا۔
ہاں تھی، ہاں نہیں تھی۔ ہاں تھی، ہاں نہیں تھی۔

ہر منظر، ہر فرد کو اسی نوع کی دو متضاد چیخیں آدبوچتیں۔

اس نے دھیرے سے احتجاج بلند کیا۔ "تم لوگ تو کچھ دیکھنے ہی نہیں دیتیں۔"

اچانک اُسے وہ خط یاد آگیا۔ اُس نے اٹیچی پر
اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ چھوٹے چچا کے سالے۔
خیر سے سالے کے سالے نہیں ہیں۔
دروازہ کھلے گا ؟ ۔ کیوں کھلے گا ؟ ۔ کیوں نہیں
کھلے گا ؟ رشتہ تو سیدھا ہے۔
وہ اگر اکیلے وہاں دریا کی راہ سے برآمد ہوتا تو کچھ
بھی نہیں بگڑتا۔ لیکن یہاں تو ایک ایک کر کے سبھی دریا کی
راہ سے برآمد ہوگئے۔ اور اب یہ ایک اجنبی شہر ہے (ایسا
کیوں ؟ کیسے ؟) جہاں بس ایک چھوٹے چچا کے سالے۔
کل ہی کی تو بات ہے۔ سردیوں کی رات تھی۔
تیز بارش اور اولہ باری کے بعد سردی برف کی تلوار لئے بڑے
سفاکانہ حملے کر رہی تھی۔
اُس کے اس شہر میں۔ وہ کچھ گڑبڑا گیا۔ اور ایک
چھوٹی سی ساعت کے لئے اُس کے دل میں ایک خوف کی لہر
دوڑ گئی۔ اگر کسی نے سن لیا تو ؟ ۔ اس کے امکانات تو قطعی
نہیں تھے کہ اس پر پھول برسائے جائیں گے، (پھولوں کا موسم
تو کب کا نکل چکا ہے) تو پھر نگاہوں کی خشت باری سے آگے
بہت کچھ۔
اور آج کہ آسمان پر سورج نے ایک بے حد خوشگوار
دھوپ کے پر پھیلا رکھے ہیں، وہ واپس آگیا ہے۔ ہاں اُس
کے سر پر پچھلی رات کے اولے اب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اور کچھ
بھی تو نہیں بدلا ہے، رات کی رات بدل بھی کیا جا سکتا تھا۔
زیادہ سے زیادہ اولہ باری کے اثرات۔ ویسے آئینہ تو کہتا ہے
(جھوٹ ہی کہتا ہوگا) کہ اب بدلنے کو رہ ہی کیا گیا ہے۔

سچ پوچھئے تو قصہ یہ ہوا تھا کہ ———
میں نے دوست سے کہا۔ میں ذرا دیر میں نہا لوں

جب تک تم بھی میرے کپڑے [illegible]
پل بھر کے بعد میرے [illegible] میں نے دیکھا
ایک اجنبی کنارا میرے سامنے کھڑا تھا، جہاں غضب کا
اژدحام تھا۔
میں اپنی صورت تو نہیں دیکھ سکا، پر ایک عجیب
حال سے دوچار تھا۔
مجھے دیکھ کر کچھ لوگ پکار اُٹھے۔ "دیکھئے یہ صاحب
نکل آئے۔
کون لوگ تھے یہ ؟ ۔ میرا ان سے کیا رشتہ تھا ؟
میرا وہ کنارا کیا میرا ؟ ——— یہ کونسا کنارا ہے جو ذہن کی
گرفت میں کسی طور آتا ہی نہیں ہے۔
لیکن وہ سب بہ یک زبان کہہ رہے تھے کہ یقینی تم نے
دریا کی تہہ میں کوئی بھیانک منظر دیکھا ہے۔
بھیانک منظر ؟ ———
تب ہی کچھ لوگ ایک قیمتی جوڑا لئے آگے بڑھے
بس دیر نہ کرو کہ وہاں ایک مولوی، ایک سہرا اور
ایک لڑکی تمہاری راہ دیکھ رہا ہے۔
مگر میں تو ——— یا الہٰی یہ ماجرا کیا ہے۔
اس لئے ہم کہتے ہیں کہ زیادہ گہرے غوطے نہ لگایا
کرو۔
اس پر کسی نے گرہ لگائی۔ اور یہ نوجوان تو بے خوف
ہو کر غوطے لگاتا ہے۔ یقینی کوئی بھیانک منظر۔
پر یہ کہ بھیانک منظر کونسا تھا۔ ؟ یہ جو نظر کے
سامنے ہے، یا وہ جو دو گھڑی پہلے نظر کے سامنے تھا۔ ؟
وہ میرے ہر سوال پر فلک شگاف نعرے لگاتے۔
میاں صاحبزادے یا تو ہم سے مذاق کر رہے ہیں، یا
واقعی ان کے دل میں کوئی خوف بیٹھ گیا ہے۔
آخر تھک ہار کر میں ان کے ساتھ چل پڑا اور کری

...ن تھا کہ وہ سب یا تو [illegible] رہے تھے یا پھر

...سایہ۔

ایسے میں [illegible] سطروں کو مٹا دینے

...سافت بھی۔

پر جب مولوی نے مجھے [illegible] سے دور کرنا چاہا تو میں نے

...اج بلند کیا۔

میں وہ نہیں ہوں جو تم [illegible] اور میں نے تو

...دوسرے کنارے پر غوطہ لگایا تھا۔

تب ہی انھوں نے [illegible] بلند کرتے ہوئے کہا: میاں

...یا بدشگونی پھیلا رکھی ہے تم نے۔

اس طرح مبارک سلامت کے دوران مولوی نے

...[illegible] یا کہ میں ایک سے دو ہو گیا۔

میں نے اپنی پشت پر کی دنیا کو دیکھنا چاہا تو یوں محسوس

...[illegible] دن ہی نہیں مڑتی ہے۔ دیر کے بعد مڑی تو کچھ بھی

...نظر نہ آیا۔

بہت کوشش کی پر وہاں تو کچھ نہ تھا۔ شاید میری پیٹھ

...غائب ہو چکی تھی۔

پھر بتدریج سب کچھ ہوا اور میں نے سبھوں کی نظر میں

...بچا کر سلیٹ کو مٹانا شروع کر دیا۔ ویسے حقیقت تو یہ ہے کہ

...سے میں نہیں مٹا رہا تھا، وقت مٹا رہا تھا۔ میں اپنی پیٹھ کے

...تعلق بھی بھولتا جا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے دبے پاؤں

ایک وقت وہ بھی آیا کہ میں اپنی پیٹھ کے ذکر ہی پر

...بھبھک اٹھتا۔

اور ہر صبح وہ جو کبھی گل نو تھی میرے ہاتھ میں ایک ڈبہ

دبا دیتی جس میں میرا دوپہر کا کھانا بند ہوتا۔ میں اپنے سسر کی

دکان پر بیٹھنے لگا تھا۔ اُسے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی،

اس لئے اس نے مجھے گویا گھر داماد بنا لیا تھا۔

میں سویرے دکان جاتا اور پھر رات گئے گھر واپس آتا

اتنا ٹوٹتا پھوٹتا کہ اس کے بعد کوئی بھی کام میرا کام نہیں

ہوتا بلکہ ......

تب ہی میں سوچتا یہاں اپنا کام کوئی کر ہی کیا

سکتا ہے کہ مختار تو کوئی اور ہی ہے۔ جیسے میں دریا

سے نمودار ہوا تھا .... اور اچانک سلیٹ کی

وہ تحریریں میرے آگے کوندسی جاتیں۔ تحریریں کہ جنھیں

میں نے کمال چابک دستی سے مٹا دیا تھا۔

پھر ایک غوغاں، دوسرا، تیسرا اور چوتھا۔

روتے دھوتے، پیشاب کرتے، پیارے پیارے

بیوی کہتے یہ سب آپ کے ہیں۔ میں کہتا یہ سب

تمہارے ہیں کیونکہ ...... اس 'کیونکہ' کے آگے میں کچھ

نہیں کہہ پاتا کہ ایسے میں میری 'مردانگی' اور اس کی

'نسائیت' دونوں پر کاری ضرب لگنے کے اندیشے تھے

لیکن یہ قصے بھی ایک خاص عمر کے تھے کہ عمر کا ہر حصہ

کچھ پرانے قصوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے اور ان کے لاشے

سے کچھ نئے قصے برآمد کرتا ہے۔

اب یہ شہر جو ایک حادثے کے نتیجے میں مجھے ملا تھا

بالکل ہی میرا تھا۔ یہ گھر میرا تھا اور پھر بیوی تو بیوی ہی

تھی۔ جس پر حق نہ جتانے سے میں ایک چلتا پھرتا صفر

بن جاتا۔

میرا شہر، میرا گھر۔

تب میرا سسر مر گیا اور سب کچھ میرا ہو گیا

پھر ایک دن میں نے دیکھا کہ میری کنپٹیوں کے اوپر

مکڑیوں نے سفید جالے سے تان دئے ہیں اور اسی

لمحے میری بیوی نے سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ

میں صرف اپنی کنپٹیوں کے اوپر کی خبر رکھتا ہوں، کچھ اور بھی

تو سوچنا چاہئے مجھے۔ ایک تبسم کرتی ہوئی کلی جو میری بیٹی

تھی

میں نے اپنی بیوی سے کہا۔ "کہو تو دریا کی طرف چلا جاؤں۔"

میری بیوی یہ سن کر کڑک اُٹھی۔ تم نے افیون کی ترنگ میں ایک کہانی گڑھ لی تھی، مگر یہ کونسا مذاق کا وقت ہے۔

بہرحال، میں نے اس فرض کو سنجیدگی سے گلے میں لٹکایا اور ایک دن اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اس فرض کو گلے سے اُتار بھی دیا۔

میرا داماد دفتر میں کام کرتا تھا اور ہفتے کی شام کو میری بیٹی کو لے کر میرے گھر آتا تھا۔ میرے تین بیٹے تھے۔ بڑا میرے ساتھ دُکان پر کام کرتا تھا اور اُس کے دو چھوٹے بھائی اسکول میں پڑھتے تھے۔

ایک دن دفتر میں چھٹی تھی کہ میرا داماد میرے گھر آیا میری بیوی نے دُکان جانے کے وقت مجھ سے کہا۔ "دیکھو لڑکا دُکان جا رہا ہے۔ تم بازار جا کر ایک روہو لے آؤ کہ میں آج داماد کے لئے روہو کا قورمہ بنانا چاہتی ہوں۔

میں بازار کی طرف چل کھڑا ہوا۔

اُس دن بازار میں روہو کے بڑے چرچے تھے۔

کیا بات ہے کہ روہو بازار میں آتے ہی غائب ہو جاتی ہے۔"

میں نے ایک دُکان پر تازہ روہو دیکھ کر دکان دار سے دریافت کیا۔

روہو کیا حساب ہے۔"

"روہو؟" اُس نے آگے پیچھے نظر دوڑائی، تب ہی جانے کدھر سے کچھ لوگ اُس کی طرف دوڑ پڑے۔

"یہ روہو کون لے رہا ہے؟" "تو یہ ہے۔ یہ جو دریا سے نمودار ہوا تھا۔"

"تو یہ روہو کھائے گا؟"

ذرا اسے پکڑو۔

اور پکڑنے کا نام سنتے ہی میں [illegible] سے اپنی جان [illegible] بھاگا۔ بس بھاگتا ہی گیا۔ پر میں [illegible] کی طرف کیوں بھاگ رہا تھا۔ اس وقت یہ کون سوچتا کہ میں تو بھاگنے کی دھن میں تھا۔ اور میرے پیچھے "پکڑو پکڑو" اور "جانے نہ دو" کا شور بھی آتا تھا۔ اب میں دریا کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔

وہ آگئے۔ وہ دور ہو گئے۔

وہ اب مجھے نہیں پکڑ سکتے۔ وہ کسی بھی لمحے مجھے پکڑ لیں گے۔

میری سانس مجھ سے بھی آگے بھاگ رہی تھی، پورا وجود اپنے اُٹھلے جیسے ہوا میں اڑا جا رہا تھا۔ ذرا چوکے اور جان سے گئے۔

اس عالم میں ہانپتے کانپتے دریا تک پہنچ گیا، تھا میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، وہ بیس گز بھر کے فاصلے پر رہ گئے تھے۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے پانی میں چھلانگ لگا دی۔

"دیکھو وہ گیا۔" یہ کہہ کر کوئی ایک نے میرے پیچھے چھلانگ لگائی لیکن پانی میں وہ میرا تعاقب کیا خاک کرتے۔

اور جب میں بہت دور نکل گیا، جب وقت بہت دور نکل گیا تو میں نے اپنا سر اُٹھایا۔ وہ کنارا کہاں تھا؟ میں بھاری بھاری سانس لیتا ہوا کنارے کی سمت چل پڑا۔ نہیں وہ کہاں ہے۔ پھر وہی مذاق۔ پھر وہی حادثہ۔ یا خدا مجھے اس مصیبت سے نجات دلا۔

میرے دوست نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اوپر کھینچا

اتنا لمبا غوطہ لگاتے ہو۔ آدھ گھنٹہ ہو گیا گھر چلو۔

میں تقریباً چیخ اُٹھا۔ میری پیٹھ کہاں ہے؟ میری ریڑھ کی ہڈی؟ میرے جسم و جان؟

دوست نے کہا۔ چلو جلدی چلو وہ کھانے پر ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے ——— مگر میں اس جوانی میں جھکا کیوں جا رہا ہوں؟ میری پیٹھ کہاں ہے؟

تم نے دریا کی تہہ میں یقینی کوئی بھیانک منظر دیکھا ہوگا۔ اس لئے کہتا ہوں زیادہ دیر تک نہ نہایا کرو۔

رکشا شہر کے جانے انجانے راستوں سے گزر رہا تھا ●●

شاہین

غزلیں

نکہتِ گل سے، نہ انفاسِ خزاں سے آئے
اب کے اک آنچ سی پہنائیٔ جاں سے آئے

آگ پر طنز نہ کرتی ہو یہ گیلی لکڑی
لحظہ لحظہ کوئی آواز دھواں سے آئے

برف چپ چاپ گری ہوگی سرِ منزلِ شب
صبح کی آنکھ میں افسانے کہاں سے آئے

زندگی نیم کنول خواب کا پل، روحِ غزل
ہاتھ کب نقدِ جنوں شرح و بیاں سے آئے

یہ مہک سے یہ ہری بیل یہ چوبی چڑیا
اک عجب بوئے طلسمانہ مکاں سے آئے

●●

کر گیا آج کوئی میرے حوالے مجھ کو
اے مری خلوتِ جاں تو ہی بچا لے مجھ کو

یخ زدہ شامِ سفر کو وہ بھٹکتی رہ جائے
اور باہوں میں مری آگ چھپا لے مجھ کو

میرے رستے میں نہ آئے وہ زمانہ ہو کر تو
لڑکھڑاؤں بھی تو کوئی نہ سنبھالے مجھ کو

دن نے وہ داغ دیے ہو گئی شب اور کٹھن
راس آئے نہ اندھیرے نہ اجالے مجھ کو

خشک پتوں سے بھری شام جب اترے دل میں
لالہ گوں خواب کی تعبیر بنا لے مجھ کو

میں کہ شاہین ہوں خود اپنی انا کا گھائل
کوئی بڑھ کر مرے نرغے سے نکالے مجھ کو

●●

غزلیں

لطف الرحمٰن

مدہوشی میں رہی میری آگہی مجھ سے
کہ ہوسکی نہ خدائی نہ بندگی مجھ سے

نہ دوستی ہی رہی خوش، نہ دشمنی مجھ سے
ادا ہوا نہ کسی کا بھی حق کبھی مجھ سے

میں خود کو تیری نظر سے بھی دیکھنا چاہوں
تو میرے لہجے میں بھی بات کر کبھی مجھ سے

سمیٹ لے میری نظروں سے جلوۂ دریا
مگر نہ چھین تو یہ اپنی تشنگی مجھ سے

نگاہِ شک سے ابھی خود کو دیکھتا ہوں میں
تو کوئی بات بھی اپنی نہ کہہ ابھی مجھ سے

خود اپنے آپ کو سہنا بھی کوئی کھیل نہیں
ہر ایک موڑ پہ روٹھی ہے زندگی مجھ سے

تمام تر وہی ظاہر ہوا تھا مجھ پہ کبھی
وہ ایک شخص جو بنتا ہے اجنبی مجھ سے

برس ہی جاتی ہے یادوں کے دشت میں اب بھی
وہ بات بھولی ہوئی کاش بھولتی مجھ سے

کسی کمی کا یہ احساس مٹ گیا ہوتا
یہ اک کسک بھی تو وابستہ رہ گئی مجھ سے

●●

عجیب سلسلۂ انتشار تھا مجھ سے
ہر ایک گام پہ کچھ لے اڑی ہوا مجھ سے

تو خود پہ ظلم نہ کر ہے اگر خفا مجھ سے
جو بات دل میں چھپی ہے ذرا بتا مجھ سے

تمہارے بعد نہ ٹوٹا حصارِ خاموشی
کہ جیسے روٹھ گئی ہو مری صدا مجھ سے

میں اپنا گم شدہ لہجہ نہ پا سکا اب تک
نہ طے ہوا ترے غم کا یہ مرحلہ مجھ سے

تری نظر میں بھی پہچان کھو گئی اپنی
مری نظر کو بھی اب کم ہے رابطہ مجھ سے

اسی نے ٹھیک سے جانا تھا مجھ کو دنیا میں
وہ ایک شخص جو اب ہو گیا جدا مجھ سے

کبھی کبھی یہ عجب درد جاگ اٹھتا ہے
کہ پوری طرح کبھی میں، نہ وہ کھلا مجھ سے

ترا یقین بھی کیا درد دے گیا ہے مجھے
کہ شش جہت میں گماں ہی گماں ملا مجھ سے

تمہیں قریب بہت اپنے آپ سے پایا
ملا ہے ٹوٹ کے جب کوئی دوسرا مجھ سے

●●

رہے گا دکھ یہی وابستہ عمر بھر مجھ سے
ہوئی سحر تو جدا ہو گئی سحر مجھ سے

ذرا پتہ تو چلے کہ لٹا ہے کتنا کون
ذرا ملا تو سہی تو کبھی نظر مجھ سے

میں خود ہی ٹوٹ چکا ہوں تجھے بناؤں
ترے لئے یہی بہتر ہے کر حذر مجھ سے

کہیں بھی جاؤں اسی رہ پہ تو نکلتا
کہ بھولتی ہی نہیں تیری رہ گزر مجھ سے

میں خود کو ہار بھی جاؤں گا دل
ہوا کی طرح مگر تو کبھی گزر مجھ سے

تری نظر میں بھی ہے دشت کا وہی
تو خوش نہیں ہے بہت تو بھی لوٹ کر

یہ کس کی دھن مجھے لیکر اڑی ہوا کی طرح
بچھڑ کے رہ گئے رستے میں ہم سفر مجھ سے

وہی تو ایک سمجھتا ہے دل کے سب
وہ آدمی جو بنا ہے بے خبر مجھ سے

بکھر گیا مری خاشاک کا اک
وہ دن کہ روٹھ گیا تھا مرا شرر مجھ

زک ہے بہت

شروَن کمار ورما

وہ اپنے کمرے میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ صرف
یکھ جا رہا تھا، کوشش کے باوجود پڑھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ
یک سطر پڑھتا، دوسری پڑھنے لگتا اور پہلی بھول جاتا،
وئی تسلسل ہی نہیں بن رہا تھا۔ اُس کی بیوی جو سامنے
قالین پر بیٹھی ننٹنگ کر رہی تھی، اُون اور سلائیاں رکھ کر کھڑکی
سجا کھڑی ہوئی

"وہ نئے مکان والے بھی گئے۔"

وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اُس نے جو سگریٹ ابھی ابھی
سلگایا تھا، ایش ٹرے میں راکھ ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ
اُس کی نگاہ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے پر جا کر ٹھہر جاتی۔
شیشے میں بال آیا تھا۔ پھر اُوپر کا حصہ آپ سے آپ فرش
آگرا۔ اُس کی بیوی نے کرچیں اُٹھا کر کوڑے کے ڈبے میں
پھینک دی تھیں۔ باقی کا شیشہ اُس نے خود نکال کر پھینک
یا تھا۔

"سب چلے گئے، محلہ خالی ہو گیا۔" اُس کی بیوی
گلی میں جھانکتے ہوئے نہ جانے کس سے کہہ رہی تھی۔ "کتنی
گہری خاموشی ہے۔" اُس کے ہاتھ میں اخبار تھا اور اُس کی
نگاہیں کھڑکی پر تھیں۔ اُس نے اخبار رکھ دیا اور کھڑکی میں
جا کھڑا ہوا۔ اُس کی بیوی نے اُس کی طرف دیکھا۔

"دوسرا شیشہ بھی ٹوٹ گیا۔" وہ بولا۔

"یہاں گتہ لگا دو۔" وہ بولی۔ "بلیک آؤٹ
میں۔"

"ہم اب بتی نہیں جلائیں گے۔" وہ تھکا تھکا سا
چلتا کرسی پر جا بیٹھا۔ اور اخبار دیکھنے لگا۔ سگریٹ جل کر
راکھ ہو چکا تھا۔ اُس کی بیوی اب بھی کھڑکی میں کھڑی تھی۔
جیسے کسی آہٹ کسی آواز کا انتظار کر رہی ہو۔ وہ کھڑکی سے
ہٹ کر کارنس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اُس نے دائیں طرف
کا گلدان بائیں طرف اور بائیں طرف والا دائیں طرف رکھ دیا۔
درمیان میں رکھی ٹائم پیس میں وقت دیکھا جو کئی دنوں سے
پانچ بجا رہا تھا۔ اُس نے ٹائم پیس اُٹھا کر اُلٹا کیا، چابی
کو انگوٹھے اور پہلی اُنگلی میں دبا لیا۔ پر نہ جانے کیا سوچ کر
رکھ دیا اور خاوند کی طرف دیکھا۔ وہ چپ چاپ کرسی پر
بیٹھا تھا، اُس کا سر سینے پر جھک آیا تھا، وہ قالین پر دبے
دبے پاؤں چلتی خاوند کے قریب آ گئی۔ اُسے لگا کہ ایک دم
اُس کے سر کے بالوں میں سفید تاروں کا اضافہ ہو گیا ہے۔
اُس نے سر اُٹھایا اور بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی
جگہ پر بیٹھ گئی اور ننٹنگ میں محو ہو گئی۔ اُس کا لڑکا قریب ہی
قالین پر بیٹھا کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ اخبار جو قالین پر بکھرا
پڑا تھا اُس نے اُٹھا لیا، اُس کی بیوی نے اُون پھر رکھ دی اور
خالی دیواروں کو دیکھنے لگی۔

"ہمیں ان دیواروں پر تصویریں وغیرہ لٹکانا چاہئیں۔"

"اُن کے بھی شیشے ٹوٹ جائیں گے۔"

۔۔۔ تھا۔ کل رات وہ اس کے
۔۔۔ کی شادی کو سات سال ہو چلے تھے
۔۔۔ گ الگ نہیں سوئے تھے، لیکن
۔۔۔ کیا ہوا بھی بہت دور چلا گیا
تھا۔ اس کی بیوی نے پوچھا بھی تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے
لیکن وہ کچھ سوچ نہیں رہا تھا۔ اور اُس نے سچ سچ کہہ بھی
دیا کہ وہ کچھ نہیں سوچ رہا۔ وہ موم بتی کی ہلکی زرد روشنی
میں بیوی کے متناسب، صحت مند، اور گداز جسم کو دیکھتا
رہا پھر اس کی نگاہیں، اس جسم کا طواف کر کے اپنی آنکھوں
میں لوٹ گئیں اس پرندے کی طرح جو آسرے کے لئے کسی درخت
کے چکر کاٹتا ہے لیکن اس پر اُترتا نہیں اور اندھیرے میں کسی طرف
پرواز کر جاتا ہے۔ پھر جیسے ہر چیز برف کی طرح ٹھنڈی ہو گئی
کمرہ، بستر، بیوی۔ وہ خود اس نے پھونک مار کر موم بتی بجھا دی
اور آہستہ سے کہا تھا۔ کپڑے پہن لو، اُس کی بیوی نے چپ چاپ
کپڑے پہن لئے۔ وہ رات بھر جاگتے رہے۔ کئی مرتبہ خطرے کا
سائرن بجا۔ طیارے چیختے ہوئے اِدھر سے اُدھر نکل گئے،
فائر ہوئے، دھماکے ہوئے۔ مکان کی کھڑکیاں تک ہل گئیں،
اور شیشہ چھناک سے ٹوٹ گیا، لیکن وہ ویسے ہی پڑے رہے۔
"وہ کلنڈر کہاں گیا۔؟" اُس کی بیوی نے پوچھا۔ "وہ
جس میں بچّہ بندوق لئے بیٹھا تھا۔"
"وہ۔ وہ میں نے لپیٹ کر رکھ دیا ہے۔"
"دو سال پہلے اس کمپنی کے کلنڈر میں اسی بچّے کی تصویر
تھی، لیکن تب اُس کے ہاتھ میں بانسری تھی۔"
وہ کچھ بولا نہیں۔ اُس نے دوسرا سگریٹ سلگا لیا۔
ایک کش لیا اور سگریٹ ایش ٹرے میں رکھ دیا۔ اُس کی بیوی
دیوار پر اُس جگہ کو دیکھ رہی تھی جہاں وہ کلنڈر ٹنگا رہتا تھا
اب وہاں صرف خالی کیل تھی۔ وہ سگریٹ کے دھوئیں کو ہوا میں

"ننگی دیواریں اچھی نہیں لگتیں ۔"

اُس نے بیوی کی طرف دیکھا۔ کل رات وہ اس کے ساتھ لیٹی تھی۔ ننگی ۔ اُن کی شادی کو سات سال ہو چلے تھے ان تمام برسوں میں وہ کبھی الگ الگ نہیں سوئے تھے۔ لیکن کل رات وہ جیسے اس کے ساتھ لیٹا ہوا بھی بہت دور چلا گیا تھا۔ اس کی بیوی نے پوچھا بھی تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے لیکن وہ کچھ سوچ نہیں رہا تھا۔ اور اُس نے سچ سچ کہہ بھی دیا کہ وہ کچھ نہیں سوچ رہا۔ وہ موم بتی کی ہلکی زرد روشنی میں بیوی کے متناسب، صحت مند، اور گداز جسم کو دیکھتا رہا پھر اس کی ننگا ہیں، اس جسم کا طواف کر کے اپنی آنکھوں میں لوٹ گئیں اس پرندے کی طرح جو آسرے کے لئے کسی درخت کے چکر کاٹتا ہے لیکن اس پر اُترتا نہیں اور اندھیرے میں کسی طرف پرواز کر جاتا ہے ۔ پھر جیسے ہر چیز برف کی طرح ٹھنڈی ہو گئی کمرہ، بستر، بیوی، وہ خود اس نے پھونک مار کر موم بتی بجھا دی اور آہستہ سے کہا تھا۔ کپڑے پہن لو، اُس کی بیوی نے چپ چاپ کپڑے پہن لئے ۔ وہ رات بھر جاگتے رہے، کئی مرتبہ خطرے کا سائرن بجا۔ طیارے چیختے ہوئے ادھر سے اُدھر نکل گئے، فائر ہوئے، دھماکے ہوئے۔ مکان کی کھڑکیاں تک ہل گئیں، اور شیشہ چھناک سے ٹوٹ گیا، لیکن وہ ویسے ہی پڑے رہے۔

"وہ کلنڈر کہاں گیا۔؟" اُس کی بیوی نے پوچھا۔ "وہ جس میں بچہ بندوق لئے بیٹھا تھا۔"

"وہ ۔ وہ میں نے لپیٹ کر رکھ دیا ہے ۔"

"دو سال پہلے اس کمپنی کے کلنڈر میں اسی بچے کی تصویر تھی، لیکن تب اُس کے ہاتھ میں بانسری تھی۔"

وہ کچھ بولا نہیں۔ اُس نے دوسرا سگریٹ سلگایا۔ ایک کش لیا اور سگریٹ ایش ٹرے میں رکھ دیا۔ اُس کی بیوی دیوار پر اُس جگہ کو دیکھ رہی تھی جہاں وہ کلنڈر لٹک رہا تھا اب وہاں صرف خالی کیل تھی۔ وہ سگریٹ کے دھوئیں کو ہوا میں تحلیل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ [illegible] جا چکا تھا۔ اس [illegible] [illegible] "خوں" کی آواز نکالتا [illegible] خالی لگتا ہو [illegible] دیکھتا رہا۔ [illegible] سنسان ہو گیا۔ [illegible]

"[illegible]"

[illegible] اس نے [illegible] کر اخبار کی تہہ کر دی۔ اور جا کر [illegible] کے ساتھ ہی [illegible] رکھ دیا۔

"بڑا سناٹا ہے۔" وہ بولا۔ "شہر بہت خالی لگتا ہے!"

اُس نے کھڑکی سے باہر خاموش، ویران مکان دیکھا۔ اُسے اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے لوگ، سامان سے لدے رکشا، تانگے، موٹریں یاد آئیں۔ اسٹیشن پر بے تحاشا بھیڑ، بے تحاشا سامان۔

"شاید۔" وہ کچھ لمحوں بعد بولا۔

"تم اخبار اونچی آواز میں کیوں نہیں پڑھتے۔؟"

"میں پڑھ نہیں رہا ہوں۔ صرف دیکھ رہا ہوں۔"

"کسی کا ٹیلی فون بھی نہیں آیا۔" اُس نے ٹیلی فون کی طرف دیکھا۔ "سب لوگ چلے گئے۔"

"ٹیلی فون خراب ہی نہ ہو۔"

اس کی بیوی نے جا کر ریسیور اٹھایا۔

"کرنٹ تو ہے۔"

"ڈائل کرو۔"

"کسے۔؟"

"کوئی سا نمبر ملا لو۔"

اس کی بیوی نے [illegible] گھما دیئے۔

"[illegible] نہیں رہا۔"

اس نے [illegible] کر کرسی

[illegible]

"تم سگریٹ [illegible] ہو۔" اُس

نے ایش [illegible] سگریٹ کی طرف

[illegible] کیا۔

وہ خاموش رہا۔

"میں پی کر دیکھوں؟"

"پیو۔"

"کھانسی تو نہیں لگنے لگی۔؟"

"پتہ نہیں۔"

"پی لوں۔"

"لو۔"

اس نے سگریٹ سے کچھ ہلکا ہی کش لیا تو کھانسی آ گئی۔ لڑکے نے ماں کی طرف دیکھا اور کھیل میں معروف ہو گیا۔

"گلا خشک ہو رہا۔"

"پانی پی لو۔"

وہ جا کر پانی پی آئی۔ کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ سوئٹر [illegible] بننے لگی۔ وہ بیٹھا اُسے دیکھتا رہا۔ وہ بیٹھی اور کمرے میں [illegible] گھڑی چھوٹی اسٹیشن پر کسی انجن کی سیٹی [illegible]۔

"پہلے صرف رات کو سیٹی سنائی دیتی تھی۔"

اُس نے جواب نہیں دیا اُٹھ کر پچھلے کمرے میں چلا گیا۔ اندر ہر چیز جیسے اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی۔ کپڑے ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ [illegible] میز پر پڑا تھا۔ برتنوں والی الماری کھلی ہوئی تھی۔ رم کی خالی بوتل [illegible] رکھی تھی۔ اس نے لیبل پڑھا For Defence Forces

[illegible] اُس کی بیوی بھی وہیں آگئی

"وہ پھر نہیں آیا۔"

"یہ ——" اُس نے کمرے میں بکھری چیزوں کی طرف دیکھا۔

"میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔"

وہ چھت کی کڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو ۔ ؟"

"وہ جالا ۔۔ کب بن گیا یہ ۔۔ ؟"

"خیال نہیں کیا۔"

"میرا خیال ہے کل یہ نہیں تھا۔ کل رات کو۔"

"کل رات کو ۔۔" اُس نے خاوند کی آنکھوں میں دیکھا۔ اُس نے نگاہیں جھکا لیں۔ وہ جانے لگا تو اُس نے خاوند کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "سنو۔"

وہ رک گیا۔ اُس کا رنگ پھیکا پڑنے لگا تھا۔ وہ کھڑا رہا۔ خاموش، سر لٹکائے، وہ بھی کھڑی تھی۔ خاموش سر لٹکائے، پھر وہ بولا:

"یہ جالا صاف کر دو۔"

"تم کر دو۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ باہر نکل گیا اور ادھر اُدھر جیسے کچھ تلاش کرنے لگا۔ اُس نے کچن، باتھ روم، پیٹی کے پیچھے تاک جھانک لیا پھر پکار کر بیوی سے پوچھا۔

"جالا صاف کرنے والا برش کہاں ہے۔؟"

"وہ تو پڑوسن لے گئی تھی۔"

"پھر۔؟"

"اس کے آنے پر ہی صاف ہو سکے گا۔"

وہ اندر آ گیا۔ وہ دونوں مل کر کپڑے سمیٹنے لگے، انہوں نے ایک ایک کپڑا تہ کر کے رکھا، برتنوں والی الماری کے پٹ بند کئے۔ وہ ایشٹرے اٹھانے کے لئے جھکا تھا کہ سائرن

زور زور سے بجنے لگا۔ وہ خوف زدہ سی اُس سے آلگی۔ وہ اسے بازوؤں سے تھامے کھڑا ہوگیا۔ پھر وہی طیالے وہی فائر۔ وہ اس سے لپٹ گئی۔ اُس نے بیوی کو آہستہ سے بستر پر بٹھایا۔ وہ لیٹ گئی۔ وہ جانے لگا۔ اس نے خاوند کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ ہی لٹا لیا۔ وہ چھت کی کڑیاں دیکھ رہا تھا۔

"وہ تیسری کڑی چٹخ گئی ہے۔"

"نہیں تو۔"

"غور سے دیکھو۔"

"تمہیں وہم ہوگیا ہے۔ ٹھیک تو ہے۔"

اچانک کہیں قریب ہی زور کا دھماکا ہوا، پھر لگاتار کئی دھماکے ہوئے۔ ان کی نگاہوں سے پرے طیالے کہیں کتوں کی طرح لڑ رہے تھے۔ گولیاں چل رہی تھیں، دھماکے ہو رہے تھے۔ اس کی بیوی اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ پھر دھماکا ہوا۔ وہ اُچھل کر کھڑا ہوگیا۔

"کیا ہوا۔ یہ چھناکا کیا تھا۔"

"ایک شیشہ اور ٹوٹ گیا۔"

وہ سر تھام کر بستر پر بیٹھ گیا۔

وہ تکئے میں منہ دے کر رو دی۔ ●●

بیان ملکیت و دیگر تفصیلات

ماہنامہ آہنگ، بیراگی، گیا

فارم IV رول نمبر ۸

مقام اشاعت	محلہ بیراگی، گیا
مدت اشاعت	ماہنامہ
پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر کا نام	کلام حیدری
ملکیت	کلام حیدری
زبان	اُردو

میں کلام حیدری اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفاصیل میری دانست میں صحیح و درست ہیں۔

دستخط

کلام حیدری

صبا اکرام

غزل

ہر اک قدم پہ شہر میں پہرا تھا رات کو
اکرام اندھے قہر کا خطرا تھا رات کو

ہر لمحہ زندگی کا تھا کتنا عزیز تر
ہر لمحہ جیسے موت کا خدشہ تھا رات کو

دل جانتا ہے طے ہوا کس طرح وہ سفر
ہر لمحہ ایک خوف کا صحرا تھا رات کو

دیوار و در پہ موت کے قصّے تھے مرتسم
کالک کا نقش اور بھی چمکا تھا رات کو

خاکسترِ حیات ہوں اب بات وہ کہاں
گر دیکھنا تھا دیکھنے شعلہ تھا رات کو

نکھرا بلیک آؤٹ میں تھا رنگ بے کسی
جب چاند آسمان میں نکلا تھا رات کو

محرومیوں کا جھونکا تھا جو گھنگھرو باندھ کے
خواہش کے زرد پتّوں پہ ناچا تھا رات کو

کل تک رفاقتوں کا یہاں جس کی ذکر تھا
خنجر بکف وہ شخص بھی نکلا تھا رات کو

وہ بھی جو رہ گیا باقی تو اکرام تھا بہت
اُن سے رقابتوں کا جو رشتہ تھا رات کو

●●

پہروں کو سخت کر دو

ہماری خاطر یہ سوگ کیسا
کہ اب تو لاشوں کا ریشہ ریشہ
اُدھڑ چکا ہے
ندی کی تہ میں بکھر چکا ہے
جوان آنکھوں کا خواب
ساحل کے خشک ہونٹوں کا ذائقہ تھا
ہمارا کتبہ تو کب کا
لہروں کے سنگِ مرمر سے مٹ چکا ہے

یہ زخم پرور
لہو سے تحریر میرا قصّہ
خزاں جو آئی
تو پتّے پتّے سے نوچ لے گی
نئی بہاریں لکھیں گی قصّہ
تمہارے سپنوں کی سرزمیں کا
ہر ایک سرحد پہ آرزو کی
ابھی سے پہروں کو سخت کر دو

●●

کرشن [illegible]

سنگِ آستاں

غضب ہے سنگِ آستاں
عجب ہے رنگِ داستاں

بہو ۔ بہو
لہو لہو ہر ایک ماہ
پھر اس کے بعد کھل گئی ملن کی راہ
جو کیف و لُطف چاہئے
وصال کے طلسم کا
تو سیج سیج مانگتی ہے جسم کا
وصال کیا
جو ہو گیا تو کھو گئے
جو رہ گئے تو سو گئے
ملال کیا ؟
جو ہو گیا سو ہو گیا
خیال کیا ؟

عجیب تھی وہ رات بھی
ٹھہر گئی حیات بھی
کبھی کبھی تو مات بھی
اُداسیوں میں اُس کی اُٹھان ہے
خلا میں ایک باز کی اُڑان ہے
اُڑان ہی تو آرزو کی جان ہے
اُڑان ہی تو زندگی کی شان ہے
اُڑان کھو گئی تو زندگی گئی
اُڑان کے لئے ہیں آسماں کی جھلکیاں
اَمل ، عمل
مچل ، جنوں
تڑپ ، فسوں

عمل وہاں ، عمل یہاں
عجب ہے رنگِ استاں
غضب ہے سنگِ آستاں

چہرہ عورت

علی حماد عباسی

وہ اس کو دیکھ کر خالص امریکی لہجے میں بولی:
ہائے! (ہائی!)
اس نے بھی اس کے لہجے کی نقل اُتارتے ہوئے
ہائے! (ہائی!)
تم نے مجھے پہچانا؟
شاید تم پروین ہو۔
ہاں
لیکن تم یہاں کیا کر رہی ہو؟
وہی جو ہمیشہ سے کرتی آئی ہوں!
یعنی؟
جھک [illegible]
پروین نے [illegible] سے ساڑیوں
اُٹھایا۔ [illegible] نے [illegible] ٹ کرایا؛

میجر کمال انور ۳۷ لانسرز، کیرانی ۹۹ اے پی او
اور تاکید کردی کہ یونیفارم تیار ہو جانے پر وہ اس پتہ
پہ بھیجے کیونکہ اس کا رسالہ کچھ ہی دنوں میں بنگلور سے
فیلڈ ایریا میں کوچ کرنے والا تھا۔

پونے میں وہ اس کی آخری رات تھی۔ اس بار
وہ خاص طور سے چھٹی لے کر اپنے کچھ پرانے دوستوں سے
ملنے اور فوجی زبان میں ذرا "خوش ٹائم" کرنے آیا تھا۔
اس نے جنوبی کمان کے افسر میس میں رات کا کھانا ذرا
پہلے کھا لیا تھا کیونکہ اس کا ارادہ ایک دوست کے ساتھ
ویسٹ اینڈ سینما میں دوسرا شو دیکھنے کا تھا۔ لیکن جب
پروین نے اپنی سرخ رنگ کی امپورٹیڈ کار کا دروازہ کھولتے
ہوئے اس سے اپنے گھر چلنے کو کہا تو اس کو اپنا ارادہ بدلنا
پڑا۔ پروین سے اس کی ملاقات پورے ۱۵ سال کے بعد
ہوئی تھی اور وہ بھی اس طرح اچانک۔

اور پھر آج اس کی سرخ ساڑی کا آنکھوں میں کھبتا
ہوا رنگ، ہونٹوں پر تازہ گھاؤ کی طرح اُبلتی ہوئی لپ
اسٹک، سیلویس سے جھانکتی ہوئی گوری اور سڈول
بانہیں، مڈرف سے جھلکتی ہوئی کمر کی مخملی جلد، کٹی ہوئی
سنہری زلفیں، اور چہرے کا گاڑھا میک اپ۔ یہ سب
دیکھنے کو پھر کہاں ملے گا۔

راستہ لمبا تھا۔ پروین پہلے کچھ دیر تو پرانے
ساتھیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہی اور کمال
کی فوجی زندگی کے بارے میں پوچھتی رہی۔ پھر اپنے بارے
میں کمال کو بتانے لگی کہ کس طرح پورے ۱۱ سال تک وہ
بھارتی کالج میں جھک مارنے کے بعد اسکالرشپ لے کر
اوہایو اسٹیٹ یونیورسٹی گئی جہاں مزید ۳ سال تک وہ جھک
مارتی رہی۔ وہیں اس کی ملاقات ایک بزنس مین یوسف
بھائی صالح بھائی سے ہوئی جو ان دنوں یو ایس اے کے ٹور پر تھے

بمبئی میں ان کا ایکسپورٹ امپورٹ کا بڑا بزنس ہے ۔
ان کے برانچ آفس تہران، لندن اور سان فرانسسکو میں
ہیں۔ اس نے یوسف بھائی صالح بھائی سے شادی کرلی پہلے
بمبئی میں رہتی تھی۔ اب پونے میں رہتی ہے۔

پروین کمال کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلی گئی۔
ایرکنڈیشننگ کی وجہ سے باہر کے مقابلہ میں اندر کی فضا
کافی خوشگوار تھی۔ کمال نے ڈرائنگ روم کی سجاوٹ
کی طرف کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔ اور تھوڑی دیر بے
خیالی میں بیٹھے رہنے کے بعد اس نے کھڑکی سے سبز رنگ
کے پردے کو ہٹا کر باہر جھانکا۔ سارا شیواجی پارک روشنی
میں نہایا ہوا تھا۔ پارک کے پیچھے ایک مدھم سمفنی کی طرح
سڑک پر بسیں، کاریں، اور آٹو رکشے ایک دوسرے کے
پیچھے بہتے چلے جا رہے تھے۔

وہ کچھ دیر یوں ہی کھڑا رہا۔ اتنے میں پیچھے دیوار
پر ایک جاپانی مکان کی شکل کی گھڑی میں لگے کھڑکی کے پٹ
ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گئے۔ اور کھڑکی سے باہر گردن نکال کر
ایک خوبصورت سی چڑیا نے ۹ بار اپنی سریلی آواز سے اس کو
اپنی طرف متوجہ کیا۔ پھر وہ چڑیا اندر چلی گئی۔ کھڑکی کے پٹ
بند ہوگئے۔ اتنے میں ڈرائننگ روم کو بیڈروم سے الگ
کرنے والی رنگ برنگ کانچ کی لڑیوں کے جھالر میں ہلکی سی
جنبش ہوئی اور پروین ہلکے گلابی رنگ کی نائٹی پہنے ہوئے
نمودار ہوئی اور مسکراتی ہوئی کمال کے سامنے یوں کھڑی ہوگئی
جیسے وہ عورت نہ ہو زہرہ کا بت ہو جس کو نائیلون کا کپڑا پہنا کر
سامنے رکھ دیا گیا ہو۔ پروین نے کمال کو خاموش دیکھ کر
پوچھا:

" کیا سوچنے لگے ہو؟ "

" کچھ نہیں ــــ لیکن تم نے یہ لباس کیوں تبدیل کر دیا؟"
اصل میں میں نے سوچا کہ تم میرے پرانے چاہنے والے ہو
اس لئے تم سے ذرا اطمینان سے ملنا بہتر ہوگا۔ کیا تمہیں
یہ نائٹی پسند نہیں آئی؟ "

وہ آکر کمال کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔

اپنے آپ کو دل ہی دل میں اس کے پرانے چاہنے والوں
کی حیثیت سے موجود پاکر کمال کو عجیب سا لگا۔ یونیورسٹی میں
ایک ساتھ پڑھنے اور کسی لڑکی میں تھوڑی بہت دلچسپی لینے
کا مطلب اس پر عاشق ہو جانا تو ہرگز نہیں ہوتا۔ لیکن
تو پروین اپنی بات کہہ چکی تھی۔ کمال نے کہا:

" نہیں پروین! یہ نائٹی تم پر بے حد کھل رہی ہے
اصل میں تمہارا جسم ہی اس طرح سانچے میں ڈھلا ہوا ہے
اس پر جو کچھ بھی ڈھانپ دیا جائے اچھا ہی لگے گا۔ "

" اچھا، تمہیں میرے جسم کا کیا پتہ؟ "

" عورت کے VITAL STATISTICS کا پتہ
اپنے آپ ہی لگ جاتا ہے۔ "

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی کمال نے سوال کر دیا:

" اچھا یہ بتاؤ، تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں تمہارے
چاہنے والوں میں تھا؟ "

" یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی؟ "

" یقیناً "

" تمہارا مطلب یہ ہے کہ تم مجھے لکھ کر دیتے تو میں
اس پر یقین کرتی "

" لیکن تمہیں تو کلاس کے سبھی لڑکے MINI FRIG
کہتے تھے۔ تم سے عشق کون کرتا؟ "

" پر تم میرے سامنے بیٹھ کر مجھ سے آنکھیں کیوں لڑاتے
تھے؟ "

اس سوال کے جواب میں کمال کے من میں آیا کہ یہ تو
ایسا ہی ہوا جیسے چھوئی موئی کے پتے کسی بچے سے پوچھیں کہ اس نے
انھیں کیوں چھوا تھا۔ لیکن وہ اس بات کو آگے بڑھانا نہیں چاہتا تھا

تھوڑی دیر چپ رہا۔
پروین نے اپنا خوبصورت سگریٹ کیس نکالا اور
اس کی طرف بڑھایا:
"سگریٹ پیتے ہو؟"
"پی لیتا ہوں۔"
"کوئی خاص برینڈ؟"
"O.R BRAND"
"یہ کوئی اسپیشل آرمی برینڈ ہے؟"
"نہیں تو O.P. کا مطلب ہے OTHER
PERSONS یعنی جو دوسروں کی طرف سے پیش ہو۔"
یہ سن کر پروین کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اس نے
کمال کی سگریٹ سلگائی اور کچھ دیر سگریٹ لائٹر کو جلا اور
بجھا کر اس کے شعلوں سے کھیلتی رہی۔ پھر ایک سگریٹ خود
بھی جلا کر پینے لگی۔ کمال اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے
کمال کو خاموش دیکھ کر پوچھا۔
"کیا مجھے سگریٹ پیتے دیکھ کر تمہیں تعجب ہو رہا ہے؟"
"تعجب کیوں ہونے لگا۔ بہت سی عورتیں سگریٹ پیتی
ہیں۔ خیر تم تو اسٹیٹس بھی ہو آئی ہو۔ میں تو بہت سی ایسی
عورتوں کو جانتا ہوں جو ڈرنک بھی کرتی ہیں۔"
"ڈرنک کا خیال خوب آیا۔ تم فوجی آدمی ہو اس
لئے کیوں نہ تمہاری VISIT کو آج کی رات
CELEBRATE کیا جائے۔"
وہ یک بیک کھڑی ہو گئی۔ اور کمال کو بھی اپنی
جگہ سے اٹھنے کا اشارہ کیا اور کانچ کی لڑیوں کے جھالر کو
دونوں ہاتھوں سے ہٹا کر اندر کی طرف راستہ بنایا۔ وہ اس
کا بیڈ روم تھا۔ اس کے آگے ڈائننگ روم تھا۔ اس سے
ملا ہوا ایک کمرہ تھا جس میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ یہ
اس کا بار روم تھا۔ اس نے کمال کے سامنے کاؤنٹر پر کوئن این

کی سبز رنگ کی بوتل رکھ دی اور پھر تھوڑی سی اسکاچ اس
کے لئے ایک گلاس میں انڈیلی اور سائڈ بورڈ پر رکھے ہوئے
تھرموسائفن سے سوڈا بھر دی۔
"میں تنہا نہیں پیتا۔" کمال نے کہا۔
"لیکن آج میرے کہنے سے پی لو۔"
"میں نے کہہ دیا نا کہ میں اکیلے نہیں پیتا۔"
"کیوں؟"
"اس لئے کہ تنہا پینے میں تنہائی کا احساس اور بڑھ
جاتا ہے۔"
وہ کمال کا مطلب سمجھ گئی۔ اس نے اپنے لئے بھی ایک
پگ بنایا۔ نئی سگریٹ سلگائی اور اس کو اپنے ہونٹوں کے ایک
گوشے میں دبا کر گلاس اوپر اٹھایا:
چیرز CHEERS
چیرز CHEERS
اس نے ذرا سی سپ کی۔ پھر باتیں کرنے لگی۔ اپنی
کی باتیں بے کیف دن، بے کیف راتوں کی باتیں۔ ان
دنوں کی باتیں جب ماں باپ اس کی سخت نگرانی کرتے تھے۔
کبھی کبھی وہ محسوس کرتی کہ ماں باپ کی سخت گیری اور اس پر
بلاوجہ شبہ کرنے کی وجہ سے اس کی شخصیت دبتی جا رہی ہے
اس کے ماں باپ کے پاس اس کے لئے شادی کے کچھ اچھے
آفر بھی آئے لیکن انھیں اس سے شادی کے لئے جس شہزادے
کی تلاش تھی وہ ملا ہی نہیں۔ وہ اندر ہی اندر کڑھتی
جلتی رہی، تعلیم ختم کر کے اس نے ملازمت کر لی لیکن اپنے
پیروں پر کھڑے ہو کر بھی وہ ہمیشہ ماں باپ کے کنٹرول میں
اور کبھی اپنے آپ کو اپنے اوپر عاید حد بندیوں سے آزاد
کر سکی۔
اس طرح اس نے زندگی کے ۱۱ سال گزارے۔ جب
اس کی عمر ۳۲ سال سے اوپر ہوئی تو وہ اسٹیٹس پہونچی ا

اس کو ایک محسوس ہوا کہ وہ چیز جسے زندگی کہتے ہیں واقعی
بہت بے معنی سی چیز ہے۔ جتنا ہی اس کی الجھنوں کو
سلجھانے کی کوشش کرو، الجھاوے بڑھتے ہی جاتے ہیں
جتنا اپنے آپ کو تلاش کرو عرفانِ ذات کی منزل دور ہوتی جاتی
ہے۔ ساری کتابیں، سارے افکار اور آئیڈیلز سب کے
سب بے معنی ہیں۔

وہ انٹلکچول بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ کمال نے
بات کا رخ پھیرنے کے خیال سے اس سے کہا:

"ارے تم اپنے شوہر سے تو مجھے ملاؤ۔"

"وہ یہاں کہاں رہتے ہیں؟"

"پھر کہاں رہتے ہیں۔؟"

"بمبئی میں۔ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ۔"

"لیکن تم بھی تو ان کی بیوی ہو۔!"

"اصل میں آج کے سماج میں بیوی ہونا بھی ایک بے معنی
سی بات ہو کر رہ گئی ہے۔"

کمال نے اس کی طرف وضاحت طلب نظروں سے
دیکھا۔ اس نے کہا "ہر چیز کو ملکیت بنا کر رکھنا مرد کی
فطرت ہوتی ہے۔ بیوی بھی اس کی ملکیت ہوتی ہے۔ وہ جس
طرح چاہے اس پر اپنا حق جتا سکتا ہے۔ اب مجھے دیکھو نا
کہنے کو تو میں یوسف بھائی صالح بھائی کی بیوی ہوں لیکن
میرا وجود اس امریکن کولے بوریشن کا ایک حصہ ہے جو انھوں
نے آٹو موبیل اور پلاسٹک انڈسٹری کی صورت میں پھیلا رکھا ہے۔"

"لیکن کیا تم بزنس میں پارٹنر ہو؟"

"نہیں، میں خود بزنس کا ایک پلانٹ ہوں۔"

"وہ کس طرح؟"

"سارے امریکن کولے بوریشن سے کاروبار تو میرے
بغیر ہی ہوتا ہے۔"

"شاید وہ تمہارے امریکن لہجے سے متاثر ہوتے ہیں۔"

"چونکہ [illegible] بہت کچھ
کرنا پڑتا ہے۔"

"بہت کچھ!"

"ہاں، مجھے انہیں بتانا [illegible]
بالکل امریکن WAY میں!"

پروین اپنا پیگ ختم کر چکی تھی۔ [illegible] ایک
پیگ بنایا۔ اس کو دیکھ کر کمال نے بھی اپنا گلاس خالی کر دیا
کیونکہ اب آہستہ آہستہ اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ کمال پر کچھ
سنجیدگی طاری ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ
اب کیا باتیں کرے۔

"تم مجھے اپنے شوہر کے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں؟"

"یہی کہ وہ کیسے آدمی ہیں؟"

"کیسے آدمی؟ ارے جیسے سب بزنس مین ہوتے ہیں"

"ان کے ساتھ زندگی کا تجربہ کیسا رہا؟"

"تجربہ کچھ خاص تو نہیں رہا۔"

"کیوں؟ تلخ، ترش، شیریں، کچھ بھی نہیں"

پروین نے ایک لمبی سانس لی اور بولی۔

"اگر یہ تینوں لفظ تجربات کے لئے ہیں تو میں لفظ
تلخ کا استعمال کروں گی۔"

"وجہ؟"

اصل میں یوسف بھائی کے گھر جس منزل میں [illegible]
میں تجربہ صرف تلخ ہی ہو سکتا ہے [illegible]
طور پر۔ ان کے لئے میرا وجود صرف [illegible]
حیثیت رکھتا ہے جو ان کے جسم کی [illegible] پورا کرتا ہے۔

"یہ تو بڑی افسوسناک صورت حال ہے۔"

"ہاں۔ بالکل TRAGIC"

"لیکن یہ سب [illegible] تم گوارا کیسے کر رہی ہو؟"

"[illegible] اب آئینہ دیکھ سکوں گی۔"

"میں سوچتی تھی تو اس صورت حال کے خلاف ضرور بغاوت کروں گی۔"

"بغاوت!" وہ چلانے کے انداز میں بولی۔ اس کی آواز میں کھرا پن تھا۔ "اس سے زیادہ بے معنی لفظ دنیا میں کوئی نہیں ہے۔" اس نے گلاس میں بچی ساری شراب حلق کے نیچے اتار لی۔ پھر کچھ لمحوں تک آنکھوں کو بند کرکے ناک کے اوپری حصہ کو انگلیوں سے دباتی رہی۔ پھر بولی "میں اپنے زمانے کی تمام باغی لڑکیوں کے انجام سے واقف ہوں۔ وہ کتنی گرمی گرج کے ساتھ انقلاب زندہ باد کے نعرے لگایا کرتی تھیں۔ آج وہ کیا کر رہی ہیں۔ کچھ تو تھک ہار کر اسٹیبلشمنٹ کا جزو بن چکی ہیں۔ کچھ نے بہت ہاتھ پیر مارا تو کسی سوشلسٹ ملک کے سفارت خانے میں RECEPTTONIST ہو گئیں۔ کچھ کسی کالج یا یونیورسٹی میں لیکچررشپ پا کر مطمئن ہو گئیں۔ وہ تو خیر باغی تھیں اور بغاوت نہ کر سکیں۔ میں تو کچھ بھی نہ تھی۔ میں کیوں زندگی کی راہ میں گم ہو گئی۔ میری شخصیت اس طرح بکھر گئی کہ اب میں صرف گردن کے نیچے زندہ ہوں میں اب سوچ بچار کرنے سے معذور ہوں۔ مجھے تو اب اس کا احساس بھی نہیں رہا کہ زندگی میں فرسٹریشن کیا چیز ہوتی ہے۔"

اب رات کافی گزر چکی تھی۔ پروین چوتھا پگ اپنے لئے بنا چکی تھی۔ کمال نے چلنے کا ارادہ ظاہر کیا تو کہنے لگی "بیٹھو، ابھی بہت رات باقی ہے۔ کچھ اپنے بارے میں مجھے بتاؤ۔" کمال کو چپ دیکھ کر اس نے پوچھا:

"تمہارے کتنے بچے ہیں؟"

"تین۔"

"فیملی پلاننگ میں کون سا طریقہ استعمال کرتے ہو؟"

پروین چاہتی ہوگی کہ کمال خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں پر اس سے کچھ باتیں کرے اور کمال پر وہ ثابت کر دے کہ وہ سکس پر بھی بلا جھجک بات کر سکتی ہے

کمال خاموش رہا۔

پروین نے اپنے ماتھے اور آنکھوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرا۔ گردن کو ذرا دائیں اور بائیں موڑا۔ پھر اپنی دھوپائی آنکھوں سے کمال کی طرف دیکھتی ہوئی بولی:

"اچھا سچ سچ بتاؤ، تم مجھ پر کیوں عاشق تھے؟"

کمال نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"اگر اس وقت تم مجھے بتا دیتے کہ تم مجھ پر مرتے ہ تو میں ضرور تمہاری ہو جاتی۔"

کمال پھر چپ رہا۔

وہ کچھ جھنجلا کر بولی:

"تم میری باتیں سن کر چپ کیوں ہو جاتے ہو۔ کیا مجھے اب بھی وہی چھوٹی موٹی قسم کی لڑکی سمجھتے ہو جو پندرہ سال پہلے تھی۔ پہلے میں ضرور کولڈ رہی ہوں گی لیکن اب ہرگز نہیں۔ میرے ہاتھ چھو کر دیکھ لو۔"

اس نے اپنا داہنا ہاتھ کمال کے بائیں ہاتھ پر رکھ دیا۔ سچ مچ اس کا ہاتھ دہک رہا تھا۔ کمال نے اس کو غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ شہابی ہو رہا تھا ہونٹوں کے اوپری حصہ اور پیشانی پر پسینے کے ننھے بے نام قطرے ابھر رہے تھے۔ آنکھیں بند ہوئی جا رہ اس نے دو ایک بار اپنا ہاتھ کمال کے ہاتھ پر آہستہ آ پھیرا اور ایک بار ہلکے سے اس کے ہاتھ کو دبا کر کہا "ت کتنے دبلے پتلے تھے۔ اب کتنے توانا اور صحت مند ہو۔ تمہارا ہاتھ بھی کتنا گرم ہے۔"

اچانک وہ وہاں سے چلے جانے کے خیال سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پروین نے طنزیہ انداز میں کہا: (بقیہ

شمیم فاروقی

(جاں نثار اختر کے نام)

اس ایک شخص کی آنکھوں میں خواب کتنے ہیں
ہے ایک جسم اور اس پر عذاب کتنے ہیں

قدم قدم پہ مری پیاس کو سمندر ہیں
عجب سفر ہے کہ اس میں سراب کتنے ہیں

تمام عمر تعلق کا بوجھ کون سہے
اُسے کہو کہ چُکا لے حساب کتنے ہیں

بہت دنوں سے یہ خواہش ہے میں بھی آجاؤں
تمہارے شہر میں خانہ خراب کتنے ہیں

کلی کو چوم کے کانٹوں پہ بھی زباں رکھ دو
یہ اک گنہ تو ہے لیکن ثواب کتنے ہیں

یہ زندگی جسے کہتے ہیں سب پہیلی ہے
اسی سوال کے لیکن جواب کتنے ہیں

●●

(باقی کی نذر)

ذرا سی بات پہ مجھ سے اگر خفا ہے بہت
تو اس سے کہہ دو کہ میرا بھی دل دکھا ہے بہت

کبھی تو اس کو سمندر گلے لگائے گا
ندی کے واسطے اتنا ہی آسرا ہے بہت

کہیں چلو کہ جہاں پیڑ ہو نہ سایہ ہو
کہ اس دیار میں یادوں کا سلسلہ ہے بہت

اسی خیال سے ہم تھک کے لوٹ آئے شمیم
ہے ایک منزلِ موہوم راستہ ہے بہت

غزلیں

دھواں پھیل جائے گا چاروں طرف
نظر کچھ نہ آئے گا چاروں طرف

سبھی راستے بے جہت ہو گئے
کہاں کوئی جائے گا چاروں طرف

اندھیرا اندھیرا زمیں ہو گئی
اُجالا بھرائے گا چاروں طرف

رہے گا یہی روز و شب کا زوال
سے آزمائے گا چاروں طرف

کسی کو نہ بخشے گا ظالم سمے
نشانے لگائے گا چاروں طرف

تجھے پا سکوں گا نہ شاید کبھی
مرا مَیں ڈرائے گا چاروں طرف

کہیں گر کے مر جاؤں گا بے نشاں
نہ تو پھر بُلائے گا چاروں طرف

●●

دھواں سا بکھر جاؤں چاروں طرف
ہر اک شے میں بھر جاؤں چاروں طرف

توڑ دوں اپنے مَیں کا طلسمی حصار
ہوا سا گزر جاؤں چاروں طرف

رہا بند یوں اپنے ہی خول میں
کہ سب کو نظر آؤں چاروں طرف

جو ہو اب مرے روز و شب کا زوال
زمیں میں اُتر جاؤں چاروں طرف

نہ پھر وہ شبِ تار گھیرے مجھے
نہ پھر خود سے ڈر جاؤں چاروں طرف

کہاں لے کے آئی یہ موجِ اَنا؟
یہاں سے کدھر جاؤں چاروں طرف

عجب وا ہمے دل میں در آئے ہیں
نہ پھر خود ہی مر جاؤں چاروں طرف

●

شمیم فاروقی

... مثالِ صورتِ ارمان و آس ہے

سمٹے ہوئے وجود، بکھرتے ہوئے وجود
عالم تمام روکشِ صہبائے یاس ہے

اُجلے پرند، کالی فضاؤں میں کھو گئے
بوڑھی زمیں کا رقصِ مسلسل اُداس ہے

بجلی چمک کے تیرہ خلاؤں میں گم ہوئی
لمحات کے فغانِ غمِ دل کا پاس ہے

مضطر سمندروں میں نہاں شہرِ آرزو
پیمانِ درد، ذوقِ تمنا کو راس ہے

تجھ کو ہے اعتبار، مرے شوق و درد کا
میرا شعور و ذوق، سراسپاس ہے

خوشبوئے جسم، پرتوِ رخسار، عکسِ لب
شاید ترا خیال کہیں آس پاس ہے

●●

زمیں کی بات ستاروں سے صبح کر کہہ دو
اگر ہو جرأتِ گفتار بے خطر کہہ دو
ہر ایک لمحہ، لہو رنگ شمع بن جائے
سحر کی بات، شبِ تار سے اگر کہہ دو
کبھی تو کوئی چلا آئے گا ہی مثلِ بہار
جلائیں نغموں کی قندیل معتبر، کہہ دو
تمہارے جسم کی مے، سرد ہو گئی ہو تو
ہر ایک قطرے کو تم میری اک نظر کہہ دو
چلو یہ مان لیا، تم ہو رشکِ [illegible]
مری حیات کو مہکا ہوا [illegible]
خمارِ چشم سے کر تر لگے [illegible]
سیاہیوں کو اجالا تو [illegible]
نشانِ منزل و رہ پوچھیے [illegible]
ہر ایک موڑ پہ میں درد کے شجر [illegible]
ہر ایک گام پہ آدھے [illegible]
یہی ہے رسم تو ان کو ہی تم [illegible]
شکستِ عزم کے تیور کچھ اور ہو [illegible]
سکوتِ سنگ کو یوں چاہو تو شرر کہہ دو

عشرت ظہیر

ہم کولتا ر کی سڑک پر بے تحاشا دوڑ رہے تھے
گے تھا اور وہ میرے پیچھے۔ اس کی رفتار
لمحہ بہ لمحہ میرے نزدیک ہوتا جا رہا
جھلی۔ سڑک کی سیاہ چھاتی
تھی۔ جسم پسینے سے تر تھا۔ اور
ٹپک رہے تھے۔
ٹھوکر کھائی اور گر پڑا۔

سے گزرتا چلا گیا۔!
جھٹکے سے مجھے کھڑا کر دیا۔
قریب سے گزر رہے تھے۔ میں

پ ہی اس کے آگے بھاگ رہے
وہ کسی کو کچھ نہیں کرتا......
سمجھتے نہیں اس مردوی میں بھی الف
نہیں کس ذہنی رو کے تحت ایک دم
نا شروع کر دیتا ہے... اکثر لوگ ڈر

وہ میرے ساتھ چلتے چلتے دائیں جانب مڑ گئے
اور میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ عجیب سی خفت اور بے چارگی
محسوس کر رہا تھا۔ مارے شرم کے میری نگاہیں ریلوے
اسٹیشن جانے والی اس سڑک پر گڑی جا رہی تھیں۔ آگے
کیا تھا؟ کون کدھر سے آ رہا تھا؟ اور کدھر جا رہا تھا؟
مجھے دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ بس آگے بڑھتا چلا
جا رہا تھا۔

دفعتاً مجھے رک جانا پڑا۔ وہ میرے سامنے کھڑا
مجھے گھور رہا تھا۔ میرے سارے بدن میں ایک برقی لہر سی
دوڑ گئی ...... اور جب میں نے اس سے کترا کر نکل جانا
چاہا تو اس نے روکا۔

"ماچس ہے؟"

نہ چاہتے ہوئے بھی، میں نے جیب سے لائٹر نکال کر
اس کی طرف بڑھا دیا۔ لائٹر کو وہ الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔
اور میں سوچ رہا تھا: لائٹر کی شامت آ گئی۔ پھر نہ جانے
کیا ہوا کہ میں نے اس سے پوچھ لیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"تمہارا کیا نام ہے؟" اس نے میرے سوال کو دہرا دیا

"مجھے حق کہتے ہیں۔"

"میں بھی حق ہوں۔"

میں نے سوچا، ایک نام ہے ہمارا مگر کتنا تضاد ہے

ہم میں!

قریب سے ایک بھرے بھرے بدن کی عورت گزر
رہی تھی۔ بڑی پرکشش تھی۔ ہاف سوئٹر ساری کے اندر
ساری سے باہر، اس کی وہ چال ...... میں اسے دور تک
دیکھتا رہا۔ اور جب میری نگاہیں لوٹیں ...... وہ مجھے
گھور رہا تھا۔ میں نے خود کو جھینپا جھینپا سا محسوس کیا اس نے
کان سے آدھ جلی بیڑی نکال کر سلگائی اور لائٹر میری طرف
بڑھا کر آگے بڑھنے لگا۔

لائٹر سلگا کر میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور اس سے پوچھا:

"تم رہتے کہاں ہو؟"

"کہیں بھی۔"

"کپڑے کیوں نہیں پہنتے؟"

"کیوں پہنوں؟"

"سب جو پہنتے ہیں؟"

"سب جو کریں وہ میں بھی کروں، ایسا کوئی اصول ہے؟"

"ایسا کوئی اصول تو نہیں ہے۔"

ٹریفک پر آمدورفت بڑھ گئی تھی۔ کوئی ٹرین آئی تھی۔ ہم باتیں کرتے اسٹیشن سے بہت قریب آ گئے تھے......

سامنے سے عورتوں اور مردوں کا غول آ کر مختلف سمتوں میں منتشر ہو رہا تھا۔ .... گلابی ساری میں ملبوس ایک عورت چلی آ رہی تھی ..... اس نے بڑے سلیقے سے ساری باندھ رکھی تھی۔ بدن کا ایک ایک خط نمایاں تھا اور.... میری نگاہیں اس کے پورے جسم کا محاصرہ کرتی ہوئی گویا پر جم سی گئیں ...... اچانک میں نے محسوس کیا ... دو آنکھیں مجھ پر بھی جمی ہوئی ہیں .... ! "وہ" اپنی آنکھوں کی برچھی سے مجھ پر وار کر رہا تھا .... میں نے بات بناتے ہوئے کہا:

"ہاں .... تو ہم کیا باتیں کر رہے تھے....؟"

"کپڑوں کے بارے میں ...."

"ہاں ..... آ ..... ہاں .. تم کپڑے کیوں نہیں پہنتے؟"

"آخر تم کپڑے پہنتے کیوں ہو؟؟؟"

اس کا سوال میرے دماغ سے بار بار ٹکرا رہا تھا۔ میں گھبرا گیا۔ کیا جواب دوں؟؟

"میں جانتا ہوں تم جواب نہیں دے سکو گے، سنو میں ہی بتاتا ہوں کہ میں کپڑے کیوں نہیں پہنتا، اگر میں کپڑے پہن لیتا تو [illegible] ہو جاتا۔ [illegible] جی چاہے گا، عورتوں کو [illegible] جانے کی [illegible] اللہ ...... اللہ ......"

"تعجب ہے!" میں نے [illegible] کہا۔ "میں تو کپڑے پہنتا ہوں، لیکن [illegible] کسی کا [illegible] نہیں چاہا، کسی عورت کو......"

اس کی آنکھوں کی [illegible] پھر میرے جسم [illegible] میں نے ایک عجیب سی [illegible] محسوس کی [illegible] قریب سے چھ سات آدمیوں کا ایک جتھہ گزر رہا تھا۔ ان میں ایک آدمی بری طرح زخمی تھا۔ سر سے خون ٹپک ٹپک کر کپڑے پر جم گیا تھا۔ شاید کسی سے جھگڑا ہوا تھا۔

میری نگاہیں پھر اس سے ٹکرا گئیں، وہ اب تک مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے اپنے بدن میں کپکپی سی محسوس کی۔

"تمہارا نام؟" اس نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا تھا۔

"حق۔"

"حق؟" اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"تمہیں عورت کو نگل جانے کی خواہش نہیں ہوتی؟"

"نہیں۔" میرا لہجہ کمزور تھا۔

"اچھا ایک کام کرو۔"

"کیا؟"

"اپنی آنکھیں بند کر لو اور ذہن کو خالی کر لو۔"

"ہوں ..... اچھا ..... پھر؟"

"اپنے آپ سے پوچھو، تمہارا کیا نام ہے؟"

میری آنکھیں بند تھیں اور میں سوچ رہا تھا۔ میں کون ہوں، میرا کیا نام ہے۔ پھر جب میں نے آنکھیں کھولیں وہ غائب تھا۔

●●

اکرام باگ

نہیں مسلسل خزاں

جسموں کا رستہ آنے دو
مَیں نے بھی بیجوں میں گچی نمو کو
اُدھیڑ دیا ہے

وہ الاؤ کسی اور کا نہیں
نہ ہی جھگڑوں پہ میرا حق ہے
تاروں پہ سفر کرتے قطروں کو نیچے آنا ہی تھا
لق و دق موسموں میں گھر نہیں
دیکھتا ہوں گنبدوں پہ سرکتی ہوئی شام کو
مَیں بھی بہتا ہوں یہاں وہاں
پتے پتے پر تھکن
ایسے کون روتا ہے جسم کے خاکداں میں
خزاں بھی مسلسل نہیں
دعائیں کہیں مگر گنہگاروں کی آواز
زمیں تا آسماں کتنی پردے لٹکے ہیں
اِسے ایسے سمجھو
منزلوں تک پہنچنے کے لئے فاصلوں نے نہیں،
اپنے پاؤں کے گیان نے ہمیشہ دھوکے دِئے ہیں

●●

کیا کہوں اے لاپتہ

اِس وقت مجھے مت چھوڑ اکیلا
ویسے ہی نڈھال محراب سے بھونکتا ہے۔
لمس سے لیس ایک کُتا
جتنے کچھ دروازہ ہیں
اُن میں ایک تو کھُلا رہنے دیا ہوتا
اب کیا کہوں وہی چاٹا ہوا قصہ
یہ صحیح ہے میرے ہانپ کر پہنچنے تک
تمام راستوں پر
شجر کہرام میں نیند کے گھونسلے اُگ گئے تھے
پھر بھی اگلے مرحلوں کے لئے
ہر احساس اکلوتا
ہے کہ نہیں؟
تُو کیا جانے اِس تگ و دو میں
جنگ ایک لمبی چُپ سے کھیلی نہیں جاتی
سامنے گھریلو پرندوں کے غول اور باہر
ہُنکار بھرتے گھر
کِس خون کا ماتم کروں بتا اے لاپتہ ●●

شہاب عراقی

صلح کل

یہ ان دنوں کی بات ہے
کہ جب دعا کا زور تھا کہ جب خدا کا زور تھا
کہ جب تصورِ حیات کی زمیں بچی نہ تھی
کہ جب وفا کمی نہ تھی

یہ ان دنوں کی بات ہے
کہ جب زمین و آسماں کی سرحدیں ملی نہ تھیں
کسی کے سر پہ دھوپ چھاؤں کی یہ گھن گرج نہ تھی
کسی کی آنکھ میں چھری کی تیز دھار وا نہ تھی
کسی کے فن میں آگ پھول کی طرح بجھی نہ تھی

یہ ان دنوں کی بات ہے
کہ جب خلوص عام تھا
کہ جب خلوص کی پکار پر خلوص بیکراں کے بے شمار قافلے
اُمڈ اُمڈ کے آئے تھے

اور اس کے بعد یہ ہوا کہ دائروں کی شکل میں
تمام سطحِ ارض پر وہ پھیلتے چلے گئے
گزر گئے بلندیوں کی ہر صلیب و دار سے
کہ ہر صلیب و دار رحمتوں کے پھول بن گئے
پھر اس کے بعد یہ ہوا
کہ 'صلح کل' کا زور ساری کائنات میں سما گیا
اور اس طرح سے کائنات بے مثال بن گئی
یہ ان دنوں کی بات ہے
کہ جب دعا کا زور تھا کہ جب خدا کا زور تھا

●●

تریاک

روشنی کو دائرے میں بند کر لو
سائے اس کی کھوج میں خود آئیں گے
اس گھڑی تم سانپ کی دو کینچلیوں کو
رینگتے سایوں کے پیچھے چھوڑ دینا
جب یہ اپنی پھول جیسی صورتوں میں
دائرے کے گرد چکر کاٹتی پرچھائیوں کو جذب کر
اس گھڑی تم ان کے مُردہ جسم پہ
دھوپ کی اک لمبی چادر ڈال دینا

●

غزلیں

موسموں کا [illegible] جب جسم زرد ہو جائیں گے
سرخ جوڑوں کو لیے رتھ میں فرشتے آئیں گے

چاندنی کی کشتی اتارو گہری نیلی جھیل میں
تارے ہی تارے نظر کے سامنے لہرائیں گے

نرم ریشم کے نہ مجھ پر تھان یوں پھیلاؤ تم
میرے خوں میں رینگتے کیڑے انھیں کھا جائیں گے

آؤ دونوں گھومیں سڑکوں پر برہنہ ساتھ ساتھ
یہ نہیں وہ حادثے جو سنسنی پھیلائیں گے

اس گلی سے بھاگ نکلو جس قدر بھی جلد ہو
شام ہوگی تو مکاں کے سائے پر پھیلائیں گے

بعد مدت کے ادھر رنگوں کے بادل چھائے ہیں
بھاپ اٹھتے جسم کو کچھ دیر تو نہلائیں گے

خوف و دہشت کی چٹانیں ہیں اگر حائل تو کیا
تم کہو تو جسم کے اس پار بھی ہم آئیں گے

مرنے والے میں رمق باقی ہے جب تک زیست کی
سر کے اوپر غول چیلوں کے شفق منڈلائیں گے

●●

نیم کے درختوں سے چاندنی جب آئے گی
ایک گاڑھی کڑواہٹ گھر میں پھیل جائے گی

جلی فاختہ کے پر رات جب دبائے گی
کچھ زمیں پہ ٹوٹے پر اپنے چھوڑ جائے گی

نرم ہے بظاہر وہ جیسے آبی چٹانیں
جیسے جیسے بھیگے گی سخت ہوتی جائے گی

گیلی گیلی مٹی کی باس ہے ہواؤں میں
آج سوندھی مٹی پر نیند خوب آئے گی

سرخ تتلیوں کے پر جب بدن کو ڈھک لیں گے
چپکے سے کوئی خواہش دل میں رینگ آئے گی

کھڑکیوں کے پردوں سے سرسراہٹ آنے دو
یہ ہوا تو پاگل ہے یونہی آئے جائے گی

جذب کر لے ہونٹوں میں ورنہ دونوں گھر کے بیچ
بات آج کی تیری سیڑھیاں بنائے گی

چھوڑ دو جزیرہ یہ ورنہ ناؤ یادوں کی
موج خوں چڑھے گی تو راستہ نہ پائے گی

آسمان کے نیچے کالی کالی سڑکوں پر
آج میری پرچھائیں میرا خوں کرائے گی

●●

"اور تمہیں یہ بھی یاد ہے کہ میں نے بھی تم سے ایک بہت بات کہی تھی؟"

"کیا؟"

"یہی کہ تم شادی کرو۔ میں تمہاری شادی دیکھنا چاہتی ہوں۔ تمہیں دولہا بنا ہوا دیکھ کر، تمہارے سہرے کی لڑیاں چوم کر اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو ٹھنڈک دینا چاہتی ہوں۔"

"اور تمہیں میرا جواب بھی یاد ہو گا؟"

"ہاں۔ طنز آمیز سا دینا کسی سوال کا معقول جواب نہیں ہوا کرتا۔"

"یقیناً نہیں ہوتا مگر تم نے میرا مدعا سمجھ لیا تھا۔"

"ہوں ......" کہاں تو نادیدہ توشی نے ہی تھا، مگر نکلا سدھیر کے منہ سے۔ اور اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ پیش نظر وہی بیابان تھا۔ وہی سناٹا، وہی خاموشی، وہی خلا، وہی قلب و ذہن کو احساس تنہائی سے متزلزل کر دینے والی ویرانی۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنا منہ ڈھانپ لیا تاکہ تاحد نظر پھیلا بیابان دکھائی دے بھی تو پیش نظر نہ ہو کر بھی پردہ ہو اور کاٹ کھانے کو نہ آئے۔

آنکھیں موندتے ہی توشی پھر سامنے تھی۔ اس کی پریشان اشکبار آنکھیں، بکھری ہوئی زلفیں، اترا ہوا چہرہ۔

"توشی تم نے میری بات نہیں مانی نا۔ شباب کی ایک لغزش تمہاری زندگی برباد کر کے رکھ گئی۔ تم کیا سے کیا ہو گئیں؟ تم نے آسو توش سے شادی کر لی صرف اس لئے کہ وہ ایک بار تمہارے قریب آ کر تمہاری زلفوں سے کھیل گیا تھا۔ صرف اس لئے کہ ایک بار اس کے ہونٹوں نے تمہارے گرم ہونٹ چھو لئے تھے۔ بس صرف اسی لئے نا۔ ورنہ تم اس سے محبت نہیں کرتی تھیں۔ اس کی ہر بات سے تمہیں بناوٹ کی بو آتی تھی۔ تمہیں لگا کرتا تھا کہ اس کی محبت نمائش بھر ہے۔ وہ صرف تمہاری جوانی اور تمہارے حسن کا شیدائی ہے۔ اور یہی دیوانگی، یہی نفسیاتی خواہش اسے مجبور کرتی رہی کہ وہ تم سے شادی کرے۔ تم چھپتی ضرور تھیں۔ شادی سے پہلے کے ہر بندھن کو تم نے توڑ نا ضرور چاہا تھا۔ مگر وہ ایک سعی ناکام تھی۔ تم سے کچھ نہ ہو سکا اور آخر تم نے آگ کی لپٹوں کو گواہ کر لیا۔"

اور پھر تم نے مجھے، میری قربت کو، میری محبت کو، میرے دیس کو، میری دھرتی کو، میرے آسمان کو، میرے وطن کے ذرے ذرے کو خیرباد کہہ دیا۔ اس لئے کہ تمہارا دادا یہ سمجھتا تھا کہ میرے ملک میں تعلیم یافتہ انسان کی قدر نہیں ہے۔ اس کے دل و دماغ پر افریقہ سوار تھا۔ تم بھی اسے نہ سمجھا سکیں کہ جس ماں کا دودھ پی کر وہ پروان چڑھا تھا، جس ماں کا لہو اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا اس ماں کو اس کی۔ اس کے علم کی اس کی تعلیم کی ضرورت تھی۔ اور میں ... ... میں نہ معلوم کس ان کہے سوال کا جواب لینے کے لئے یہاں چلا آیا ہوں۔"

"شباب ......" سدھیر چونک گیا۔

"ہوں!" اس نے چہرے سے رومال ہٹایا۔ آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ سامنے وہی نیپالی چھوکرا کھڑا تھا جو اس ہوٹل میں بیرے کا کام کرتا تھا جہاں سدھیر مقیم تھا۔ اور جسے ایک گھنٹہ پہلے اس نے خط دے کر توشی کے پاس بھیجا تھا۔ اس سے ملاقات کا وقت اور مقام طے کرنے کے لئے۔

"کیا بات ہے موتھو رام؟"

"شاب بی بی جی نے یہ چھٹی دی ہے۔"

"وہ خود نہیں آئیں؟"

"جی نہیں۔" اور موتھو رام نے خط سدھیر کی جانب بڑھا دیا۔ لائٹر جلا کر سدھیر نے خط پڑھا اور اسے لائٹر کی لو کے حوالے

(بقیہ ص ۱۷۰)

دو نظمیں

سیّد احمد شمیم

۱

انگلیاں
اوس کے نرم قطروں میں اپنی
بھگو کر
اگر چاٹتی تم رہو گی
کبھی تشنگی کا مداوا نہ ہوگا
کہ یہ تشنگی
اپنے اندر کی
جلتی ہوئی آگ کا روپ ہے
بجز موسلا دھار بارش
بجھی ہے
نہ یہ بجھ سکے گی ــ!

●●

۲

نیلے پیلے
[illegible]
رنگوں کی بارش میں بھیگا
میں اکثر
سوچا کرتا ہوں
جب یہ بارش تھم جائے گی
تب کیا ہوگا؟
جسم کے اندر
برفیلی لہریں دوڑیں گی

چاروں جانب جال بچھائے
اک بھیانک تاریکی ہوگی
انت
اننت
ایسا سناٹا
جس کا کوئی نام نہیں ہے!!

●●

ن بشیر

غزلیں

زباں سے لفظ جو بولا گیا تھا
کئی کانٹوں میں وہ تولا گیا تھا

کسے معلوم تھا میں کھِل اُٹھوں گا
مجھے کیچڑ میں جب گھولا گیا تھا

جہاں پر ڈھیر سوکھی گھاس کے تھے
وہیں پر آگ کا گولا گیا تھا

مزا تھا اک فرشتے کو سڑک پر
کناروں سے رِشی بولا گیا تھا

مری سگریٹ تو مرے ہاتھ میں ہے
ہوا کے ساتھ مرغولا گیا تھا

مرا ہی گڑگڑا کر بھاگ نکلا
دُر احساس جب کھولا گیا تھا

••

نہ ہو زندگی سے پریشان رکھ دے
گناہوں کی آتش پہ ایمان رکھ دے

دکھا دل میں کتنی طرحداریاں ہیں
لبِ سُرخ کی میٹھی مسکان رکھ دے

قدم بہ قدم آپ مٹتا چلا جا
نگر کے خداؤں پہ احسان رکھ دے

مہک جائے پھر ریگِ صحرائے ہستی
مری میز پر کوئی گلدان رکھ دے

کہانی سُنا کر پریشان کیوں ہے
"مزیدار غپ" اس کا عنوان رکھ دے

حسن چٹکیوں سے نمک پاشیاں کیا
کسی دن اُلٹ کر نمکدان رکھ دے

••

غزلیں

روحی قریشی

نفس نفس میں سُلگتی ہیں حسرتیں کیسی
ترے سلوک سے لیکن شکایتیں کیسی

سبھی کو مصلحتوں نے بنا دیا بہرا
مری صداؤں کو سمجھیں ورنہ حسرتیں کیسی

ہوں اپنے دور کی رنگینیوں میں گم کب سے
یہ آئینہ مجھے بخشے ہے حیرتیں کیسی

زمانہ ریت کے محلوں کے غم میں ہے اب تک
اگرچہ دھنس گئیں مٹی میں رفعتیں کیسی

جو مجھ پہ وقت پڑا ہے تو ساری بستی میں
بدلتی جاتی ہیں لوگوں کی صورتیں کیسی

نہ جانے قید ہوں زندانِ وقت میں کب سے
صدی کی طرح گذرتی ہیں ساعتیں کیسی

نکھرتی جاتی ہیں رہ رہ کے دل میں کچھ یادیں
بکھرتی جاتی ہیں صحرا میں نکہتیں کیسی

بس ایک گردشِ پیہم ہے لطف ہے ورنہ
ملے زمین کو راحت، تو راحتیں کیسی

نہ اختیار تجھے اب، نہ اختیار مجھے
بس ایک بھول نے بدلی ہیں قسمتیں کیسی

ہمارے حصے میں گم نامیاں رہیں راہی
مگر زمانے کو دیں ہم نے شہرتیں کیسی

پرویز ...انی

تنہا سا ہر اک سمت سے نقطے کی صدا ہوں
میں اپنی ہی آواز کی تصویر بنا ہوں

پروانے کے مانند جلا جب بھی کسی روز
تاریک خلاؤں کا فسوں توڑ گیا ہوں

باہر سے بہر کیف ہوں میں نور کا ہالہ
اندر سے مگر دیکھو تو تاریک خلا ہوں

اس شہر کی ویرانی سے گھبرایا ہوا میں
سائے سے بھی خود اپنے ہی اب آزردہ ہوں

آسیب پنپتے ہیں جہاں کرب کے اکثر
صدیوں سے اسی شہر کے ملبے میں چھپا ہوں

اپنے ہی خیالات کی گہرائی میں ڈوبا
نقطے پہ کھڑا اپنا نشاں ڈھونڈ رہا ہوں

آئینہ احساس نے دکھلا نہ کبھی ...
پرویز کئی بار میں خود سے ملا ہوں

مائی

انیس رفیع

سر پہ ایک ٹوکری ہے۔ بانس کی بنی ہوئی ہے شاید۔ بانس کی ٹوکری ہلکی اور پائیدار ہوتی ہے۔ بانس جب کٹ جاتا ہے تو اس کی ٹوکری بن جاتی ہے۔ ٹوکری بنانی ہو، بچی بنانی ہو تو بانس کاٹنا پڑتا ہے۔ لیکن بنسیلے ہاتھ تو نحیف اور سرد ہیں۔ [illegible] کس طرح کاٹے۔ کوئی بھی بانس کاٹ کر ٹوکری بنانے والا۔ [illegible] سڑک کے پیپ بھٹے تارکول پر قدم [illegible] بھٹک جاتی ہے۔

"کون ہو تم ـــــــ؟"

"[illegible] سکتے ہو ویسے بڑھی تو ہوں ہی۔"

"وہ تو ہے، مگر شناخت؟"

"میرے [illegible] اپنے کپڑے کرنا تم خود [illegible]"

"تم بہت دل چسپ ہو مائی۔ تمہارے سر پر رکھی ہوئی ٹوکری میں کیا ہے؟"

"تمہارا سر...... کچھ نہیں ہے۔"

"میں تمہیں سچ بولنے کا حکم دیتا ہوں مائی، ورنہ تمہاری تلاشی لینے پر مجبور ہوں گا۔"

میں اپنے پیچھے جو کچھ چھوڑ آئی ہوں اسے دُہرانا نہیں چاہتی مگر میرے سامنے جو آسمان ہے اس کے نیچے "سچ" سے بڑا کوئی جھوٹ نہیں۔ جھوٹ بولنے کا حکم دو میں سچ کہہ دوں گی۔!"

"اچھا جھوٹ ہی سہی۔"

"ٹوکری میں گوبر ہے۔" ٹوکری اُتار کر سامنے رکھ دیتی ہے۔

"اس کا کیا کرو گی؟"

"چولھے جلاؤں گی۔ اس کے بغیر چولھے سرد ہیں تم پیاس سے گدھ اور بُو سے عقاب معلوم پڑتے ہو۔!"

"بُو کیسی بُو۔"

"تمہارے بدن سے دیرتا اور گیہوں کے دانوں کی خوشبو آ رہی ہے۔"

"دیرتا۔ خوشبو! یہ سب فراڈ ہے دغلبازی ہے۔ میری ہڈیوں پر جو گوشت کی تہیں دیکھ رہی ہو یہ بھی فراڈ ہے۔ یہ گوشت نہیں ہے بارود کی تہیں ہیں۔ میں وارہیڈ ہوں۔ اگر سونگھ سکو تو قریب سے آکر سونگھو۔ میرے قریب آکر ہلاک ہو جاؤ گی تو یہ ذمہ داری تمہاری اپنی ہوگی۔ آؤ مائی قریب آکر مجھے ایک بار سونگھ لو۔"

"تم بہت جذباتی ہو، اچھا یہ بتاؤ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"اسٹین گن۔"

میں صرف اپنی بھاشا جانتی ہوں۔ کچھ ایسا کہو کہ میں بھی

سمجھ سکوں۔ اچھا تمہاری پیٹھ پر کیا ہے؟"
"پُش بٹن۔"
"ہاتھ میں اور پیٹھ پر کہیں بھی تمہاری اپنی کوئی چیز نہیں
میں نے کہا تاکہ کچھ ایسا ہو کہ میں بھی کچھ سمجھ سکوں۔"
"اچھا اب اپنی بھاشا میں جواب دوں گا۔"
"تمہیں یہاں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ تم گیہوں کے
دیش سے آئے ہو۔ ہمیں گیہوں کی ضرورت تھی۔ دھان کی
فصل تو بالکل برباد ہوگئی۔"
"دھان کی فصل کے بعد ہی گیہوں کی فصل آتی ہے۔
ہم یہ فصل کامیاب کرادیں گے۔"
"ہاں ـــ اور گیہوں کی فصل کے بعد پھر دھان کی
فصل آتی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کون فصل کب برباد
ہو جائے۔ سب اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔"
"شاید تم ٹھیک ہی کہتی ہو!"
"اچھا یہ بتاؤ کہ یہاں تم کس لئے آئے ہو جب کہ ہم
ایک دوسرے کو پہچانتے بھی نہیں۔"
"مجھے مُکتی دُوت کہا جاتا ہے۔ تمہیں مکت کرانا
ہے۔"
"مگر کس سے ـــــ؟" (تم لباس سے
گدھ اور بُو سے عقاب معلوم پڑتے ہو۔ تمہارے بدن سے
ویرتا اور گیہوں کے دانوں کی خوشبو آرہی ہے۔)
ایک گونج ـــــ
"ذرا جلد بازی میں ہوں۔ چلوں گا مائی۔ میری پیٹھ
کا پُش بٹن کوئی دبا رہا ہے۔"
"میں بھی جلدی میں ہوں۔ مجھے بھی بانس کے جنگل کے
اس پار جانا ہے۔ میرا آدمی جنگل کے بانس کاٹ کر خوبصورت
کھولی بناتا ہے۔ یہ ٹوکری بھی اسی نے بُنی ہے۔ اس کی کلہاڑی
بانس کی جڑوں پہ ہوگی۔ بانس کے گرتے ہی وہ آکر روٹی
مانگے گا۔ اور میں اب تک گوبر ہی اکٹھا کر رہی ہوں۔ ذرا
ٹوکری سر پہ رکھ دینا۔"
"اچھا مائی تمہاری کوئی اولاد نہیں ـــ؟"
"ہیں ـــ ایک بیٹا، ایک بیٹی۔"
"تو پھر تم اتنا کشٹ کیوں کرتی ہو؟"
"وہ لوگ اپنا دھندا کرتے ہیں۔"
"کیا دھندا کرتے ہیں ـــ؟"
"رنڈی اور بھڑوے کا۔"
"کیا ـــ؟"
"ہاں یہ سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ بھی نہیں۔"
"کہاں کرتے ہیں یہ دھندا؟"
"اور کہاں ـــــ جنگلے میں۔"
"تم مجھے ان دونوں کا پتہ دو۔ ان سے مل کر انہیں
درست کرنے کی کوشش کروں گا۔"
"اس کی ضرورت نہیں۔ تم ان سے مل چکے ہو۔"
"مائی!"
"دیکھو کوئی تمہاری پیٹھ کا "پُش بٹن" دبا رہا ہے۔
مجھے بھی چولھے کی آگ جلانی ہے، الوداع!"

اور وہ بڑھیا گوبر کی ٹوکری سر پہ لئے بانس کے جنگل
میں گم ہوگئی۔ اور کسی کی پیٹھ پر پُش بٹن دبتا رہا۔ اور بادل
لُو بانس کے جنگلوں کی جانب لپکتی رہی۔ ●●

اپنی تخلیق
کے اختتام یا آخری صفحہ کی
پشت پہ اپنا پتہ ضرور تحریر
کریں۔ (ادارہ)

غزلیں

سیف سہسرامی

ڈوبتی رات کو ساحل سے اٹھا آہستہ
جاگتی صبح کا دے اس کو پتا آہستہ

ہو نہ جائے کہیں شرمندہ ترا حسنِ طلب
دستِ امید مری سمت بڑھا آہستہ

چور ہو جائے نہ پیڑوں کی انا کا شیشہ
برگِ آوارہ کو دھرتی سے اٹھا آہستہ

میں گلا موم ہوں بہ جاؤں گا پانی کی طرح
جسم کو میرے ذرا ہاتھ لگا آہستہ

چند لمحے کسی مصلوب سے بھی بڑھ کر گزرے
دن مری سوچ کا کچھ ایسے ڈھلا آہستہ

دیکھ مغرور چٹانوں سے نہ ٹکرا جائے
لا کے ساحل کو سفینے سے لگا آہستہ

خاک میری نہ بکھر جائے زمیں پر دیکھو
مجھ کو کاندھوں پہ اٹھاتا تو ذرا آہستہ

اس کی تیزی سے چٹانوں کو بھی شکوہ ہے مگر
ریگ زاروں سے تو گزری تھی ہوا آہستہ

سیف مٹی کی وہ گڑیا بھی بڑی نازک تھی
ہاتھ جب میں نے لگایا تو کہا آہستہ

ساجد اثر

ساتھ ہو تم مگر اکیلا ہوں
واقعی، حل طلب معمّہ ہوں

جس پہ سبزہ کبھی نہیں اگتا
میں وہی بدنصیب ٹیلہ ہوں

پت جھڑوں کے کٹھور گھیرے میں
ایک ننھا، اداس پودا ہوں

کاش مٹ جائے میری گمنامی
میں تہِ آب اک جزیرہ ہوں

حادثوں کا شکار ہو کر بھی
زندگی کو حسین کہتا ہوں

عیب اپنا نظر نہیں آتا
آنکھ ہوتے ہوئے بھی اندھا ہوں

پاٹ کر جبر کی خلیجوں کو
عافیت کے قریب پہنچا ہوں

مت کرو تم مطالعہ میرا
سرد آہوں کا اک صحیفہ ہوں

میری تکمیل فرض ہے تم پر
دوستو! وقت کا تقاضا ہوں

جو کہانی کی جان ہے ساجد
میں وہی بات بھول جاتا ہوں

فاروق راہب

تمام رات عجب بے بسی کا عالم تھا
وہ اپنی سانسوں کی سرگم سے تھا سراسیمہ

جھلستی دھوپ میں اس کو سکوں کہاں ملتا
بس ایک ضد تھی جو برگد سے وہ لپٹ بیٹھا

دھواں کی طرح بکھر ہی گیا فضاؤں میں
مرا وجود جو کل تک پڑا تھا ٹوٹا ہوا

تمام عمر جسے ڈھونڈتا رہا ہوں میں
ملا ضرور مگر موت کا سبب بھی بنا

وہ خود ہی شیشے کے گردوں میں آج جا بیٹھے
شعورِ آذری راہب نہیں جنھیں بھی ذرا

غزلیں

حسن رضا

اکھڑ ہٹاؤ، بہتر ہٹاؤ
پرانا ہوا، یہ کلنڈر ہٹاؤ

خلوص و وفا کے یہ پیکر ہٹاؤ
یہ چبھتے ہوئے تیر و نشتر ہٹاؤ

بسکتی ہیں جن میں کلرکوں کی روحیں
مرے شہر سے ایسے دفتر ہٹاؤ

کھڑا ہے جو گم سم نہ حرکت نہ برکت
یہ خاموش چہرہ یہ پتھر ہٹاؤ

مرے ذہن میں دیر سے چبھ رہے ہیں
جنون و خرد کے یہ کنکر ہٹاؤ

لگے جس سے ٹھوکر رضا ہے یہ بہتر
وہ رستے کا پتھر وہ رہبر ہٹاؤ

احترام اسلام اٹک

جب تک تنا کھڑا تھا تو اک سنگِ میل تھا
اب ٹوٹ کر پڑا ہوں تو پتھر ہوں راہ کا

میں سکہ بن کے جیب میں جب ان کی پڑ گیا
کھوٹا سمجھنے والے بھی کہنے لگے کھرا

سنجیدگی سے ملتا تھا لیکن نہ جانے کیوں
آئینہ دیکھتے ہی مجھے آج ہنس پڑا

جسموں کے جنگلات سے باہر نکل کے میں
خود کو تلاش کرتے ہوئے تجھ کو پا گیا

کہئے اسے کمالِ تجسس کہ بے جھجک
گمنام راستوں پہ بھی بڑھتا چلا گیا

[illegible]

پھرتا ہوں ایک سیپی کی چادر لئے ہو[illegible]
اے دوست تیرے شہر کا منظر لئے ہو[illegible]

حالات اگر دبوچ ہی جاتے ہیں ہر نفس
احساس ہے خودی کا سمندر لئے ہوئے

اے عمر تو نے مجھ میں کئی شیشے تراش[illegible]
بیٹھا ہوں کب سے شیشۂ [illegible] لئے ہوئے

ہوتے ہی صبح گوشے سے [illegible] سارا دن
آتی ہے شام ہاتھ میں خنجر لئے ہوئے

بقیہ: ملاقات

دیا۔ وہ بولا۔ "نہیں آ سکتی۔ میری مجبوری سمجھ لینا۔ میں
نہیں ہوں...۔ وہ شی کو دیکھ کر
کے بھاگا۔ ... تمہارے ماضی میں محفوظ پڑی ہے
ہارے پاس۔"
اور اس نے اٹھتے ہوئے مسکراتے کہا۔ "چلو ہمیں
لے چلو۔ ہم ہندوستان لوٹنا چاہتے ہیں!"
"ابھی شایب؟"
"ہاں ابھی۔ اسی وقت۔"

●●

بقیہ: اردو میں عربی، فارسی.....

۲۵۰۔ لَیْسَ الْاِنْسَانَ اِلَّا مَا سَعٰی
انسان جتنا ہی کوشش کرے گا وہ کامیاب ہوگا

۲۵۔ اَلسَّعیُ مِنِّیْ وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ
مجھے کوشش کرنی ہے پورا کرنا اللہ کا کام ہے

●●

بقیہ: فارسی نثر کے...

وجود میں آیا جس کو شاہی سرپرستی اور خصوصی مالی
اعانت حاصل ہے یہ ادارہ اپنے مقررہ مقاصد کے تحت
ایرانی فارسی نثر کی نشو و نما میں گراں مایہ خدمات انجام
دے رہا ہے۔

●●

بقیہ: بے چہرہ عورت

"تم کیسے فوجی ہو جو ذرا سا ہاتھ چھو جانے پر بھاگنے
کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہو۔"
کمال نے باہر کا رُخ کیا تو وہ دروازے پر
راستہ روک کر کھڑی ہو گئی اور قریب آنے پر لڑکھڑاتی
ہوئی اس پر اس طرح گر گئی کہ اس کے سینے کا سارا گداز
کمال کی باہوں میں سمٹ کر رہ گیا۔
کمال اس کو سہارا دے کر اس کے بیڈ روم میں
لے گیا اور اس کو اس کے بستر پر ڈالنے کی کوشش کرنے لگا
تو اس کی گرفت کمال پر اور مضبوط ہو گئی۔ چند لمحے وہ اپنے
آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔
کون این NO MANS LAND
پار کر چکی تھی اور اب G.O.B (گتھم گتھا کی لڑائی) پہ
اُتر آئی تھی۔

●●

فون: ۲۴۴

اعتماد اور بھروسہ کے لیے صرف

جنتا سمنٹ پائپ

قائم شدہ: ۱۹۵۶ء

کا نام یاد رکھنا کافی ہے

- پانی کی نکاسی ہو
- آب پاشی کا مرحلہ ہو

یا

- کلورٹس سیوریج

آپ کو جنتا سمنٹ پائپ ہی استعمال کرنا چاہیئے

ہمارے پائپ کی گورنمنٹ کے محکموں سے

جانچ ہو چکی ہے اور منظوری کی سند مل چکی ہے

زیادہ خریدنے پر حوصلہ افزا رعایتیں

ریلوے یا ٹرک کے ذریعہ آرڈر کی فوری تکمیل اب ہم بہتر طور پر کر سکتے ہیں کیوں کہ

۳۰ اگست ۱۹۷۱ء کو ہماری دوسری نئی فیکٹری بھی شروع ہو گئی

جنتا سمنٹ پائپ کمپنی، بیراگی، گیا

اور

جنتا سمنٹ پائپ کمپنی، بھرتولی اورنگ آباد
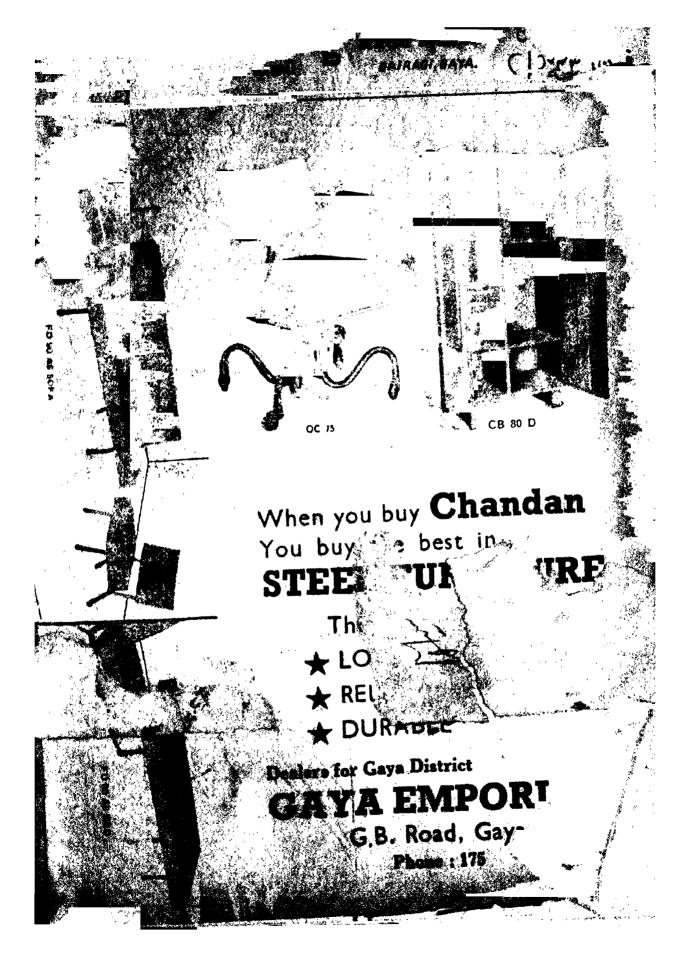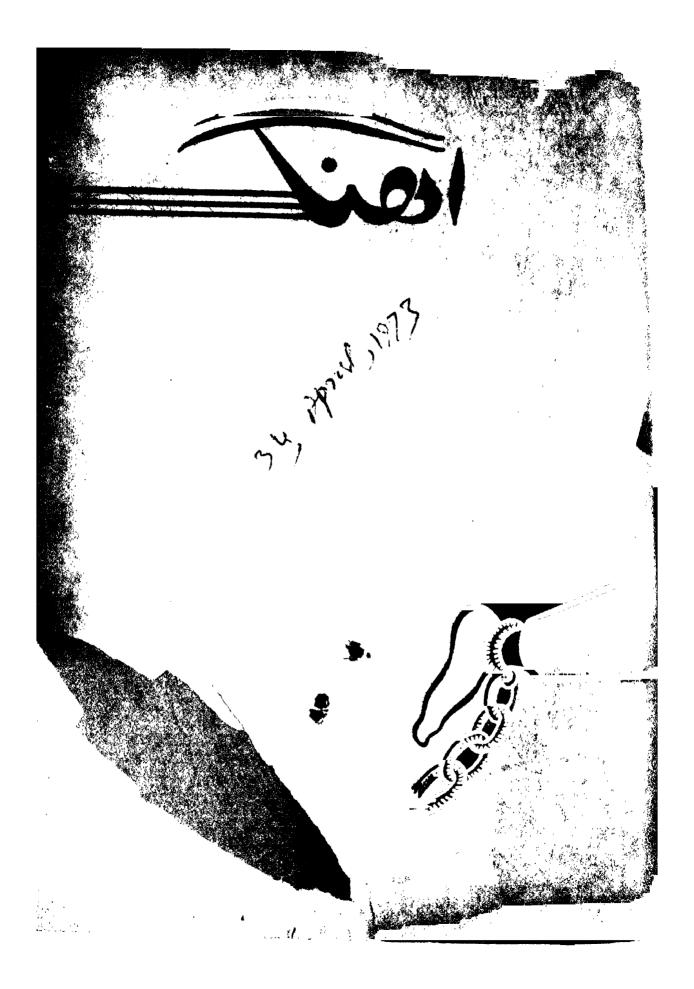
BAIRAGI, GAYA.
OC 75
CB 80 D
When you buy Chandan
You buy the best in
STEE UR URE
Th
★ LO
★ REL
★ DURA
Dealers for Gaya District
GAYA EMPORI
G.B. Road, Gay
Phone : 175

...ونس جگ جیون روڈ، گیا

شمارہ : ۳۴

اپریل ۱۹۷۳ء

۱ سال کے لئے ۱۲ روپے
۲ سال کے لئے ۲۲ روپے
۳ سال کے لئے ۳۰ روپے

...تر : بیراگی، گیا
...ع : ہندلیتھو پریس گیا
...ابت : قمر نظامی

فون
دفتر : ۶۶۲
رہائش : ۵۳

مرتبین

کلام حیدری پرکاش فکری

ممتاز شیریں کا انتقال

ریڈیو پاکستان سے ممتاز شیریں کے انتقال کی خبر ہندوستان میں بے حد صدمے اور قلق کے ساتھ سنی گئی۔

ممتاز شیریں اردو کی مایۂ ناز افسانہ نگار تھیں۔ اُن کا وطن بنگلور تھا جہاں سے انہوں نے 'نیا دور' نکال کر اردو میں ادبی رسائل کے وقار کو آسمان کی بلندیوں تک پہونچا دیا تھا۔ ممتاز شیریں اور نیا دور معیار اور وقار کے لیے اردو میں بے مثال ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد آپ مع اپنے شوہر جناب صمد شاہین' کراچی منتقل ہو گئی تھیں۔ کراچی سے بھی 'نیا دور' نے تخلیقی اور تنقیدی ادب کے اتنے سورج اُچھالے کہ اردو ادب کی تاریخ میں دونوں کا نام مہر تاباں کی طرح روشن رہے گا۔

انتقال کے وقت آپ کی عمر مشکل سے پچاس سال رہی ہو گی۔ یقیناً یہ عمر دنیا چھوڑنے کے لیے کم ہے۔ کیا پتہ اگلے برسوں میں اس بے حد ذہین فن کار کے قلم سے کیا کچھ اردو ادب کو ملتا۔

مختصر افسانے کی تکنیک پر سب سے پہلا مفصل اور بھرپور مقالہ لکھ کر ممتاز شیریں نے ادب کے بڑے بڑے جغادریوں کو مرعوب کر دیا تھا۔ اس مقالے پر مہ و سال کی گرد پڑ جانے کے باوجود اسے اردو تنقید میں سنگ میل کا درجہ دیا جاتا رہے گا۔

ممتاز شیریں کے افسانوں میں ترقی پسندی کی آندھیوں کے زمانے میں بھی اپنے آپ کی تلاش کا سراغ ملتا ہے۔ ادب ممتاز شیریں کی شخصیت کا جزوِ اعظم تھا۔

اردو کے افسانہ نگاروں کو اس موت پر ایسا لگا ہے جیسے کوئی اُن کا اپنا مر گیا ہے۔
ہم ممتاز شیریں کی یاد میں آہنگ کے اِس شمارے کو اُن کے نام معنون کرتے ہیں۔

● ●

”تنقید کے اصول بنانا، اگر واقعی انھیں اصول کہا جا سکے، اپنے انفرادی ذوق یا اپنی ذاتی پسند کی بات نہیں ہو سکتی۔ اصول تو اس لئے بنتے ہیں کہ ان سے دوسروں کی رہنمائی ہو سکے۔ یا کم سے کم راستے کے نشیب و فراز سے واقفیت حاصل ہو جائے، اپنی ذاتی پسند کے لئے اصول بنانے کی ضرورت نہیں۔ تنقید کی یہی اجتماعی حیثیت ہے جو دشواریاں پیدا کرتی ہے اور جس سے عہدہ برآ ہونا ہر نقاد کے بس میں نہیں ہوتا۔ اپنے ذوق اور وجدان کے سہارے کسی ادیب یا شاعر کی روح میں اتر جانا آسان ہے لیکن اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے جانا اچھے نقادی کا کام ہو سکتا ہے کیوں کہ وہ داخلی کیف پذیری اور لذت اندوزی کی ایسی نازک لکیر بناتا ہوا نہیں چلتا جو اس کے گزر جانے کے بعد مٹ جائے۔ بلکہ علم کی روشنی میں ایک شاہراہ بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہی اصول، اصول کہے جا سکتے ہیں جو صرف اصول بنانے والے یا اس کے چند ساتھیوں کے کام نہ آئیں بلکہ جو زیادہ سے زیادہ انسانوں کو روشنی دکھا سکیں، جن میں انجانی داخلیت اور ہر لمحہ بدلتے ہوئے وجدان ہی کے سہارے منزلیں طے نہ ہوں بلکہ جن میں تاریخ، منطق اور دوسرے علوم سے مدد لی جائے تاکہ نتیجہ میں غلطی کے امکانات کم ہوں۔
“

——— احتشام حسین ———

ہمارے فن کار......

جوگندر پال

فی الحال اورنگ آباد (دکن) میں رہتے ہیں۔ کبھی افریقہ میں بھی ہوا کرتے تھے، باقاعدگی سے دوستوں ساتھیوں سے ملاقات کرنے ٹور پر نکلا کرتے ہیں۔ بڑے انتظام سے افسانے لکھتے ہیں مگر کیا مجال کہ افسانے سے اِس "انتظام" کا راز جھلک جائے۔ تین سطروں سے لے کر ہزاروں سطروں کے افسانے لکھ سکتے ہیں، لکھتے رہے ہیں، آئندہ بھی لکھتے رہنے کا یقین ہے۔ افسانے پر جوگندرپال کا نام نہ لکھا ہو تب بھی نام کی چھاپ اتنی گہری ہوتی ہے کہ نام زبان پر آجاتا ہے۔

نظام صدیقی

الٰہ آباد میں رہتے ہیں۔ مقالے لکھتے ہیں تو پتہ لگتا ہے کہ مطالعے کا میدان کتنا وسیع و عریض ہے۔ اس لیے مقالے بھی طویل ہوتے ہیں مگر طوالت کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔ مغربی ادب میں انگریزی اور فرانسیسی سے براہ راست تعلق ہے اور گہرا۔ عالمگیر ادبی اصولوں اور نظریات کی تاریخ و تنقید تک بے تکلف دسترس ہے۔

زاہدہ زیدی

علی گڑھ یونیورسٹی میں ریڈر ہیں۔ کئی بہنیں ہیں اور سب ہی ادب میں چندے آفتاب چندے ماہتاب ہیں۔ انگریزی ادب پڑھاتی ہیں اردو میں شاعری کرنے کے علاوہ انہوں نے مضامین بھی لکھے ہیں۔ ترجمے بھی کیے ہیں۔

ع۔ رشید

پولیس کے بہت بڑے افسر ہیں۔ "توپ چانچی" (بہار) وطن ہے۔ مغربی بنگال میں مقرر ہیں۔ ہر طرح جدید ہیں اور اس سے زیادہ نفیس۔ شاعری کرتے ہیں اور اردو تنقید میں جدید نقادوں کی قابلیت کے مظاہروں پر کڑھتے ہیں۔

وحید الحسن

اینتھروپولوجی کے رسیا ہیں۔ چھوٹا ناگ پور ٹرائبل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں [illegible] پوسٹ پر
برسوں سے فائز ہیں۔ شاعری کرتے ہیں، بہت پہلے افسانے بھی لکھے تھے۔
بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ پرکاش فکری اور وحید الحسن [illegible]

عبد الصمد

پالٹیکل سائنس کے طالب علم ہیں۔ افسانہ نگاری سنجیدگی اور انکساری کے ساتھ کر رہے ہیں
ان کی چند کہانیاں ارباب نظر کے لیے پیش کی جارہی ہیں۔

صفدر

بمبئی میں رہتے ہیں، شاعری کی عمر زیادہ نہیں۔ لیکن ان کی شاعری ان کی عمر سے بڑی نظر آتی ہے

غلام مرتضیٰ راہی

علی گڑھ میں رہ رہے ہیں۔ انہیں اکثر شکایت رہتی ہے کہ رسالوں کے مدیر ترتیب میں انہیں جائز
مقام نہیں دیتے۔

نصر قریشی

الہ آباد میں پائے جاتے ہیں۔ سورج اور آہنگ میں خوب چھپے ہیں اور اس سے زیادہ چھپنے کا حوصلہ
ہے۔ بدلتے حالات کو غور سے دیکھتے ہیں مگر قدم آگے بڑھانے میں ہچکچاتے رہے ہیں۔

احتشام اختر

کچھ دنوں قبل مسلم یونیورسٹی کے ہر ہوسٹل میں دیکھے جاتے تھے۔ آج کل کوٹہ میں نظر آتے ہیں۔ گورنمنٹ
کالج میں لکچرار ہوگئے ہیں اب اطمینان سے شاعری کریں گے۔

عقیل شاداب

کوٹہ میں مل جاتے ہیں۔ بہت سوچ سمجھ کر شعر کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادبی ذوق کافی نکھرا ہوا
ہے۔ کمار شیو کی نظموں کا انہوں نے بڑی محنت سے ترجمہ کیا ہے جو آہنگ کے پچھلے شمارہ میں
چھپ چکا ہے۔

جھاڑیاں اب بھی منتظر ہیں

ناھدہ زیدی

گزرا تھا

کاروانِ شیشہ گراں

ہے یا شکستہ راہی ؟

توں پہ پھوٹتی شعاعیں

لال — نیلی — روپہلی

آگے ——

شیشہ گر ساربان

تمکنت سے مہار تھامے

. . . .

وان تو منزل سے جا ملا ہے

ان

محمل پہ جلوہ افروز ہیں — دراز

پہ ان کے دراز قد

دراز تر ہیں . . . .

شیشہ گری

چور ، چور ، بکھری ہے

راہوں میں

دینہ

ہوا میں تحلیل ہو رہی ہے

. . . .

اُداس راہی ——

تم جو پا برہنہ نکلے تھے ، دھرتی کے لمس کی آرزو میں ، چنچل

ہوا کی آغوش میں زندگی کی اساس پانے

دیکھو —

تمہارے قدم لہو لہان ہیں ، ہوا کے بوسے تمہارے تشنہ لبوں

کو مجروح کر رہے ہیں

وہ کون ہیں ؟ کیا تمہارے ساتھی ہیں وہ ، جنھوں نے اس شاہراہ

سے ذرا ہٹ کے رنگیں پلاسٹک کے خیمے لگا لئے ہیں

وہ کون ہیں ، جو پلاسٹک کے دبیز ملبوس میں پلاسٹک کی نقابیں

جو سنے ، اس دھج سے زخمی زمیں کے سینے پہ گامزن ہیں

شکستہ راہی ——

جو ہو سکے تو پاگل ہوا سے پوچھو . . . . . .

سیاہ جھاڑیوں میں کتنے فگار جسم . . . . . .

وہ سب جو نکلے تھے دھرتی کے لمس کی آرزو میں . . . .

جو ہو سکے تو زخمی ہوا کے سینے پہ اب —— یا

فگار دھرتی پہ اپنے لہو سے تم اپنا نام لکھ دو

سیاہ جھاڑیاں اب بھی منتظر ہیں —— ●●

تنبولا

وہ جو مثلِ موجِ ہوا شہر شہر گھومتے ہیں ....

اردو کے جدید ادیبوں میں ایسے کتنے ادیب ہیں، یہ ایک الگ سوال ہے ... جانتے ہیں کہ اس ملک میں جینے کی "... سانس کے آنے جانے کی نہیں، "بہ ہوش و حواس گاڑی ہانکنے کی"... جس میں مرنا بھی شامل ہے، دو علامتیں ہیں: کلکتہ اور بمبئی۔ جدید ادب کی تخلیق اور بقا کے لیے ہمیں ایک علامت کو جینا ہوگا اور ایک کو رد کرنا ہوگا

محمد حسن عسکری جنھوں نے مغرب کے ادب کو سمجھا ہے، کی میکارتھی ازم کے زمانے کی ایک تحریر ہے ....

"آج کل ہمارے ملک میں مغربی ادب کا ذکر کچھ بدتمیزی یا بداخلاقی کی علامت سمجھا جانے لگا ہے کیونکہ ہمارے نقادوں کے خیال میں ہماری زندگی اور روایت یورپ سے بالکل الگ ہے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے لیکن آج کل ہمارے درمیان ایک چیز مشترک ہے

اور وہ روایتوں سے بھی زیادہ سنگین ہے یعنی ایٹم بم سے فنا ہو جانے کا خطرہ۔ اگر ساری انسانیت کو ایٹم بم سے نیست و نابود ہونا ہے تو تنقیدی مضامین ہمیں اس موت سے نہیں بچا سکتے لیکن فنا ہونے سے پہلے ہمیں یہ تو سمجھ لینا چاہیے کہ آخر ایٹم بم ہمارے سروں پر کیوں گریں گے۔"

[انسان اور آدمی - اشاعت ماکتوبر ۱۹۵۲]

یہ اُس قدآور ادیب محقق کی تحریر ہے جو IDEOLOGICAL CONVICTIONS کی کمی کا رن ایٹم بم سے فنا ہو جانے کے خطرے کو روایتوں سے بھی زیادہ سنگین سمجھتا ہے اور یوں پندرہ بیس برسوں میں مرکھپ جاتا ہے کہ وہ یہ نہیں جانتا، ایٹم بم سے فنا ہو جانے کا خطرہ اسلامی ادب کی تحریک چلانے سے ٹلا نہیں کرتا۔ محمد حسن عسکری کی موت یقینی تھی۔ اگر کل وہ اپنا کم علمی ذہن دوبارہ پڑھے

ھے ہیں) کہ ان ۵ دہرسے تو ۱۹۷۱ بنگلہ دیش کی کہانی اُن
موت کا سبب بنی۔
ممکن ہے آپ چاہیں، کلکتہ، بمبئی اور بنگلہ دیش
جدید ادب سے کیا مقصد ہے ؟
میں آپ کو اطلاع دوں گا۔ آپ کا BRAIN
WAS ہو چکا ہے
ویت نام جینے کا اسلوب ہے۔ دیت نام جینے کی
ورش صورت ہے۔ دیت نام جدیدیت ہے۔ ویت نام
زادی ہے۔

۱۹۵۳ کے آس پاس تقسیم وطن کے ایسے اور تلملکانہ
حادث کے باوجود اور باوصف ہمارے پاس جینے کے ڈھیر
سارے سادھن تھے۔ ہماری نظروں کے سامنے ہمارے ہیرو
ی نیتا، ادبی شخصیتیں موجود تھے۔ سات آٹھ کٹھن برسوں
ں ہم نے دیکھا کہ امتحان کی آنچ تک جھیلنا ان کے بس کا
تھا۔ ان ہی دنوں زندگی کے ہر شعبے میں DEGENE -
RATION - کے دوران وہ تحریر نما پیدا ہوئی جس کا
کارلی ازم کے بعد کے REBEL WITHOUT
A CAUSE سے کوئی تعلق نہ تھا یعنی یہ تحریر
عالمگیر ناکامی کے سمبل یو این او کے عہد میں اپنے
پنے ڈربوں میں بند رہے۔ اور ہمارے پرانے ادبی ہیروز
تحریک کا ہینگ اوور ثابت ہوئے۔

ساتویں دہائی کے شروع میں MYTH - MAKING
ور روایتی ہیرو کی موت کے بعد جو تحریر سامنے آئی، وہ
ام نہاد LITRARY OUT PUT سے لگا نہیں
کھاتی تھی۔ اس اچھی بری تدریسے اجنبی تحریر کا جو تقسیم
ن کے بعد کی نئی نسل کی COMPLEX PRO -
BLEMS - کا احاطہ کرتی ہے، کا المیہ یہ ہوا کہ یہ
ن ATTENTION - GETTING VALUE ہوگئی

جس کا استعمال آج ادب دشمن، عوام دشمن عناصر کرتے
ہیں اور یہ REVOLUTION IN TEXTILE
کی طرح کی سوچی سمجھی سازش ہے۔
اب تھوڑا سا فساد ہو جائے۔
اڑتیس۳۸ برس کے جیف نٹل کا کہنا ہے۔ (کیا
آپ اپنے ہاں کے کسی ایسے اہم جدید افسانہ نگار کا نام
لے سکتے ہیں۔ جو پینتیس۳۵ برس سے کم کا ہو۔ یوں تو یہ بچی
سی بات ہے، پھر بھی میں آپ سے یہ بات پوچھنا چاہتا
ہوں):

"DAD WAS A LIAR. HE LIED
ABOUT THE WAR AND HE LIED
ABOUT SEX. HE LIED ABOUT
THE BOMB AND HE LIED ABOUT
THE FUTURE. HE LIVED HIS
LIFE ON AN ELABORATE SYSTEM
OF PRETENCE THAT HAD BEEN
GOING ON FOR HUNDRED OF
YEARS." (1968)

ترجمہ میں نے اس لیے نہیں کیا کہ محمد حسن عسکری کہتے ہیں، یہ
بڑا کٹھن کام ہے۔ غالباً اسی لیے ہمارے ہاں دوستوئیفسکی
اور ٹالسٹائی ترجمہ نہیں ہوئے۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ
یو ایس آئی نے بڑے بڑے مترجم پیدا کیے ہیں۔
ساتویں دہائی کے شروع کی ایک اردو کہانی کا جملہ سنئے
یہ جملہ نئی نسل کی اس زمانے کی ذہنی کیفیت کی طرف اشارہ
کرتا ہے: "ہمارے والدین ہماری ذلت کا باعث ہیں"۔
وہ لوگ جو دوسری جنگ عظیم سے ذرا سی بھی دلچسپی
رکھتے ہیں، جانتے ہیں کہ دورانِ جنگ سویڈن (جس نے
بعد میں فلاسفر فلم ساز انگمار برگمان پیدا کیا۔ جس نے

اور ایٹم بم کے خوف پر قیامت SEVENTH SEAL
کی انقلابی فلم WINTER LIGHT بنائی) غیر جانبدار
ملک تھا۔ سویڈن کی نئی نسل نے اپنے بزرگوں کو اب تک
نہیں بخشا ہے کہ ان کے نزدیک غیر جانب داری نازیوں کی
حمایت تھی اور آج نئی نسل کے جھنڈے تلے پورا سویڈن
ویت نام کی جنگ آزادی کی حمایت کرتا ہے اور ویت نام
سے بھاگے ہوئے امریکی فوجیوں کو پناہ دیتا ہے۔ لیکن اپنے
ہاں اب تک جدید ادیب دانستہ غیر جانب داری (مواد اکٹھا
کرنے کی حد تک ہی سہی) کے فریب کا شکار ہے۔ غالباً وہ کوئی
خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔

غیر جانب داری، بے عملی اور ماضی پرستی حکومت
کے بڑے کام آتی ہے اور جب دانشور بھی اس مرض میں مبتلا
ہو جاتا ہے، تب حکمراں چین کی نیند سوتا ہے۔

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اردو کے بیشتر جدید ادیب
نہ جی رہے ہیں، نہ ادب لکھ رہے ہیں بلکہ تنبولا کھیل رہے ہیں
تنبولا بنا کسی RISK کے بڑی نفع بخش LIGHT
ENTERTAINMENT اور REFRESHMENT
ہے اور جدید اردو ادب کے CREATIVE PROCESS
کا مکمل اظہار ہے۔ اعلان ہوتا ہے: TWO FAT
COLONALS اگر آپ جدید ہیں، IMAGINATIVE
ہیں، آپ فوراً اٹھاسی (88) کے ہندسے کو کاٹ دیں گے
اسی طرح اگر اعلان ہوتا ہے: LONELY۔ آپ فوراً
ایک کے ہندسے کو کاٹ دیں گے۔ اب صاحب! ایک
بھونپو بجے چلا جا رہا ہے اور دھڑا دھڑ جدید افسانے نکلتے
رہے ہیں جن کا نہ تو سماجی مسائل کے اقتصادی پہلوؤں سے
ہی تعلق ہے اور نہ عصری تاریخ کے تیز و تند عوامی بہاؤ سے۔
بھونپو کیا ہے؟ یہ وہی بھونپو ہے جو انقلابی عمل سے بچے
ہوئے الفاظ کو اشتہار بازی کے لیے استعمال کرتا ہے،

[illegible] کا پہلا
[illegible] جاذب [illegible]
ادب کے [illegible]
[illegible] DICTIONS — [illegible] کی کوشش
ہے، جو زندگی اور ادب کو [illegible] ہے اور
اس کا پرچار کرتا ہے اور یوں عمل اور تخلیق کو الگ کرنے
کی سازش میں شریک ہے۔ کیا [illegible] کسی [illegible] یا ر جان
انور سجاد سے افسانہ نگار کا کوئی [illegible] ہو سکتا ہے جس نے
اپنی سہولت کے لیے ایک افسانہ نگار کا انتخاب کیا ہے۔

"ویت نام اپنے ملکوں میں انسان کشی، میری موت
ہے۔ آزادی کی جنگ لڑنے والی، آزادی کی حفاظت کرنے
والی ہر قوم کے جن دوش بدوش ہوں۔ یو۔ ایس۔ اے جب بنگو
کی گردن میں پھانسی میرے سانس کو کاٹتی ہے۔ سلز کے بابوں
کی بھوک میرے پیٹ میں خلا پیدا کرتی ہے۔ لاطینی امریکہ اور
افریقہ ایشیا کی نو آزاد قوموں کی امیدیں، میری امیدیں ہیں
ان کے خوف، ان کی تشویش، میرے خوف، میری تشویشیں
ہیں۔ وہ سب مجھ میں زندہ ہیں، میں ان میں زندہ ہوں"

"مجھے سرگرمی سے اپنی ذات کی تخلیق، اپنے معاشرے
کی تخلیق میں حصہ لینا ہے کہ ہم نے ابھی عروج کی سیڑھی کے
رخ قدم نہیں اٹھایا۔ مجھے سیڑھی کا چناؤ بھی کرنا ہے کہ جس پر
آخری قدم کوئی نہ ہو، کوئی انتہا نہ ہو کہ زوال کا امکان پیدا
ہو۔ میں حقیقت کی تلاش، معنویت کی کھوج میں سیڑھیاں
چڑھتا ہی چلا جاؤں، ہر نیا قدم ساتھیوں کے قدموں کے ساتھ
مل کر اٹھے۔ جب ایک حقیقت کا سراغ ملے تو نئی حقیقت
کی جستجو شروع ہو جائے کہ حقیقت کی تلاش کا عمل انقلاب"

میرے نزدیک دنیا کے کرب انگیز منظر، جابہ جا آتش زدہ ہوئے

کی پلاسٹک سرجری صرف ایک طرح ممکن ہے اور وہ یہ ہے
[illegible] ایسے سوشلسٹ نظام کی دریافت ہو یا آخر پھر کہیں
[illegible] اور روس کی طرح اور دنیا کے چہرے کو ترشانے کے امکانات
[illegible] اکرے ...."

کہیں نئی حقیقت کی جستجو میں اور روس کے نظریاتی
[illegible]لافات سے تو نہیں شروع ہوتی - ؟

جو لوگ سیاست اور ادب کو الگ الگ خانوں میں
[illegible]ٹتے ہیں ، اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انور سجاد نے
[illegible] لکھا تھا :

" اس سازش میں تمہارا کوئی حصہ نہیں کیونکہ میں تمہیں
[illegible]ہاری کہانیوں کے حوالے سے بھی جانتا ہوں ۔ "

میں نے اُدھر کے افسانہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے
[illegible]کھا تھا :

" اُدھر انور سجاد ، خالدہ اقبال ہیں جنھیں اب
[illegible]سانہ نگاری کے علاوہ عملی کام بھی کرنا پڑے گا ورنہ فوجی ڈکٹیٹر
[illegible]پ انھیں ڈس لے گی ۔ "

یہ جملہ بنگلہ دیش کی جنگ آزادی سے تقریباً دو برس
[illegible]لے لکھا گیا تھا ۔ انور سجاد کے الفاظ اور انور سجاد کا
[illegible]سٹیتھواسکوپ انور سجاد سے لڑ رہے ہوں گے ۔ مجھے اس کا
یقین ہے ۔

جدیدیوں کے وہ سردار جو ہاتھی دانت کے ٹاور میں
(کرشن چندر کی بات صحیح تھی لیکن گھپلا یہ ہو گیا کہ وہ اپنی بات
QUALIFY نہیں کر پائے تھے) بیٹھ کر کہہ رہے ہیں ۔
(اور کریڈیٹ لے رہے ہیں) کہ پاکستان کے ترقی پسند
بنگلہ دیش کے مسئلہ پر خاموش ہیں جبکہ پاکستان کے جدید
ادیبوں نے مظالم کی مخالفت کی ہے ، یہ ایک اور سازش ہے
پاکستان کے جن جدید ادیبوں نے بنگلہ دیش کے عوام پر

توڑے جا رہے مظالم کی مخالفت کی ہے ، ان کا ہندوستان
کے جدید ادیبوں سے کوئی سمبندھ نہیں ہے کہ پاکستان
کے وہ جدید ادیب ایک سیاسی نظریے میں یقین رکھتے ہیں
اور یہاں کے جدید سرداروں کا مسلک اب ترقی پسند
بہروپیوں کی طرح سماجی مرتبہ حاصل کرنا ہے ۔

ہماری زبان کو بھی حکمرانوں نے ہمارے ہی ہاتھوں سے
ختم کیا ہے ۔

اگر اُردو بولنے والے ، اُردو لکھنے والے اور
اردو پڑھنے والے صرف دس منٹ کے لیے ، صرف دس
منٹ کے لیے غالب کو بھول جائیں ، تو کیا ہو ؟ آپ نے کبھی
سوچا ہے ؟ یہ دس منٹ حکومتِ وقت کے لیے مصیبت
بن جائیں گے کہ ان دس منٹوں میں ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے
ہماری زبان کا اس جمہوریت میں قتل کیا گیا ہے اور ہمیں
قاتل کی گردن مارنی ہے ۔ ہماری جذباتی تسلی کا رن اب
ہماری عظمت کا سمبل لوہے اور سمنٹ کی شکل میں ہماری زبان
کی چھاتی پر کھڑا ہے ۔

" میں پاگلوں کی طرح بول رہا ہوں ۔ تم سوچ رہے
ہوگے کہ بے ربط ، مہمل ، واہیات جملے ، یہی کچھ میری
زندگی میں باقی رہ گیا ہے .... پیارے ! یہ میری زبان
ہے جو میری روح بھی ہے ۔ میں نے اس زبان میں کھایا
ہے ، پیا ہے ، اس زبان میں سوچا ہے .... میری زبان
کے گلے پر چھری چل رہی ہے اور میں کچھ نہیں کر سکتا بس!
اپنی نظروں سے گرتا چلا جا رہا ہوں .... میں پاگل ہوں مگر
مجھے اپنا پاگل پن اچھا لگتا ہے کہ یہ میں نے مستعار نہیں
لیا ہے ۔ میں نے اسے جنم دیا ہے ۔ ... "

ایک شہری جو قلی ہے اور ایک شہری جو افسانہ
نگار ہے (ویسے ایک قلی افسانہ نگار بھی ہو سکتا ہے اور
افسانہ نگار قلی بھی) دونوں میں کیا فرق ہے ؟ یہی نا کہ

افسانہ نگار علم کے میدان میں تلی سے آگے ہے۔ اسی لیے افسانہ نگار کی ذمہ داری کہیں زیادہ ہے۔ اسے تمام سماجی مسائل کی تفتیش کرنا ہوگی۔ سماجی برائیوں اور امراض کی تہ تک جانا ہوگا اور ہر عوامی مسئلے پر ایک مضبوط اسٹینڈ بھی لینا ہوگا المیہ ہے کہ بہت سارے معصوم ادیب PLANTED ادیبوں جو یقیناً ذہین ہوتے ہیں، کے جال میں پھنس کر مسائل کو حل کرنے کی گرم بازاری میں مسائل ہی کو جھٹلا دیتے ہیں اور یوں نادانستہ طور پر عوام دشمن عناصر کا ساتھ دیتے ہیں۔

تقریباً دو برس پہلے میں نے ایک کہانی میں شہر کا شہر عمارت کو BLAST کیا تھا جہاں کا گرد وچ، کیکٹس اور صلیب پناہ گزیں تھے (یہ اور ایسی بہت ساری چیزیں ہیں جدیدیوں کا من بھاتا میوہ ہیں) اس کہانی کو سی پی (ایم) سے نظریاتی طور پر وابستہ ادیبوں نے پسند کیا اور اسی کہانی میں ایک صاحب نے "تخلیت" بھی دیکھی۔ [میں نہ تو سی پی (ایم) کا ممبر ہوں اور نہ ہی ایم ایل کا۔ ہاں! میں نے اتنا جانا ہے کہ سی پی (ایم) کے نکتۂ نظر کو جانے بنا آپ ہندوستان کی سیاسی صورت حال کو صحیح طور پر نہیں جان سکتے۔ مجھے سی پی ایم ایل نوجوانوں سے بھی گہری دلچسپی ہے کہ انھیں سمجھے بغیر آپ نئی نسل کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے نئی نسل جواب ادب نہیں پڑھتی، سیاسی نظریات پڑھتی ہے۔ ۱۹۶۸ء کی فرانس کی طالب علم۔ مزدور بغاوت کے بعد جب لوگوں نے دیکھا بھالا تو پتہ لگا کہ ناول مارا گیا ہے۔ اور پھر یہ لوگ نئی نسل کے احساس کی شدت کی نمائندگی کرتے ہیں اور اس کی بڑی قیمت ادا کر رہے ہیں۔ اور یوں بھی مجھے ییٹوا وانی سے کوئی دلچسپی نہیں۔] میں نے اس کہانی میں ادھر کے پڑھے لکھے نوجوانوں کا تجزیہ کیا تھا جن کے کان عوامی چاپ کی طرف لگے ہوئے ہیں لیکن جو اپنے نام سے سکھ آرام کی کرسی میں ابھی بری طرح گرفتار ہیں۔ میں نے اس

تضاد کو ایک [illegible] کے [illegible] دیکھنے کی تھی۔ میں [illegible] کی [illegible] کا [illegible] تھا اس تضاد سے چھٹکارا پاسکوں۔

ہم نے جس سماج میں [illegible] ہے، اس نے بیشتر اس کے کہ ہم اپنی سوچ [illegible] کا کام ہے، کھوپڑی میں ایک مخصوص [illegible] دو [illegible] والے ایک ملک اور اس کی [illegible] کا سارا [illegible] اپنے آپ کو اس بلاخیز عہد میں جینے کے قابل بنانے کے لیے پہلے ہمیں اپنی کھوپڑی صاف کرنا پڑے گی۔ [illegible] اور فرد کی زندگی میں موجود تضادات کا احساس، ان کی واضح پہچان اور پھر ان سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی جانب پہلا قدم ہے۔

"ماؤ صرف اس لیے بڑا نہیں ہے کہ اس نے اپنے ملک کو غلامی سے نجات دلائی، وہ اس لیے بھی بڑا ہے کہ اس نے کھوپڑی میں پاؤں پسار کر سوئے ہوئے CONFUCIOUS کو دھکے مار مار کر نکال باہر کیا۔ یہ لازوال تخلیق ہے۔"

ہم سمبلز کے درمیان زندگی گزارتے ہیں۔ جو سمبلز ہماری زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں، وہ [illegible] کے پیدا کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب ان سمبلز کے بوسیدہ [illegible] کو چیلنج کیا جاتا ہے تو طلسم ٹوٹتا ہے۔ آج دنیا بھر کی نئی نسل [illegible] طلسم ٹوٹ رہا ہے۔ اب ذرا اپنے یہاں دیکھیے۔ [illegible] سیاسی شعور کی کمی کے کارن اور غیر شعوری طور پر مذہبی تعصب کی اسیری کے کارن بیکار کی تعلیم اور INDIRECT تجربات کے ملبے کا استعمال کیے چلا جا رہا ہے۔ [illegible] تک پہنچے نہیں۔ نتیجہ؟ زندگی تضادات کا شکار ہے جس کا اسے علم نہیں۔ تحریر میں جو تضادات آجاتے ہیں ان کا کیسے ہو؟ افسانے کے مرکزی خیال کی [illegible] افسانے کی جزئیات کو جھٹلاتا ہوا چلتا جائے گا اور [illegible]

پیر کے پیچھے چھپ رہنے کا اور ڈھیر ہو جانے کا۔
بچے ہیں انقلاب بھی مغرب کی دین ہے۔ چھوٹ کچا
مگر بڑی خوب صورت اور ہم ایشیائیوں کا سرا اونچا
بات بھی ہے۔ کہا ہے۔
انقلاب کو ایشیا کی بھی بہت بڑی دین ہے۔ لانگ
جدیدیت نام۔
یہاں، اپنے ہاں جدیدیت کے ایک رجحان بننے
بھی دہائی کے شروع میں جب نئی تحریر سامنے آئی
دنوں بھی ایک ہیرو پیدا کیا گیا تھا۔ کینیڈی۔
جدید ادیب جانتے ہیں کہ ژاں ژینے جس کی موت
حال ہی میں ایک جدید پرچے نے شائع کی تھی۔
پھر بھی نہیں مرا)، نے کینیڈی کے مقابلے میں،
کو ترجیح دی تھی۔ اور یہ وہی ژاں ژینے ہے،
حیات اس لیے سارتر کو عزیز تھا کہ وہ بورژوا
لیے بہت بڑا چیلنج تھا اور یہ وہی ژاں ژینے ہے
کے ایک چھوٹے سے دائرے میں گھری زندگی بسر
اس تجربے کو ادب کرنے کے بعد جب بڑے
میں آیا اور کند دھار گرنے لگا تو اُن حقیقتوں کو
سکا جو انقلاب کے لیے فضا تیار کرتی ہیں۔
ب تو خیر PENTAGON PAPERS کی
نے کینیڈی سنڈ بھی پاش پاش کر دی ہے۔ آج
ہیرو DANIEL ELLSBERG ہے جو
بات کے اعتبار سے اینٹی ہیرو ہے۔
جدیدیت جسے ایک رجحان کہا جاتا ہے، نہ تو
کے بعد کی کسی سماجی تحریک سے پھوٹا ہے اور
تا ان کوئی تحریک بن پایا ہے جو صورت حال کو
سنوارنے کی ناکام یا کامیاب کوشش ہوتی جدیدیت
چند ایک حساس، دکھی اور برہم نوجوانوں کی
تحریر تھی۔ ان چند لکھنے والوں کی برہمی جو غلط یا صحیح تو ہو سکتی
ہے، سچی تھی۔ اس لیے نئی تحریر کا مشکل اور خطرناک کام
ہوتا رہا۔ آخرکار وہی ہوا جو ترقی پسند تحریک کے ساتھ
ہوا تھا۔ مفاد پرست آئے، قریب آئے، گھل مل بیٹھے
اور پھر جلد ہی وہ وقت آ گیا جب نئی نسل کی برہمی کا اظہار
جو ایک مقبول قدر ہے، ایک بے ہنگم، بے رُخ شور میں
گُم ہو گیا۔

ایسا ہوا، اچھا ہوا کہ ایک حقیقت کا سراغ تو ملا۔
اب نئی حقیقت کی جستجو ہو گی۔

جدید ادب کی تخلیق اور بقا کے لیے ہمیں کلکر کا انتخاب
کرنا پڑے گا جو ہمارے عہد کا شعور ہے، ہمارے عہد کا عمل
ہے، ہمارے عہد کی تخلیق ہے۔ اگر یہ انتخاب جدید ادیب کے
بس کی بات نہیں، تب سمجھوتوں سے بہتر تو یہی ہے کہ یا تو
وہ (بہ قول افتخار جالب) ویت نامی بدھ بھکشوؤں
کی طرح جل مرے اور یا پھر (بہ قول عزیز الحق) اپنی
FRONTAL LABACTOMY کروا کے ابدی
EUPHORIA میں مبتلا ہو جائے۔ ●●

دو نظمیں صادق کے لئے

○

آگ لگتے ہوئے
جنگلوں کا دھواں
میرے اندر اُتر جائے گا

سوکھ کر خون کی لہر کی ہر صدا
بے فضا چار سمتوں میں بہ جائے گی

برف کی قاش پر
جتنے گہرے نشاں منڈھ گئے ہیں
پگھل جائیں گے
بھیگے سبزے کے سُلگاؤ پر
پھوٹتی گندھ میں
دونوں آہستہ آہستہ
جھڑ جائیں گے

○

سب کے ہاتھ سرد ہیں
ڈھلے ڈھلائے جسم پر
بجھے ہوئے لباس ریزہ ریزہ ہیں
سب گناہ گار ہیں
اپنی ماں کی کوکھ سے
سب کے سب کھنچے ہوئے
اپنی اپنی پیٹھ کا خراج دے کے آئے
سب کے ہاتھ

●●

آخری منظوم کے بعد

اسلم عمادی

سنگ دل سنگ دلاں زہر ہوا پی کے چلے
اور میں آخری منظوم کے بعد
چشم گل تازہ لئے
ریک پر رکھی ہوئی فلسفہ آوازوں کو ان سونگھتے حرفوں کا
تماشا دیکھوں ؟
چونکتی آنکھوں کو اعصاب کی لرزش کا سبب
قوس و تحریر سے اندازۂ ہنگامہ دری کا کوئی معیار
مقرر کر کے
مسکراہٹ کے نئے ناپ بنانے کے لئے
کس طرح لوگوں نے
ہنگامہ کیا —
میں نے معصوم سے بچے کی طرح چپکے سے پتھر کو اٹھا سامنے موڑ کے
چمکتے ہوئے شیشے کو ذرا چوم کے آ جانے کو بھیجا تو کہا سب نے
کہ یہ ایک بہت غیر حقیقی سا عمل ہے تو
بھلا کون کہے ۔ چپ رہو، خاموش رہو ۔ ؟
سنگ دل دیدہ وری
راہ انداز کرے
ذرا نگہ
چپ
کر
یہ گلدستہ
رواں
پھول بھرا
لو اتر آئی بسنت ۔ !
جانے دو تم تو سناتے رہو وہی، روندی ہوئی ضابطہ آلودہ
صدائیں وہی پیتے جو پرانے ہیں کہ ہم چاہیں تو تلوار ہی بنا لیں
کبھی جسموں کو چھپا لیں مگر ایسا نہیں ہوتا کہ سبک ہاتھ پہ پتھر
کا فسوں ہو نٹ نہیں
ہم تو یہ سب وہی بچپن کے دریچے میں سجا دیکھتے
آئے ہیں
میں نے پھر
ایک نئی طرح سے
جلتے ہوئے تانبے پہ
دعا مانگی
تو دیوار
ہری ۔
شاخ ہری
آنکھ ہری
جسم
کرشاداب، سبک
نرم، [illegible]
پھر مرے
سنگ دل سنگ دلاں زہر ہوا پی کے جلے
اور چمنی پہ لٹکتے رہے ۔ !!
صدیوں کے لئے

نیا ادب کا پسِ منظر

نظام صدیقی

" بیسویں صدی غالباً انسانی تاریخ کی سب سے زیادہ انتشار آگیں صدی ہے۔ آج جو شخص سکون اور طمانیت کا متلاشی ہے۔ اُس نے اپنی پیدائش کے لئے بہت ہی غیر موزوں وقت کا انتخاب کیا ہے۔ "

ٹراٹسکی کے محولا بالا بین السطور میں پوشیدہ ہمہ گیر تباہی، خوف و ہراس، شدّتِ انتشار، احساسِ جرم،
ےقہر، لاتمیت، ذہنی کرب، بے تعلقیت، ذات میں گم شدگی، موت کا آسیب، ماورائی تشکیک،
معنی کی ہولناکی، پسپائی اور بے قدری، ہمہ جہت فریب شکستگی اور جسم اور روح کی دوئی کی فضا میں بیشتر
نئیس سال (از ۱۹۴۷ تا ۱۹۷۰) کے اردو ادب کی تخلیق ہوئی جو موجودہ عہد کے صنعتی، مشینی، بے معنی
تعلقات کی بے حسی اور کھوکھلے پن اور آدم خور انسانیت کُش " دوغلی " تہذیب کی آبرو باختگی، ذہنی بیوائی
ابینائی، جذباتی دیوالیہ پن، احساسِ بے وطنی، بے زمینی اور بے دست و پائی کے عذاب کا عطیہ ہے۔ یہ
اردو ادب کی تاریخ میں ایک غیر معمولی واقعہ ہے کہ اُس نے حتی الامکان اس بحرانی روح فرسا کیفیت اور پر آشوب
تاکی کو بخوبی جذب کیا ہے اور پہلی بار خود کو عالمی تاریخی قوتوں کے قریب پایا ہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات
اردو کے اکثر دیدہ ور شاعروں اور ادیبوں کو اس بات کے لئے مجبور کیا کہ وہ اس نوزائیدہ تاریخی عمل کے چیلنج کو
۔ اگر وہ اپنے شدید عصری احساس و آگہی کی پُرخلوص ترجمانی نہ کرتے تو آج کی انسانی تاریخ انہیں فراموش کر
اتی۔ خواہ ۱۹۴۷ کے بعد ادبی منظر پر زیادہ اچھی طرح نمایاں ہونے والے اختر الایمان، خورشید الاسلام، حبیب الرحمٰن

...کرل اور خلیل الرحمٰن اعظمی ہوں یا ۱۹۵۰ کے قریب ابھرنے والی نسل کے باقر مہدی، وحید اختر، عمیق حنفی،
...سلیم، محمود ایاز، بشر نواز، مغنی تبسم، حسن نعیم، بشیر بدر، فضا ابن فیضی، عزیز قیسی، ساجدہ زیدی،
...ناز تمکنت، زاہدہ زیدی، محمود سعیدی، زبیر رضوی، مظہر امام اور راج نرائن راز ہوں یا ۱۹۶۰ کے بعد
...شعری حیثیت کا جوہر طور پر منوانے والوں میں محمد علوی، شہریار، عادل منصوری، کمار پاشی، ندا فاضلی، بانی
...صدیقی، فضیل جعفری، پرکاش فکری، احمد ہمیش، صادق، شاہد احمد شعیب، سلطان اختر، لطف الرحمٰن، علیم اللہ
...، نمر قریشی، معصوم سبزواری، غلام مرتضیٰ راہی، ظفر حمیدی، علقمہ شبلی، قیصر شمیم، اویس احمد دوراں، یوسف
...، اقبال ماہر، رؤف تمیم، مظفر حنفی، تیم حنفی، احتشام اختر اور شمس الرحمٰن فاروقی ہوں۔ وہ سب اپنے مختلف
...، لہجہ، موضوعات، تعصبات اور تاثرات کے باوجود اس مشترک درد اور آگ کے کسی نہ کسی طور پر حلیف رہے
...جو باقر مہدی کے "کالے کاغذ کی نظمیں" کا سرنامہ اور زندگی کا اشاریہ ہے:

اک آگ سی جلتی رہتی ہے رگ رگ میں مری
اک بے معنی سا درد میرا احساس جگاتا رہتا ہے
اس طرح کہ میں سب کچھ یوں ہی محسوس کروں اور کچھ نہ کہوں
جب تک یہ جہنم روشن ہے
میں زندہ ہوں

ورنہ ایسے زندہ مُردوں کی نئے ادب میں بھی کمی نہیں ہے جن کا سر دو چار قابلِ توجہ تخلیقی کاوشوں کے بعد اپنے
...دوں کے چھوڑے ہوئے نشانوں کی کوکھ میں اور ذہن پیٹ کی کیچ میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اردو کے
...بیش زندہ رسائل ادبی بدروحوں کے بدترین مسکن بن گئے ہیں۔ تاہم ایسی تخلیقی ناداری اور تقلیدی طوفانِ بے تمیزی کے
...یٹ ریس میں، ۱۹۴۷ کے بعد سے ہندوستانی افسانوی ادب میں (قطع نظر پاکستانی نئی کہانی کے) جوگندر پال، اقبال متین،
...دیوندر اسر، رام لعل، بلونت سنگھ (۱۹۴۷ سے لے کر ۱۹۵۳ تک۔ بلونت نے بھی کئی معرکہ آرا نئی کہانیاں اردو ادب کو
...عطا کی تھیں۔ لیکن یہ موصوف بھی اب کرشن چندر، مہندر ناتھ اور واجدہ تبسم وغیرہ کے مانند غیرا دیبانہ حد تک خالص "پیشہ ور"
...بن کر رہ گئے ہیں) انور عظیم، کلام حیدری، محمد عمر میمن، غیاث احمد گدی بعد ازاں سریندر پرکاش، بلراج مینرا، اقبال مجید
...احمد ہمیش، احمد یوسف، ایس احمد گدی، اختر یوسف، ظفر اوگانوی، شفیع جاوید، محسن شمسی، تسکین انصاری،
...وہاب اشرفی، اکرام باگ، علی امام، شمس ندیم، انور، خلیل مامون، شوکت حیات اور قمر احسن کا وجود غنیمت ہے
...جنھوں نے آج کے تحت مسموم اور زہرناک حالات میں انسانی روح کی حفاظت کرتے اس کے درد و داغ کو نمایاں کرنے
...اور عصری دور کے "سلگتے" سوالوں کو زبان عطا کرنے کی حتی الامکان پُرخلوص کوشش کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی بیشتر کوششیں
...ضائع ہی ہوتی رہیں۔ لیکن اکثر موثر اور کارگر بھی ثابت ہوئی ہیں۔ یہ بے حد نازک اور نامیاتی باریکیوں کا حامل اہم کام ابھی تک مکمل
...نہیں ہے۔ کیونکہ موجودہ سماج سے زیادہ فلسفیانہ، سماجی اور سیاسی آدرشوں اور نظریوں کے دائرہ میں بنا ہوا ہے کہ
...انسانی روح کی بات کرنا بظاہر مضحکہ خیز سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ان اختلافات کے باوجود مغربی، یورپی، امریکی، روسی،

ہندوستانی اور دوسرے کئی ترقی یافتہ، نیم ترقی یافتہ یا پس ماندہ سماجی نظاموں میں رہتے ہوئے بھی [illegible] جو مرکزی [illegible] نمایاں ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ آج کی دنیا ایک "اکائی" کی مطلوبہ صورت حال کی جانب تیزی سے بڑھ گئی ہے اور بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ایک عالمی انسان کا جنم ہو رہا ہے۔ قومی غرور و نخوت سے مملو زہرہ دار احساسات، جغرافیائی تحفظات اور احرامات اب فنا ہو رہے ہیں۔ دنیا میں بوقلمونی اور اختلافات کے بھرپور امکانات تو باقی رہیں گے اور رہنا بھی چاہئے۔ کیونکہ انسانی معاشرہ کی یہی زندگی نواز خصوصیت ہے جو اسے حیوانی معاشرہ سے الگ کرتی ہے۔ دنیا کے ایک ہونے کے یہ قطعی معنی نہیں ہے کہ دنیا بھر کا کوئی ایک مرکزی سرکاری نظام قائم ہوگا۔ اس کا مطلب سیدھا سا صرف اتنا ہی ہے کہ کثیر الابعاد اختلافات کے مابین معنوی اتحاد کی کوئی صورت رونما ہوگی۔ ہم ہندوستانیوں کے لئے کثرت میں وحدت کے تہ در تہ معنی کو انگیز کرنا دشوار نہیں ہے۔ علاوہ ازیں عصری تاریخ اب محض چند سربرآوردہ آدرشی آدمیوں، ہیروؤں، شہریاروں، شریفوں اور سورماؤں کی کھتونی نہیں ہے۔ موجودہ عہد جگمگاتے چکاچوند کرتے ہوئے انواعوں اور خام خیالیوں کے گھوڑوں پر سوار ہیروؤں سے مبرّا عوامی شعور، رائے عامہ، افوقی ماس ماسز کا عہد ہے۔ انتہا ہی نہیں بلکہ اب اس آشوب زدہ دور میں انسانی ذہن کی نئی گتھی نے دنیا کے بڑے مفکرین کے سامنے اتنے بہت سارے مسائل انگیخت کر دئے ہیں جن کا حل ہونا انسانی فلاح و بہبود کے لئے لابدی ہے۔

عصری اردو ادب (۱۹۴۷ تا ۱۹۷۰ء) کی تشکیل جس سرعت سے بدلتی ہوئی دنیا میں ہونا شروع ہوئی اور ہو رہی ہے۔ وہ اس کی گذشتہ دنیا سے بہت مختلف ہے۔ وہ اب پریم چند، سدرشن، سلطان حیدر جوش، اعظم کریوی، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز کے گاؤں، قصبہ، دیہات اور پس ماندہ شہروں اور دیہاتوں کی اکھڑی ہوئی اور رنگی ہوئی دنیا نہیں ہے جس میں حفیظ جالندھری، اختر شیرانی اور جوش ملیح آبادی کے میگھ ملہار، راگ والاپ اور گھن گرج کے لئے بھی کافی گنجائش تھی۔ اب تو بلونت سنگھ اور راجندر سنگھ بیدی کا پنجاب، منٹو کا امرتسر اور بمبئی، کرشن کا کشمیر اور آندھرا پردیش، شاہد احمد کی دہلی، حیات اللہ انصاری کا یوپی، علی عباس حسینی اور سہیل عظیم آبادی کا بہار، قرۃ العین حیدر کا لکھنؤ، قاضی عبدالستار کا ہردوئی اور عصمت اور رشید احمد صدیقی کا علی گڑھ بھی بہت حد تک بدل گیا ہے حتیٰ کہ غلام الثقلین نقوی، صادق قریشی، جمیلہ ہاشمی اور احمد ندیم قاسمی کے ٹھیٹ دیہاتوں کو بھی شہری تہذیب کی تیز ہوا نے بُری طرح اپنی لپیٹ میں کھینچ لیا ہے۔ اس کے خدوخال بنیادی طور پر بدل رہے ہیں۔ بٹ رہے ہیں۔ کھو رہے ہیں۔ اب تو عصری اردو ادب اور دنیا کے دوسرے ادبیات کے درمیان کی دیواریں بھی منہدم ہو چکی ہیں۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے فن کاروں کے مانند اردو کے ادیبوں نے بھی ایسے متعدد مسائل انگیخت کئے ہیں اور مختلف نوعیت اور اہمیت کے سوال بے محابا پوچھے ہیں جن کا تعلق ان کی اپنی ذات سے اپنے معاشرہ سے اپنے شہر سے اپنے صوبہ سے اور اپنے ملک سے ہوتے ہوئے بھی ساری دنیا سے ہے۔ جس میں مارسل پروست، جیمس جوائس، کافکا، آندرے ژید، مالرو، سارتر، ہنری ملر، مارشل، بیکٹ، آئنسکو، کامیو، روب گرئیے، گنس برگ، آلبی اور گارتھر ملر وغیرہ کے مادی وجود سے ماورا ان کی تخلیقی اور فنی دنیائیں بھی موجود ہیں جو متعدی کردار کی حامل ہیں اور مختلف نوعیت کی تاثر پذیری اور تجربیت کوئی گناہ نہیں ہے۔ زندگی جہاں پہلے بھی روایت کے بجائے تجربہ کے ساتھ تھی۔ اسی طرح اب بھی ہے اور ترقی

وں کی پرچھائیں ہے جو ہمیشہ اُس کے ساتھ ہی ساتھ رواں دواں رہتی ہے۔ اور اپنے اندر گھُستی، سکڑتی، دھنستی
پادم گونجتی ہوئی جس مجرمی دنیا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس دبی دبی اور بھینچی بھینچی دنیا میں ہر نوعیت کے سراعد کی
ت دریافت اب بہت مشکل ناگزیر ہے۔

لیکن اردو کے ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کی شخصیت و عمل کی اس توسیع کا تجربہ جس قدر مسرت انگیز ہے
ی تلخ بھی۔ اُس کا ورود جس دور میں ہوا۔ اس میں زندگی اور موت کی ایک عجیب کشمکش کارفرما تھی۔ اس کشمکش
روحانیت اور مادیت، مشرق اور مغرب اور کالے اور گورے کے سوالوں کو بے جان اور بے روح ثابت کرنے کے
ساتھ نئے ادیبوں اور شاعروں کی نوخیز شخصیت کو بھی شدید طور پر متاثر کیا۔ اُس نے انسان کو "ملکوتیت" اور
یت" کا (غالباً حیوانیت کا بہت زیادہ) ایک عجیب و غریب مرکب ثابت کیا کہ انسان کے اندر کا وحشی
جس کو صدیوں سے اخلاق و مذہب، آدرش و عقیدہ، سماج اور تہذیب کے ہزاروں قیود اور پابندیوں نے زبردستی
دبانے کی کوشش کی۔ وہ اب بھی بگشت اور سرکش بدروح کے روپ میں موجود ہے۔ اُس میں بلا کی طاغوتی طاقت
ہے۔ اسی آویزش نے اُن سب مہیب اور سنگلاخ حقائق کے بارے میں بھی فن کار کو گہری بصیرت بخشی جو انسان
موجودہ تشویشناک صورت حال، اُس کی ذات کے اندر کارفرما بہیمیت اور درندگی، امریکہ کے مشہور شاعر کارل سینڈ
(CARL SAND BURG) کی تخلیق (WILDERNESS) اور کافکا کے (ANIMAL
IMAG) میں پوشیدہ جذبہ اور عادل منصوری اور کمار پاشی کی فسادات سے متعلق مختصر نظموں کو مزید شدت اور معنویت
کرتی ہے۔ اس بات کی مزید صراحت کے لئے کمار پاشی کی نظم " گندے دنوں کا قصہ " کی شدید نشتریت، تاثراتی
ت اور ایجاز کو ذہن میں رکھئے۔

گندے دنوں کا قصہ (اقتباس)

ہماری کنواری جواں بیٹیوں نے
جو بچے جنے تھے
وہ اب اپنے ہاتھوں میں ترشول لے کر
ہماری بھی جانب چلے آ رہے ہیں
تو شاید انھوں نے
ہماری نئی بیٹیوں (اپنی بہنوں) کے جسموں کی بو سونگھ لی ہے

——— کمار پاشی ———

خیر و شر

ایک بپھرا ناگ
کاجل ناگ

بجلی کی طرح
دفعتاً لپکا کہیں سے ناگ کی صورت پر
اور ڈس کر چل دیا
بے خطر، آسودہ، خوش دل، شادکام

فطرتاً نے لکھنے والے کو نظریۂ ارتقا اور مسیحی عقیدہ کے اولین گناہ (ORIGINAL SIN) تک کے تصور میں لا نظر آنے لگتی ہے۔

دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ تا ۱۹۴۵) کی ہلاکت خیزی اور دہشتناکی نے انسان کے ذہنی سکون کو شدت سے جھنجھوڑ ڈالا اور کرۂ ارض کے اربوں سال کی تاریخ کے مقابلہ میں بے چارے مختصر آدمی (HOMO - SAPIEN) کی آئندہ زندگی پر ایک بہت بڑا سا سرخ سوالیہ نشان لگا دیا۔ انسانی نسل کی اب تک کی تاریخ کو دیکھتے ہوئے پاسکال کا وہ فرانسیسی جملہ بے اختیار یاد آتا ہے جس کا انگریزی ترجمہ حاضر خدمت ہے:

"I MARVELL THAT MAN DOES NOT FALL INTO DESPAIR AT HIS MISERABLE STATE."

آج کا صاحبِ احساس ادیب و شاعر اس عالمی خلفشار اور بدبختی سے فکرمند ہے۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہے کہ انسان اُمید و یاس کے درمیان ڈوبتا اُبھرتا ایک ایسے نازک مقام پر جا پہنچا ہے جہاں اگر احتیاط نہ برتی گئی تو اس کے گمراہ ہو جانے کے پورے امکان ہیں جہاں ہی مشہور فرانسیسی مفکر رینے گرُوسے (RENE GRUSSE) کے انسانی تہذیب سے متعلق عقائد کی مزید توثیق کی صورت بھی نظر آتی ہے۔

اردو کے معاصر ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کے مطالعہ سے کچھ نتائج نہایت واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ اُن نتائج کو دو حصوں میں سہولت کے لیے تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصہ کے ضمن میں ان کے فکری میلانات کا تعلق مجملاً نسلِ انسانی کی موجودہ مادی اور روحانی حالت اور اُس کے امکانات سے ہے۔ روز افزوں سائنسی اور تکنیکی ترقی کے تحت خلائی جانبازوں نے جو نئی مہمات سر کی ہیں۔ اُس سے اُن کی پوری انسانیت کے بقا و تحفظ کے متعلق زاویۂ نظر میں مزید بالیدگی پیدا ہوئی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ انسانیت کی زندگی میں خوف و تعجب سے ملے جلے ایک عجیب سے پریشان کن نئے موڑ کو بھی دیکھ رہے ہیں۔ بہت ساری مادی اور سائنسی سہولتوں اور مسرتوں کے درمیان وہ انسان کو اندرونی طور پر بے حد شکست خوردہ اور لہولہان پاتے ہیں۔ مختلف قوموں اور ملکوں کے باہمی خوف، بے یقینی، رشک و حسد اور متشددانہ تجربوں اور جھپٹوں نے انسان کی زندگی کو صد درجہ صبر آزما بنا رکھا ہے۔ ایٹمی اسلحوں کی ہیبت ناکی نے اس کی زندگی میں ایک عجیب سی بے یقینی اور بے اطمینانی پیدا کر دی ہے۔ مزید برآں مغرب کی سائنسی فکر کی کائنات اصغر (MICRO COSM) اور اکبر (MACRO COSM) کی بابت

روز افزوں تحقیقات [illegible] اور انتظامیہ میں پوشیدہ نامعلوم خطرات کے انکشافات کے باعث انسان کا اپنی ذات
بھی یقینی انتشار [illegible] اور قوتِ فیصلہ کے فقدان کے سبب اس کے پیر ڈگمگا رہے ہیں۔ وہ بیچارگی اور
بیزاری کے ایک عجیب و غریب شکست کے عالم میں مبتلا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان اُس گدھ کے مانند ہو گیا ہے جو آسمان میں
بھی اُڑان بھرنے کے [illegible] مُردوں کو اپنی غذا بناتا ہے۔ اُردو کی بیشتر نئی نظموں اور کہانیوں میں انسانی زندگی کے
[illegible] بلکہ نہایت ہی بھیانک روپ میں پیش کیا گیا ہے جو قطعی طور پر افراط و تفریط کا شکار رہے
ہیں [illegible]، عادل منصوری اور صادق کی اکثر اچھی تخلیقات بھی اسی میلان کی نمائندہ ہیں۔
بات کچھ حد تک تو ٹھیک ہے کہ آدمی آج بہت حد تک اپنی شخصیت سے محروم ہو کر خود اپنے آپ سے ہارا اور ٹوٹا پھوٹا ہوا
ہے۔ اس کی نظر میں اس کی حیثیت [illegible] تو چیز سی حقیر ہو گئی ہے۔ اس سے کلی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اُردو کی ہی دوسری
بہت ساری نگارشات سے اس بات کی صدا بھی بلند ہوتی ہے کہ عصری انتشار انگیز حالات کے باوجود انسانیت کی ہی بالآخر
فتح ہوگی۔ ان کا منشا انسان کو HUMANIZE کرنے کا ہے۔ وحید اختر، باقر مہدی، خلیل الرحمن اعظمی، بشیر بدر
[illegible] قیصر، عمیق حنفی، کمار پاشی ہوں یا کلام حیدری، جوگندر پال یا غیاث احمد گدی ہوں۔ ان لوگوں کی تخلیقات
عصری پیچیدگیوں اور انتشار میں ایک وسیع الامکان انضمام اور توازن کی تلاش و یافت میں کوشاں ہیں۔ سائنس
درحقیقت انسانی نسل کو مادی نقطۂ نظر سے متحد کرنے کے ساتھ ساتھ ذہنی اور روحانی سطح پر بھی قریب لا رہی ہے
اور آئندہ بھی توڑنے کے بجائے جوڑنے کے عمل میں وہ زیادہ موثر اور کارگر ہی ثابت ہوگی۔ انسانی نسل کی موجودہ روحانی
جہالت (SPRITUAL ILLITERACY) کے باوجود اُردو کا ادیب شاعر امید کا سمبل کھو نہیں بیٹھا۔ ایک
جانب گیگرین، تیتو، شیپرڈ، گلین اور کارپنٹر ہیں اور دوسری طرف آئنسٹین ہے۔ انسانی تہذیب و تمدن کے یہ
دونوں پہلو دو انتہاؤں کی واضح طور پر نمائندگی کرتے ہیں۔ اُردو کا تاریخی شعور اور عرفانِ نفس بے بہرہ ادیب آج زہریلے
پانیوں میں "ڈوبتا اتراتا اور آگے بڑھتا ہوا" نیل کنٹھ" کی طرف نظر مرکوز کئے ہوئے ہے تاکہ زندگی کی بے معنویت کی
بانجھ کوکھ ثمر بار ہو سکے۔

نئے ادیبوں اور شاعروں کے اس فکری رجحان کے دوسرے حصہ کا تعلق قدرتی طور پر قومی زندگی سے ہے
خصوصی طور پر آزادی کے بعد کی زندگی سے۔ آزادی کا تجربہ نہ صرف ان کے لئے بلکہ پورے ملک کے لئے یکلخت نیا تھا۔
سامراجیوں اور نو آبادیات پروروں کے شکنجہ سے آزاد ہونے پر ملک خود کو سنبھال نہیں پا رہا ہے۔ بڑے بڑے
منصوبے ملک کے سامنے آئے ہیں اور آ رہے ہیں۔ جمہوری اشتراکیت کا نقشہ تیار ہو رہا ہے۔ قومی آمدنی میں مزید اضافہ
ہو رہا ہے۔ لیکن تاہم عام آدمی شادماں نظر نہیں آتا۔ زندگی کی نابرابریاں دور نہیں ہو پا رہی ہیں۔ اس میں کہیں
گھن لگا ہوا ہے۔ یہاں جنگ، انقلاب اور ایٹمی خطرات سے کہیں زیادہ ناداری، افلاس، جہالت، بیماری اور
زوال پذیر معاشرے کے روح فرسا مسائل درپیش ہیں۔ زندگی کی یہ ہیئت کذائی اردو شاعروں اور ادیبوں کی
برافروختگی اور شعلہ فشانی کا ہدف بنی ہوئی ہے۔ ان کی تخلیقات میں عوامی آرزوؤں، خوابوں اور امیدوں کی
بازگشت اور عام کے پچھڑے ٹوٹے پھوٹے آدمی سے ہمدردی اور وابستگی کے ساتھ ملک کے غیر دیانت دار سربراہوں اور

پرستوں، اقتدار پرستوں، جاگیرداروں اور حکومت، مذہب، معاشرت اور سیاست [illegible] کے پہلوؤں کے خلاف شدید انکاری، احتجاجی اور انحرافی رویہ کارفرما نظر آتا ہے۔ بے شک ایسے معاشرے [illegible] اور معصوم سادہ لوح بھیڑوں کی کمی نہیں ہے جو ٹھگ بھیڑیوں کے نگہبانہ پر شب بیداری [illegible] کی طرح سادوں کے اندھوں کی طرح مگن رہتے ہیں اور انسانی فلسفہ خیر کی قربان گاہوں میں بھی [illegible] ہے۔ لیکن اردو کے معاصر ہوش مند فن کار آج اپنے گرد و پیش کی زندگی کی بابت پہلے سے بھی [illegible] اور ہولناک زندگی کے انھیں سخت بے رحم حالات کی بھٹی میں جلتے اور پگھلتے ہوئے اور عدیم الفرصتی کی شدید [illegible] اور تنہا و کربناک اور بھوکتے ہوئے بھی انھوں نے حتی الامکان عرفان نفس اور نفسیاتی تجربہ کی جانکاہ زحمت بھی گوارہ کی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مسئلہ خواہ کل عالم انسانی سے متعلق ہو یا قومی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے۔ اردو ادیب شاعر کے سامنے جو اہم مسئلہ اب درپیش ہے۔ وہ انسانی قدروں کا ہے۔ ایک ایسی اخلاقیات کی تشکیل کا جواب تک کی اخلاقیات سے مختلف اور نئی ہو اور جو آدمی کی آزادی کی حفاظت کرتے ہوئے بھی اسے جذباتی اکائی میں منسلک کر سکے۔ وہ ایسی قدروں اور اخلاقیات کی تاسیس کا خواستگار ہے جس سے صرف مختلف نوعیت کے پروپیگنڈائی اور اشتہار بازکور مغز بہروپیوں کی نہیں، ذہنی طور پر مفلوج رال بہاتے ہوئے بے آزادانہ ہاتھوں کی نہیں، مٹی کے پیروں پر اکڑتے تنکڑے سربراہوں کی نہیں، یا وردی احتجاجوں کے دہانے پر بیٹھی پارٹی کے قیود و ضوابط اور مطلق العنانی کی نہیں بلکہ کچلے اور پسے ہوئے عام آدمی کے مادی، جذباتی، ذہنی اور روحانی زندگی کے ہمہ گیر ارتقا کی نشاندہی ہو سکے تاکہ عام آدمی کی بے رنگ اور ویران زندگی میں بھی خوشیوں اور کامرانیوں سے [illegible] سکیں۔[1]

اردو کے فن کار نے جب قصباتی اور دیہی فضا کے تنگ اور محدود دائرہ سے باہر وسیع حلقہ میں قدم رکھا تو حالات کے دباؤ کے تحت اس کا سب سے گہرا تعلق مغربی خیالات اور افکار سے قائم ہوا۔ اس ذہنی رفاقت نے اس کے فکری میلان کے محولا بالا پہلے حصہ کی تشکیل کی اور دوسرے حصہ کے ضمن میں نفسیاتی تجزیہ اور عرفان نفس کا حوصلہ بخشا۔ یوں بھی نسل انسانی کی موجودہ حالت کے بناؤ بگاڑ میں بہت حد تک مغربی تہذیب کی خاص ذمہ داری ہے کیونکہ پچھلی دوسری تہذیبوں کے برخلاف اس تہذیب نے ہی تاریخ کی پگڈنڈی پر تیشا آگے بڑھنے میں سب سے زیادہ سرگرمی کا مظاہرہ کیا ہے۔

اردو کا ادیب شاعر جب مغربی خیالات کی رفاقت میں آیا تو سب سے بڑی بات جس سے وہ آگاہ ہوا وہ یہ تھی کہ ان افکار میں مختلف حسین اور افادی عناصر کے کارفرما ہوتے ہوئے بھی "نئے آدمی" کی بے یقینی اور اس کی روح کی تنزلی کے سوتے بھی ان ہی میں پوشیدہ ہیں۔ اُس نے دیکھا کہ اگرچہ جدیدیت کی تحریک یعنی عہد وسطیٰ کے کلیسائی ماحول کے بعد نشاۃ الثانیہ کے انسانیت دوست نظریہ کے زیر اثر ہوئی۔ اگرچہ یورپ کی اس نئی تہذیبی روشنی میں انسان کا دل انسان کے دل سے آمرتا کی درخواست کر رہا تھا۔ تاہم آنے والی انسانی نسلوں کو مضطرب کرنے والی تلخی اور تیزابیت کی

---

[1] اس مسئلہ پر مزید روشنی کے لیے میرا آرٹیکل "قدروں کے زوال کے نوحہ کا مسئلہ" مطبوعہ آہنگ شمارہ ۳ میں ملاحظہ فرمائیے۔

اُس میں نفوذ ہوا۔ اس سے ڈیوائن رائٹ آف کنگس (DIVINE RIGHT OF KINGS) کے فکری میلان کی تقویت ہوئی۔ آگے چل کر تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ پروٹسٹنٹ عقائد کے موئدوں کی کوششوں کے نتیجے میں انسانیت کا اولین مقصد ثانوی ہو گیا۔ زندگی میں تشدد، کشت و خون اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھی اور آدمی کا دل مختلف شکوک کا شکار ہو کر اندرونی تناقضات سے معمور ہو گیا۔

درحقیقت یورپ کی تہذیبی تاریخ کی پندرھویں سے انیسویں صدی تک کے چار سو سال کے عرصہ کے مختلف ادوار پڑھاؤ کے مطالعہ سے اردو کے ادیب پر یہ بات بخوبی آشکارہ ہوئی کہ ڈاروِن [اوریجن آف اسپے سیز ۱۸۵۹] اور نیتشے [ارسٹو کریٹک انارکزم کے تحت " انفیر یرمین " کا قیام اور سوپر مین ' کا تصور] وغیرہ کے نظام فکر کے باعث وہاں کے مفکرین کو انسان میں پوشیدہ شیطان کا سامنا کرنا پڑا۔ سائنسی اور صنعتی تبدیلیوں کے سبب ان صدیوں میں یورپ میں دو قسم کے فکری میلانات نے سر اٹھایا جن کا براہ راست تعلق بیسویں صدی سے ہے۔ (۱) رومانیت (ROMANTICS) اور (۲) عقلیت (RATIONAL) پہلی فکری رو بائرن، شوپن ہوئر اور نیتشے سے موسلینی (اٹلی) اور ہٹلر (جرمنی) تک چلی آتی ہے اور دوسری فرانسیسی انقلاب کے محرک فلسفی ہیں، مونتیسکو، والتیر، دیدرو سے لے کر کارل مارکس اور روسی نظام تک ـــــ ان میلانات نے مسیحی خدا کو برطرف کر اس نوعیت کے دنیوی اقتدار کی بنیاد ڈالی جس کی وجہ سے انسانی روح مفلوج اور مجہول ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کے ساتھ ہی اُن سے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ انسانی زندگی انگنت اندرونی تناقضات اور تضادات کی آماج گاہ ہے اور اُن سے "THE BEAST IS LURKING IN HIM (MAN)" کا خوف دور نہیں ہو پاتا۔ حتیٰ کہ مارکس کا " میٹریالسٹک ڈائلکٹک " (مادی جدلیت) پُرکشش ہوتے ہوئے بھی انسانی روح اور ضمیر میں گھٹن پیدا کرنے والا ہی ثابت ہوا (کیسلر کی " ڈارک نیس ایٹ نون " اور " گوڈ ڈیٹ فیلڈ " اور جارج آرول کی " ۱۹۸۴ " اس روحانی جبر اور گھٹن کی آئنہ دار ہیں) اس نے انسان کی انفرادی آزادی اور انتخاب کے حق کو سلب کر کے اس کے ذہن و ضمیر پر مسلط عوائد اور ضوابط (ریجی منٹیشن) کی پرداخت کی (اگرچہ اب " ڈی۔ اسٹالینائزیشن " کے بعد " ریجی منٹیشن " کا کرب کچھ کم ہو گیا ہے) اس طرح جب بیسویں صدی کا انسانی ذہن خود کو اپنے ہی بُنے ہوئے جال میں جکڑا ہوا پا رہا تھا۔ اُس وقت فرائیڈ، ایڈلر، ینگ، پولو اور پریوٗ کے نفسیاتی انکشافات نے انسان کو ایک ٹھوس سماجیات دینے کی کوشش کی۔ لیکن بدقسمتی سے ان روز افزوں تحقیقات کے باعث انسان کے اندر پوشیدہ، نامعلوم، قدیم، وحشی اور سرکش حیوانی جبلتوں پر مبنی اس کی ذہنی خباثت اور کثافت کا ہی انکشاف ہو سکا۔ انسان وہی کرتا ہے جو اس کا لاشعور اُسے کرنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ اس فکری میلان نے بھی انسانی روح کی اُپج اور اُمنگ پر زد دی بلکہ انسان کی بنیادی آزادی، قوت ارادی اور انتخاب کے حق کو مسلوب کیا۔ اِدھر جیرلڈ ہرڈ نے " سپر کانشسنس " ٹائن بی نے " ایتھریالائیزیشن " اور سوروکن نے " آئیڈی ایشنل " کے تصور کو پیش کرتے ہوئے بھی انسانی زندگی اور قدروں کی بابت بہت ساری یاس انگیز باتیں کہی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نیتشے اور برگسوں سے لے کر ولیم جیمس اور جان ڈیوی تک کے خیالات میں آج اتنا تضاد نظر آتا ہے کہ جدید دانش ور خود کو متوازن اور ہموار سطح پر زیادہ دیر تک

اندرونی شکست و ریخت سے [illegible] سکے گی۔ اس ضمن میں شک کنڈلی مار کر بیٹھ گیا ہے۔ ایسی ہی کشمکشوں کے مابین
اردو کا ادیب و شاعر انسانی ضمیر کی گہرائی میں غواصی کرنا چاہتا ہے۔ ایک نئی آفاقیات (کوسمولوجی) کے بیچ انسان کو
خلق کرنا چاہتا ہے۔ اس ماحول کے درمیان سرد جنگ بھی اسے پریشان کئے رہتی ہے اور یہ سب باتیں اسے ایک
بے زمانیت میں لا کھڑا کرتی ہیں جبکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کے سائنس کے بڑھتے ہوئے قدموں (الیکٹرونک، روبوٹس
وغیرہ) ایٹمی مادوں، [illegible] اور [illegible] خلائی پروازوں کے نتیجے میں دوسرے سیاروں میں ترقی پذیر ذی
حیات کے امکانات اور آفاقی تخلیقات نے بے پایاں آفاقی ذہانت کے مانند اس زمین کی پیدائش، قیامت اور اس
کے بعد ارضی انسانی اعمال سے متعلق عقائد کی جڑیں ہلادی ہیں۔ اس نئی سائنسی ترقی نے کرۂ ارض پر آباد ہمارے عقل مند
آدمی (HOMO - SAPIEN) کا شرف و بزرگی، فخر و ناز اور عظمت و فضیلت پر ایک گہرا سرخ سوالیہ نشان
لگا دیا ہے۔ لیکن اس احساس بے چارگی اور کمتری کے ساتھ ساتھ اسے ایک آفاقی اور عالمی زاویۂ نگاہ قبول کر کے نئے
ابھرتی (ETHEREAL) آدرشوں اور قدروں کی تلاش و تفحص کے لئے مجبور ہونا پڑ رہا ہے۔ اسے دنیا کے دوسرے
ادیب شاعر کے ساتھ ایک نئی معنویات کی تشکیل کرنی ہے۔ جدید شاعروں میں وحید اختر، عمیق حنفی، کمار پاشی اور
عادل منصوری کی اکثر تخلیقات سماجی رشتوں اور کائناتی مسائل کی از سر نو دریافت اور ان کے نئے معانی متعین کرنے کی کوشش
سے عبارت ہے۔ عمیق حنفی جیسا مضبوط ضمیر بے نیام شاعر بھی عقیدہ کی ضرورت کا منکر نہیں بلکہ اس کے فکر و فن کی "شب گشت"
محض "گیڈر گشتی" نہیں بلکہ حقیقتاً نئے عقیدہ کی تلاش کا عمل ہے۔ "سند باد" بھی اسی تلاش کا بین ثبوت ہے۔ اس تلاش
کا کردار عادل منصوری اور کمار پاشی کے یہاں مختلف نوعیت کا حامل ہے۔ عادل منصوری کے یہاں اس تلاش کا عمل
موجودہ تہذیب سے بے اطمینانی اور عصری معاشرہ کی اقدار سے ناآسودگی کے سبب اسلامی عقیدہ کی بازیافت اور اس کے
حیا کو ہی انسانیت کا نجات دہندہ قرار دیتا ہے۔ کمار پاشی پرانے ہندو سیکولر تصور مذہب اور انسان دوستی میں نروان
پاتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید اختر کے یہاں اس رومانوی مراجعت کے برخلاف وہ سیاسی اور سماجی رویے خفی طور پر نظر آتے ہیں
جنہیں نئی ترقی پسندی کے اجتماعی شعور کا بلیغ ترین شعری اظہار کہا جاسکتا ہے، جس کی گہری جڑیں ذات کے عرفان،
عصری آگہی اور کائناتی مسائل اور اسرار کو از سر نو سمجھنے کی کوشش میں پنہاں ہے۔ ان تمام شاعروں کو باقر مہدی کی
RADICALISM اور مبہم پسندانہ میلان، آگہی و بے باکی سمیت انسانی حیات اور آفاق کے مسائل پر نئے ڈھنگ سے
سوچنا پڑ رہا ہے۔ انسانی روح کو زوال آمادہ اثرات سے بچانا اور زندگی کی نئی قدروں کو قائم کرنا ان کا نصب العین ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد کا اردو ادب جب مذکورہ آفاقی اور عالمی ذہنی عوامل سے اندرونی فیضان قبول
کر کے بخوبی پنپ رہا تھا۔ اسی دور میں اسے قومی زندگی کے گوناگوں مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ انگریزوں کی ہندوستان سے
سے روانگی، ملک کی تقسیم اور حکومت کی باگ ڈور ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آنے سے بہت سارے ایسے مسائل سامنے آئے جو
ابھی تک غیر ملکیوں کے خلاف جنگ آزادی کے شور و شر میں دبے پڑے تھے جن کی بابت اردو کے ادیب شاعر کو اب از سر نو
غور و فکر کرنا پڑا۔ اوپر اشارہ کردہ اس کے فکری رجحان کے دوسرے قومی زندگی سے متعلق حصہ کا یہی نقطۂ آغاز ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے نتائج سب سے پہلے ملک کے سیاسی اور اقتصادی شعبوں میں نمایاں ہوتے ہیں۔

انیسویں صدی کی تاریخ میں ایک عظیم واقعہ رونما ہوا تھا جسے صنعتی انقلاب [illegible]
کی ترقی پذیر سائنس اور آگے چل کر وہاں کی قومیت، وہاں کی اقتصادی زندگی، وہاں کے [illegible] اور وہاں کی
نوآبادیات پسندی سے ہے۔ اس نئی بیداری اور بصیرت کے باعث یورپ کی طاقت ور قومیں دنیا کے مختلف حصوں میں [illegible]
قائم کرنے نکل پڑیں۔ ایشیا اور افریقہ خصوصاً ان کی ہوس کا شکار بنے۔ کیونکہ یہ دونوں براعظم ترقی میں پس ماندہ تھے۔
ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں سامراجیت اور سرمایہ داری کی آمد سے ان کی سیاسی، اقتصادی، سماجی، مذہبی اور
ادبی زندگی کے مختلف شعبوں میں متعدد تغیرات رونما ہوئے۔ ان تغیرات کے اچھے اور برے دونوں ہی نتائج برآمد
ہوئے۔ نتیجتاً بتدریج سامراجی جبر و استحصال کی چکیوں میں پسنے کے ساتھ ساتھ ان ممالک نے غلامی کی زنجیروں سے نجات
حاصل کرنے کی کوشش کر کے اپنی بیداری کے جذبہ کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ آزادی کی تحریکات مختلف ممالک میں مختلف
اوقات پر رونما ہوئیں۔ ان تحریکات کی تیز رفتاری یا سست روی ایک طرف مختلف سامراجیوں کے اپنے افتادِ مزاج
اور دوسری طرف مغلوب ممالک کے اپنے ارتقائی احوال پر منحصر رہی ہے۔ سامراجیوں نے مفتوحہ ملکوں کی زندگی کے شیرازہ
کو ہی نہیں منتشر کیا بلکہ دنیا کو بھی جنگ کی زہرناک فضا سے مملو کر کے انسانی نسل کے سکون کو درہم برہم کر دیا۔ نوآبادیات
پسندی دنیا کے امن کو فنا کرنے کا ایک بڑا سبب رہی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے نتائج سے سامراجی طاقتوں نے
فوجی اور اقتصادی زاویۂ نگاہ سے کئی نئے سبق سیکھے۔ انھیں اب نوآبادیوں کو زیادہ دنوں تک دبائے رکھنا ناممکن معلوم
ہونے لگا۔ نتیجتاً سب سے پہلے ۱۹۴۷ میں ہندوستان کی آزادی دنیا کے غلام ممالک کے روبرو ایک انقلاب انگیز خیال
کے طور پر سامنے آئی اور ایشیا اور افریقہ کے تقریباً تمام ممالک میں آزادی کی جنگ شروع ہو گئی۔ اب نوآبادیات پسندی
اپنی آخری سانس لے رہی ہے۔ ایٹمی طاقت کے ارتقا اور آفاقیات (کوسمولوجی) کی تحقیقات کے مانند گزشتہ بیس
اور بائیس سالوں کا یہ بھی ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ ایشیا اور افریقہ کا بیکراں عوامی ہجوم جاگ اٹھا ہے۔ پچھلے اور پچھڑے
ہوئے ملکوں میں آزادی کے حصول کے بعد کی خوشگوار تبدیلیاں ظاہر ہونے لگی ہیں۔ امن کے ایام میں ایٹمی طاقتوں کے
نت نئے تجربات، نئی سائنس اور ٹیکنولوجی کی استعانت، کردار و اخلاق کی قوت اور اعلیٰ اور برتر نظم و نسق کے
وسیلہ سے ان ممالک کے لئے اپنے مقاصد کی تکمیل میں کوئی بڑی دشواری حائل نہیں ہے۔ روس اور امریکہ کا فکری
تصادم شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ سرد جنگ جو یقینی طور پر فوجی تصادم سے زیادہ خطرناک ہے۔ لیکن ایشیا
اور افریقہ کی نوزائیدہ آزاد قومیں اپنے پس ماندہ اقتصادی نظاموں اور زندگی کے معیاروں کو بلند کرنے کے لئے ان دونوں
میں ایک یا بیک وقت دونوں ہی ملکوں سے اقتصادی یا تکنیکی مدد حاصل کر رہی ہیں۔ ہندوستان کی پنج سالہ منصوبہ بندی
اور امن بقائے باہم ان کے بھی نصب العین ہیں۔ بدلتی ہوئی تاریخ کے ساتھ یہ ملک بھی بدلتے جا رہے ہیں۔

سامراجیت کی سفاک گرفت سے آزاد ملک نیا ہندوستان اب انسانی نسل کی آنے والی تاریخ میں اخلاقی اور روحانی
اقدار کو قائم کرنے کے لئے نہایت سرگرمی سے کوشاں ہے۔ اس کا اپنا یہ مقدس مشن ہے۔ بہت دنوں کے بعد اسے
یہ مبارک موقع نصیب ہوا ہے۔ برطانوی دور حکومت میں اپنی تہذیبی عظمت کے بارے میں جذباتی طور پر بیدار ہوتے ہوئے
بھی ملک کو اپنی آزاد شخصیت کی بھرپور نشو و نما کے مواقع نہ فراہم ہو سکے تھے۔ درحقیقت وہ جنگ آزادی میں اس قدر منہمک تھا

کرا سے انسانی نسل کے واسطے اپنے تہذیبی فرائض کی ادائیگی کا وقت ہی نہیں مل سکا۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ
انیسویں صدی میں بیرونی اقتدار کے مضبوطی سے قائم ہوتے ہی ملک میں مشرق اور مغرب کا شدید تصادم شروع ہو گیا تھا۔
ہندوستان نے مغربی مادہ پرستانہ نگاہ سے اپنی روح کو مضمحل اور پراگندہ ہوتے دیکھا۔ اگرچہ اس ملک کی قدیم تہذیبی
تاریخ مختلف تناقضات اور تضادات سے معمور تھی اور اس دور کے سائنسی اور اقتصادی ترقی کی روشنی میں یہ تضاد اور
تناقص اور بھی واضح طور پر نمایاں ہونے لگے تاہم اُسے اپنے روحانی پیغام میں بے پایاں ایقان تھا۔ ہکسلے، موم،
فورسٹر، ماشرا اور دوسرے مغربی ادیبوں نے ہندوستان کے اس مقدس مشن کو نہایت خندہ پیشانی سے تسلیم کیا۔ انھوں نے
ہندوستانی تہذیب میں انسان کے اندر ایک ایسی چیز پائی جس کا یورپ میں فقدان ہے اور جس کے بغیر انھوں نے انسان کی
زندگی کو کھوکھلا پایا۔ ملک کے سامنے اپنی روح کے تحفظ کا مسئلہ اہم مسئلہ تھا۔ لیکن غلامی کے ایام میں یہ کام ممکن نہ تھا۔
لہذا آزادی کی جنگ بذات خود اہم ہوتے ہوئے بھی اس عظیم اور مقدس کام کے حصول کے لئے ایک وسیلہ تھی۔

آزادی کے بعد ہندوستان دنیا میں اپنی بابت پھیلی ہوئی افواہوں اور بدگمانیوں کو دور کر کے خود کو صحیح تاریخی
پس منظر میں رکھنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی گذشتہ ذہنی اور روحانی اذیتوں کو فراموش کر کے دورِ حاضر کے پیچیدہ مسائل پر
دماغ پاشی کر رہا ہے اور اپنی بھولی ہوئی تاریخی ذمہ داری کو آج کے سنگلاخ حقائق کے پس منظر میں خوش اسلوبی سے ادا
کرنے کی کوشش میں منہمک ہے۔ اپنی تہذیبی روایتوں کا از سرِ نو تجزیہ اور تحلیل کر کے وہ اپنے کھوئے ہوئے قیمتی عناصر کو
پانے کے لئے کمربستہ ہے۔ اُس کو خوف لاحق ہے کہ اگر اُس نے اُس سے روگردانی کی تو وہ تاریخ کے موجودہ نئے چیلنج کو
قبول کرنے کے قابل نہ ہو سکے گا۔ مشرق اور مغرب کے فرق و امتیاز کو نظر انداز کر کے وہ جملہ نسلِ انسانی کے کل علوم
وفنون کے ذخائر کے تناظر میں موجودہ زوال آمادہ اور انسانی روح کو فنا کے گھاٹ اُتارنے والی طاقتوں کے سامنے
سینہ سپر ہو کر انسانی اقدار اور سماجی شعور پر مبنی شخصی آزادی کا بھرپور تحفظ کرتے ہوئے ایک نئی اُمید، یقین اور عقیدہ کو
زندگی عطا کرنے کا متمنی ہے۔ اس کو انسانی تہذیب کی جڑیں ہلتی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ وہ غمگین ہے۔ لیکن مغربی مشینی
ذرائع کا سہارا لینے اور ساتھ ہی ان کے تخریبی اثرات سے بچنے کی سخت دشوار بات کرتے ہوئے بھی دوسرے ہندوستانی
ادیبوں کے مانند اردو کا ادیب شاعر بھی نئی تاریخی ذمہ داری کے بھاری بوجھ کو اُٹھانے کے لئے غیر معمولی جوش و خروش کا مظاہرہ
کر رہا ہے۔ اُس کی آنکھ "چراغ" کو قطار میں رکھنے

TO RESTORE MAN TO MANKIND WHILE DEEPENING
AND ENHANCING HIS COMMUNION WITH THE UNIVERSE
[R.N. ANCHEN]

کی جانب ہے۔

انسانی فلاح و بہبود کے وسیع دائرہ میں اُردو کا فن کار اپنے قومی ماحول اور گرد و پیش کو غیر جانب داری سے نہیں
دیکھ سکا اور نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کی شخصیت قومی اور بین الاقوامی یا انسانی دونوں رول کا بیک وقت احاطہ کر لینا چاہتی
ہے۔ لیکن یہیں سے مزید اُس کی ذہنی اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

[illegible] روح اور ضمیر کی عظمت کو بحال کرنے کا آرزو مند ہو۔ لیکن [illegible] تو [illegible]
[illegible] نظر نہیں آتا۔ نتیجتاً نئی عصری آگہی وہ بے باکی کو برتنے میں وہ [illegible] بابت [illegible] کے
[illegible] ملک کی جس قدیم عظیم الشان تہذیب کا وہ وارث ہے۔ اس کے [illegible] ایک [illegible]۔ [illegible]
[illegible] اشرف المخلوقات ہے کہ آدمی کو کیڑوں مکوڑوں سے زیادہ حقیر سمجھنے والے باہم [illegible]
[illegible] تناقض کا وہ خود شکار ہے اور اپنے چاروں طرف بھی [illegible] کا شور و غوغا پاتا ہے۔ [illegible]
انگنت ذہنی گھتیوں اور پیچیدگیوں کے مذموم اثرات سے بھی وہ [illegible] رستگاری نہیں حاصل کر سکا ہے۔ [illegible] آزادی تو
نصیب ہوئی۔ لیکن ابھی سماجی انقلاب کا برپا ہونا باقی ہے۔ اس خوش آیند انقلاب کی علامتیں [illegible] ہونے لگی
اُس کی ایک مثال عورت اور مرد کے باہمی سماجی، اقتصادی اور جنسی رشتوں کا نئے فکری میلانات کی روشنی میں تجزیہ
[illegible] عصری اردو ادب کا ایک وصف ہے۔

جب تک یہ دوسرا انقلاب بھی رو نما نہیں ہوتا۔ (ملک کے اندسٹریالائزیشن سے یہ انقلاب ممکن ہوگا) اُس وقت
تک ادب و شاعری کی بہت ساری اُلجھنیں برقرار رہیں گی۔ ملک کی جنگ آزادی میں اُسے بہت جدوجہد کرنی پڑی، اور
سیاست سے متعلق اُس کے سامنے ایک ایسا اخلاقی آدرش رکھا گیا جو حقیقت سے کوسوں دور تھا اور جو آزادی حاصل
ہوتے ہی چشم زدن میں ڈھ گیا۔ اگر چہ اس آدرش کی دہائی دینے والوں کی اب بھی کمی نہیں ہے۔ گاندھی جی نے سوراج کے
خواب کی رام راج کے روپ میں تعبیر دیکھی تھی۔ سوراج سے بھی ان کا مطلب سوراجیہ (ضبطِ نفس) سے تھا۔ جس میں ایثار
خود ضبطی، کسر نفسی، خدمت، حسن سلوک، ریاضت اور بے پایاں حلیمی کا جذبہ کارفرما تھا۔ جنگ آزادی میں [illegible]
ملک کے عوام میں یوں تو بے شمار خوبیاں از خود پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ بھی درگزر کرنے کی بات نہیں ہے کہ ملک کی آزادی جب
آئی تو یکایک اور غیر متوقع طور پر آئی۔ ایسے انقلابی تاریخی واقعہ کے وقت ملک میں کردار کی اُستواری، راست بازی، عزم
و استقلال اور بے پایاں صبر و تحمل وغیرہ جن اوصاف کی ضرورت تھی۔ اُن سب کا قطعی فقدان تھا۔ ملک کی تقسیم کے نتیجہ
میں رونما حیوانیت اور بربریت کے ننگے مظاہرے اور گاندھی جی کے لرزہ خیز قتل کے مہیب مناظر تو اس کی نگاہوں کے
سامنے تھے جس سے پورے ملک کی روح کانپ اُٹھی تھی۔ اُس کے ساتھ ہی دوسری جنگ عظیم کے بعد کی بے دست و پائی، زندگی
کے ہر جہت زوال، حرماں نصیبی، خالی پن، ذہنی گھٹنوں، اُلجھنوں اور تصادمات زندگی کے دباؤنے زندگی میں ایک عجیب کا
پژمردگی پیدا کر دی تھی۔ ملک کی نئی تعمیر کے نقطۂ نظر سے یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ نتیجتاً گاندھی جی کے مقصور رام راج
اور سوراج کا آدرش یکایک زمین بوس نظر آنے لگا اور ہندوستانیوں کو ازالۂ سحر (DISILLUSION) کے کرب سے گزرنا
پڑا۔

رویندرناتھ ٹیگور نے ایک بار کہا تھا کہ وقت کی گردش ایک دن انگریز کو ہندوستان چھوڑنے کے لئے مجبور کرے گی لیکن
جب وہ جائیں گے تو ملک کو کھنڈر میں تبدیل کر جائیں گے۔ رویندرناتھ ٹیگور کی یہ بات سچ ثابت ہوئی۔ لیکن آزادی کے بعد
دوسری کئی ناہمواریاں بھی سامنے آئیں اور آ رہی ہیں۔ آزاد ہندوستان کا نصب العین "ویلفیر اسٹیٹ" کی تعمیر تھا۔ جمہوری
دستور میں ہر شہری کی مذہبی، سماجی، اقتصادی، سیاسی اور انفرادی آزادی اور سب کے مساوی حقوق کے [illegible] دیئے

جاگیروں اور زمینداری نظام کی بیخ کنی سے جاگیرداری کا وجود فنا بھی ہو چکا ہے۔ ملک میں پُرامن وسائل کے ذریعہ [illegible] جمہوری اشتراکیت (DEMOCRATIC SOCIALISM) کے قیام کے تحت تین پنج سالہ [illegible] بعد چوتھے پنج سالہ منصوبہ بندی کی اچھی بُری کارگزاریاں سامنے آرہی ہیں اور اُن سے [illegible] ملک میں کافی ترقی بھی ہوئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن ہمہ گیر ترقی اور سود مندی کے ساتھ ساتھ [illegible] بے اطمینانی کا احساس [illegible] ہے۔ یہ ایک بڑی عجیب بات ہے۔ درحقیقت زندگی سے متعلق کسی اعلیٰ آدرش کے فقدان میں زندگی میں اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ [illegible] اور یاس انگیز حالات کا پیدا ہو جانا لازمی ہے۔ ہم جمہوریت کی دُہائی دیتے ہیں۔ لیکن اُس میں اور ملک میں مروجہ سماجی، مذہبی اور اقتصادی فرق و امتیاز اور ناہمواریوں کے مابین کوئی تناسب اور توازن قائم نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان جیسے اقتصادی نقطۂ نظر سے پسماندہ اور اپنی مخصوص روایتوں میں پرورش یافتہ ملک کے لئے جمہوری نظامِ حکومت مناسب ہے بھی۔ اس کی بابت مختلف مفکرین فکر مند ہیں۔ قومی سطح پر منظم ایک طاقت ور اور موثر حزبِ مخالف کے فقدان نے ویسے بھی ملک کی جمہوریت کو ایک عجیب شکل دے رکھی ہے جو انگلینڈ اور امریکہ کی جمہوریت سے مختلف ہے پھر موبندگی، فرقہ پروری، کنبہ پرستی، زبان پسندی، ذات اور حکومت بازی اور ملک کے وسیع النظر فلاح کے برخلاف پارٹی کی محض بہبودی کی بدترین لعنتوں سے جذباتی ہم آہنگی اور ہمہ گیر اتحاد کے فقدان سے ملک علٰحدہ پریشان ہے۔ مزید برآں خودغرض اور مفاد پرور ضمیر فروش لوگوں اور نقلی چہرے لگائے لیڈروں سے ملک بھرا ہوا ہے۔ بنیادی ضرورتوں کی اشیاء کی روزافزوں قیمت سے حالات اور بھی دگرگوں ہو گئی ہے۔ زندگی کا شیرازہ منتشر ہوتا ہوا نظر آرہا ہے۔ ملک جیسے جیسے صنعتی تیز رفتاری سے ہم آہنگ ہوتا جا رہا ہے ویسے ویسے پرانی قدروں کا زوال ہوتا جا رہا ہے اور نئے اقدار کو قائم کرنے کا مسئلہ پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ آزادی کے ایام کے آدرش کی آب و تاب کے ماند پڑنے سے دورِ حاضر کا ادیب و شاعر خود کو ایک عجیب سے تذبذب آمیز کیفیت میں مبتلا پا رہا ہے۔

درحقیقت ۱۹۴۷ اور اس کے بعد کی قومی زندگی کے سیاق میں اردو کے ادیب و شاعر کے ذریعہ انسانی عظمت کی لن ترانی کچھ عجیب سی لگتی ہے۔ آزادی کے بعد ذاتی مفاد، بے یقینی، عدم سلامتی، حرماں نصیبی، فریب شکستگی اقدار کی بے حرمتی، ذہنی بے چینی، تذبذب، کشمکش اور بے اطمینانی سے معمور فضا کے باعث متوسط طبقہ کے ادیبوں اور شاعروں کے دل و دماغ دونوں ہی کانپ اٹھے ہیں۔ خود ان میں بھی سچی ریاضت اور صداقت کا فقدان ہے۔ ریاضت کے بجائے وہ سہل انگاری، تشہیر پسندی اور عشرت کوشی کے متلاشی ہیں۔ متوسط طبقہ کا نوجوان بھوک اور کرپشن سے بدحواس ہے۔ ایسے معاشرہ میں اُردو کا ادیب خود کو کھویا ہوا پاتا ہے۔ اور جب وہ اپنی ذات کو محور مان کر انسانیت کی وحدت کو کھوجنے اور اُس کی ازسرِنو قدر و قیمت کو متعین کرنے نکلتا ہے تو اُس کی غیر معمولی ہمت کی داد دینی پڑتی ہے۔ پریم چند نے "گؤدان" ۱۹۳۶ میں ہیرو سے مبرّا معاشرہ کا تصور کیا تھا۔ آزادی کے بعد بہت حد تک ویسے ہی حالات اپنے ملک میں پیدا ہو گئے ہیں۔

اپنے چاروں طرف کی اس ماحولی جبریت سے سراسیمہ ہو کر اردو کے ادیب و شاعر کے دل میں شدید ردعمل پیدا ہوئے ہیں۔ انسانی اقدار، اخلاقیات، اور عدم اخلاقیات، سائنسی اور تکنیکی ترقی کے مابین بھوک، نئے حالات میں جنسی رشتے اور دوسرے مسائل کے مختلف پہلوؤں کے وہ حل تلاش کرنے کے متمنی ہیں۔ اردو کی نئی کہانیاں، ناول، نظمیں اور ایک بابی

ذرائع اس شدید ردعمل کے بین ثبوت ہیں۔ یہ تازہ کار ردعمل [illegible] تسلیم،
ماحول اور ذہنی کیفیت کے مطابق مختلف نوعیت کا حامل ہے۔ نئے انسان اور سماجی شعور [illegible] کی تلخ
ناآسودگی کے ساتھ ساتھ عقلیت نے اس کے دل کے خوابیدہ تاروں کو بیدار کر دیا ہے۔ نیا ادیب [illegible] اند
ور باہر کے تضاد کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے ایک نئے صحت مند زندگی کے فلسفہ کی تشکیل کا متمنی [illegible] شکست ذہنی
پیچیدگیوں، کرب، تضاد، حرماں نصیبی، شکست خوردگی اور بے دست و پائی کے بارہ [illegible] اور داخلی
یک بہت بڑا موڑ لیا ہے۔ اس کا خاص رخ ہی بدل رہا ہے۔ وہ تہذیبی روایتوں کا از سر نو جائزہ [illegible] چاہتا ہے
چونکہ وہ انسان کو انسان سے علیحدہ کرنے والی جغرافیائی اور تہذیبی دیواروں کو منہدم کر دینا چاہتا ہے۔ اسی لئے اس
فن میں تجریدیت کا غلبہ بڑھتا جا رہا ہے۔ نئی نظموں اور کہانیوں میں یہ تجریدی کیفیت آسانی سے دیکھی جا سکتی ہے۔ اس
ساتھ ساتھ موضوع، اسلوب، تکنیک، زبان وغیرہ سبھی میں آج نیا پن اور نئی آویزشوں کے باوجود زندگی کی حرارت
ور بوقلمونی برقرار ہے۔ جوگندر پال، غیاث احمد گدی، کلام حیدری، محمد عمر میمن، بلراج مینرا، سریندر پرکاش، احمد
یشی، کمار پاشی سے لے کر شوکت حیات اور علی امام تک افسانوں کی زبان میں ایک نئی تجربا تازگی اور برجستگی کا شدت
سے احساس ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تنقید کی زبان و بیان تک میں یہ کیفیت در آئی ہے۔ ان نئے پن کو وحید اختر، باقر مہدی
اکرم عقیل، شمس الرحمن فاروقی، نظام صدیقی، وہاب اشرفی، عمیق حنفی، محمود ہاشمی، شمیم حنفی سے وارث علوی تک
کے یہاں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مگر خصوصی طور پر شاعری کے آہنگ میں تکنیک اور بیان میں تیکھا پن، جدت وغیرہ،
بول چال اور دوسری چونکا دینے والی باتیں اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ ہوا کا رخ کس طرف ہے اور بیان و اظہار کی
نئی قسمیں اور بندشیں پیدا ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ نئے حالات کے اتار چڑھاؤ کے تحت ایک بار زبان پھر ریختہ اور نیا لائحہ
فکر و نظر ابھرنے کا علامیہ ہے۔ یہ ایک زندہ اور نامیاتی حقیقت ہے کہ نیا ریختہ اردوئے معلّیٰ کا مثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ اسے
جامع مسجد کی سیڑھیوں کے سند کی ضرورت کے تحت ماضی کی طرف مراجعت کی ضرورت ہے۔ اور نہ فرنگی محل کے ثقاہت
۔ اس میں عربی اور فارسی آمیز عالمانہ وضع کے برخلاف وہ بے ساختگی اور برجستگی پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے جس کو عصریت
سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا آج کے حالات کی آتشیں بھٹی سے ایک ایسی لچک دار زبان نکلتی ہوئی نئے سانچے میں ڈھل کر آ رہی
ہے جو بے حد کھری، تر و تازہ اور اصلیت میں رچی بسی ہے۔ سودا، غالب، جوش، ابوالکلام، خواجہ عبدالحکیم اور اقبال
وغیرہ سے بہت دور اب الفاظ کے ان فطری اوصاف کی لو کو ابھارنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ جس سے ہر نوعیت کے
نی، تخلیقی، انفعالی اور حسی اشارات و کنایات میں نئی تابندگی پیدا ہو جو تخلیقی بلاغت کا انتہائی درجہ ہے۔ آج
کے غزل گو کے یہاں بھی شعری زبان کا تصور بہت ہی زندہ اور متحرک نامیاتی باریکیوں کا حامل ہے۔ باقر مہدی کی
غزلیں اس کی اچھی مثال ہیں۔ وہ بول چال کی زبان کو شاعری کی رمزیت دینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ان کے ایک شعر
الفاظ کے نپے تلے شائستہ و باشعور استعمال اور اظہار کی کیفیت آفرینی ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں کمیت و تجریدیت
سماجی رومانویت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ شاعر کے اپنے ذاتی تجربات کا سیاہ ہیولیٰ بھی ہے ؎

ہر طرف پھیلی ہے یہ کیسی ہری تاریکی　　　کیسے رگ رگ میں خموشی کا اندھیرا ٹھہرا —— باقر مہدی

یہاں الفاظ اور صوتی تصاویر کے پیچھے کارفرما شاعر کے مافی الضمیر کی اہمیت فزوں ہو جاتی ہے اور الفاظ صرف آرٹ کار کی سطح سے بلند ہو کر جیتے جاگتے متحرک کردار بھی بن جاتے ہیں۔ ہر صوت و لفظ اپنی جگہ طلسمات اور رنگ کا ایک نقطہ بن جاتا ہے۔ الفاظ کے ارتقائی اور حرکیاتی شعور کی کارفرمائی بشیر بدر کے ان اشعار میں دیکھئے جس کے باعث اُن کے معمولی احساس اور شعلۂ احساس فکر و صوت کا تانا بانا کتنا چست اور موثر ہے :

وہ شہسوار بڑھا، رحم دل تھا میرے لئے
بڑھا کے نیزہ زمیں سے اُٹھا لیا مجھ کو

عظیم دشمنو! بڑھا تو چلاؤ موقع ہے — ہمارے ہاتھ ہماری کمر کے پیچھے ہیں

زمیں نے مانگ لیا آسماں نے چھین لیا — ہمارے پاس نہ اب جسم ہے نہ سایہ ہے

دونوں کو پیاسا مار رہا ہے کوئی یزید — یہ زندگی حسین ہے اور میں فرات ہوں

آئی ہوئی دُلہن کے آگے جو رکھ گئی — اُس ماں سے یہ نہ کہنا بقیدِ حیات ہوں

ایک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم اپنا پیغام لاتی تھی موجِ رواں
آج دو ریل کی پٹریوں کی طرح ساتھ چلنا ہے اور بولنا تک نہیں

وہ خشک ہونٹ ریت سے نم مانگتے رہے — جن کی تلاش میں کئی دریا گزر گئے

——— بشیر بدر

پتھروں کا خوف اس کی جان کا دشمن ہوا — کون پوچھے کیوں لگائی اس نے شیشے کی دکاں

——— پرکاش فکری

تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے — مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے

——— خلیل الرحمن اعظمی

پتھر کی قبا پہنے ملا، جو بھی ملا ہے — ہر شخص یہاں سوچ کے صحرا میں کھڑا ہے

——— زبیر رضوی

اس حادثہ کو سن کے کرے گا یقیں کوئی — سورج کو ایک جھونکا ہوا کا بجھا گیا

——— شہریار

بدن میں پگھلتی رہی چاندنی — لہو میں سلگتی رہی دوپہر

——— عادل منصوری

رکھتے ہو اگر آنکھ تو باہر سے نہ دیکھو — دیکھو مجھے اندر سے، بہت ٹوٹ چکا ہوں

——— محمد علوی

کٹے ہوئے جسموں کے خوں سے پالی بھولی بھالی کرچیں — خود کو سمجھ بیٹھی ہیں بھٹکی روحوں کی رکھوالی کرچیں
کس نے ہم کو توڑ پھوڑ کر سارے جگ میں بانٹ دیا ہے — اب جس سے ملتے ہیں اس میں پاتے ہیں ہم اپنی کرچیں

——— آزاد گلاٹی

وہ مجرم ہوں کہ جسے موت سے ڈرا ہوں — اب [illegible]

— [illegible]

چاروں طرف بکھیں تلسم ہارن بج اٹھے — رستے کے بیچوں بیچ وہ لڑکی ٹھہر گئی

— عادل منصوری

نیند کی کانی تو آنکھوں میں ابھی ہے لیکن — سونے دیتا ہی نہیں گرم ہوا کا جھونکا

— سلطان اختر

گھر بھی جلا، لہو بھی بہا پھر یہ حکم ہے — فریاد مت کرو، یہ کوئی حادثہ ہوا

— وحید اختر

آج کی تازہ کار نظموں میں بھی الفاظ کی اپنی الگ فضا اور کیفیت ہے جو ترقی پسندوں کے پُر رعب اور پُر از طراق الفاظ کی گھن گرج اور للکار سے جداگانہ کردار کا حامل ہے۔ اب الفاظ کے علامتی استعمال اور شعر میں جادو گری اور رمزیت کی طرف زیادہ توجہ ہے۔ جس کے باعث الفاظ کی فضول خرچی کے بجائے کفایت شعاری کا چلن عام ہو رہا ہے [illegible] شمیم کی مندرجہ ذیل احتجاجی مگر علامتی گھٹی ہوئی نظم کتنی موثر اور کارگر ہے۔

خون

کالے آسمانوں کے نگر میں
روشنی بن کر بکھر جانے سے پہلے
بہ گیا !
خون

ہاتھوں کا پسینہ بن کے
سوکھی دھرتیوں کے تن پر
کچھ بوٹے اُگا لینے سے پہلے
بہ گیا

خون
میری عمر کے لوگوں سے بہتر
نسل کی تخلیق کرنے
آہ کتنی چھاتیوں میں دودھ بن جانے سے پہلے
بہ گیا !

خون

میرے فن کی داسی، انگلیوں میں
اور کچھ تحریر کر لینے سے پہلے
جل نہ جائے !
جل نہ جائے !

مزید افہام و تفہیم کے لیے عمیق حنفی کی نظم "جنگل" کے کچھ بند ملاحظہ فرمائیے جس میں انھوں نے اپنے اسلوب کی شعریت کو ہندی اور سنسکرت شاعری کی فنی آگہی اور غنائیت سے مخصوص اور منفرد آہنگ عطا کیا ہے :

وہ لچکتی فصل کے پہلو میں کہنی مار کر کلکاریاں بھرتی ہوا
چھن چھنا کے اُٹھتے ہیں، چم چماتے تار
ٹیپ پر جاتی ہے بل کھاتی ہوئی آواز
چھڑ گئی ہو دور جیسے جلترنگ
جیسے پانی میں ہزاروں مچھلیاں ایک ساتھ کودیں اور چادر چیر جائیں
جیسے پکے کام والی ساڑیاں لہرائیں، سرسر سرسرائیں
گن گنائیں جیسے بھینسوں کے ہجوم
گنگنائیں سرمدی نغمے نجوم
وہ سنہری چولیوں میں کسمساتے گول اُبھرے سانولے ٹیلے
گول اُبھرے سانولے ٹیلے، سنہری تنگ روشن چولیاں
کسمساتے گول اُبھرے سانولے گدرائے بھاری سخت ٹیلے
وہ سنہرے پن کو یاں واں پھاڑ کر خود پھٹ پڑا ہے شیام رنگ
پارسے ہے چاک چولی، جھانکتا ہے سانولی دھرتی کا رنگ
[یاد آتا ہے یہاں تشبیہ کا سمراٹ کالی داس]

اسی نوعیت کی خوب صورت مثال کمار پاشی کی نظم "گھٹن" ہے۔

سمندر چار طرف گمبھیر
کہ جس پر اُڑتی جائے سمیر
بیچ میں دھرتی جیسے راکھ
کہ جس پر جنگل، کھیت پہاڑ

کہیں پہ چُپ چاپ، گُم سُم گاؤں ـــــ سکون کی چھاؤں
کہیں پہ شہروں کا ہے شور
سُلگتی رات ـــــ دُکھتی بھور
جاگتی گلیاں اور بازار
لگا ہے لوگوں کا انبار

نصر قریشی کی طویل نظم " اگنی کنڈ " آخری بند بھی زبان و بیان کے نئے ابعاد کے مظہر ہیں۔

اندر سبھائیں، کھیل تماشے، کیسے کیسے میلے ہیں
رُوپ کا اُجلا پن رکھنے کو کیا کیا ناٹک کھیلے ہیں
تن من کے سُکھ چین کی خاطر دنیا کے دُکھ جھیلے ہیں
پھر بھی ہر محفل میں تنہا، ہر میلے میں اکیلے ہیں

درد کے موسم، رات اور دن بھی کیا کیا رنگ بدلتے ہیں
آج کے وعدے، کل کے سپنے، لاوا بن کے پگھلتے ہیں
مَن کے کجلی بن میں کتنے ناگ، جواب بھی پلتے ہیں
نظمیں، غزلیں، گیت اور دوہے اگنی کنڈ میں جلتے ہیں

جانے کب اس اگنی کنڈ کو آکر کوئی توڑے گا
ساگر کے کھارے پانی میں امرت پانی گھولے گا

علوی کے یہاں زبان و خیال کی چونکا دینے والی تازگی، نکھار، غیر رسمی بے تکلف اظہار کی سادگی اور عصریت حد درجہ جاذب توجہ ہے:

" کہاں جاتے ہو" رستہ ٹوکتا ہے
گلی کا موڑ کہتا ہے " رُکو بھی "
" کہو کیسے ہو " کھڑکی پوچھتی ہے
مگر کچھ دن سے گونگی ہو گئی (گونگی)

شہر یار کی ابتدائی ایک نظم دیکھنے کے بعد عادل منصوری کا " اپنے والد کے انتقال پر " اپنی نوعیت کا اولین انتہائی انوکھا

اور مکمل مرثیہ شعری زبان و بیان کے نئے ڈائمنشن کی رو سے دیکھتے چلئے۔

اندھیرے کا سر جو اُجالے کی تلوار سے کاٹتی تھی
سیہ بختوں کو روشنی بانٹتی تھی
جو تنہائی کی کھائی کو پاٹتی تھی
اس آواز کو بھی ہوا کھا گئی ہے
قیامت بہت ہی قریب آگئی ہے

ـــــ والد کے انتقال پر ـــــ

وہ چالیس راتوں سے سویا نہ تھا
وہ خوابوں کو اونٹوں پہ لادے ہوئے
رات کے ریگزاروں پہ چلتا رہا
میز پر
کانچ کے ایک پیالے میں رکھے ہوئے دانت
ہنستے رہے
کالی عینک کے شیشوں کے پیچھے سے پھر
موتئے کی کلی مسکرانے لگی
آنکھ میں تیرگی مسکرانے لگی
سبز پانی کی سیال پرچھائیاں
لمحہ لمحہ
بدن میں اُترنے لگیں
روح کا ہاتھ چھلنی ہوا
سوئی کی نوک سے
خواہشوں کے دیئے
جسم میں بجھ گئے
گھر کی چھت میں جڑے
دس ستاروں کے سائے تلے
عکس دھندلا گئے
عکس مرجھا گئے

آج کل کی بیشتر نظمیں بے تکی ہیئت پرستی یا بے معنی لسانی شکست و ریخت [illegible] کی پامال زدہ مثالوں کی افراط و تفریط میں سلیمان اریب کی نظم "تم کس سے ملنے آئے ہو" کے زبان و بیان [illegible] بے ساختہ گفتگو کی ایمائی شاعری ہی شاعری معلوم ہوتی ہے۔ پہیلی اور پیکر تراشی اور اس کے آخری مصرعے خود کلامی کے ایسے سادہ سیمیائی اشارے ثابت ہوتے ہیں جو دورِ حاضر کے انسان کی تہہ در تہہ پہلو دار اور پیچیدہ شخصیت کے بکھرے رنگ کے حامل ہیں اور عصریت کی برتر مثال فراہم کرتے ہیں :

تم کس سے ملنے آئے ہو
اُس انساں سے جس کے اندر
ایک قاتل ، زانی ، سارق کے
تینوں چہرے ایک ہوئے ہیں
لیکن اُس کے ہاتھ بندھے ہیں
پیروں میں زنجیریں پڑی ہیں
اور وہ قاتل اب بزدل ہے
اور وہ زانی اب شوہر ہے
اور وہ سارق اب منصف ہے
تم کس سے ملنے آئے ہو
میں خود اپنے آپ سے مل کر
پہروں سوچ میں پڑ جاتا ہوں
کس چہرے سے بات کروں

سلیمان اریب کے مانند دوسرے نئے ادیب شاعر اپنے خارج و باطن کا تجزیہ کر کے فکر مند ضرور ہو جاتے ہیں لیکن وہ انسانی زندگی کی بنیادی اندرونی وحدت اور نئے بھٹکتے ہوئے نامیاتی آہنگ کی تلاش میں کوشاں ہیں۔ انھوں نے اس بڑی ذمہ داری کو نہایت خندہ پیشانی سے قبول کیا ہے ۔ وہ عصری دور کے عذابوں کو برکتوں میں تبدیل کر دینے کے متمنی ہیں۔ وہ اپنے کو ، فرد کو اور سماج کو سکون اور مسرت عطا کر کے اس دوزخ کو جنت میں بدلنے کا ایک اور خواب دیکھنے کے خواستگار ہیں۔ عالمی اور آفاقی تہذیب کے پس منظر مختلف تعصبات سے بالا ہو کر نئی انسانی قدروں کی تشکیل کے ساتھ ساتھ ذمہ دارانہ شخصی آزادی، عوام کی بہبودی اور اس کی ترقی اور آزادانہ فکر کے ذریعہ زندگی کے تمام پہلوؤں کی خیر آگیں تخلیق ان کا مطمح نظر ہے۔ تھوڑی سی ذہنی نامردانگی اور تذبذب آگیں کیفیت کی کارفرمائی تو ان میں ضرور ہے ۔ لیکن اُس کے ساتھ ہی انسانی عظمت اور شرف کا دبا کچلا احساس بھی ان میں موجود ہے ذاتی بھر توسیع کا بھی خواہش مند ہے۔ تاریخ کی رفتار کو متعین کرنے کا ان میں حوصلہ ہے۔ اس ذمہ داری کو سنبھالنے میں

بہت سے لوگ مادی منفعت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ کافی لڑکھڑا رہے ہیں اور کچھ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جانے پر بھی للکار رہے ہیں۔ اُمید ہے انہیں بھی راستہ مل جائے گا اور وہ اپنی تخلیقی قوتوں سے سرشار ہو کر مثبت رویہ اور اتحاد باہم آہنگی کے شدید جذبے سے زندگی کو متحرک کر سکیں گے۔ اُس کا جواب مستقبل کے بطن میں ہے۔

انسانی قدروں کی تحقیر و تردید اور اخلاقیات کے سوانگ اور دھوم دھڑاکا کے مابین رہتے ہوئے عام اردو کے ادیب و شاعر کے ایک ہاتھ میں اس وقت تعمیر کی شمع فروزاں ہے اور دوسرے میں تخریب ۔ وہ یقینی طور پر بت شکن ہے۔ لیکن وہ معبد زیست میں انسانیت اور ملک کے ایسے اصنام بھی تراشنا چاہتا ہے جو اُبھر کر شکن کئے جا سکیں اور جو نئے ہونے کے ساتھ ساتھ روایت کے اعلیٰ ترین عناصر سے مزین ہوں۔ کچھ باہم متناقض باتیں ہوتے ہوئے بھی اس کی شدید آرزو انسانیت کو زندہ رکھنے کی ہے تاکہ وہ خود کو اور عام آدمی کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک زندہ رکھ سکے۔ اور زندگی کا کارواں خوب سے خوب تر کی تلاش میں اپنے سفر مدام سفر میں نہایت سرگرمی سے آگے بڑھتا رہے۔ ظاہر ہے جہاں پہلے بھی زندگی کا کارواں روایت کے بجائے تجربہ ہی کے ساتھ تھا اسی طرح اب بھی ہے اور ترقی تو زندگی کا ہی پر تو ہے جو ہمیشہ اُس کے ساتھ رواں دواں رہتا ہے ۔ ●●

اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ ان تمام حضرات سے مضامین نظموں اور خاکوں کی درخواست ہے جو جناب احتشام حسین مرحوم کی زندگی کے کسی گوشے سے واقف ہوں۔ اس نمبر میں شائع ہونے والی تمام غیر مطبوعہ تخلیقات پر ادارہ مناسب معاوضہ نذر کرے گا۔

کلام حیدری

گمنام شہری

W. H. AUDEN

[illegible] آڈن
[illegible] رشید

محکمۂ اعداد و شمار نے بتایا کہ اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں تھی
چال چلن سے متعلق تمام رپورٹ اس بات پر متفق ہیں کہ
وہ نیک تھا ۔ (اس فرسودہ لفظ کے جدید معنوں میں)
زندگی بھر انسانیت کی خدمت اس کا نصب العین رہا
وہ جب تک ملازم رہا
ایک ہی کارخانے میں کام کرتا رہا
ترک ملازمت کی نوبت نہیں آئی
[illegible] مالک اس سے خوش تھے۔ فج موٹر کمپنی والے
اس کے رو سے خوشامدی یا سنکی نہیں تھے
یونین کے چندے دیا کرتا
(اور ہماری رپورٹ ہے کہ اس کی یونین تگڑی تھی)
ہمارے سماجی نفسیاتی کارکنوں کا کہنا ہے کہ
وہ اپنے دوستوں میں مقبول تھا اور کبھی کبھی تھوڑی سی پی لیتا تھا
پریس والے اس بات پر مطمئن ہیں کہ وہ ہر روز اخبار خریدتا تھا
اور اشتہارات کے متعلق اس کے ردعمل ہر طرح سے نارمل تھے
اس کی پالیسیوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بیمہ شدہ تھا
صحت کے کارڈ سے ظاہر ہے کہ وہ ایک بار ہسپتال میں داخل ہوا تھا
اور صحت یاب ہو کر نکلا

"معاشیاتی تحقیق" اور "اعلیٰ زندگی" والوں کا کہنا ہے کہ
وہ قسط کے پلانوں سے واقف تھا
اور جدید آسائش کے تمام اسباب اس کے پاس تھے
ریڈیو گرام ، گاڑی ، ریفریجریٹر
'رائے عامہ' کے محققوں کی رائے ہے کہ
اس کی رائیں موسم اور سال کے عین مطابق تھیں
جب امن ہو تو وہ امن کا حامی تھا جب جنگ ہوئی تو وہ گیا
شادی شدہ تھا اور اس کے پانچ بچے تھے
اصلاح نسل کے ماہرین کہتے ہیں کہ اس نسل کے والدین کے لئے
یہ مناسب تعداد تھی
اساتذہ کی رپورٹ ہے کہ وہ ان کی تعلیم میں کبھی مداخلت نہیں کرتا
کیا وہ خوش تھا؟ کیا وہ آزاد تھا؟ یہ سارے سوالات بیکار ہیں۔
اگر ایسی ویسی کوئی بات ہوتی تو ہمیں ضرور خبر ہوتی

● ●

یوتوشنکو
وحیدالحسن

بات

لوگ کہتے ہیں کہ ہو باہمت
مگر میں نہیں
مجھ میں جرأت نہیں
میں نے سوچا نہیں
دوسروں کی طرح اپنی تذلیل خود ہی کروں
اور اس سے اساطیر میں
کوئی بھونچال آیا نہیں
جھوٹی شوکت پہ ہنستا رہا
اور لکھتا رہا
کسی کی مذمت بنا
اور جو کچھ کہ سوچا کیا
پیش کرتا رہا
اور جو اس کے لائق ہے
ان کی تائید کرتا رہا
بے بصر سے ادیبوں کی تنقید کرتا رہا
جو کسی طرح لکھ ڈالنے کو ادب ہی سمجھتے رہے
اور وہی چاہتے ہیں
کہ خود کو میں جرأت کا پیکر کہوں
آئندہ نسلیں تو شرمائیں گی
بدلہ جو لیں گی ہمارے ان آسیبی کرتوت کا
اور سوچیں گی کیا سے تھا
جو ایمان داری بھی جرأت سے موسوم تھی

●●

جنم دن

ماں! مبارک ہو تجھ کو
تیرے بیٹے کا یہ جنم دن
تیری پریشانی کا
جو باعث بنا،
یہاں یہ پڑا ہے
جو کماتا ہے کم
جس کی شادی نہ ہوتی
تو اچھا ہی ہوتا
جو لمبا تو ہے
مگر ہو رہا ہے نحیف
جس کی داڑھی بڑھی ہے
جو کس بے بسی سے
محبت سے تکتا ہے تجھ کو
ماں، مبارک ہو تجھ کو
تیری پریشانی کا یہ جنم دن
جس نے پایا ہے تجھ سے
زمانے سے کرنا محبت
مگر رحم ہرگز نہ کھانا
ہاں، انقلاب، اس کا بھی ایمان ہے
جس پہ نازاں ہے یہ اور جس پہ اٹل ہے
تو نے خوش حال اسے کو بنایا نہ مشہور
مگر تو نے اس کو بہادر بنایا ضرور
کھڑکیاں کھول دے
اور آنے دے آواز چڑیوں کے چہکار کی
ایک بوسے سے تو کھول دے اس کی آنکھیں
اس کی کاپی و دوات اس کو دے دے
اور دودھ کا ایک پیالہ
پھر دیکھ جاتا کہاں ہے ●●

جھوٹ

جھوٹ بچوں کو سکھانا ہے غلط
جھوٹ کو سچا بتانا بھی غلط
اور یہ تو ہے یکسر غلط
کہ خدا ہے آسماں پر
اور زمیں پر چین ہے
کیونکہ بچوں کو معلوم ہے
حقیقت ہے کیا
بچے بھی آخر تو انسان ہیں
اُن کو بتاؤ
ہماری مصیبت کی سیما نہیں
اُن کو فرداسے کرتے ہوئے آشنا
آج کی ہر حقیقت کو ظاہر کرو
انھیں یہ بتاؤ
غموں اور تکالیف
راہ کی ٹھوکروں کے مقابل
وہ سینہ سپر ہوں
اور ان کا کریں سدّباب
جس نے قیمت خوشی کی چکائی نہیں
اُس کا حاصل خوشی تو نہیں
غلطی کا معاف کرنا غلط
یہ خود کو دُہرائے گی اور بڑھے گی
اور بچے ہمارے
معاف کرنے سے مجبور رہیں گے
جو ہم معاف کرتے رہے ہیں

● ●

یوتوشنکو
وحید الحسن

[illegible] رنگ

میری شکست میں کسی زیست کے [illegible]
تمہارا چہرہ جو ضوفشاں ہوا تو
میری کم مائیگی کا احساس جاگ اٹھا
جب اس کی کرنوں نے جال ڈالے
سمندروں ، دریاؤں ، جنگلوں پہ
تو میں نے دنیائے رنگ میں پہلا قدم اٹھایا
مجھے تو رنگینیٔ جہاں کا کوئی پتہ نہیں تھا
میں ڈر رہا ہوں
ابھی ابھی جو سورج سے جہاں پہ چمک اٹھا ہے
معدوم ہو نہ جائے
میں جس حقیقت سے آشنا ہوا ہوں
جو میرے آنسو چھلک پڑے ہیں
جو جذبۂ مسرت میں محسوس کر رہا ہوں
ختم ہو نہ جائے
میں اس سے نبرد آزما نہیں ہوں
مجھے خوف سے محبت سی ہو گئی ہے
میں اس کی آمد کا بھی کچھ جا رہا ہوں
مجھے کچھ اس کے سوا ملا نہیں ہے
میں نگہبانیٔ محبت جو کر رہا ہوں
خوف نے ہر طرف سے حصار ڈالا
وقت محدود ہے ، مجھ کو معلوم ہے
میری آنکھوں میں چھائے ہوئے رنگ
تیرے چہرے کے ڈھل جانے سے
ختم ہو جائیں گے

● ●

یوسف اعظمی

وٹ سائیڈر

میں ہوں دھرتی کا بے نور سایہ
روح کے بند ہیں سب دریچے
ذہن کی ڈور میں جھولتا ہے
ملگجی روشنی کا پنڈولم
روشنی کے منحنی دائرے میں
آسماں کھول دے
ایک کھڑکی ذہن میں،
کتنی صدیوں کے سپنے
پیاسی آنکھوں میں گھلنے لگے ہیں
سائے، آواز، پیاسے سمندر
روشنی گھل گئی ہے

یہ بے جسم
لمحے کتنے پراچین دُکھ کے پھیلے برگد کی پرچھائیاں
ذہن میں اک چتا جل رہی ہے
اور احساس ذرّوں کی مانند
بیکراں وقت کے ساحلوں سے
اس سمندر کو تکتا ہے جس سے
دودھیا چاندنی جیسی آنکھیں
ایک سورج سے ٹکرا گئی تھیں
منحنی دائرے کے لبوں پر
چیختی ہیں شفق کی لکیریں
ایک اندھیرا، مسلسل اندھیرا
ہاتھ کی ان لکیروں میں جکڑا
میں کہاں تک اندھیروں میں بھٹکوں
ہاتھ، اندھیرا، لکیریں
——— مقدّر

●●

بیسویں صدی

خواب : چھائیوں کے پیراہن
جسم : کافرشباب کی خوشبو
ذہن ——— ایک کیمرے کی تازہ آنکھ
آرزو ——— اسٹریپ ٹیز کا جنگل
حاصل ——— اک ڈھول پیٹتا وحشی

●●

کیا کروں ؟ پھر [illegible] ہے
اور پھر جب سوچتا ہوں
دھیان یہ آتا ہے مجھ کو
آرزوئیں میرے مردہ جسم کو بھی بخشنے والی تھیں
اس کا یہ مطلب ہوا !
آرزوئیں بھی مری مانند ہیں آشفتہ جاں آشفتہ حال

••

یوسف جمال

آرزوؤں کی شہرت

ایک دن ایسا ہوا ! آرزوؤں کے سلگتے زخمے کو کاٹ کر
اپنے ہاتھ کی مفلوج قوت سے دبائے
اس کو اک اندھی گپھا میں پھینک آیا ، جس جگہ مایوسیوں کا زمزمہ تھا
(تھی امانت جس کی اس کو سونپ دی)
لیکن آخر یہ ہے کیا ؟
ٹھوکروں پہ ٹھوکریں یہ کون مجھ کو مارتا ہے پے بہ پے
دھندلی آنکھوں سے جو دیکھا غور سے
آگئی ہیں لوٹ کر وہ آرزوئیں جن کو میں اندھی گپھا کی سلطنت میں
چھوڑ آیا تھا ، انہیں شہری بنالو آج سے
اور مجھ سے کہہ رہی ہیں !! ایسی بھی کیا بے رُخی ؟ کیا ہوگئے بیگانہ ہم
یاد کر ان ساعتوں کو ، کرب کے ان تیکھے لمحات کو
جبکہ تو مایوسیوں کے غار میں دھنستا ہی جاتا تھا مدام
تجھ کو دیتے تھے نیا اک حوصلہ
ہم اڑاتے تھے تجھے امیدوں کے اونچے فلک پہ
سوچتا ہے کیا ؟
سو گیا ہو تو جگا دے اپنے اس احساس کو
اور پھر سے راہ آنے کی ہمیں ، ہم تجھے دیں گے سکونِ لازوال
تیرا ہے جب تک وجود
ہم نہ چھوڑیں گے تجھے
ہم تعاقب میں ہیں تیرے بھاگتا ہے تو کہاں
ہم ترے پیچھے رہیں گے ، تجھ کو دوڑاتے رہیں گے جسم خاکی میں ترے جب تک ہے یہ روحِ رواں
اور میں یہ سوچتا ہوں دہشتوں کے سائے میں بیٹھا ہوا
کیا انھیں پھر ہونے دوں کاشانۂ دل میں مکیں ؟

حسین سہروردی

اشتراط

شاید بہ ہوش و حواس
سارے کاریہ کرم انجام تک پہنچے
تو ممکن تھا کہ خوشحال ایام کی صورت نصیب ہوتی
لیکن حماقتوں نے
بے وقوفی ، نا اہلی اور کمزوریوں کو مدعو کیا
عجب وقت تھا کہ دست حنا سے محروم ہوگئے
(کفِ دست ملتے رہ گئے)
موسم بہار کی خوش فعلیاں مردم میں جاوداں رہیں گی
اور مرغزار کے لمحوں کی مسرت انگیز کہانیاں
ڈھیر ڈھیر مشریہ کے ایک اک انگ سے اتر جائیں گی
کیوں کہ
اپنی ہی صداقتوں نے ، اپنے وجود کا ناس کر دیا ہے
تو اسے ہمیشگی کے سپرد کر دو
چپ انداز صداقتوں سے احتراز

••

مقتل

روشنی کے ساتھ ہی
سخت ہاتھوں میں سنبھالے اک صلیب
آگیا ہوں میں بھرے بازار میں
اس جگہ
جو بھی ہے انسان صورت
بس مرے ہی روپ کی تکرار ہے
مجھ کو ہر چہرے پہ عیسیٰ کا گماں ہے
اور ہر چہرہ مجھے یوں دیکھتا ہے
ڈھونڈتا ہو جیسے میری ذات میں
آدمی
جو اُسے مطلوب ہے

دیکھنا ہے
روشنی کی موت تک
کس کے ہاتھ اور پاؤں میں
آہنی کیلے لگیں گے

●●

عتیق انور

سائے کا قد

صبح نے اپنی آنکھیں کھولیں
سائے نے انگڑائی لے کر
جھیل کے گہرے آئینہ میں
اپنے لمبے جسم کو دیکھا

دن چڑھتے ہی سورج نے
دھوپ کی گہری چادر پر
اک چھوٹی سی بوتل میں
سائے کا قد ڈھانپ دیا

●●

ایک رُت اور

جوگندر پال

[یہ بھی وہ نہیں۔ ہوتی تو میں اسے دیکھتے ہی پہچان جاتی۔

اچھا، پہلے یہ بتاؤ، تمہیں اس سے ملنا ہے یا اُسے پہچاننا ہے؟ تمہاری مشکل یہ ہے کہ ملنے سے پہلے ہی پہچاننا شروع کر دیتی ہو، اسی لئے تمہاری اُس سے ملاقات نہیں ہوتی۔

نہیں، مجھے یقین ہے اُس سے ملتے ہی میں اُسے پہچان لوں گی۔ میں اُسے ڈھونڈ کر ہی دم لوں گی۔ آؤ، آؤ، میرا ساتھ مت چھوڑو! تمہیں اپنے ساتھ پا کر میرا حوصلہ بندھا رہتا ہے۔

میں تمہارا ساتھ کبھی نہ چھوڑوں گا۔

بس ایک بار وہ مل جائے پھر تم جو چاہو گے وہی کروں گی۔ تمہاری چاکر بن کر رہوں گی۔ بس ایک بار۔

تم میرے دل کی ملکہ ہو۔

آؤ، پہلے ہمیں اُسے ڈھونڈنا ہے —]

پیارے!

پیاری!

اب میں تمہیں چھوڑ دینا چاہتی ہوں۔ اور میں نہ چھوڑا تو مجھے یقین ہے تم مجھے چھوڑ دو گے۔

کیا تم مجھے اس لئے چھوڑنا چاہتی ہو کہ کہیں میں تمہیں چھوڑ دوں؟

نہیں، تم مجھے نہ چھوڑو گے تو میں تمہیں چھوڑ دوں گی

پر کیوں؟

کیونکہ جو کچھ بھی ہمیں کرنا تھا ایک عرصے سے ہم اُسے کر چکے ہیں، اس کے بعد سے ہم محض اپنے آپ کو دُہرا رہے ہیں

محبت! — ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں!

نہیں، ہم محبت کر چکے ہیں۔ اس کتاب کی بے تکی تکرار بالغ ذہنوں کو بچکانہ معلوم ہوتی ہے۔

تو پھر ————

تو پھر کیا، پیارے، اگر ہمیں محبت کئے جانا ہے تو ایک ہی بات ہے: ہم ایک دوسرے کو چھوڑ دیں اور نئے رابطوں کے اسباب کریں۔

...ے رہا ہے

ہاں پیارے، جب کا گیت تم نے چھوا، میں تو گزرت
ہو جاتا ہے۔ تم جو چاہو کرو، مجھے اور مجھے
ہے۔ میری خواہش ہے میرا تن ریشے ریشے وجود
[illegible] ٹکڑے ہیں ——— [illegible] ناٹ، پیارے!
[illegible] بانی فارگٹ!

لیکن ———

نہیں، جاؤ اب ——— اور مجھے بھول جاؤ۔ اور
میں بھول جاؤں گی ——— اور جب ہم ایک دوسرے
کے نہ رہیں گے تو پھر ہم اپنے اپنے لئے از سر نو ہو جائیں گے
ہم میں ایک اور گناہ کے ارتکاب کی توانائی آ جائے گی
ہم مرنے سے بچ جائیں گے۔

لیکن ———

نہیں، پیارے، ابھی سے مجھے موسیقی کا سبق نہیں رٹنا
، مجھے معلوم ہے کہ بالآخر مجھے اپنی بوڑھی ماں کی طرح
سبق رٹ رٹ کر مرنا ہے۔ مر کر مجھے سکون آجائے گا
رہوں گی ہی نہیں تو سکون کیوں نہ آئے گا لیکن جب تک
ہوں مجھے جلے جانا ہے، سارا جسم جلے جانا ہے ———
[illegible] بائی!

[ایک بار تو میں ٹھٹک کر رہ گئی کہ یہی ہے وہ!
اس میں یہ فیصلہ کن والہانہ پن نہیں، یہ جرأت نہیں!
پر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے بہتر ہو کر
ہو گئی ہو۔

نہیں، ہم اپنے آپ سے بہتر کبھی نہیں ہو سکتے۔ جو اپنے
آپ سے بہتر لگتے ہیں، وہ اپنا آپ نہیں ہوتے، کوئی اور
ہوتے ہیں ——— یہ بھی کوئی اور ہے ——— آؤ، رکو نہیں
مجھے اس کی تلاش کئے جانا ہے۔ اس کے بغیر میرے لئے
سانس لینا بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ آؤ، رک کیوں گئے ہو؟

[illegible] بھگوان ہی ہوتا اور
تو تمہیں اتنا پریشان پاکر جہاں بھی ہوتا تمہارے سامنے
ہواؤں میں سے یوں ——— ن برآمد ہو جاتا۔

ہاں، بھگوان یوں ہی برآمد ہوتا ہے، لیکن تم
بھگوان نہیں ہو اور تم کھوئے بھی نہیں۔

لیکن ———

نہیں ہمیں صرف اُن ہی کی تلاش ہوتی ہے جو ہمارے
ساتھ نہ ہوں۔ آؤ، آتے جاؤ۔ تمہارے ساتھ مجھے
لگتا ہے کہ ایک نہ ایک دن میں اُسے ضرور ڈھونڈ لوں گی
آؤ!]

میرا میاں بھی پھل بیچا کرتا تھا بابو۔ وہ مر گیا تو یہ کام
میں نے سنبھال لیا۔ اُس نے دھندا چوپٹ کر رکھا تھا لیکن
مجھے ایک منٹ کی بھی فرصت نہیں۔ ذرا سوچو بابو، سارا
شہر ٹوٹ پڑے تو اکیلی جان بے چاری کس کس سے نمٹے۔
بولو، کیا لو گے؟ میرے سارے پھل رس کے میٹھے شہد
گھونٹ ہیں۔ یہ میرے بھرے بھرے آم دیکھو بابو، ہاتھ میں
لیتے ہی زبان پر گھلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اور یہ گول
گول ناشپاتیاں، دانت ہوں، نہ ہوں، منہ میں آپ
ہی آپ دب جاتی ہیں۔ اور۔ کیا لو گے بابو؟ ——— وہ
تپتے ہوئے سیب دیکھو ——— بولو، لو گے؟ ——— مجھے اپنے میاں
کا نام بنا کے رکھنا ہے بابو۔ مجھے اپنے میاں کی قسم، میری ہر چیز
فسٹ کلاس ہے۔ جو ایک بار میرا پھل چکھ لیتا ہے، وہ
بار بار میرے پاس آتا ہے۔ نکالو، چار روپے چودہ پیسے!
ارے ساب، آپ! ——— آئیے! ——— پورے دو ورج باد اپنی
پھل والی کی دکان پر قدم رکھے ہیں آپ نے۔ میں سوچتی
رہ گئی ساب، یہ پکی ہوئی ناشپاتیاں کب تک روکے
رکھوں گی ———

[شاید یہ وہی ہے ——— نہیں، کوئی اور ہے۔

[illegible] زندہ عورت ہے !

ہاں، سانسوں کی اتنی بڑی گٹھڑی کہ ساری دنیا کے مردے جی اٹھیں، پھر نہ جانے اُس کا شوہر کیوں مرگیا۔ اُس نے سارے کے سارے سانس بیک وقت بچارے کے منہ میں ٹھونس دئیے ہوں گے۔ جس سے اُس کا دم اُلٹ گیا ہوگا۔

سنو، اپنے شوہر کو کھو کر یہ عورت جھٹ باہر سڑک میں آگئی ہے مگر مجھ میں سڑکوں پر چلتے رہنے کی ہمت صرف تمہاری وجہ سے ہے۔ تم مر جاؤ تو میں کہیں اندر ہی اندر پڑی رہوں اور میری سمجھ میں نہ آئے کہ کیسے جیوں، یا جی نہ سکوں تو کیسے مروں۔

فکر نہ کرو، تمہارے لئے مجھے ہمیشہ زندہ رہنا ہے ہر شخص اس لئے مرتا ہے کہ اُسے اپنی موت مرنا ہوتا ہے لیکن مجھے ——

ہاں، تمہیں ہمیشہ میری موت جینا ہے۔ شاید کبھی لازوال لوگوں کو اسی لئے زوال نہیں کہ اُنہیں اپنی ذات سے موت کا خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ اُنہیں اپنی ذات کے باہر سے موت پیش آتی ہے —— تم کتنے خوش قسمت ہو !

تمہاری وجہ سے ! تم ہی میرا مقدر ہو، میرا اپنا کوئی مقدر نہیں۔

مجھے خوشی ہے کہ میں تمہارا مقدر ہوں، کیوں کہ اگر واقعی میں ہی تمہارا مقدر ہوں تو تمہیں سدا میرے ساتھ ساتھ رہنا پڑے گا۔ میں سدا تمہارے ساتھ رہوں گا۔ تو آؤ، اُسے ڈھونڈے بغیر مجھے چین نہ آئے گا۔]

آپ کچھ بھی کر لیجئے ڈیڈی، میں اُسے نہیں بھولوں گی، نہیں بھولوں گی، نہیں ——

[ارے، اِدھر آؤ ! —— یہاں ! —— یہ وہی ہے !!]

[illegible] تمہاری [illegible]

آپ کیوں تکلیف کر رہے ہیں [illegible] میں آپ ہی اپنے آپ کو [illegible]۔ [illegible] جائیے، [illegible] ہو جاؤں گی تو اُسے یاد کیسے کروں گی؟ — [illegible] کر دیجئے ڈیڈی، تاکہ میں اُسے بھول جاؤں گی۔ اُسے بھول جاؤں گی؟ پہلے میری جان لے لیجئے، [illegible] جان لے لیجئے !

[یہ وہی ہے ! —— یہ تو میں ہی ہوں، [illegible] لڑکی، جس سے سارے گھر والے لاچار ہو کر رہ گئے [illegible] یہ لڑکی میرے پیچھے کہیں رہ گئی۔ کہاں رہ گئی؟ — اِدھر [illegible] اور مجھے تھام لو۔ میرا سر چکرا رہا ہے، پاؤں کانپ رہے ہیں، ذہن میں دھند ہی دھند ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا میں وہی ہوں جو تھی؟ اتنی صاف، کہ اپنی تہوں تک ایک دم نظر آجاتی۔ اُن دنوں اگر تم مجھے ملتے اور وُوڈ کی بجائے میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو جاتی تو ہمارے گلے ملتے ہی میں حاملہ ہو جاتی —— میرے میرے والدین نے وُوڈ کا بچہ میری انتڑیوں سے کھرچوا کر [illegible] تلف کر دیا اور (رو رو کر) —— اور دیکھو نا۔ وہ زخم میرے اندر ابھی تک جوں کا توں پھٹا پڑا ہے اور اُس سوراخ سے ہر مہینے باقاعدگی سے ہمارے معصوم بچے کا خون بہتا ہے۔ پہلے گاڑھا تھا اب پتلا ہوتا جا رہا ہے، ہوتے ہوتے سوکھ جائے گا۔ میں بوڑھی کھوسٹ ہو جاؤں گی تو میرے لئے بھولنا آسان ہو جائے گا۔ میں نے اپنی مرضی سے اپنے ہی جگر کے ٹکڑے کو تلف کروا دیا تھا، اپنی پوری موت سے سہم کر چھوٹی سی خودکشی کر لی تھی کہ زندہ بھی رہوں ہاں، میں زندہ نہیں ہوں، زندہ بھی ہوں اور اپنے

اپنی معصوم دجود کو ڈھونڈ رہا ہوں جس کے قتل میں
میری رضا شامل تھی ۔
صبر کرو ! ــــــ میں ــــــ !
کیوں ، کیسے صبر کروں ؟ اپنی معصومیت چھن جانے
پر جو لوگ بے چین نہیں ہوتے انہیں خدا اور شیطان دونوں
ایک معلوم ہونے لگتے ہیں ۔ اپنے ایمان کے کھو جانے پر
کم سے کم میرا بے چینی کا حق تو بنا رہنے دو ۔ کیا تم چاہتے
ہو میں اپنے کرب کے احساس سے بھی عاری ہو جاؤں ، بڑے
چین سے مسکرا کر تمہیں یقین دلاؤں ، جو کچھ ہوا ہے اُسے
یوں ہی ہونا تھا اور یوں ہی ہونا ٹھیک تھا ، اور ــــ اور
بلکہ نہایت تحمل سے اپنے بارے میں تمہیں بھی صبر کی تلقین کروں ؟
تمہارے ایمان کی سلامتی میرے ذمہ ہے ۔ تم ــــ
تم ــــ ہا ہا ہا ہا ! ــــ تم میرے ایمان کی
رکھوالی کیسے کرو گے ؟ تمہیں کیا پتہ ، میرا ایمان کیا ہے ،
کیوں اور کہاں ہے ؟ ــــ
لیکن مجھے یہ تو پتہ ہے کہ میرا ایمان تم ہو ۔ مجھے زندگی
بھر صرف یہی کرنا ہے کہ اپنے ایمان کی راہیں ہموار کیے جاؤں
ہاں ، تمہاری دیکھ بھال کے بغیر میں کچھ نہیں کر سکتی ۔
تم میرا ضمیر ہو ، میری محبت ہو ۔ میں تمہارے زوال
کی تاب نہیں لا سکتا ۔
کاش ہم اپنے زوال کی تاب لا سکتے ! جب زوال
ہی ہماری تقدیر ہے تو ــــ تو ــــ تم ٹھیک کہتے ہو کہ
مجھے صبر کرنا چاہیئے ۔ جب زوال ہی ہماری تقدیر ہے تو
اس کی تاب نہ لا سکنے سے بھی کیا ہو گا ؟ خداؤں کی موت
بھی محض اس لئے نہیں رک جاتی کہ وہ اپنی موت کی تاب
نہیں لا سکتے ، بلکہ اس سے تو اُن کی بے بسی پر اور زیادہ
یقین آنے لگتا ہے ۔ تم میرے خیر خواہ ہو ۔ دعا کرو ، میں
جلدی سے بوڑھی کھوسٹ ہو جاؤں ، سوکھ جاؤں ۔ بدن

تندرست ہو تو زخموں کا درد کھنا معلوم ہونے لگتا ہے اپنے
زوال سے مجھے راحت ملے گی ۔
نہیں ، میں تمہارے دور دور بھی زوال کو نہیں
آنے دوں گا ۔ آؤ ، میں تمہارے ساتھ ہوں تو تمہیں کیا ڈر
ہے ؟ ــــ آؤ ، ہم اپنی تلاش کو جاری رکھیں ۔
تلاش ؟ ــــ ؟ ــــ ہاں ، آؤ ، چلو ! ــــ لیکن
سنو ، جو رہا ہی نہیں ، اُسے ہم کہاں ڈھونڈیں گے ۔
حوصلہ نہیں ہارو ۔ جس خوش قسمت کو ایک بار زندگی
عطا ہو جاتی ہے وہ سدا زندہ رہتا ہے ۔ اُس کی شکلیں
صرف اس لئے مٹتی رہتی ہیں کہ نو بہ نو رہیں ــــ آؤ ، حوصلہ
نہیں ہارو ! ــــ آؤ !

تم مجھ پر بھروسہ کیوں نہیں کرتیں ؟ بولو ! ــــ بولو نا !
میں تمہیں یقین دلاتا ہوں تمہاری ہر خواہش پر اپنی جان
قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کروں گا ۔
میں ــــــــ
میں ویں کچھ نہیں ۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے تم اپنے
دل سے وہی چاہتی ہو جو میں چاہتا ہوں ۔ اگر تم مجھ سے
شادی کرنے پر رضا مند ہو تو ــــــــ
تو تم میری ہر خواہش پر اپنی جان قربان کرنے سے بھی
دریغ نہ کرو گے ۔ مگر میں تم سے شادی نہیں کر سکتی ۔
نہیں کر سکتی !
مگر کیوں ؟ ــــ کیوں ؟
[مجھے معلوم ہے ، کیوں ؟ ــــ میں ــــ مجھے ہمیشہ سب
معلوم ہوتا ہے کہ کیوں کیا ہوتا ہے ۔ اپنی معصومیت کو کھو کر
میں نے ہر شے کا علم پا لیا ہے : میرا علم میری سزا ہے ، میرا کرب ہے
گھبراؤ نہیں ، میں تمہیں اِس دلدل سے نکال کر ہی چین
سے بیٹھوں گا ــــــــ

بھاگتے کو آ رہی تھی کہ اچانک —

تم اپنی بات کو بھولے رہی ہو۔ جو کچھ بھی ہمیں چھپائے

بیٹھی ہیں اپنا ہی خیال کرتا ہے۔

ہاں، دیکھو نا۔ ایک ہی پل میں میں بالکل کوری

نکل آئی ہوں، گویا ایک بار بھی ہاتھ ہی نہ لگی ہو۔ کیا میں

تمہیں اچھی لگ رہی ہوں؟ — تمہارے من بھاتے پکوان

کون کون سے ہیں! — میں نے کئی مردوں سے محبت کی

ہے اور ہر بار ہر مرد کو اس نے سچے دل سے چاہا ہے کہ

دوسرے سب بھولے رہیں۔ لیکن تمہارا قصہ کچھ اور ہی ہے

تم سے محبت کرتے ہوئے مجھے لگ رہا ہے کہ میں سبھی مردوں

سے بیک وقت محبت کر رہی ہوں۔ بس ایک تم ہی تم ہو، تمہارے

سوا میں نے کسی اور سے محبت نہیں کی ہے۔

مجھے معلوم ہے تم نے صرف مجھ سے ہی محبت کی ہے۔

تو پھر وہ سب کون تھے؟

اگر انہوں نے تم سے محبت کی ہے تو اُن میں سے

ہر ایک میں ہی تھا —

تم کیسے آدمی ہو؟

جیسے وہ سب تھے: ایک ہی قبیلے کے سارے

پھل کا ذائقہ ایک ہی ہوتا ہے۔

میرے سارے گناہ جھڑ گئے ہیں اور میں موسمِ گل کا

انتظار کر رہی ہوں۔

لیکن میں تو آ چکا ہوں۔

ہاں، مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم آ رہے ہو — آؤ!

آ — ؤ! — ہاں، تم آ چکے ہو! — تم نہ آتے تو میں

کہاں جاتی؟

جسے آنا ہوتا ہے وہ اپنے آنے سے پہلے بھی موجود ہوتا ہے۔

تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا ہے۔

تم بڑی بھولی ہو، بے حد بھولی! — وہ دیکھو،

وہ ننھی منی لڑکی! — وہ دوڑی جا رہی ہے —!

ہاں، وہ! — وہ! — وہ غائب ہو گئی ہے

مجھے اپنے بازوؤں میں زور سے بھینچے رکھو۔ اور زور سے!

مجھے لگ رہا ہے کہ میں بھی غائب ہو جاؤں گی۔ اور زور

سے! — وہ معصوم کہاں غائب ہو گئی ہے؟

میرے دل میں! — یہاں — یہ دیکھو! — یہ!

یہ تو میں ہی ہوں!

آؤ! آتے جاؤ!

نہیں، میرا خیال ہے جہاں ہمیں جانا تھا، ہم

وہاں آ چکے ہیں۔

کیا واقعی آ چکے ہیں؟ — یا ہم تھک گئے ہیں اور

آگے نہیں جانا چاہتے؟

یہیں بیٹھ جاؤ!

ہاں، بیٹھ جاؤ، بڑا میٹھا اندھیرا ہے!

ہاں، جس کے بھی گلے لگ جاؤ وہ اپنا ہی معلوم ہوتا

ہے! — ●●

غزلیں

بچھے ہیں راستے کچھ اس طرح کہ مل نہ سکیں
وہ اجنبی ہیں ابھی تک تو اجنبی ہی رہیں

وہ ایک بات جو ٹھہری ہے دو صلیبوں پر
ہے انتظار میں عالم صدا بنے تو سنیں

الجھ رہی ہے ادھر شام دن کے دامن سے
ادھر یہ فکر ہے، ایسے میں دل جلیں کہ بجھیں

میں اپنے پاؤں سے لپٹی زمیں چھڑاتا ہوں
عجیب غم ہیں مرے زائرینِ غم دیکھیں

دکانِ آئینہ گر کو ہے پتھروں کی طلب
پڑے جو چوٹ کوئی تو وہ آنکھیں جاگ اٹھیں

چراغِ خانۂ ویراں ہے منتظر کتنا!
کبھی تم آؤ تو دیوار و در بھی ساتھ چلیں

کوئی بارش جو ٹوٹ کر برسے
اپنے جسموں سے کچھ تو کالک دھلے

چاند تاروں کی رہبری کے لئے
ہم چراغوں کی لو بڑھاتے رہے

میں اگر تم سے دور ہو جاؤں
تم کتابوں میں ڈھونڈ لینا مجھے

کل یہ بھٹکیں گی بے وطن ہو کر!
خوشبوئیں توڑ لیجے گملوں سے

برسے دیوار سے ادھر بادل
میرے آنگن کے پھول پیاسے رہے

تم نے آخر کہاں تلاش کیا
ہم گلاسوں کی تہ میں بیٹھے تھے

زلیں

گزارا آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک رات مری
دکھائی دیں گی تجھے دن میں کیفیات مری

لے گا وہ مجھے ، لیکن کہاں بٹھاؤں گا
کہ ٹوٹ پھوٹ چکی ہوگی کائنات مری

نہ ہندسوں میں لگا کر حساب دیکھا گیا
نہ انگلیوں پہ گنائی گئیں صفات مری

کسی میں دیکھنے کی تاب ہی نہ تھی شاید
کوئی بتاتا نہیں مجھ سے واردات مری

جو میرے نام پہ تو نے کما لیا ہے تو اب
نکال جسم مرا تول کے زکات مری

میں ہر اصول کو دل سے قبول کرتا ہوں
کسی طرح نہیں ہوتی مگر نجات مری

اگرچہ سب کو ملوث کئے ہوئے ہوں میں
پر، اپنی رو میں بہی جا رہی ہے ذات مری

تمہارے کان میں کہنا غلط ہوا راہی
کہ اب رہے گی تمہیں تک ہر ایک بات مری

●●

غلام مرتضیٰ راہی

ہاتھ پاؤں میں کیسا کس بل تھا جب
میرے کاندھے پر میرا ہل تھا جب

کن قدموں کی چاپ ہلا کرتی تھی
سارا منظر، آنکھ سے اوجھل تھا جب

اپنے ہی سائے سے ڈر لگتا تھا
گھر کے دروازے پر پیپل تھا جب

شام سویرے کیا کیا گل کھلتے تھے
ہرا بھرا ندّی کا آنچل تھا جب

دھرتی، جیبھ نکالے، ہانپ رہی تھی
آسمان پر گہرا بادل تھا جب

ایک زمانہ پتھر کا گذرا ہے
میٹھا میٹھا تیشے کا پھل تھا جب

بوچھاریں کمروں میں در آتی تھیں
سیدھا سادہ پانی، چنچل تھا جب

پیڑوں پر ڈیرے ڈالے جاتے تھے
رستے کے ہر موڑ پہ جنگل تھا جب

●●

غزلیں

تیغِ شبِ سیاہ کا اک یہ ہنر بھی دیکھ
ہاتھوں میں آسمان کے اب اپنا سر بھی دیکھ

فرصت ملے جو پرورشِ آب و رنگ سے
نظارۂ شکستنِ دیوار و در بھی دیکھ

اڑنا کھلی ہوا میں تو آسان ہے بہت
پہلے ذرا سا مڑ کے سوئے بال و پر بھی دیکھ

گذرے ہیں کتنے لوگ صلیبِ سفر لیے
اک پل ٹھہر کے آئینۂ رہگذر بھی دیکھ

دکھتا ہو گر نگاہ تو ہر ضرب تیشہ پر
بوسیدہ پتھروں میں نمودِ شرر بھی دیکھ

عشرت کبھی نکل کے حصارِ امید سے
بے روح خواہشوں کے چمکتے کھنڈر بھی دیکھ

●●

جب بھی تمھارے سنگ سے میرا بدن بنا
اک شیشۂ سفید مرا پیرہن بنا

کچھ بھی نہ مل سکا مجھے اس دشتِ خاک سے
کوئی نہ اس فضا میں مرا ہم سخن بنا

کوئی چھپا سکا نہ مرے مردہ جسم کو
آخر حصارِ گرد ہی میرا کفن بنا

تاریخِ رنگ و نور کا تھا اک حسین ورق
وہ ریگ زار جس کا سمندر وطن بنا

پھینکے ہزار سنگ ہوائے سیاہ نے
دریا جو ایک پل کے لیے بے شکن بنا

عشرت [illegible] ہم کنار لوگ
[illegible] قلم جو شغلِ تہذیبِ فن بنا

[غز]لیں

ان کے درد شگفتہ نہ ان کے زخم ہرے
ک رہے ہیں خلاؤں میں بے یقین چہرے

لوگ جو کبھی غنچوں میں مسکرائے تھے
یں ملے ہیں تو سنگِ گراں نظر آئے

ہر ہم اپنے کو ڈھونڈتے ہی رہے
ی کی یاد نے ایسے بھی دے دیئے دھوکے

جہاں نے تو فرصت نہ دی مگر ہم لوگ
لے ساتھ جہاں بھی رہے زیادہ رہے

جی میں ہے کہ کبھی دولتِ جنوں دے دوں
ئی تو بہرِ خدا قرض مانگنے آئے

●●

میر نقی علی خاں ثاقب

تمام مطلعِ نظم و غزل نگارِ چمن
لہو کی آتشِ سیّال ہے کہ تیرا بدن

کوئی نہیں کہ جو پوچھے مزاجِ شوکتِ فن
سلگ رہی ہیں زبانیں چیخ رہے ہیں دہن

پگھل رہی ہے بصارت کی شمعِ کافوری
سجائیں پھر سے پری خانۂ شرابِ کہن

کچھ اور دیر تو ٹھہرو کہ رات جاتی ہے
تمہارے جسم سے پہلو سے سوئے گنگ و جمن

ابھی طلوع ہوا چاہتی تھی موجِ سحر
حیا کی آنکھ نے آہستہ چھوڑ دی چلمن

●●

علقمہ شبلی

اجنبی کوئی نہ تھا اور آشنا کوئی نہیں
ذات میری درمیاں تھی دوسرا کوئی نہیں
دل کے دروازے پہ دستک کی صدا کوئی نہیں
کونسی منزل ہے یہ آوازِ پا کوئی نہیں
یوں تو کہنے کو سبھی ہیں میکدے میں ہم سبو
ہم نظر لیکن یہاں بھی ساقیا، کوئی نہیں
کربلا تو آج بھی ملتا ہے ہر ہر گام پر
شہر میں لیکن حسینِ با وفا کوئی نہیں
کچھ سمجھ کر ہی کیا ہے میں نے اس کا انتخاب
کیا ہوا، اس راہ میں گر نقشِ پا کوئی نہیں
اے شبِ فرقت! کہاں بھٹکے گی چل میرے گھر
یہ وہ بستی ہے جہاں روشن دیا کوئی نہیں
آتشِ احساس میں جلتے رہو شبلی! سدا
شاعری سے بڑھ کے دنیا میں سزا کوئی نہیں

●●

بچ نکل گیا (یہ دس منٹ ان کے ہاتھ منہ دھونے میں صرف ہوئے) ورنہ سب مزدوروں نے ہمارے پاس سے گذرتے ہوئے قانون کے مطابق تین بار میرے منہ پر تھوکا ہوتا۔

وہ لال اینٹوں کا ایک معمولی مکان تھا جہاں مجھے لے جایا گیا۔ وہاں دو کانسٹبل پہرہ دے رہے تھے انھوں نے اپنی رائفلوں کے کندے سے میری پیٹھ پر مارا۔ وہاں دو کرسیاں تھیں اور کچھ نہیں۔ میں کمرہ کے بیچ میں کھڑا ہوا تھا میز کے سرے پر کوئی خود لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ پیچھے سے کوئی آیا۔ اور خاموشی کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ ایک بادامی رنگ کی وردی پہنے ہوئے تھا۔ سوالات شروع ہوگئے۔

"تمہارا پیشہ ؟"

"معمولی ساتھی"

"تاریخ پیدائش ؟"

"ار جنوری ۱۹۰۱ء"

"حال میں تم کیا کر رہے تھے ؟"

"میں قیدی تھا"

"کب اور کہاں ؟"

"جیل نمبر ۱۲ ، کوٹھری نمبر ۱۳ ، کل ہی رہا کیا گیا۔"

"رہائی کا حکم ؟"

میں نے رہائی کا حکم اپنی جیب سے نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔

"تمہارا جرم کیا تھا ؟"

"میں خوش وخرم نظر آیا تھا۔"

دونوں نے دوبارہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا: "صاف صاف بتاؤ۔"

جناب ایک اعلیٰ سرکاری افسر مرگیا تھا۔ سرکار نے حکم جاری کردیا تھا کہ پوری ریاست سوگ منائے۔ ایک سپاہی نے دعویٰ کیا کہ اس نے مجھے سوگ کے عالم میں نہیں پایا۔

اس لئے مجھے سزا دی گئی۔

"کتنے دن کی ؟"

"پانچ برس کی۔"

سوالات ختم ہو گئے۔ مجھے کھڑا کر کے پیٹا گیا اور سزا کا حکم سنا دیا گیا۔ دس برس۔

خوش وخرم چہرہ کی وجہ سے مجھے پانچ برس کی سزا ملی تھی، اداس چہرہ نے دس سال کی سزا دلائی۔ میرا خیال ہے کہ اگلی بار جب میں جیل سے باہر آؤں گا تو میرا کوئی چہرہ ہی نہیں ہوگا۔ نہ خوشی نہ غمگین۔ ●●

...لیں

...ہوئے عنبر نثار کا عالم
...ہر کا ہے شہرِ یار کا عالم

...رہے ہیں جو آسودۂ بہار مجھے
...کاش دیکھتے خونِ ہزار کا عالم

...ب چہرے پہ جبرًا ہے خندہ روئی کی
...ہے دل میں عجب انتشار کا عالم

...ا وصل بھی مجھ سے کبھی بھلا نہ سکا
...ان کی شبِ انتظار کا عالم

...وعدۂ فردا پہ دم پلٹ آیا
...ادی مرگ ہو برقؔ اعتبار کا عالم

●●

طلحہ رضوی برقؔ

سرِ معانی شرطِ وصالِ حروف ہے
خورشید کا سیاہیٔ شب میں وقوف ہے

دار و مدارِ زیست بہ موجِ نفس سہی
دیکھو تو چھو کے جسم بھی میرا سفوف ہے

گہنا چکا ہے کب سے مری شخصیت کا چاند
اے دوست یہ وقتِ صلوٰۃ الکسوف ہے

ساقی اس آبگینۂ نازک کی خیر ہو
صہبا تند وجہِ شکستِ ظروف ہے

صوفیٔ صاف قلب کی نسبت کا پاس ہو
کہنے کو برقؔ آپ کا ملبوس صوف ہے ●

نصر قریشی

ہم جہاں پھرتے رہیں گنبد کی صدا کی صورت
دیکھ آ کر کبھی اُس دشتِ بلا کی صورت

شیشۂ جسم بھی خوں رنگ نہ ہو جائے کہیں
موسمِ گل میں ہے خوں رنگ فضا کی صورت

ڈسنے ماحول کے ہاتھوں میں ہے خنجر پھر بھی
ہاتھ رکھتا ہے کوئی دستِ صبا کی صورت

کربِ احساس کا جلتا ہوا لمحہ اکثر
دل کے کہساروں میں گونجے ہے صدا کی صورت

تم، وہ پیکر کہ ہو رعنائیٔ تخلیقِ جمال
میں وہ تخلیق دریدہ ہوں قبا کی صورت

بے گھروں کی طرح بھٹکے ہے دیارِ شب میں
نصرؔ آنکھوں میں لئے صبحِ ضیا کی صورت

●●

غزلیں

احتشام اختر

مجھے حیات کے سانچوں میں ڈھالنے والے
کہاں گئے وہ سمندر کھنگالنے والے

لڑھک رہا ہوں ڈھلانوں سے پیار کی میں تو
نہ آئیں راہ میں مجھ کو سنبھالنے والے

ہمارے شوقِ فراواں نے ڈس لیا ہم کو
کہ آستیں میں تھے ہم سانپ پالنے والے

ہوا میں پھینک نہ مجھ کو سمجھ کے کھیل کوئی
تجھی کو آ کے لگوں گا اچھالنے والے

یہ گھر ہے چھوٹا سا لیکن اماں ملے گی یہیں
کہ قتل ہوں گے سبھی سر نکالنے والے

کنواں ہوس کا تھا گہرا کچھ اس قدر اختر
کہ خود ہی گر گئے مجھ کو نکالنے والے

●●

عقیل شاداب

کعبۂ گورِ غریباں چاہیے
میرے افسانے کو عنواں چاہیے
زندگی اُکتا رہوں میں گھر گئی
کچھ تو بربادی کا ساماں چاہیے
ان بڑے شہروں کی رونق کے لیے
ایک چھوٹا سا بیاباں چاہیے
کھینچنے کو چاہیے دامن کوئی
پھاڑنے کو اک گریباں چاہیے
بحرِ غم درکار ہے دل کے لیے
بوند کے سینے میں طوفاں چاہیے
گھر گیا ہوں ایسے لوگوں میں جنہیں
درد سے پہلے ہی درماں چاہیے
خاک و آب و باد و آتش کا عمل
زندگی کو ایک زنداں چاہیے

●●

غزلیں

...یم اشفاق

...ی صورت کوئی تدبیر نکالی جائے
...رت کے منھ سے وہ دوشیزہ بچالی جائے

...ٹا چلنے کی یہ ترکیب نکالی جائے
...سری آنکھ بھی گردن پہ لگالی جائے

...یاس، غم، کرب، اداسی ہی کے رنگوں سے کبھی
...ول کی محفل ہے کسی طور سجالی جائے

منہ بنائے ہوئے ملتی ہے ضرورت جب بھی
سوچتا ہوں اسے کم بخت منالی جائے

اک اہم شرط ہے اس شہر میں جینے کے لئے
...ر کے جسم پہ کملی سی اوڑھالی جائے

عشق صدیوں کی اداسی کے سوا کیا دے گا
ابنِ آدم کی کبھی خام خیالی جائے

ہر نفس وقت گزشتہ کی ہے تاریخ نعیم
اُن کی یادوں سے کوئی لمحہ نہ خالی جائے

●●

شاہ حُسین

زندگی اک سراب ہے، کیا ہے!
تشنگی کا عذاب ہے، کیا ہے!

وہ زمانہ کہاں، وہ عمر گئی
بے سبب التہاب ہے، کیا ہے!

وجہِ تسکیں نہیں تو میری ہنسی
پردۂ اضطراب ہے، کیا ہے

ہر رگِ دل مری بوقتِ طرب
صوتِ تارِ رباب ہے، کیا ہے!

فکر و فن ہو، خلوص، جذبہ ہو
شعر تب لاجواب ہے، کیا ہے!

●●

منظور ہاشمی

اپنے لہو کی آگ میں جلتے ہوئے ملے
چلتی ہوا کی زد میں کچھ ایسے دیے ملے

تھا سخت انتظار جنھیں میٹھی نیند کا
وہ پوری پوری رات ہمیں جاگتے ملے

لیکن نہ ٹوٹ پائی کبھی درد کی فصیل
دیوانہ وار کتنے ہی سر مارتے ملے

ظاہر میں یوں تو کوئی نہ تھی وجہِ خودکشی
کمرے میں کچھ خطوط مگر ادھ جلے ملے

جیسے یہاں سے گزری ہو چنگیز کی سپاہ
یوں راہِ شب میں خوابوں کے ٹکڑے پڑے ملے

●●

غزلیں

محسن جل گانوی

سلگتے درد کے صحرا، غموں کے ویرانے
سوائے اس کے دیا کیا ہے ہم کو دنیا نے

نئے صبح اجالوں کا ہم مقدر ہیں
تمہاری آنکھ کی قسمت میں ہیں سیہ خانے

گریز کر کہ مرا جسم گرم صحرا ہے
ترا وجود نہ لگ جائے تجھ سے کترانے

کوئی پہاڑ ہی اب راہ روک لے تو الگ
اٹھا ہوں آج میں لاوے کی طرح بہ جانے

ہر ایک چہرہ ہے تحریر اجنبیت کی
ہے پتھروں کا نگر کون کس کو پہچانے

ہے فطرتاً ہی جنھیں شوق سنگباری کا
بنا رہے ہیں وہی لوگ آئینہ خانے

تغیرات نے اتنا بدل دیا ہے کہ اب
تری نگاہ بھی شاید ہی مجھ کو پہچانے

کسی سے کوئی شکایت نہیں مگر محسن
مرے خلوص کو سمجھا نہیں ہے دنیا نے

●●

شہزاد نیّر

کھوکھلی آوازوں کے روغن شدہ گنبد میں ہوں
سالخوردہ آرزوؤں کی نئی مرقد میں ہوں

چند سانسوں کی جٹاؤں میں ہوں یوں جکڑا ہوا
جیسے دھرتی کی طنابیں کھینچتے برگد میں ہوں

خرچ ہوتا جا رہا ہوں لمحہ لمحہ دن بہ دن
جانے کن اشیائے ارزاں کی ضروری مد میں ہوں

جی اگر چاہے تو مجھ سے آ ملو کچھ دن ہیں
دن گئے" میں پھر دھوئیں کی دھندلی سرحد میں ہوں

کس کو فرصت ہے کہ رک کر راہ میں مجھ کو اٹھائے
ناتراشیدہ ہوں جب تک [illegible] میں ہوں

بے خیال و خواب ہے تھہرا ہوا [illegible]
میں ہی شامل ہو گئی اک [illegible]

●●

وُدود آفریدی

آئینہ چھوڑتا نہیں مجھ کو
ذات میں میری، تیرا نور نہ ہو

کتنا ہر دل عزیز ہے ظالم
جس جگہ بیٹھو! اُس کا ذکر سنو

میری خوشیاں جو تم سے قائم تھیں
میرے ماضی کے حال کو دے دو

درد کی ندیاں تھیں، پھوٹ بہیں
عشق کی زندگی کو کچھ نہ کہو

آنسوؤں کی نہیں کوئی قیمت
کیوں دمکتے ہو رات کے تارو

ق

[illegible] سی ہے یہ فضا
[illegible] عتیں سوچو
[illegible] ہے پاس رہو
[illegible] میں بات کرو!

●●

شمارہ ۳۳

خصوصی پیشکش

عبد الصمد

ایک افسانہ نگار، چار افسانے

- ــــ بن کا تعارف
- بارہ رنگوں والا کمرہ
- رانی صلیب
- اوس اور کرن
- نہیں

میں کا تعارف

عبدالصمد

'میں کا تعارف' مجھے لکھنا ہے مگر سچی بات ہے کہ مجھے اپنے بارے میں لکھنا بہت مشکل معلوم پڑتا ہے۔

میری عمر اس وقت بائیس سال ہے۔ سیاسیات میں ایم۔ اے کر رہا ہوں اور قلم کی عظمت کا قائل ہوں۔

کہانیاں غنچہ سے لے کر کتاب لکھنؤ تک میں شائع ہو چکی ہیں۔ کہانیاں لکھنا سیکھ رہا ہوں تاکہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں ایک سلیقہ اور ذریعہ سے کہہ سکوں۔

کون جانے کلام حیدری صاحب کو ایسی کون سی بات نظر آ گئی کہ میری کئی کہانیاں بیک وقت شائع کر رہے ہیں اور اوپر سے یہ 'میں کا تعارف' بھی لکھوا رہے ہیں، بہت جان بچائی مگر ——————

'میں' کتنی پرتوں میں نہاں ہے اور ان پرتوں کو ہٹا کر 'میں' کو خود میں دیکھنے سے قاصر ہوں۔ مگر غور کرتا ہوں تو مجھے اپنے اندر کہیں ماں مل جاتی ہے کہیں باپ، کہیں میں، کہیں اُستاد، کہیں دوست، کہیں تلامذ، کہیں....

اور اس بھیڑ بھاڑ میں ——————

اپنی کہانیوں میں بکھر رہا ہوں یا سمٹ رہا ہوں، کیا معلوم؟

●●

بارہ رنگوں والا کمرہ

عبدال

اوپر سے گرا چوں چوں ـــــــ اس قسم کے فقرے اس نے کئی بار اپنے بچپن میں دیہاتی گنوار لڑکوں کے منہ سے سنے تھے لیکن چونکہ وہ ایک بڑے گھرانے کا چشم و چراغ تھا اس لئے اُسے ان سب چیزوں پر دھیان دینے کی ضرورت ہی کیا تھی ـ لیکن آج یہ فقرہ جو اتفاق سے اس کے دماغ کے کسی گوشے میں محفوظ رہ گیا تھا، دماغ میں مستقل چکر لگا رہا تھا کیونکہ وہ خود کو اب اسی پوزیشن میں پا رہا تھا۔

آنکھ کھلی تو وہ تھا اور یہ کمرہ ـ چاروں طرف سے گھرا ہوا اور خالصتاً مٹی سے بنا ہوا ـ زمین کچی، دیواریں مٹی کی بنی ہوئی اور چھت بھی مٹی ہی کی تعمیر شدہ اور مٹی کے اس گھروندے کے بیچ وہ نفس موجود تھا جو مٹی ہی کا بنا ہوا تھا ـ اوپر نیچے آگے پیچھے اِدھر اُدھر سب جگہ مٹی ہی مٹی۔ مٹی کی حقیقت ہی کیا ہے لیکن مٹی کی حقیقت یہی تھی۔

وہ آنکھیں ملتا ہوا ہمت کر کے اُٹھ کھڑا ہوا لیکن لاحاصل کیونکہ کمرے میں کوئی روشندان ہی نہیں تھا کہ کچھ فائدہ ہوتا ـ چھت سے اس کا سر لگتا تھا۔ وہ پھر اپنی جگہ

بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ وہ یہاں کیوں پایا جا رہا ہے
کی سوچ نے منزل کی سمت پا کر قدم تیز کر دئے اور
یاد آنے لگا۔ موڑ دینے کے الٹ بہت بجنے لگے تھے اور
چیخ پکار شروع ہو گئی تھی اور پھر ـ سوچ کی منزل اس مٹی کے
سے کمرے میں آکر منجمد ہو گئی تھی۔ اسے بے چینی ہونے لگی
ہوا تھا کھڑا ہوا اور ٹٹول ٹٹول کر کمرے میں ٹہلنے
کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس قدر شدت کے اندھیرے
اسے کبھی واسطہ پڑا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ بغیر ہوا
زندہ کیوں کر ہے۔ ہوا آنے جانے کی گنجائش تو بظاہر کم
میں معدوم تھی۔ لیکن وہ زندہ تھا یہ حقیقت تھی۔ وہ سو
سکتا تھا۔ فکر کر سکتا تھا اور فکر کی بات تھی کہ وہ یہاں
تک کیسے پہنچا تھا۔ کس نے پہنچایا تھا۔ اور پھر جیسے جیسے
کی سوچ و فکر تیزی سے آگے بڑھنے لگی ویسے ویسے
یادوں کے کھنڈر میں بھٹکنے لگا۔

ایک وقت پر اس کا عالیشان بنگلہ تھا جس میں
بیوی بچے اور نوکروں کی ایک فوج رہتی تھی۔ بنگلے کے اس پا

ہوا تھا اور اس کے سامنے ایک خوبصورت چمن
تھا جس کے کنارے سمنٹ کے بنچ بنے تھے تالاب
چھوٹی سی کشتی تھی۔ بنگلے تک پہنچنے کے لئے گیٹ سے
خوبصورت سڑک کی تعمیر کی گئی تھی جس پر گیو بجری کوٹ
تھا۔ سڑک کے دونوں کناروں پر قطار سے پھول
رکھے تھے۔ بنگلے میں آرائش و آسائش کا سبھی سامان
۔ وہ ایک بے فکر اور بھری پری زندگی گزارنے کا
تھا اور یہاں سب ہی مستی تھی۔ اسے الجھن ہونے لگی۔
دیر تک خود سے ذہنی طور پر الجھنے کے بعد وہ بیٹھ گیا
لیٹ گیا اور آنکھیں موند کر اپنے ذہن کے دھارے
کے بہاؤ میں تنہا چھوڑ دیا۔

اپنے مکان میں اس نے ذاتی استعمال کے لئے ایک
کمرہ بنوایا تھا۔ مکان کی سب سے اوپری منزل پر،
تک پہنچنے کے لئے ایک چھوٹی سی لفٹ لگوائی تھی
ذہنی طور پر خود کو ایک کمرے میں پہنچا دیا ——
میں ایک طرف دیوار سے لگ کر ایک بہت ہی خوبصورت
سی مسہری بچھی تھی جس پر دو آدمی بیک وقت شب
سکتے تھے۔ مسہری پر ایک خوب صورت رنگین مچھر دانی
تھی۔ مسہری سے ملحق ایک گول سی خوب صورت
جس پر فیشن ایبل رسالے اور اخبارات رکھے تھے اور
گھڑی رکھی تھی جو دلفریب موسیقی کے ذریعہ وقت
تھی۔ بڑی میز کے پاس ایک اور چھوٹی سی میز تھی جس پر
کا ایک حسین ٹیبل لیمپ رکھا تھا۔ کور کے کلغی میں
رنگ کا بلب لگا تھا اور اس کے دونوں پیروں کے
لیمپ کا سوئچ تھا۔ لیمپ سوتے وقت جلا
تھا اور اس سے پھوٹتی ہوئی ہلکی روشنی نیند کی تھپکیاں
۔ کتابوں والی میز پر جواب آور گولیوں کی شیشی بھی
تھی۔ کمرہ ویسے سادہ تھا، زیادہ سامان اس میں

نہیں بھرا گیا تھا البتہ اس کی دیواروں پر بہت ہی خوبصورت
انداز میں رنگ پھیرے گئے تھے، پورے بارہ رنگ!
ایک کے بعد ایک سرخ، سیاہ، سبز، زرد، نیلا، آسمانی
سرمئی، گلابی، بادامی، اودا، کتھئی اور نیلا۔
یہ جدت اس کی تھی وہ اکثر اس قسم کی جدتیں اختیار کیا کرتا
تھا اور انھیں بلا روک ٹوک اپنے اوپر لاگو کر لیتا تھا مثلاً
یہی کہ اسے خواہش ہوئی کہ اس کا کمرہ اپنا خاص کمرہ بارہ
رنگوں کا ہو —— اور یہ خواہش اس نے پوری کر لی حالانکہ
اس سلسلے میں اس کا مذاق بھی اڑایا گیا لیکن اس نے اس کی
کوئی پرواہ نہ کی۔ اسے اکثر ان لوگوں پر تعجب ہوا کرتا جو اپنی
خواہشوں کو محض لوگوں کی انگشت نمائی کی وجہ سے پورا
نہیں کر پاتے تھے۔ اسے یاد تھا، جب وہ کالج کا طالب علم
تھا تو اس کا ایک ساتھی اکثر اس سے تذکرہ کیا کرتا تھا کہ اسے
ننگا مادر زاد ہو کر بازاروں میں دوڑ جانے کی تمنا ہے۔
لیکن وہ اسے صرف اس لئے پورا نہیں کر پاتا تھا کہ اسے
لوگوں کا ڈر تھا۔ وہ اپنے اس دوست کا اکثر مذاق اڑایا
کرتا اور یہ واقعہ تھا کہ اگر اسے ایسی خواہش ہوتی تو وہ اسے
ضرور پورا کر کے رہتا۔ چاہے لوگ کچھ بھی کہتے لیکن اسے
افسوس یہی تھا کہ اسے ایسی کوئی خواہش نہیں تھی!

اسے اکتاہٹ سی ہونے لگی اور وہ اٹھ کر کمرے میں
چاروں طرف دروازہ تلاش کرنے لگا ٹٹول ٹٹول کر اور ہاتھ
پھیلا پھیلا کر! اس تلاش میں تیزی آتی چلی گئی اور تیزی شدت
اختیار کر گئی۔ اور وہ دیوانہ وار گھوم گھوم کر بلکہ دوڑ دوڑ کر دروازہ
تلاش کرتا رہا لیکن لا حاصل۔ پھر اس نے چیخنا شروع کیا اور
خوب زور زور سے چیخنے لگا اور دیوار پر دیوانہ وار مکے برسانے
لگا۔ کمرے میں اس کی آوازیں صدائے بازگشت ثابت ہو رہی
تھی اور اس کی چیخ چلاہٹ خود اسی کے لئے تکلیف کا موجب
بن رہی تھی۔ چیختے چیختے اس نے رونا بھی شروع کر دیا۔ وہ

زندگی میں کبھی نہ رویا تھا اس کی زندگی میں ایسے بہت سے
مواقع آئے تھے جب وہ رو سکتا تھا اور اسے رونا چاہئے تھا
کیونکہ اس کے ماں باپ مر گئے تھے۔ بھائی مرا تھا، نزدیک
اور دور کے عزیز و اقارب مرے تھے، دوست احباب اللہ کو
پیارے ہوئے تھے۔ اور تو اور خود اس کا ایک بچہ بھی ایک
مہلک مرض میں مبتلا ہو کر داغ مفارقت دے گیا تھا لیکن
اس کی آنکھوں سے ایک قطرہ آنسو کا نہ ٹپکا تھا۔ کسی کی موت
پر بھی اس کی آنکھیں بھیگ نہیں پائی تھیں حالانکہ اکثر واقع
پر اس کا دل خون کے آنسو رویا تھا لیکن یہ آنسو دل ہی دل
میں بہے تھے اور وہیں منجمد ہو گئے تھے، باہر نہ نکل سکے تھے،
ہو سکتا ہے انھیں باہر نکلنے کا راستہ ہی نہ ملا ہو۔!

لیکن یہاں رونے سے بھی راستہ نہ ملا۔ اور بہت دیر
تک چیخنے چلانے، رونے اور سر پٹکنے کے بعد بھی اسے کوئی
کامیابی نہیں ہوئی تو وہ تھک ہار کر چپ ہو گیا اور دھم سے
زمین پر بیٹھ گیا، پھر لیٹ گیا۔ آنسو خود بخود خشک ہوتے
جا رہے تھے اور اسے اپنی حالت زار پر اندر ہی اندر ہی
رونا آ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اسے نیند آنے لگی اور تھوڑی دیر
بعد ہی وہ گہری نیند سو رہا تھا۔!

کافی دیر بعد اس کی نیند ٹوٹی تو اسے اندازہ ہوا کہ
گھنٹہ دو گھنٹہ گزر چکا ہے۔ اس نے اپنی کلائی پر ہاتھ پھیرا،
گھڑی غائب تھی۔ پھر اس نے بالوں پر انگلیاں پھیریں، ہیرے
اور زمرد کی قیمتی انگوٹھیاں ندارد تھیں۔ گلے سے سونے کی
پتلی حسین زنجیر لاپتہ تھی۔ غالباً یہ سب چیزیں اسے یہاں
اس حالت کو پہنچانے والے نے اتار لی ہوں گی بلکہ قبضہ کر لی
ہوں گی۔ اس کا دماغ پھر اپنی موجودہ حالت پر اور پیچھے
ہونے لگا لیکن وہ چپ چاپ پڑا رہا۔ طویل نیند کے بعد
دماغ کچھ ہلکا سا ہو گیا تھا اور اس میں خلط ملط والی کیفیت
کم ہوتی جا رہی تھی اور اس طرح ذہن آہستہ آہستہ صاف ہوتا۔

[illegible]
اس کی آنکھیں [illegible]
[illegible]
پیرزدہ کر [illegible] اس کمرے کی طرح بارہ
رنگا ہو [illegible] اس کی آنکھیں ان رنگوں کو
پہچانتی تھیں اور [illegible] عجیب سی ان سے
انسیت ثابت کر رہی تھیں۔ حیرت اور تعجب جیسے اس
ایک کمی میں [illegible] اٹھ بیٹھا، پھر کھڑا ہو گیا اور
سے قریب جا کر معائنہ کرنے لگا۔ ہو بہو وہی رنگ
بارہ رنگ! اسی کے کمرے والے! ایسا لگتا تھا جیسے
کمرے کی دیواریں چرا کر یہاں لگا دی گئی ہوں اور اسے
بھی چرا کر ہو سکتا ہے وہ اپنے ہی کمرے میں موجود ہو
اس کا یہ شک جلد ہی دور ہو گیا کیونکہ اپنے کمرے میں اس
دم نہیں گھٹتا تھا، اس کے کمرے میں سنہری لگی تھی، نیل
جس پر کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ لیمپ تھا جس سے خواب
روشنیاں نکلتی تھیں۔ پھر اس کے کمرہ پر سیمنٹ کا پلاسٹر
اور اس کی دیواروں پر بارہ رنگ...... بارہ رنگ
تو یہاں بھی تھے لیکن صرف بارہ رنگوں سے کیا ہوتا ہے
بہت سی چیزیں تھیں اس کے کمرے کی شرائط کو پورا
کر پاتا تھا اس لئے وہ مطمئن سا ہو گیا لیکن تھوڑی دیر
اسے اپنا ماننے میں حرج ہی کیا تھا۔ یہاں بھی وہ
ہاتھوں، دو پیروں، دو آنکھوں، دو کانوں، ایک ناک
ایک سر اور ایک منہ والا انسان ہی تھا اور اتفاق سے
کمرہ بھی بارہ رنگوں والا تھا اس لئے یہ بالکل اپنا نہیں
قریب قریب اپنا ضرور تھا۔ اس حد تک بات اس کی سمجھ
میں آگئی تھی۔ وہ پھر بیٹھ گیا اور بیٹھا رہا اور جب بیٹھے
طبیعت گھبرا گئی تو لیٹ گیا اور کافی دیر تک لیٹا رہا اور

[illegible] اٹک گیا [illegible] بالکل نہیں
[illegible] رہی تھی اور یہ ایک [illegible] کہ اس
[illegible] ورت میں ہو ہی کیا سکتا تھا۔

وہ سویا [illegible] بہت دیر تک ــــ یہاں تک کہ اس
کی نیند ٹوٹی تو اسے اندازہ ہوا کہ شاید ایک رات بیت گئی
ہے اور دوسری صبح آ گئی ہے۔ اسے وقت کا اندازہ ہو جاتا تھا
کیونکہ اس کی زندگی کے منٹ منٹ میں گھڑی کے منٹ منٹ
چھپے تھے اور گھڑی کی سوئی چلتی تھی تو اس کی زندگی کا محور
گھومتا تھا۔ اسے ایک کہانی یاد آنے لگی۔ ایک دیو تھا
جس نے ایک حسین شہزادی کو قید کر لیا تھا۔ ایک شہزادہ شہزادی
کی تلاش میں نکلا اور ایک محل میں پہنچ کر شہزادی کی لاش دیکھی
تو اس نے سرہانے رکھی ہوئی دو لکڑیاں پائینتی کر دیں اور پائینتی
رکھی ہوئی دو لکڑیاں سرہانے رکھ دیں۔ شہزادی اٹھ بیٹھی اور اس
نے اپنا حال زار شہزادے کو کہہ سنایا۔ اس نے شہزادے کو بتایا
کہ یہاں سے پچھم دس کوس جانے پر ایک ندی ملتی ہے اس ندی
کے پرے ایک پہاڑ ملتا ہے اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک درخت
ہے اس درخت کی ایک ڈالی میں ایک پنجرہ لٹکا ہوا ہے
اس پنجرے میں ایک مینا ہے بس اسی مینے میں دیو کی جان ہے
ــــ شہزادہ تمام مشکلات کو پار کرتا ہوا مینا تک جا پہنچتا
ہے اور اسے مار ڈالتا ہے تو ساتھ ہی دیو بھی مر جاتا ہے۔ اسے
لگا کہ ٹھیک یہی قصہ اس کے ساتھ ہے۔ گھڑی کی سوئی میں
اس کی زندگی کا راز پوشیدہ ہے اور اگر گھڑی کی چال رک
جائے تو اس کی زندگی بھی اپنی چال روک دے۔ یہاں بھی
گھڑی سے اس کا رشتہ یوں برقرار تھا کہ اسے وقت کا اندازہ
ہو رہا تھا اور وہ وقت کی چال کو اپنی چال سے ناپ سکتا تھا۔

جب اسے یہ یقین کامل ہو گیا کہ صبح ہو ہی گئی ہے تو وہ
اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں آس پاس صبح کے کوئی آثار نہیں تھے نہ وہ
بیڈ ٹی کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ یونہی ادھر ادھر نظریں
دوڑاتے ہوئے اسے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ کمرے کے
رنگوں میں ایک رنگ کی کمی ہو گئی ہے۔ بارہ رنگوں میں صرف
گیارہ رنگ رہ گئے ہیں اور بارھویں کی جگہ پر سفیدی پھری
ہوئی ہے۔ حیرت کے سمندر میں غوطہ لگانے کے بعد وہ
کھڑا ہو گیا اور دیوار کے نزدیک جا کر سفیدی پر ہاتھ پھیرنے
لگا۔ حیرت انگیز بات تھی۔ رنگ واقعی اڑ گیا تھا اور ٹھیک
اسی طرح اڑا تھا جس طرح پرانے کپڑے زیادہ دنوں تک
بکس میں رکھے رکھے اپنے رنگ کھو دیتے ہیں۔ اسے الجھن
ہونے لگی۔ اس طرح یہ بات صاف تھی کہ اس کمرے سے کوئی
اور بھی واقف ہے اور اس سے منسلک ہے اور اس میں
دلچسپی لے رہا ہے۔ اسے اپنی حالت زار پر پھر رونا آنے لگا
اور وہ پھر یہاں سے نکل بھاگنے کے لئے دروازہ تلاش کرنے
لگا لیکن بے سود۔ دروازہ رہتا تب تو ملتا یہاں تو اس کی
موجودگی کا سوال ہی نہیں تھا ــــــ وہ ناکام ہو کر چپ
چاپ ایک جگہ بیٹھ گیا۔ پھر لیٹ گیا اور ذہنی طور پر پھر اپنے
ماحول میں پہنچ گیا۔

اس کی غیر موجودگی سے اس کے کاروبار کا کتنا نقصان
ہو رہا ہوگا۔ پورے کاروبار میں لوٹ مار مچ گئی ہوگی۔ اس کے
سوا کوئی دیکھنے والا بھی تو نہ تھا۔ بچے سب چھوٹے چھوٹے تھے
بیوی پھر بھی عورت تھی، ناقص العقل! وہ بھلا کہاں تک
اتنے بڑے کاروبار کو دیکھ سکتی تھی۔ پورا کاروبار منیجروں اور
گماشتوں کے سہارے چلتا تھا اور وہ اس کا واحد نگراں تھا
ربر کی بہت بڑی فیکٹری تھی اور ملک گیر شہرت کی مالک تھی
یہ اس کی خاندانی ملکیت تھی۔ اسے اس کے دادا نے ایک چھوٹی
سی دکان کی شکل میں کھولا تھا اور اس کے باپ نے اس چھوٹی
سی دکان کو ایک بڑے کارخانہ میں بدل دیا تھا اور اس نے
اس میں مزید توسیع کر کے اسے ترقی کی منزلوں پر پہنچا دیا تھا۔
اب اس کی کمپنی کا مال غیر ملکوں میں بھی سپلائی ہونے لگا تھا،

لاکھوں کی آمدنی تھی، سب اُلٹ پھیر میں برباد ہو رہی ہوگی کیا کیا جائے ۔ بیوی بچے الگ پریشان ہوں گے ۔ چھوٹے بچے نے تو شاید اپنے مونہہ میں ایک دانہ بھی نہ ڈالا ہوگا ۔ وہ صرف اسی کے ساتھ کھانا کھاتا تھا اور وہ بھی اس صورت میں جبکہ وہ اپنے ہاتھوں سے اُسے کھلائے ، اکثر ایسا ہوا تھا کہ وہ صبح سے گئی رات تک کام میں مصروف رہنے کے بعد گھر پہنچا تو وہ اسے بھوکا پیاسا انتظار کرتا ہوا پاتا ۔ اس کی بیوی نے اس کے لیے اس کو کئی بار سزا بھی دی تھی ، لیکن اس کے کانوں پر جوں نہ رینگی تھی ۔ پتہ نہیں اس لڑکے نے یہ فطرت کیوں کر پائی تھی ۔ اس کا دل اپنے سینے میں اٹکنے لگا ، پتہ نہیں اس کی غیر موجودگی میں اس کی کیا حالت ہو گئی ہوگی —— اور اس کی بیوی — وہ — وہ تو شاید ——

اس کی آنکھیں تو روتے روتے اب تک سوج چکی ہوں گی اور کیا پتہ کہ اس غم نے اب تک اس کی جان ہی لے لی ہو ۔ سوچتے سوچتے اس کی طبیعت گھبرانے لگی اور اس کی آنکھوں سے خود بخود گرم گرم آنسو بہنے لگے ۔ یہ نئی بات تھی کہ اس کی آنکھوں سے بار بار آنسو چھلک پڑتے تھے ۔ وہ یونہی آنسو بہاتے بہاتے سو گیا ۔

اس کی نیند ٹوٹی تو اسے اندازہ ہوا کہ دوسری صبح پھر آگئی ہے ۔ اس صبح پھر اس نے محسوس کیا کہ دیواروں پر ایک رنگ کی کمی ہو گئی ہے اور گیارہویں رنگ کی جگہ سفیدی پھری ہوئی ہے ۔ ! اب کی بار اسے بجائے تعجب کے کچھ ڈر سا محسوس ہونے لگا ۔ آخر بات کیا تھی کہ دیواروں پر روز ایک رنگ کی کمی ہوتی جا رہی تھی ۔ وہ چپ چاپ سفیدی پھری ہوئی جگہ کو گھورتا رہا ۔ سہما سہما اور ڈرا ڈرا سا ۔ !

لیٹا لیٹا وہ پھر اپنی دنیا میں جا پہنچا جہاں اس کا عظیم کاروبار تھا ، بیوی ، بال بچے تھے ۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب تک تو اس کے گھر والوں کو اس پر صبر و قرار آگیا ہوگا اور وہ اسے مُردوں میں شمار کر کے

[illegible]

سے زیادہ سہارے کی ضرورت ہوگی ۔ اسے یہ کرنا ہی چاہیے ۔

سب کچھ سوچتے سوچتے اس پر ایک عجیب سی غنودگی اور یاسیت چھانے لگی اور اسے اپنی بدنصیبی پر رونا آنے لگا ۔ وہ بیوی کو کس قدر چاہتا تھا ۔ جب وہ پہلی بار اس کے ہاں بیاہ کر آئی تھی تو اس کے پاؤں مارے خوشی کے زمین پر پڑتے ہی نہ تھے اور اس کی گھر میں موجودگی کو ہمیشہ اپنی بے انتہا خوش قسمتی تصور کرتا تھا اب وہی چہیتی بیوی دوسرے کی آغوش میں ...... اس کا گلا رندھ گیا ۔ لگا جیسے اس میں کوئی چیز پھنس کر رہ گئی ہو جو نہ اوپر آ رہی ہو نہ نیچے جا رہی ہو ۔ کچھ دیر کے بعد اس نے اپنی حالت پر قابو پا لیا اور تھوڑا خود کو مطمئن بھی کر لیا کہ یہی کچھ تو ہوتا ہے ۔

تیسری صبح تیسرا رنگ بھی دیواروں پر سے غائب ہو گیا اور اس کی حیرت و تعجب اور خوف میں بھی اضافہ کی ہوتی گئی کہ عام چیز تھی ۔ چوتھی صبح چوتھا رنگ بھی غائب پایا گیا ۔ یہاں تک کہ روز ایک رنگ کم ہوتا گیا اور پوری دیوار پر سفیدی پھری ہوئی نظر آنے لگی اور جب پورے رنگ دیواروں پر سے غائب ہو گئے تو اس نے خود کو اپنی دنیا سے کٹا ہوا پایا ، اس کی فکر ، سوچ ، تردد بھی کا سلسلہ ٹوٹ گیا اسے لگا جیسے اس کا ہر رشتہ اس کے مکان سے اس کے کنبے سے بیوی بچوں سے کاروبار وغیرہ سے ختم ہو گیا ہے اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ کر وہ مطمئن سا لیٹ گیا اور اس عہد کے ساتھ گہری نیند سو گیا کہ اب کبھی نہ اٹھے گا ۔ !

••

اپنی صلیب

عبدالصمد

اب قصہ چاہے علی گڑھ کا ہو، دلی کا ہو، پٹنہ کا ہو —— کہیں کا ہو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ دو سڑکوں کو ملا کر صرف پُل ہی بنایا جا سکتا ہے اور یہ کہیں بھی بن سکتا ہے!

تو یوں سمجھ لیجئے کہ میں ایک ایسے پُل پر بیٹھا ہوں جو لمبی چوڑی فرشی سڑک کو چھوڑ کر اس کے نیچے سے کچھ اس طرح بنائی گئی ہے کہ اگر آدمی پل سے ہو کر دوسری طرف والی سڑک کو جائے تو وہ اُن لوگوں کی بہ نسبت پہلے پہنچے گا جو مصروف اور بڑی سڑک سے ہو کر جاتے ہیں۔ پُل مضبوط لوہے کا بنا ہے اور تعمیر شکلاً کچھ ایسی ہے جیسی بچے تاش کے پتوں سے پُل بنا لیا کرتے ہیں لیکن وہ پل صرف ایک پھونک سے گرایا جا سکتا ہے اور اس پل کو صرف توڑنے کے لئے ایک طویل منصوبے کی ضرورت پڑے گی۔ مختصر یہ کہ پل بہت ہی مضبوط بنا ہے اور اس پر بیٹھ کر گھنٹوں وقت گزارا جا سکتا ہے

میں بہت دیر سے پُل کے جنگلے پر اکڑوں بیٹھا ہوں اتنی دیر سے کہ اگر میں اُٹھ کر کھڑا ہوں تو میرے زین کے پینٹ کی کریزیں غائب ہو چکی ہوں گی اور اس کی جگہ ایک ایسے لباس نے لی ہوگی جسے نہ تو پینٹ ہی کہا جا سکتا ہے نہ پاجامہ —— حالانکہ پاجامہ پر شکنیں پڑ جاتی ہیں تو وہ پاجامہ ہی رہتا ہے کچھ اور نہیں بن جاتا۔ کبھی کبھی میں سوچنے لگتا ہوں کہ ہم ہندوستانی جب پتلون کا صحیح استعمال ہی نہیں کرتے تو پھر اسے پہنتے ہی کیوں ہیں —؟ پاجامہ کیوں نہیں پہنتے۔؟ دھوتی کیوں نہیں باندھتے۔؟ لیکن۔ یہ سب باتیں تو شاید کسی انگریز کو ہم لوگوں کے بارے میں سوچنا چاہئے ہم ان بے کار باتوں میں وقت کیوں ضائع کریں۔؟

تو بات ہو رہی تھی پل کی۔ لیکن اس ڈھلڈائی دور میں آدمی کو اپنی سوچ پر کنٹرول کہاں رہا ہے جو جی میں آتا ہے سوچتا چلا جاتا ہے بلکہ جی میں بھی کہاں آتا ہے۔ وہ تو ایک سلسلہ ہے سوچوں کا، ایک کڑی ہے، زنجیر ہے جو خود بخود ایک دوسرے سے جڑتی چلی گئی ہے کہ کوئی حد مقرر رہی نہیں۔ ہاں تو بات —— تھوڑی دیر پہلے کی بات ہے کہ ایک نیم جاں سا مدقوق اور منحوس صورت کتا آیا اور ٹھیک میرے سامنے کہ میں

بیٹھا ہوا ہوں، ایک ٹانگ اُٹھا کر پاخانہ کر گیا۔ میں نے ہزار بھگایا ہاں کی لیکن اس کم بخت کو فرصت کہاں جو مجھ پہ دھیان دے۔ وہ تو اپنا کام کر کے چلتا بنا اور ادھر میری یہ حالت کہ ابکائی پر ابکائی آرہی ہے، بدبو سے دماغ پھٹا جارہا ہے۔ جی میں آتا ہے اُس کم بخت کتے کو پکڑ کر چاروں ٹانگیں توڑ ڈالوں بلکہ ساری دنیا کے کتوں کی جان لے لوں۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔ ابھی تو مجھے بہت دیر تک یہیں بیٹھے رہنا ہے لیکن بدبو اور گندگی ______

آہستہ آہستہ مجھ پہ بے چارگی آتی جاتی ہے۔ اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ میرا یہاں کچھ دیر تک بیٹھے رہنا بھی ایک حقیقت ہے اور کتے کی گندگی جو ٹھیک میرے سامنے ہی پڑی ہے، یہی ایک حقیقت ہے۔ اب میں حقیقت پسند ہو گیا ہوں کہ بے چارگی سب کچھ سکھا دیتی ہے۔

سوچوں کی کڑیاں جڑنے کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا کہ معاً ایک کڑی کہیں سے اُڑتی ہوئی آکر کھٹ سے زنجیر میں اس طرح جڑی جس طرح لوہے کا ٹکڑا مقناطیس میں جا چپکتا ہے

خواہش — ؟!!

جی میں آتا ہے اتنے سارے مسافر جو پل سے گزر رہے ہیں ان میں سے کسی کا پاؤں اس گندگی کے ڈھیر میں پڑ جائے

______ !!

کافی دیر گزر چکی ہے اور گندگی جوں کی توں پڑی ہے اُس میں کہیں سے کوئی خراش تک نہیں پڑی ہے صرف مکھیوں نے اس کو چاروں طرف سے ڈھک لیا ہے۔ لوگ گزر رہے ہیں پر بڑی ہوشیاری سے کہ گندگی جوں کی توں بچی رہتی ہے کوئی اس طرف آنے لگتا ہے تو میں اس کے قدم گننے لگتا ہوں لیکن آج کل کے لوگوں کے قدم اس قدر سنبھلے اٹھتے ہیں کہ کسی قسم کی لغزش کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اور مجھ یہ ہوتا ہے کہ میری خواہش برقرار رہتی ہے۔

سوچوں کی زنجیر میں کڑی ۔۔۔ کہ اگر جوڑ توڑ کا سلسلہ جاری رکھا جائے

کالج کے کچھ لڑکے زور زور سے ہنستے ہوئے میری طرف آرہے ہیں۔ میں پُر اُمید ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا اگرچہ وہ ابھی کچھ دور ہیں لیکن پھر بھی اُن سے بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں۔

"اب وحیدہ رحمان اور نوتن میں وہ بات کہاں ہیما مالینی کی بات کرو، ریحانہ سلطان کی بات کرو، بھادوری کی بات کرو۔ ہائے قسم خدا کی! .... ادا کاری دکھائی ہے، کیا انداز ہے، کیا مسکراہٹ۔"

"ارے اِن کو دیکھو۔ ہیما مالینی کے بڑے بھائی اندر کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔!"

"اندر کے آدمی بھائی جان کیسے ہو سکتے ہیں؟ یار کچھ کورے ہی معلوم ہوتے ہو۔"

"یار تم کیا جانو — دراں بھائی جان ہی تو کچھ ہوتے ہیں۔!"

"میں تم لوگوں سے ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ میرے سامنے ہندوستانی فلموں کی، ہیروئنوں کی بات مت کیا کرو۔ صرف انگریزی فلمیں دیکھتا ہوں اور اُسی کے متعلق باتیں پسند کرتا۔ الزبیتھ ٹیلر کی بات کرو، رچرڈ برٹن کی بات کرو۔ جینا لولو برجیڈا کی بات کرو ......"

سبھی کے قدم گندگی کو پھلانگتے ہوئے صاف نکل گئے۔ کالج کے لڑکے اور اتنے محتاط!

شاید یہ خوشی کی بات ہونی چاہیے تھی پر میری خواہش میں کیا کروں۔ گندگی کا ڈھیر جوں کا توں ہے اور مکھیوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بدبو میں البتہ کچھ کمی ہوئی ہے لیکن ابھی کچھ دیر بعد جب اس FERMENTATION سے بدبو پیدا ہونا شروع ہوگا تب کیا ہوگا — یہ کم بخت کتے کی ...

[ب]ہت ہی سہانا لگتا ہے ندی کے بہنے کا منظر بڑا خوب صورت [ص]اف و شفاف ندی بہتی ہے اور اس کے کنارے کشتیاں [کھڑ]ی ہیں۔ کچھ لوگ کشتیوں میں ندی کی سیر بھی کر رہے ہیں [د]ور سے یہ سب دیکھنے میں بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے اور تھوڑی [دیر] پہلے مجھے بھی بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا لیکن اب تو مجھ میں [ایک] درد سر گھس آیا ہے جو مجھے مستقل طور FERMENTATI[ON] [کر] رہا ہے!

سامنے سے دو آدمی زور زور سے باتیں کرتے ہوئے [چلے] آ رہے ہیں۔ ان کے لباس، شکل و صورت سے بے ڈھنگا [پن] ٹپک رہا تھا۔ اور چال میں بھی مستی تھی۔ میں بہت زیادہ [نا]امید ہو گیا ہوں کہ اب میری خواہش پوری ہوتی نظر آ رہی تھی

" جب میں پہلی بار علی گڑھ گیا تھا تو مجھے ہر شخص پر آل احمد [س]رور کا گمان ہوا تھا۔ "

" اور جب میں بمبئی گیا تھا تو ہر شخص کو دلیپ کمار سمجھا تھا۔ بیک وقت دو زور دار قسم کے قہقہے ابھرے اور بھیڑ میں گم ہو گئے۔ میں مایوس بیٹھا رہا۔

کتے نے ابھی تھوڑی دیر پہلے جس گندگی کو منظر عام پر لا چھوڑا تھا اُس نے اب اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا — مکھیوں نے اس میں جا بجا چھوٹے چھوٹے سوراخ کر دیے تھے اور ان میں بہت چھوٹے چھوٹے کیڑے گھس رہے تھے۔ گندگی میں دراڑ پڑتی جا رہی تھی اور اس دنیا میں کوئی انسان ایسا نہ تھا جو اسے اپنے پیروں سے کچل دے! ہائے انسان!

میں اکتا کر اُٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور تھوڑی دور تک چلتا ہوں پھر واپس لوٹ کر تھوڑی دیر مخالف سمت میں چلتا ہوں۔ شاید میں لاشعوری طور پر اپنا وقت گزار رہا ہوں وقت گزر رہا ہے اور بڑی تیزی سے گزر رہا ہے۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔ کتے کی گندگی ویسے ہی پڑی ہے۔ لوگ آتے ہیں، نظر پڑ جائے تو تھوک دیتے ہیں اور پھر بڑی ہوشیاری سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ میں پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ اس دفعہ میں کوئی فلمی نغمہ گنگنانا چاہتا ہوں۔ کھڑکی والی ......

تیرے نیناں ہیں جرا بے ایمان سے ...... وغیرہ وغیرہ میں گنگنا رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ چھوٹا سا پل اس ترقی یافتہ دنیا سے کتنا کٹا ہوا ہے۔ بھلا جہاں موٹر کار وغیرہ بھی نہ چل سکے۔ وہ بھی کوئی جگہ ہے۔ مثلاً اگر یہ گندگی سامنے والی مصروف سڑک پر ہوتی اور اتفاق سے میں بھی وہاں موجود ہوتا تو اب تک ———— اب تک تو اس زندگی کا پتہ بھی نہیں رہتا! انسان اسے نہیں چھیڑ رہا، موٹریں تو نہیں چھوڑتیں اور اب تک میں مستقل درد سر سے بھی نجات پا جاتا۔

شام رات میں ڈھل چکی ہے اور رات بھیگتی چلی جا رہی ہے۔ مسافروں اور راہگیروں کی آمد و رفت کم ہوتی جا رہی ہے۔ میں اپنی جگہ بیٹھا ہوں اور دونوں گھٹنوں کے درمیان اپنا سر دیے ڈالتا ہوں۔ اب میری اُمید مایوسی میں بدل چکی ہے اور مایوسی یقینی کا جامہ پہن چکی ہے۔ میں یہاں سے چل دینے کی سوچ رہا ہوں۔ یہاں سے سیدھا ایک ہوٹل میں جاؤں گا، اور بارہ آنے میں کھانا کھاؤں گا۔ چاہے اتنے میں کچھ بھی کیوں نہ ملے (میری جیب میں اس وقت صرف بارہ آنے ہیں!) پھر بڑی مسجد سے ملحق بوسیدہ سے ویران کمرے میں رات بتاؤں گا چاہے نیند آئے یا نہ آئے اور پھر صبح دو گھنٹے جج صاحب کے ہاں ٹیوشن پڑھاؤں گا اور اپنا مشاہرہ لوں گا۔ اس کے بعد کہیں وقت بتاؤں گا۔ کوئی ضروری نہیں کہ کل بھی یہاں پر ہی بتاؤں — میں چل کھڑا ہوتا ہوں، سر جھکائے، خیالات میں غرق — اب میرے دماغ سے گندگی والی خواہش ختم ہو چکی ہے۔ گندگی میں اب FERMENTATION شروع ہو چکا ہے۔

رات زیادہ ہو گئی ہے۔ میں تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوں۔ [بقیہ

اوس اور کرن

عبد الصمد

اُس رات گرمی بہت تھی۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ تنگ آکر میں نے اپنا حساب کرنے کی ٹھانی۔ بہت دنوں سے اس کا موقع نہیں مل رہا تھا حالانکہ یہ بہت ضروری تھا۔

عالم وجود میں آنے کے بعد دنیا کو دیکھنے سمجھنے میں (NEGLIGIBLE PERIOD) ــ آٹھ برس

سونے میں بارہ برس ــــــــ بارہ برس

کھانے پینے میں ــــــــ ساڑھے تین برس

فکر معاش میں ــــــــ بارہ برس

متفرقات (جس میں بہت سی باتیں شامل ہیں)۔ ساڑھے چھ برس

جمع ۔ چالیس برس

ان سب کا نچوڑ ـ لفظوں اور معانی کا ایک عظیم الشان لشکر، جسے بہرحال اپنی ہی پیٹھ پر ڈھونا تھا۔ حاصل ــــ صفر ــــ!

میں بہت پریشان ہوگیا۔ اب میں عمر کے نقطۂ عروج سے ڈھلا ہوا ایک انسان تھا اور دن بدن ڈھلتا ہی جارہا تھا اور اب تک کا نتیجہ صفر نکل رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نفی اور اثبات دونوں برابر ــــــ!

پریشان ہوکر میں باہر نکل آیا اور سڑکوں پر بے مقصد آوارہ گردی کرنے لگا۔ شہر میں چوراہے بہت ہیں اور اتنے موڑ کہ آدمی چکرا کر رہ جائے۔ ایسے ہی ایک موڑ پہ میری اس سے ٹکر ہوگئی۔ ہم دونوں دو مخالف سمتوں سے ایک ہی خطوط پر آرہے تھے اور ٹکر ناگزیر تھی!

ٹکر سے میں جھنجھلا اٹھا اور ابھی کچھ کرنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا اور بڑے دوستانہ لہجے میں بولا۔

"بگڑو مت دوست! دیکھو میں کہاں بگڑ رہا ہوں آؤ کہیں پرسکون جگہ پر بیٹھ کر باتیں کریں۔"

اس کے اخلاق اور حسن سلوک سے میں متاثر ہوگیا اور شرمندہ بھی۔ ابھی ابھی میں اس پر جھنجھلا اٹھا تھا۔ اور چپ چاپ اس کے ساتھ چلتا رہا۔

پھلواری کے ادھر بنے پُل پر ہم پہنچے۔ وہ پُل کے جنگلے پر اطمینان سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ حالانکہ ایسا کرنے میں خطرہ یہ تھا کہ ذرا سی حرکت سے وہ پُل کے نیچے جا گرتا۔

میں نے اُسے خوبصورت کہا ۔ تو وہ زور سے ہنسا اور اُسی بات میں بہکنے لگا ۔

" رسک لینے سے ڈرتے ہو ۔ ؟ زندگی تو خود ہی ایک جانا پہچانا خطرہ ہے پھر اس خطرے کو دور کیوں نہیں کر دیتے ۔ ؟ "

" بے شک خطرہ تو ہے ۔ لیکن مرنے مرنے کا فرق ہے زندگی ایک مزے دار خطرہ ہے اور ۔۔۔۔۔ "

میں نے اُسے لاجواب کرنا چاہا لیکن وہ یوں لاجواب ہونے والا نہ تھا ۔ میری بات کاٹ کر قہقہہ لگانے لگا ۔ میں جھنجھلا گیا اور چپ چاپ پُل کے نیچے کی ندی کو دیکھنے لگا ۔ عجب ندی تھی ۔ ابھی خشک تو ابھی جل تھل ۔ مزاج کا کوئی پتہ ہی نہیں کہ آدمی دھوکا کھا جائے ۔ اُس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا

" تم تو ذرا ذرا سی بات میں بگڑ جاتے ہو ۔ عجب آدمی معلوم ہوتے ہو ! "

میں چپ رہا ، وہ پھر بولا ۔

" سنو سنو ۔ وقت کم ہے اور راستے بھی ہم اگر اپنے مزاج کی مٹ ملگی میں گزار دیں گے تو پھر رہ کیا جائے گا ؟ "

" صفر ۔۔۔۔۔۔۔۔ ! "

میں فوراً بولا ۔

" تب تو اور بھی کمال ہے کہ سب جانتے ہوئے بھی تم ایسا کرو ۔ آؤ باتیں کریں ۔ دیکھو کتنی حسین فضا ہے ، کتنی خوب صورت ندی ہے ۔ ایسی خشک اور حسین ندی تم نے دیکھی ہے ۔ ؟ "

وہ کچھ جذباتی سا ہو گیا ۔

" کس نے کس کو دیکھا ہے ۔ ؟ اس بات کو رہنے ہی دیا جائے تو بہتر ہے ! "

" تمہاری چھتری کے پیچھے تو کوئی چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے ! "

اُس نے میرا مذاق اُڑایا لیکن میں اپنے سابقہ لہجے میں اڑا رہا ۔

" کس کی چھتری کے پیچھے کون ہے ۔ اسے دیکھنے کے لئے نظر چاہیئے ۔ "

" خیر چھوڑو ۔ تم مجھے نقطۂ انجماد پر ٹھہرے ہوئے معلوم ہوتے ہو ، تمہاری باتوں میں ویسا ہی ٹھہراؤ ہے ! "

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

" عورت کے پاس چلو گے ۔ ؟ "

" عورت ۔۔۔۔۔۔ ؟ تم کون سی عورت کی بات کر رہے ہو دوست ! میں تو پندرہ برس سے لے کر پینتیس برس تک کی عورت کو جانتا ہوں ۔ جب میری شادی ہوئی تھی تب میری بیوی کی عمر پندرہ سال تھی ، اب وہ پینتیس برس کی ہے ۔ ! "

میں اس عورت کی بات نہیں کر رہا ہوں ۔ اُس عورت کو تو سب کوئی جانتا ہے میں تو اس عورت کی بات کر رہا ہوں جسے کوئی نہیں جانتا ۔ ! "

" میں ایسی عورت کے پاس کیوں جاؤں جسے کوئی نہیں جانتا ! "

" جاننے کے لئے ۔۔۔ اس طرح تمہاری معلومات میں اضافہ ہوگا ۔۔۔۔۔۔ ! "

" معلومات میں اب گنجائش نہیں ۔۔ ان سبھوں کا اتنا بوجھ ہو گیا ہے کہ میرے لئے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہے "

" بس ۔۔۔ ! ؟ تم کم ہمت ہو ۔ ایسے میں تم سے مجھے کیسے نبھے گی ۔ ؟ "

" نبھ جائے گی اگر تم چاہو ۔۔۔ سمجھوتہ ! "

" لیکن سمجھوتے میں تو تھوڑا آگے پیچھے ہونا پڑتا ہے اور تم ایک RIGID انسان ہو ! "

" میں RIGID ہوں لیکن سمجھوتہ کر سکتا ہوں ۔۔۔

اب تک یہی کرتا آیا ہوں۔ یہ RIGIDITY اسی کی تو

دین ہے ——— !"

"کیا تم نے وہ قصہ سُنا ہے ......"

"میں قصہ کہانیوں میں یقین نہیں رکھتا — میں تو اس بات پر یقین رکھتا ہوں جو کچھ میں دیکھتا ہوں۔ اس سے آگے نہیں جاتا — !"

"اب تم نے کام کی بات کہی ہے۔ کچھ لوگ خواہ مخواہ قصے کہانیوں پر یقین کر لیتے ہیں اور اپنے اوپر ILLUSION طاری کر لیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ FRUSTRATION کے شکار ہو جاتے ہیں۔ جو کچھ دیکھتے ہیں اُس پر یقین نہیں رکھتے، جو کچھ دیکھتے نہیں اُس پر یقین کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگ ایک مسئلہ بن جاتے ہیں۔"

"سمجھوتہ ——— سمجھوتہ !"

"اب تم نے عورت کے ہاں جانے سے انکار ہی کر دیا ہے تو پھر رہ کیا گیا — ؟"

"اب میں صفر نہیں کہوں گا ! "

"نہ کہو — لیکن ایک کام کرو — آؤ ہم اپنے چہرے بدل لیں — !"

اس کی آفر سخت تھی لیکن میں سمجھوتے کی بات چھیڑ چکا تھا اس لئے مجھے مان جانا پڑا اور ہم دونوں نے اپنے اپنے چہرے بدل لئے۔ میرا چہرہ اس کے بالکل فٹ آ گیا اور اس کا چہرہ مجھے۔ اور تب اس نے مجھے بہت سے واقعات سُنائے۔

نمرود کی خدائی کا ....

فرعون کی فرعونیت کا ....

حسن بن الصباح کی جنت کا ....

قارون کی دولت کا ....

اور پھر ——— ہٹلر کا، مسولینی کا ——— اور تب موجودہ دَور کے نامور ظالموں کا، آگ اور خون کا ——— مہلک ہتھیاروں اور عقیدوں کا ——— [illegible]

اور — اور بھی بہت سے [illegible] ...!

ان تمام قصوں میں مجھے [illegible]

کیونکہ وہ بہت جوش سے بول رہا تھا اور جوش سے آدمی اس وقت بولتا ہے جب بات اس کے دل کی گہرائی سے نکلتی ہے اور جو بات دل کی گہرائی سے نکلتی ہے وہ بات سچی ہوتی ہے اور سننے والے کو سچی لگتی ہے۔

——— اور ان تمام واقعات کو سُن کر مجھے پتہ چلا کہ میری معلومات ناقص تھیں اور وہ مجھ سے بہت زیادہ جانتا تھا۔

اتنی بات چیت کے بعد میری اس سے دوستی ہو گئی اور اب ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر باتیں کرنے لگے۔ بہت سی باتیں جیسے یہ دنیا بہت ہی حسین بہت خوب صورت ہے ——— یہ ایک خوب صورت باغ ہے، گل ہائے رنگ رنگ سے سجا ہوا — یہ کسی آرٹسٹ کا ایک عظیم الشان شاہکار ہے — بہت قیمتی، بہت ہی نایاب چاند ستاروں کی دنیا کی باتیں تو محض فریب ہیں، حقیقت کی دنیا تو بس یہی ہے۔ عظیم، عظیم الشان دنیا ...... وغیرہ وغیرہ!

"دنیا کی حقیقت ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہے!"

ایک زور دار آواز آئی۔ ہم دونوں چونک گئے۔

ایک دراز قامت، بارعب شخص، سفید لباس میں ملبوس ہم دونوں کے سر پر کھڑا تھا۔ اس کے سر پر روشنی کا ایک ہالہ سا تھا جو جلتا تھا اور بجھتا تھا۔ جب جلتا تھا تب روشنی پھیلتی تھی اور جب بجھتا تھا تب تاریکی چھا جاتی تھی۔ ہم حیران ہوئے۔ یہ کہاں سے آ ٹپکا — ؟ اور ہم لوگوں کی باتیں اُس نے کیسے سُن لیں — ؟

ابھی ہم کچھ پوچھنے بھی نہ پائے تھے کہ وہ شخص ہم سے مخاطب ہوا۔

اے شخص ——— ! تو ایک گنہگار انسان ہے کیونکہ اپنا چہرہ تبدیل کر لیا ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایسا کیوں کیا — ؟

بجائے میرے وہ بول اٹھا۔

" تمہیں کسی سے ایسے سوال کرنے کا کوئی حق نہیں — ! "

اس شخص نے اس پر کوئی دھیان نہیں دیا اور جواب کا منتظر سا صرف میری طرف دیکھتا رہا۔ مجھ سے جواب نہیں بن پڑ رہا تھا آخر میں نے سچ بات کہدی۔

" ہم نے سمجھوتہ کیا ہوا ہے — ! "

وہ شخص بڑا مغموم سا ہوگیا اور بولا۔

" تیرے سمجھوتے کی بات سن کر افسوس ہوا کیونکہ سمجھوتے کمزور انسان کیا کرتے ہیں۔ کیا تو نے وہ قصہ نہیں سنا کہ جب ایک وسیع و عریض سنسان میدان میں تجھ جیسے ایک انسان پر ایک اژدہا لپکا تھا۔

وہ شخص بھاگا، اژدہا بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ دور ایک نحیف و نزار بوڑھا کھڑا تھا۔ اس شخص نے اس سے پناہ کی درخواست کی لیکن وہ بوڑھا رونے لگا کہ میں ضعیف و ناتواں تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا لیکن تو قبلہ رخ چلا جا، شاید کوئی صورت بچاؤ کی نکل آئے۔

وہ شخص قبلہ رخ بھاگا، اژدہا بھی آگ اگلتا ہوا اس کے پیچھے تھا کہ اتنے میں ایک خندق آ گئی اب تو آگے کا کوئی راستہ بھی نہیں رہا اور اژدہا قریب سے قریب تر چلا آ رہا تھا، تب خندق سے آواز آئی کہ پیچھے بھاگ — ! وہ شخص پیچھے مڑا، تب اس نے ایک اور بوڑھے کو دیکھا، ہانپتا کانپتا اس کے پاس پہنچا اور اس سے مدد کی درخواست کی۔ بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے — وہ بھی مجبور تھا لیکن اس نے ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کر دیا کہ وہاں بہت سی امانتیں ہیں، شاید تیری بھی کوئی امانت ہو اور وہ تجھے بچا سکے۔ اور تب وہ شخص اس پہاڑی پر چڑھ گیا جو چاندی کا تھا اور جس میں ہر طرف نہریں رواں تھیں۔ ایک چوٹی پر ایک عالی شان قلعہ تھا۔ وہاں اس شخص کی رکھی ہوئی امانت نے اس کی جان بچائی۔

ہم دونوں محو ہو کر سن رہے تھے۔ میرے دوست کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا، ایک جاتا تھا۔ ماحول بوجھل سا ہوگیا تھا۔ میرے دوست نے میرا شانہ ہلا کر کہا۔

" اٹھو چلو یہاں سے — ذرا پل کے نیچے چلتے ہیں نیچے کا منظر بڑا حسین ہے ..... "

" لیکن نیچے تو خطرہ ہے۔ کیا پتہ، پانو کی تہہ سے جیتا پل پڑے .... ؟ "

" تمہاری یہی عادت مجھے پسند نہیں ہے۔ تم رسک سے اتنا بھاگتے ہو، یہ اچھی عادت نہیں ہے۔ یہی چیز تمہیں لے ڈوبے گی — "

بات معقول تھی۔ مینارہ والے شخص کی وجہ کر ذہن ایسا بوجھل ہوگیا تھا کہ میں نے نیچے جانے ہی میں عافیت سمجھی لیکن دفعتاً وہ شخص چلا اٹھا۔

" اے انسان ! کیا تو چاہتا ہے کہ تیرے دوست ایسے کمزور ہیں کہ وہ تجھے خوفناک اژدہے سے بھی نہ بچا سکیں۔ ؟ "

" نہیں — ! "

" نہیں تو پھر کیا تو یہ چاہتا ہے کہ تیرے دوست ایسے کمزور ہیں کہ وہ تجھے راہ بھی نہ سجھا سکیں۔ ! "

" نہیں نہیں — ! "

میں چیخ پڑا۔

" کیا تو نے اپنی کوئی امانت رکھی ہے — ؟ "

" نہیں — ! "

" نہیں تو پھر تو اپنے اس دوست کو مار ڈال۔ حملہ کر دے اس پر۔ یہ تیرا دشمن ہے۔ ! "

اس شخص نے مجھے ترغیب دلائی۔ میں بڑا حیران ہوا۔

وہ بہت ہی اچھا دوست تھا۔ اس نے مجھ سے بہت سی میٹھی میٹھی باتیں کی تھیں، اُس نے مجھے بہت سے قصے سُنائے تھے اور وہ مجھے نیچے جانے کو کہہ رہا تھا تاکہ میرے بوجھل ذہن کو عافیت ہو۔ اب اُس سے میں جھگڑ پڑوں۔؟ عجیب سی بات تھی مضحکہ خیز سی ——— لیکن مینارہ والے شخص نے حملہ کرنے کی بات اتنی بار کی کہ میں کچھ سمجھے سوچے بغیر اُس پر پل پڑا اور پھر ——— اُف!

کس قدر طاقت ور تھا کم بخت —! میری ہڈی، پسلیاں ایک ہوتی معلوم ہو رہی تھیں۔ میں بھی اپنا پورا زور لگا رہا تھا لیکن بھلا اس کا میرا کیا مقابلہ —؟

مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ خواہ مخواہ اس سے لپٹ پڑا۔ نہ دشمنی، نہ عداوت۔ مجھے مینارہ والے شخص پر غصہ آنے لگا کہ اس نے مجھے یوں لڑا دیا اور پھر اپنے پر غصہ آنے لگا کہ اپنی طاقت کا غلط اندازہ کیوں لگایا اور کیوں خواہ مخواہ جھگڑ پڑا۔ اب مرو کم بخت!

کافی دیر کی نبرد آزمائی کے بعد اتنا ہوا کہ ہم دونوں بے دم ہو گئے اور اتنے بے حال ہوئے کہ حرکت کی بھی سکت نہ رہی اور تھک ہار کے ایک دوسرے سے دُور جا گرے۔ اب جا کر معلوم ہوا کہ اس بیچ ہم دونوں کے چہرے اپنی اپنی جگہ پر آ گئے تھے۔

کافی دیر تک ہم لوگ یونہی پڑے رہے۔ مینارہ والا شخص غائب ہو چکا تھا اور رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی مجھ میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ میں اُٹھ کر جا سکتا۔ یہی حال اس کا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب صبح آئے گی، جب سورج آئے گا، جب زندگی آئے گی تب ہم دونوں کہیں روند ڈالے جائیں —!

لیکن جب صبح ہوئی، جب سورج آیا، جب زندگی آئی تو ہم دونوں روندے نہیں گئے بلکہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اس کا وجود بھی غائب ہو گیا۔ ریت جیسے گھاس میں سے شبنم کے قطرے غائب ہو جاتے ہیں اور اس کرن نے اندر اتنی حرارت پیدا کر دی کہ میں اُٹھ کر جا سکوں ——— اور میں مرے مرے قدموں سے چل پڑا۔

بقیہ: اپنی صلیب

ارے ارے یہ کیا ——— ؟؟ اُف ——— ! یہ کیا ہوا خدا! توبہ توبہ ——— چلتے چلتے میرا پاؤں خیالی میں گندگی پر پڑ گیا اور میں پھسل کر گرتے گرتے بچا گندگی میرے سُراخ شدہ ہوائی چپل سے ہو کر میرے تک میں لگ گئی ہے اور بہت سے کیڑے کلبلانے لگے

اب میں کیا کروں، یہ عذاب تو مجھ پر ہی آ پڑا۔ قریب میں پانی ملنے کے آثار بھی نہیں ہیں۔ پُل کے ندی تو ہے لیکن اس کے لئے کافی دُور جانا ہو گا ظاہر ہے گندگی ساتھ لے کر جانا ہو گا ———

میں جھنجھلا اُٹھتا ہوں اور تھوڑی دیر تک وہیں پر کھڑا رہتا ہوں۔ آہستہ آہستہ جھنجھلاہٹ دور ہو جاتی ہے میں چلنے لگتا ہوں چُپ چاپ سر جھکائے ——— ندی دور ہے تو کیا ہوا، گندگی صاف کرنا ضروری ہے۔

● ●

عبدالصمد

ـہ لندن ہے ــــ! اور یہ لندن کے نواحی علاقے
ـکالونی ہے جہاں ہندوپاک سے آئے لوگوں نے
ـاد کر رکھی ہے۔ ان میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی
ـے لوگ ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تلاش معاش میں
ـاسے نکل پڑے تھے اور حالات کے تھپیڑوں نے انھیں
ـھینکا ــــ اس کالونی کی اصل خصوصیت جو ہے وہ
ـں بھی بھائیوں کی طرح رہتے ہیں اور بزرگوں نے
ـے لئے خواب دیکھا تھا وہ ماحول یہاں بدرجۂ اتم
ـدہ یہ عجب بات تھی کہ جس سرزمین سے بالادستی حاصل
ـانے خواب دیکھا تھا وہی سرزمین ان کے خوابوں
ـیا آباد کئے ہوئے تھی۔
ـونی کے دائیں سمت جو ایک زیر تعمیر سرخ رنگ کی
ـا اور جس کے داخلی دروازے کے اوپر "ہندوستان"
ـہے۔ اس کے چھٹویں منزل کے ایک سرے پر دو فلیٹ
ـیٹ میں دو ہندوستانی نوجوان احمد اور کمار اپنی فیملیوں
ـتے ہیں۔ ان کے فلیٹ ایک دوسرے سے ٹاٹ کی ایک

دیوار سے علیحدہ ہیں لیکن اس تقسیم کا اثر ان کے دلوں پر نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ان دونوں میں اتنی ـــــ گہری ہے کہ کالونی میں ان کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ احمد کی چیزیں کمار کے لئے وقف ہیں اور کمار کی چیزیں احمد بلا اجازت استعمال کرسکتا ہے۔ احمد کے گھر مرغی پکتی ہے تو کمار کے لئے آتی ہے اور کمار کے گھر دال پکتی ہے تو احمد کے گھر آتی ہے۔ ہولی احمد کے گھر بھی کھیلی جاتی ہے اور عید کی سوئیاں کمار کے گھر بھی پکتی ہیں۔ اخبار دونوں مشترکہ طور پر خریدتے ہیں اور ٹیلی ویژن کے پروگرام دونوں ساتھ دیکھتے ہیں اور یہ طریقہ ان کے یہاں سالوں سے چلا آرہا ہے، اس میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا ہے اور دونوں کی امٹ دوستی اس بات کی ضامن ہے کہ آئندہ بھی اس میں کوئی فرق نہیں آئے گا ــــ
احمد مقامی ڈاکخانے میں نوکر ہے اور کمار کی ہندوستانی گڑیوں کی ایک چھوٹی سی دکان ہے۔

دونوں کے بچوں اور بیویوں میں بھی کچھ کم بہناپا نہیں ہے انہیں بھی ایک دوسرے کے بغیر چین نہیں ہے دونوں گھرانے ایک دوسرے کے شریک غم و شریک مسرت ہیں۔ دونوں ایک دوسرے

وہ بہت ہی اچھا دوست تھا۔ اس نے مجھ سے بہت سی میٹھی میٹھی باتیں کی تھیں۔ اس نے مجھے بہت سے قصے سُنائے تھے اور وہ مجھے پیچھے جانے کو کہہ رہا تھا تاکہ میرے اُلجھن ذہن کو عافیت ہو۔ اب اُس سے میں جھگڑ پڑوں۔ ؟ عجیب سی بات تھی مضحکہ خیز سی ——— لیکن مینارہ والے شخص نے حملہ کرنے کی بات اتنی بار کی کہ میں کچھ بھی سوچے بغیر اُس پر پل پڑا اور پھر ——— اُف!

کس قدر طاقت ور تھا کم بخت ——! میری ہڈی، پسلیاں ایک ہوتی معلوم ہو رہی تھیں۔ میں بھی اپنا پورا زور لگا رہا تھا لیکن بھلا اس کا میرا کیا مقابلہ ——؟

مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ خواہ مخواہ اس سے لپٹ پڑا۔ نہ دشمنی، نہ عداوت۔ مجھے مینارہ والے شخص پر غصہ آنے لگا کہ اس نے مجھے یوں لڑا دیا اور پھر اپنے پر غصہ آنے لگا کہ اپنی طاقت کا غلط اندازہ کیوں لگایا اور کیوں خواہ مخواہ جھگڑ پڑا۔ اب مرو کم بخت!

کافی دیر کی نبرد آزمائی کے بعد اتنا ہوا کہ ہم دونوں بے دم ہو گئے اور اتنے بے حال ہوئے کہ حرکت کی بھی سکت نہ رہی اور تھک ہار کے ایک دوسرے سے دُور جا گرے۔ اب جا کر معلوم ہوا کہ اس بیچ ہم دونوں کے چہرے اپنی اپنی جگہ پر آ گئے تھے۔

کافی دیر تک ہم لوگ یونہی پڑے رہے۔ مینارہ والا شخص غائب ہو چکا تھا اور رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی مجھ میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ میں اُٹھ کر جا سکتا۔ یہی حال اس کا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب صبح آئے گی، جب سورج آئے گا، جب زندگی آئے گی تب ہم دونوں کہیں روند نہ ڈالے جائیں ——!

لیکن جب صبح ہوئی، جب سورج آیا، جب زندگی آئی تو ہم دونوں روندے نہیں گئے بلکہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اس کا وجود بھی غائب ہو گیا۔ یوں جیسے کہ اس کا وجود بھی غائب ہو گیا ہو ... اور سورج کی کرن نے اندر اتنی حرارت پیدا کر دی کہ میں اُٹھ کر چل سکوں ——— اور میں سرپٹ قدموں سے چل پڑا۔

بقیہ: اپنی صلیب

ارے ارے یہ کیا ——— ؟؟ اُف ——! یہ کیا ہوا خدا؟ توبہ توبہ ——— چلتے چلتے میرا پاؤں بے خیالی میں گندگی پر پڑ گیا اور میں پھسل کر گرتے گرتے بچا۔ گندگی میرے سوراخ شدہ ہوائی چپل سے ہو کر میرے پاؤں تک میں لگ گئی ہے اور بہت سے کیڑے کلبلانے لگے ہیں۔ اب میں کیا کروں، یہ عذاب تو مجھ پر ہی اُترا۔ کہیں قریب میں پانی ملنے کے آثار بھی نہیں ہیں۔ پُل کے نیچے ندی تو ہے لیکن اس کے لئے کافی دُور جانا ہوگا اور ظاہر ہے گندگی ساتھ لے کر جانا ہوگا ———

میں جھنجھلا اُٹھتا ہوں اور تھوڑی دیر تک وہیں پر کھڑا رہتا ہوں۔ آہستہ آہستہ جھنجھلاہٹ دور ہو جاتی ہے تو میں چلنے لگتا ہوں چُپ چاپ سر جھکائے ———
ندی دور ہے تو کیا ہوا، گندگی صاف کرنا بھی ضروری ہے۔

●●

یں

عبدالصمد

یہ لندن ہے ۔۔۔! اور یہ لندن کے نواحی علاقے
یک کالونی ہے جہاں ہندو پاک سے آئے لوگوں نے
اختیار کرلی ہے ۔ ان میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی
ح کے لوگ ہیں ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو تلاش معاش میں
دن سے نکل پڑے تھے اور حالات کے تھپیڑوں نے انھیں
لا پھینکا ۔۔۔ اس کالونی کی اصل خصوصیت جو ہے وہ
یہاں سبھی بھائیوں کی طرح رہتے ہیں اور بزرگوں نے
وں کے لئے خواب دیکھا تھا وہ ماحول یہاں بدرجۂ اتم
ہے اور یہ عجیب بات تھی کہ جس سرزمین سے بالادستی حاصل
نھوں نے خواب دیکھا تھا وہی سرزمین ان کے خوابوں
دنیا آباد کئے ہوئے تھی ۔

کالونی کے دائیں سمت جو ایک زیر تعمیر سرخ رنگ کی
ہے اور جس کے داخلی دروازے کے اوپر "ہندوستان"
لکھا ہے ۔ اس کی چوتھی منزل کے ایک سرے پر دو فلیٹ
فلیٹ میں دو ہندوستانی نوجوان احمد اور کمار اپنی فیملیوں
رہتے ہیں ۔ ان کے فلیٹ ایک دوسرے سے ٹاٹ کی ایک

دیوار سے علحدہ ہیں لیکن اس تقسیم کا اثر ان کے دلوں پر نہیں معلوم
ہوتا کیونکہ ان دونوں میں اتنی ۔۔۔ گہری ہے کہ کالونی میں ان
کی مثالیں دی جاتی ہیں ۔ احمد کی چیزیں کمار کے لئے وقف ہیں
اور کمار کی چیزیں احمد بلا اجازت استعمال کرسکتا ہے ۔ احمد کے
گھر مرغی پکتی ہے تو کمار کے لئے آتی ہے اور کمار کے گھر دال پکتی
ہے تو احمد کے گھر آتی ہے ۔ ہولی احمد کے گھر بھی کھیلی جاتی ہے اور
عید کی سوئیاں کمار کے گھر بھی پکتی ہیں ۔ اخبار دونوں مشترکہ طور پر
خریدتے ہیں اور ٹیلی ویژن کے پروگرام دونوں ساتھ دیکھتے
ہیں اور یہ طریقہ ان کے یہاں سالوں سے چلا آرہا ہے، اس میں ذرہ
برابر بھی فرق نہیں آیا ہے اور دونوں کی امٹ دوستی اس بات کی
ضامن ہے کہ آئندہ بھی اس میں کوئی فرق نہیں آئے گا ۔۔۔
احمد مقامی ڈاکخانے میں نوکر ہے اور کمار کی ہندوستانی گڑیوں کی
ایک چھوٹی سی دکان ہے ۔

دونوں کے بچوں اور بیویوں میں بھی کچھ کم بہناپا نہیں ہے
انہیں بھی ایک دوسرے کے بغیر چین نہیں ہے دونوں گھرانے ایک
دوسرے کے شریک غم و شریک مسرت ہیں ۔ دونوں ایک دوسرے

کے رازدار ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی بھلائی برائی سے واقف ہیں۔

لیکن اس دن کیا ہوا تھا ــــــــــ ؟

ہوا تو کچھ بھی نہ تھا بس یہ ہوا تھا کہ احمد نے اپنے دفتر میں یہ خبر سنی تھی کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات ہو گئے ہیں۔ ہندو مسلمان کو اور مسلمان ہندو کو بلا امتیاز دوستی برادری کاٹتے پھر رہے ہیں، ایک دوسرے کے خون سے رنگ رلیاں منا رہے ہیں وغیرہ وغیرہ ــــ اور بہت کچھ ــــ ٹھیک یہی خبر کمار کی گھڑیوں کی دکان میں بھی پہنچی تھی۔

دونوں اپنی اپنی جگہ سن سے ہو کر رہ گئے تھے، اور دونوں کے دلوں میں ایک ہی خواہش نے جنم لیا تھا۔

"آج اکیلے ریڈیو سنا جائے اور صحیح واقعات معلوم کئے جائیں۔!؟"

اور دوسرے ہی لمحہ ایک خیال بجلی کی طرح ان کے دلوں میں کوند گیا تھا۔

"کمار کیا سوچے گا۔؟"

"احمد کیا سوچے گا۔؟"

اور ــــ پھر آنے والے لمحوں نے انہیں جلد ہی سمجھا دیا تھا۔

"اگر مسلمان EXCESSIVE ہوئے تو میرے سامنے احمد پر کیا بیتے گی۔؟"

"اگر ہندو EXCESSIVE ہوئے تو میرے سامنے کمار پر کیا بیتے گی۔؟"

ــــــــــــ اور پھر دونوں اپنی اپنی جگہ مطمئن تھے ــــــ

ڈھلتی شام دونوں گھر پہنچے تو روزمرہ کی طرح ایک دوسرے سے ملے، چائے پی، حالات حاضرہ پر تبادلۂ خیالات کئے لیکن پتہ نہیں کون سی انجانی طاقت انہیں ہندوستان میں ہونے والے فسادات پر بات کرنے سے روکے رہی۔ اور جب خبروں کا

وقت ہوا تو دونوں کے قدم خود بخود اپنے اپنے [illegible] کی طرف اٹھ گئے۔ یہ قدم ان کے اپنے یا [illegible] انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ یہ قدم ان کے اپنے نہیں ہیں [illegible] کہیں سے مستعار لے گئے ہیں۔

اب اگر ان کے فلیٹوں سے دور، بہت دور اوپر سے نگاہ ڈالی جائے تو ایک ہی منظر دکھائی دے [illegible] ــــــــ ایک چھوٹا سا گھر ہے جس میں فیشن [illegible] زمانے کی تمام اہم ضروریات قرینے سے سجی ہوئی ہیں، خوبصورت صوفے لگے ہوئے ہیں۔ جن پر ایک مرد، ایک عورت اور [illegible] تین بچے بیٹھے بہت ہی دھیان سے دھیمی آواز میں ریڈیو سن رہے ہیں جو صوفہ سیٹ کے بیچ میں ایک خوبصورت سی شیشے کی دبیز میز پر رکھا ہے اور اس کی بغل میں ایک چھوٹی سی تپائی پر چند رسالے اور اخبارات رکھے ہیں۔ ریڈیو سے فسادات کے بارے میں خبریں نشر ہو رہی ہیں اور عجیب عجیب خبریں آ رہی ہیں۔ دشمن ممالک کے ریڈیو ان میں نمک مرچ لگا کر بیان کر رہے ہیں۔

"ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات ــــ کل پانچ ہزار ...... اور ...... ہلاک ہوئے۔"

"ایک .... نے اپنے ...... دوست کے گھر میں اپنے ہاتھوں سے آگ لگائی اور اس کے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا۔ ــــــ"

"ایک ...... نے ایک مندر میں آگ لگا دی جس میں پجاری بیٹھے پوجا کر رہے تھے اور یہ سب کے سب جل کر ختم ہو گئے ــــ"

"ایک ...... نے جامع مسجد میں ڈائنامیٹ لگا کر اسے اینٹوں کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا۔"

"ایک ...... نے راہ چلتے تین ماہ کے بچے نے بچوں کو قتل کر دیا اور ان کے سر ان کے والدین کے گھروں [illegible]

...نک گئے

ایک ...

ایک

عورت نے گھبرا کر جلدی سے ریڈیو کی سوئچ بند کر ڈالی
اور اپنے بچوں کی طرف خوف و ہراس سے پُر نظروں سے
دیکھنے لگی جو اپنے ماں باپ کی طرف سہمی سہمی نظروں سے
دیکھ رہے تھے۔ مرد نے شام کا اخبار اُٹھایا اور اُسے
اپنی آنکھوں سے بہت قریب کر کے پڑھنے لگا۔ عجیب عجیب
خبریں تھیں، عجیب عجیب داستانیں تھیں، فسادات
کے سلسلے میں نمایاں تصاویر دی گئی تھیں اور پورا اخبار
"فساد نمبر" بنا ہوا تھا۔ مرد نے تھوڑی دیر تک اخبار کا
مطالعہ کر کے اُسے عورت کی طرف بڑھا دیا۔ عورت نے کچھ
دیر تک اخبار کو دیکھا اور پھر اُسے تہہ کر کے میز پر رکھ کر ایک
موٹی سی کتاب سے داب دیا۔ بچے ایک ٹک اپنے والدین
کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔
آخر مرد نے سگریٹ کی ڈبیہ نکال کر ایک سگریٹ
اپنے ہونٹوں میں دبایا اور عورت نے ماحول کے سکوت کو
توڑا۔ "اب کیا ہوگا؟"
مرد نے چونک کر عورت کی طرف دیکھا اور سگریٹ
سُلگاتے ہوئے بولا۔
"ہوگا کیا ــــــ یہاں کیا ہوگا ــــــ تم بھی
کمال کرتی ہو، یہ انگلینڈ ہے ڈارلنگ، یہاں کیا ڈر ہے۔"
کہتے کہتے اُس نے ایک مسکراہٹ سی اپنے چہرے پر بکھیر لی۔
عورت کچھ کہتے کہتے رُک گئی اور اپنے ناخنوں پر لگے
نیل کو کھرچنے لگی ــ تھوڑی دیر تک ماحول پر پھر سکوت چھایا
رہا جسے عورت ہی نے توڑا۔
"پھر بھی کچھ تو ــــــ کچھ تو کرنا ہی چاہیے
یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا بھی تو ٹھیک نہیں۔"

مرد نے آدھا پیا ہوا سگریٹ ایش ٹرے میں رکھ دیا اور
عورت کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔
"کیا کیا جائے ــــــ تم ہی کچھ بتاؤ۔"
اسی لمحے بچے ایک دم بول پڑے۔
"پاپا۔ کل ہی ہم لوگوں کا اسکول بھی تو ہے، ہم لوگ
تو جائیں گے نا؟"
عورت نے جواب دیا۔
"نہیں نہیں کل اسکول جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔
یہیں چپ چاپ پڑھتے رہنا اور دیکھو گھر سے باہر نکلنا
بالکل ختم، سمجھے!"
بچے پھر کچھ نہ بولے۔ مرد اتنی دیر تک چپ چاپ
غور کرتے رہنے کے بعد بولا۔
"تم ٹھیک کہتی ہو۔ کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی چاہیے۔ انہوں
کا بھی کیا بھروسہ، اپنی زمین پر نظر بدلتے دیر نہ لگی تو پھر اس
دیارِ غیر میں کتنی دیر لگے گی ــ"
عورت نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مرد سے
کہا۔ "تو پھر......؟"
مرد صوفے پر پھیلتے ہوئے بولا۔
"وہ پستول جو میں نے فرانس میں لیا تھا، تمہارے
ہی پاس تو ہوگا، ذرا نکال لو۔"
عورت اُٹھی اور ایک بند الماری سے چمڑے کے خول میں
ایک پستول لا کر مرد کو دیا۔ مرد نے پستول نکال کر اُسے دیکھا
بھالا اور بغیر گولی کے ٹریگر دبا دیا۔ 'چٹ' کی ایک آواز آئی
اور مرد نے مطمئن سا ہو کر پستول کو پھر خول میں رکھ دیا اور
یکایک چونک کر اپنی بیوی سے بولا۔
"ارے ہاں ــ یاد آیا ــــــ وہ تلوار تو رکھی ہوگی جو
مجھے جمیس جان نے تحفہ میں دی تھی۔ اُسے نکالو تو۔"
عورت اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی اور جب آئی

[illegible]

جو اس نے مرد کے حوالے کی۔ یہاں لائٹنی بہت ہی گرد آلود تھا۔ [illegible] سے اسے باہر نکالا تو گرد سے بھی کے چہرے دھواں ہوگئے۔ تلوار نکالی تو اس پر کہیں کہیں پر زنگ لگ گئی تھی۔ مرد اٹھ کر ایک الماری کی طرف گیا اور اس میں سے ایک چوڑے منہ والی چھوٹی سی شیشی نکال لایا۔ اس میں لوہے صاف کرنے کا کوئی سفوف تھا۔ صوفے پر بیٹھ کر اور روئی کے گالوں سے اس نے تلوار کے پھل کو رگڑنا شروع کیا۔ تھوڑی سی کاوش کے بعد تلوار چمکنے لگی تب مرد نے اسے پھر سے میان میں رکھ دیا اور دیوار میں لگی کھونٹی سے لٹکا دیا۔

عورت یکایک چونک کر اٹھی اور ایک شیشے کی الماری سے بہت سی چھریاں سمیٹ لائی اور مرد سے بولی۔

"یہ اتنی ساری چھریاں رکھی ہوئی ہیں۔ شاید کام دے جائیں۔"

مرد کچھ نہ بولا۔ بچوں نے ایک ایک چھری اٹھالی اور خوشی سے تالیاں سی بجاتے ہوئے کہنے لگے۔

"پاپا — اسے ہم لوگ رکھیں گے۔"

مرد پھر بھی کچھ نہ بولا اور غور سے بچوں کو دیکھنے لگا جو چمچماتی چھریوں پر اپنے عکس کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے عورت نے اب کچھ مطمئن سی ہو کر سوئیٹر بننا شروع کر دیا تھا۔ اور مرد سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جارہا تھا۔

لمحوں کی کئی کڑیاں مختلف مراحل سے گزر کر ایک دوسرے سے جڑتی چلی گئیں۔ دیوار پر لگی گھڑی نے نو بجائے تو عورت چونک اٹھی اور مرد سے کہنے لگی۔

"ارے۔ کھانے کا تو کچھ خیال ہی نہ رہا اور نو بج گئے دیکھئے ذرا بند ٹوبن میں کھانے تو لے آئیے۔ ہائی وے پر ابھی دوکان کھلی ہوگی۔ بچے بھوکے ہیں۔"

مرد نے جلتا ہوا سگریٹ بجھا دیا اور صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور [illegible] سے بولا۔

"لاؤ — میرا اوور کوٹ [illegible]"

عورت نے اوور کوٹ لاکر [illegible] مرد اسے پہن کر جانے لگا تو یکایک بول اٹھی۔

"سنئے تو — [illegible] ٹھیک [illegible] پستول تو رکھ لیجئے۔"

مرد ٹھہر گیا۔ عورت نے پستول اسے دیا تو اس نے چپ چاپ اپنی جیب میں ڈال لیا۔

— [illegible] بلڈنگ کے [illegible] کے اوپر "ہندوستان" لکھا ہوا ہے احمد اور کمار کی [illegible] ہوگئی، ایک دوسرے کو دیکھتے ہی دونوں کے ہاتھ اپنے اوور کوٹ میں گئے اور پستول پر گرفت مضبوط ہوگئی اور احمد بول اٹھا۔

"تم نے ریڈیو سنا کمار؟"

"نہیں — اور تم نے؟"

"نہیں — میں نے بھی نہیں سنا۔"

احمد نے کہا اور دونوں دوست ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہائی وے کی طرف بڑھتے گئے کہ دونوں کے گھروں میں کھانا نہیں پکا تھا اور رات زیادہ ہو رہی تھی۔

●●

OC 75
CB 80 D
When you buy Chandan
You buy the best in
STEEL FURNITURE
They are
★ LOVELY
★ RELIABLE
★ DURABLE
Chandan
Dealers for Gaya District
GAYA EMPORIUM
G.B. Road, Gaya
Phone : 175

[illegible] — ریز ہاؤس — بِگ جون روڈ — گیا

شمارہ ۳۵ / ۳۶

مئی ۱۹۷۳ء

جون ۱۹۷۳ء

دفتر : بیراگی، گیا
مطبع : ہند لیتھو پریس گیا
کتابت : قمر نظامی

۱ سال کے لئے ۱۲ روپے
۲ سال کے لئے ۲۲ روپے
۳ سال کے لئے ۳۰ روپے

فون

دفتر : ۶۶۲

رہائش : ۵۳

●

مرتّبین

کلام حیدری　　پرکاش فکری

مرثیہ

آہنگ کے اس شمارے کے بعد جو شمارہ پیش کیا جائے گا، وہ "احتشام حسین نمبر" ہوگا۔ ہم نے اس نمبر کے سلسلے میں بلند بانگ دعوے نہیں کئے ہیں' اپنی روایت کے مطابق اسے ہم بے حد انکسار کے ساتھ ادبی دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ جن فن کاروں نے ہماری مدد کی ہے وہ اظہار تشکر سے بے نیاز اور پیکر خلوص و محبت ہیں۔

یہ نمبر جناب احتشام حسین صاحب مرحوم کی خدمت میں ایک حقیر سا نذرانۂ عقیدت ہے۔ ہماری کیا بساط کہ ہم ایسی عظیم شخصیت کے شایان شان نمبر نکال سکیں۔ تاہم چند مضامین ایسے ضرور ہیں جن کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کیا جاسکے گا۔

جناب احتشام حسین کے ہزاروں عقیدت مندوں میں سے میں بھی ایک بے حد معمولی سا عقیدت مند ہوں۔

۱۹۴۴ء سے ۱۹۷۲ء تک اتنی یادیں بکھری ہوئی ہیں کہ انہیں سمیٹ دوں تو دفتر ہو جائے لیکن ان یادوں کو سمیٹنے میں میری آنکھیں بہہ جائیں گی ـــــــ کیونکہ میں جب قلم اٹھاتا ہوں تو ....
مگر یہ بالکل ذاتی لگاؤ ہے اس لئے اس کا زیادہ ذکر کیا کروں ؟

(کلام حیدری)

ہمارے فن کار ....

احمد یوسف

اس بابان کار پر تاثر پڑھئے۔ وہی درد ویشانہ اسلوب اور انداز فکر۔ وہی رچاؤ جوان کی افسانہ نگاری میں ہے۔ احمد یوسف کی شخصیت اور فن میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ گوتم کی سرزمین پر ہونے والے اس سیمینار کی اہمیت اس لئے بھی قائم رہے گی کہ اس نے اُردو کو اتنا اچھا پر تاثر دیا۔

انور عظیم

دہلی، بہار، سسرال یوپی۔ مختلف ملکوں کی سیر کرنے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کے بعد ان دنوں سوویت سفارت خانے میں کام کرتے ہیں اور ترقی پسند مصنفین کے احیاء کے سجاد ظہیر کے ساتھ مل کر بے حد جوش و خروش کے ساتھ مشغول ہیں۔ دو ناول اور ایک افسانوں کے مجموعے کے مصنف ہیں۔ یوپی اُردو اکیڈمی نے ابھی ابھی ان کو ناول اور افسانوں کے مجموعے پر دو دو ہزار کے انعامات دئے ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے مختصر کلامی ان سے ممکن نہیں۔ ! نہرو ایوارڈ بھی انگریزی میں ایک کتاب لکھ کر حاصل کر چکے ہیں۔

شمس ندیم

غیاث احمد گدی کے دیار میں بہت عرصے تک رہے ہیں۔ افسانہ نگاری کے علاوہ پینٹنگز سے بھی ذوق رکھتے ہیں۔ آہنگ کے سرورق پہ ان کے آرٹ کا نمونہ آ چکا ہے۔ نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ کئی برس کے گیپ کے بعد ادبی میدان میں آگئے ہیں اور کئی اچھی کہانیاں اُردو کو دے چکے ہیں

سلام مچھلی شہری

پدم شری سلام مچھلی شہری سا قادر الکلام شاعر کم ملے گا۔ پچھلے تیس سال سے اُردو شاعری میں ان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ ذہانت مسلم ہے۔ سنا ہے کہ اب شراب نے ان کو چھوڑ دیا ہے۔ یہ ماننے کو جی نہیں چاہتا کہ شراب کو انہوں نے چھوڑا ہے۔

سلطان اختر

محکمۂ جیل میں کام کرتے ہیں۔ اسی لئے ہر قید سے آزاد ہیں۔ غزل کو جدت سے اور جدت کو غزل سے ٹکرا کر چنگاریاں پیدا کرتے ہیں۔ ان چنگاریوں میں بے حد کشش ہے اور ان کی بڑی قدر ہے۔

حق اعظمی

شارٹ ہینڈ کے ماہر ہیں اس لئے غزل کہنے میں ان کو بڑی آسانی رہتی ہے۔ خوب صورت اور اچھی غزلیں کہتے ہیں۔ اسی شمارہ میں ان کی نظم ملاحظہ کیجئے۔

طلعت جہاں فیروز

بہار یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں۔ "پیکر تراشی" کی تلاش میں غالب سے فیض تک سرگرداں ہیں۔

[illegible] شوری

وہ زندہ ہے —!

۱

— گلابی دور میں
وہ اپنے فن کا شاہزادہ تھا
فضائے عارض و چشم و لب و گیسو کا شیدائی
وہ عریاں
نیم عریاں جسم کی قوس و قزح
اُن کا تاثر
اُن کی تجلی
اپنی تصویروں میں بھرتا تھا
حسینوں کے دلوں میں وہ تھا
خود بھی اُن پہ مرتا تھا —!
اسے اس دور میں
عزت ملی
دولت ملی — لیکن
دلِ رومان پرور میں
کوئی شعلہ سا بھی محسوس کرتا تھا —!!

۲

مصور ہی کے ناطے
اُس کا "شش پہلو" تصور
ایک شعلہ تھا
کہ جس نے فن کا وہ پچھلا تصور خاک کر ڈالا
وہ تصویروں میں
"تجریدی تصور" زندگانی کا
بڑی خوبی سے بھرتا تھا،
دکھائی دینے والا اک نیا سنگیت دیتا تھا۔!

۳

وہ جانب دار تھا
اور صاف کہتا تھا:
"— کہ جب انسانیت
تہذیب
اور اعلیٰ ترین قدریں
گھری ہوں سخت خطروں میں
تو اک فن کار پر بھی یہ بتانا فرض ہوتا ہے
کہ وہ کس کی طرف ہے
فن کا اُس سے کیا تقاضا ہے۔!"

۴

"پکاسو" مر گیا
یہ سوگ ہے — لیکن
"پکاسو" اب بھی زندہ ہے
وہ اپنے شاہکاروں میں
اُسی انداز سے کھویا ہوا ہے
اور کہتا ہے:
میں زندہ ہوں
دلوں کے درد کو
بے چینیوں کو،
اضطرابوں
اور آہوں کو
کہیں اِک منزلِ زندہ "سے پہلے موت آتی ہے۔؟

●●

[illegible] ہوئے اوپر پہنچتے ہیں۔

[illegible] ہے۔

[illegible] "یہ فصیل کا جو ہیں۔"

[illegible]، جہاں طلبا رخاص [illegible] ہیں۔ اور اس کے قریب ادیبوں اور مہمانوں کی نشستیں۔

[illegible] کے بعد افسانہ نگاروں کی گل پوشی اور [illegible] کی لائف ممبرشپ۔

انور عظیم، جیلانی، غیاث احمد گدی، کلام حیدری اور احمد یوسف۔

کلام حیدری، احمد یوسف کے آگے کچھ سفید کاغذ رکھ دیتے ہیں۔ "اتنے میں کام چل جائے گا۔"

(دوست ایسے ستم پیشہ کہ غزل میں بھی اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔)

اور شاہ شکیل احمد فرما رہے ہیں کہ گیا کالج کی یہ انجمن بے حد فعال رہی ہے۔ انور عظیم نے اپنا تعلیمی سفر اسی کالج سے شروع کیا تھا۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ وہ میرے اسٹوڈنٹ رہ چکے ہیں۔ آج کی شام اس مذاکرے کی صدارت بھی وہی فرمائیں گے۔

انور عظیم صدر کی نشست پر آجاتے ہیں۔ ان کے ایک بازو میں کالج کے پرنسپل ہیں، دوسرے میں شاہ شکیل احمد اور ان سے ملے ہوئے انجم ظفر۔

اعلان ہوتا ہے۔ کلام حیدری اس مذاکرے کی ابتدا کریں گے۔

(بجھی ہوئی مٹھیاں آسمان تک بلند ہوئیں چہرے پر غم و غصے کی تیز لہریں ابھریں اور آنکھوں میں سرخ ڈورے سے دوڑ گئے۔ یہ ۱۹۴۹ء / ۵۰ء کے عہد کی چند ایک علامتیں تھیں، جو اچانک بجلی کی طرح کوند گئیں۔)

کلام حیدری کہہ رہے ہیں۔ مذاکرے کا عنوان ہے۔ "افسانہ، کل اور آج" اس مذاکرے میں ہم لوگ اردو افسانے پر بحث کریں گے۔ داستانوں سے آگے بڑھ کر مختصر افسانہ جس طرح پریم چند کے یہاں ملتا ہے، اسے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ کل اور آج کی تفریق ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ ۵۰ء سے پہلے کل ہے اور ۵۰ء کے بعد آج۔ پریم چند کے یہاں جو اصلاح پسندی ہے وہ تحریک آزادی کے نتیجے میں تھی ہے۔ اعظم کریوی اور سدرشن کے یہاں بھی اصلاح پسندی کا رجحان ملتا ہے۔

'انگارے' کے بعد راہیں کھلتی ہیں اور تحریک میں فرائڈ اور مارکس دونوں آجاتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے کرشن، بیدی اور منٹو دیئے۔

اور اس کے بعد ردعمل کے طور پر یہ رجحانات آئے۔ کرشن کے CONTRIBUTION سے انکار ممکن نہیں۔ انہوں نے بڑا سرمایہ دیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان کے افسانوی انبار سے اچھے افسانے نکالیں۔ ترقی پسند تحریک نے ہمیں دو عظیم افسانہ نگار دیئے۔ کرشن اور بیدی۔

جدید ادب کے سامنے کوئی منزل نہیں ہے۔ اس لئے وہ بے سمتی کا شکار ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک بھی پندرہ سال رہی اور کوئی پندرہ سال جدید ادب کی عمر بھی بتائی جاتی ہے۔ لیکن پندرہ برسوں کے اندر جہاں ترقی پسند تحریک نے کئی ایک بلند قامت افسانہ نگار دیئے، جدیدیت نے ہمیں ایک بھی بلند قامت افسانہ نگار نہیں دیا۔

میں رانے شروع یوں کیا کہ ——— مجھے کلام حیدری کی ہر بات سے اختلاف ہے۔ [کرشن چندر کے افسانے معصوم قاری کی معصومیت سے فائدہ اٹھانے کی بدترین مثالیں ہیں] انہوں نے جن بڑے لوگوں کا نام لیا ہے ان میں ایک اور نام جوڑ لیجئے سعادت حسن منٹو۔

اس وقت میں ایک مقالہ پڑھوں گا۔ جسے میں نے دو سال

علی گڑھ سے فکشن سیمینار کے لیے لکھا تھا۔ اس کا عنوان ہے "تتولا"۔

"اس ملک میں بھینس کی، سانس کے آنے جانے کی نہیں۔ یہ ہوش و حواس گاڑی باندھنے کی ... جس میں مرنا بھی شامل ہے۔ دو علامتیں ہیں۔ [illegible]۔ جدید ادب کی تخلیق اور بقا کے لئے ہمیں ایک علامت کو لینا ہوگا اور ایک کو رد کرنا ہوگا ——"

محمد حسن عسکری جنہوں نے مغرب کے ادب کو سمجھا ہے، کی میکانکی ازم کے زمانے کی ایک تحریر ہے۔ [...... ہمارے نقادوں کے خیال میں ہماری زندگی اور روایت یورپ سے بالکل الگ ہے، یہ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن آج کل ہمارے یہاں ایک چیز مشترک ہے اور وہ روایتوں سے بھی زیادہ سنگین ہے یعنی ایٹم بم سے فنا ہو جانے کا خطرہ۔ اگر ساری انسانیت کو نیست و نابود ہونا ہے تو تنقیدی مضامین ہمیں اس موت سے نہیں بچا سکتے۔ لیکن فنا سے پہلے ہمیں یہ تو سوچ لینا چاہئے کہ آخر ایٹم بم ہمارے سروں پر کیوں گریں گے۔ (انسان اور آدمی)]

"ایٹم بم کا خطرہ' اسلامی ادب کی تحریک چلانے سے ٹلا نہیں کرتا۔ محمد حسن عسکری کی موت یقینی تھی۔ اگر کل وہ اپنی کم علمی (یوں تو وہ بہت پڑھے لکھے ہیں) کے کارن نہ مرتے تو آج بنگلہ دیش کی کہانی اُن کی موت کا سبب بنتی۔"

"ویٹ نام جینے کا اسلوب ہے، ویٹ نام جینے کی آدرش صورت ہے، ویٹ نام جدیدیت ہے، ویٹ نام آزادی ہے"

"اس اچھی بُری قدرے اجنبی تحریر کا جو تقسیم کے بعد کی نئی نسل کے COMPLEX PROBLEMS کا احاطہ کرتی ہے، کا المیہ یہ ہوا کہ یہ ATTENTION-GETTING VALUE بن گئی۔ جن کا استعمال آج ادب دشمن، عوام دشمن عناصر کر رہے ہیں۔"

"ساتویں دہائی کی شروع کی ایک اردو کہانی کا جملہ سُنئے

نئی نسل کی اس [illegible] ہے

[پہلے ہوا دین ہماری ذات کا [illegible]]

"سوویٹ یونین کی نئی نسل نے اپنے بزرگوں کا [illegible] بخشا کہ ان کے نزدیک غیر جانب[illegible] کی ضرورت تھی۔"

"لیکن اپنے ہاں اب تک جدید ادب [illegible] دانشورانہ (مواد اکٹھا کرنے کی حد تک سہی ہی) کے فریب کا شکار ہے۔ غیر جانبداری، بے عملی اور نا [illegible] حکومت کے بڑے کام آتی ہے اور جب دانشور بھی اس مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے، تب حکمراں چین کی نیند سوتا ہے۔"

"مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اردو کے بیشتر جدید ادیب نہ جی رہے ہیں نہ ادب لکھ رہے ہیں، بلکہ تتولا کھیل رہے ہیں۔ تتولا بنا کسی RISK کے بڑی نفع بخش LIGNT REFRESH-MENT اور ENTERTAINMENT ہے اور جدید ادب کے CREATIVE PROCESS کا مکمل اظہار ہے۔"

"ایک بھونپو بجے چلا جا رہا ہے اور دھڑا دھڑ جدید افسانے نکلتے آ رہے ہیں، جن کا نہ تو سماجی مسائل کے اقتصادی پہلوؤں سے کوئی تعلق ہے اور نہ عصری تاریخ کی تند و تیز ہواؤں سے۔"

"کیا ایسی کسی تحریک یا رجحان سے انور سجاد سے افسانہ نگار کا کوئی سمبندھ ہو سکتا ہے۔ [ویٹ نام ایسے ملکوں میں انسان کُشی میری موت ہے، یو۔ ایس۔ اے۔ میں نیگرو کی گردن میں پھانسی میری سانس کو کاٹتی ہے۔ بسفورس کے باسیوں کی بھوک میرے پیٹ میں خلا پیدا کرتی ہے۔ ..... وہ سب مجھ میں زندہ ہیں اور میں ان میں زندہ ہوں۔ (ایک خط بنام مین را۔ انور سجاد)].

[جب ایک حقیقت کا سراغ ملے تو نئی حقیقت کی جستجو شروع ہو جائے کہ حقیقت کی تلاش کا عمل انقلاب ہے۔
(انور سجاد)]

...بلا بالی' اپنے دکھ مجھے دے دو' کو چھوڑ کر کوئی بڑا
...فسانہ نہیں ملتا۔ بیدی کے افسانے غم اور جنس کے چکر میں پھنسے
...ہے ہیں۔ ان کا فن غم اور جنس کے EXPLOITATION پر
...ن ہے۔ ترقی پسندوں کا PHILOSPHICAL BASE
...کسزم ہے، جس میں اخلاقی قدروں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔
جدید افسانہ اپنے اپروچ میں ROMANTIC ہے۔
...وہ زیادہ وسیع میدان میں سانس لے رہا ہے۔
مین را کا افسانہ 'ماچس' ایک PIECE OF POETRY ہے۔

[سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔
سلگتے سگریٹ اور دھڑکتے دل میں کتنی مماثلت ہے۔

ماچس کہاں ملے گی،
ماچس نہ ملی تو کہیں......
تو کہیں......

(ماچس — مین را)]

'ماچس' کی تلاش فیلول کے ناول میں WHALE کی تلاش جیسی لگتی ہے۔ اس دور میں افسانہ شاعری سے قریب آ گیا ہے۔
انور عظیم کا افسانہ 'لا بوہیم' (مولاں روژ) PATCHES کا افسانہ ہے۔ اس میں INDUSTRIAL DEVELOPMENT کا اثر ہے۔ یہ کہنا کہ اس میں اکائیاں نہیں ہیں غلط ہے اس طرح دیکھا جائے تو WAITING FOR THE GODOT میں بھی اکائیاں نہیں ہیں۔

[میرے ناک نقشے میں وہ بات نہیں ہے جو عام ریستورانوں میں ہوتی ہے، میرا انداز تراشیکھا ہے، سب سے الگ، روشنی ہے تو ایسی کہ پرچھائیاں معلوم ہوں، میزیں، دیواریں، لکیریں، پردے جھالر، ہر چیز کا انداز ہی الگ ہے، ہر چیز آڑی ترچھی ہے۔ اب اس میز کو دیکھو کونے میں، جہاں اس چھوٹی سی دیوار کا سایہ پڑ رہا ہے، جس پر پلاسٹر نہیں کیا گیا ہے، دیوار پر ایک سیاہ تختہ...

...میں پھونس پر سیاہ [illegible] رنگ [illegible] ہوتے ہیں اور بیچ بیچ میں سیپیاں [illegible] لگے ہوئے ہیں۔ جو اس دھند لکے میں [illegible] معلوم ہوتے ہیں۔ دو دو تین تین میزوں کی [illegible] دیواروں پر روزن بنے ہوئے ہیں۔ [illegible] گزرتی لیکن نگاہیں گزرتی ہیں اور پُراسرار پرچھائیوں کو دیکھتی ہیں جو ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں لیکن جو ایک دوسرے کی تلاش میں ہیں، ایک دوسرے میں جذب ہونے کو بے قرار۔
مولاں روژ — (لا بوہیم) — انور عظیم]

بہت لکھنا کوئی خوبی نہیں ہے۔ ایک ناول (WUTHERING HEIGHTS) عظمت کی مہر ثبت کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ کرشن چندر نے بہت کچھ لکھا، مین را نے بہت کم لکھا، لیکن مین را اس سے بڑا افسانہ نگار ہے۔
غم اور ذاتی رنج و آلام غیاث کے یہاں بھی ملتے ہیں، لیکن مختلف SHADES کے ساتھ۔ ان میں یکسانیت نہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ غیاث بیدی سے بڑا افسانہ نگار ہے 'اپنے دکھ مجھے دے دو' پر بیدی کے فن کا CULMINATION ہو جاتا ہے۔

[شام ڈھلے درختوں پر بسیرا لینے والی چڑیوں کی چہکار سنائی نہیں دیتی، لاجوردی آسمان پر سفید بگلے، قوازن سے اڑنے والے بگلے بھی دکھائی نہیں دیتے، بھری دوپہر کی خاموش فضا میں چیلوں کی درد بھری چیخ بھی سنائی نہیں دیتی، کبوتر کی غٹرغوں، پپیہے کی پی کہاں، مینا کی ٹوئیں ٹوئیں کی آواز سے بھی کان محروم ہو جاتے ہیں، حتیٰ کہ مولوی صاحب کے مرغ کی آواز بھی کہیں گم ہو گئی ہے — غیاث احمد گدی — پرندے پکڑنے والی مشین]
خود کلام حیدری کی کہانی 'گئی' کرشن چندر کی [illegible]

یوں پر [illegible]

[میں [illegible] والے نوجوان سے پوچھتا ہوں، یہ کیسے مرا۔ [illegible]، بینچے کے دھڑے اس نے چادر ہٹا کر دکھایا۔ مجھے چکر آنے لگا ہے، نا خدا مسجد ہے مولا بخش ہے، جس کے کفن دفن کے لئے ایک آنہ دو آنے راہ گیر چادر پر پھینکتے جا رہے ہیں۔

سخی ——— کلام حیدری]

ایسے میں یہ کہنا کہ پندرہ سال میں بڑے افسانے نہیں لکھے گئے ہیں، گویا کم علمی کا مظاہرہ کرنا ہے۔

محمد شفیع کہہ رہے ہیں مجھے وہاب اشرفی کی ساری باتوں سے اختلاف ہے۔ مجھے مین را کا مقالہ پسند آیا جس میں انہوں نے کہا ہے کہ سماجی پس منظر کے بغیر بڑا افسانہ وجود میں نہیں آ سکتا۔ وہاب نے کرشن اور بیدی کو نہایت SWEEPING انداز میں DENOUNCE کیا ہے۔ کرشن اور بیدی کے یہاں زندگی ہے۔ انہوں نے بڑی سچی شکل میں رومانیت پیش کی ہے۔ سوچنے کا یہ طریقہ غلط ہے۔ یہ MATHEMETICAL انداز ہے۔

"آج ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد کے عہد کو دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا جاتا ہے"۔ یہ سریندر چودھری ہیں جنہوں نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ کرشن اور بیدی نے PERSPECTIVES دئیے ہیں۔ اندرونی دنیا کے متعلق جب ہم بولتے ہیں تو دو نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ کافکا اور ٹامس مان پھر بھی کافکا ہندوستان پر FANTASY لکھتا ہے۔ آج ہم UNMEHSURED SENSE OF CONTINUITY میں جی رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ۵۰ء کے بعد جو افسانے لکھے گئے ہیں وہ ہماری زندگی سے ہم رشتہ ہی نہیں ہیں۔

"[illegible] چندر دھیشا" افصح ظفر بتا رہے ہیں کہ ہندی کے

مشہور افسانہ نگار ہیں ——— کرشن اور بیدی کے متعلق دو رائیں آ رہی ہیں۔ یہ کہنا بیکار ہے کہ کچھ کہانیوں کو مار کر کچھ کہانیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ کہانیاں آگے بڑھ رہی ہیں۔

شکیب ایاز کا نام پکارا جاتا ہے۔ جدید افسانہ نگاروں نے اپنے ذہن کے سبھی دروازے کھول دئیے ہیں۔ روایتوں کے بغیر بڑا ادب نہیں بن سکتا۔ جدید افسانہ نگاروں کے CONTRIBUTION سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ احمد یوسف کا افسانہ "تلوار کا موسم" اس عہد کا بہترین افسانہ ہے۔

اور اب افصح ظفر اعلان کر رہے ہیں "اس مذاکرے کو کلام حیدری نے شروع کیا تھا، لہٰذا اُن سے میری درخواست ہے کہ اس بحث کو سمیٹنے کا کام بھی وہی انجام دیں ——— مذاکرہ جس مقصد سے شروع ہوا تھا وہ پورا ہو گیا کہ بحث میں گرمی آئی اور کچھ نئی باتیں ہمارے سامنے آئیں۔ میں مین را کی باتوں کو سمجھ نہیں سکا اس لئے اس کی مخالفت بھی نہیں کر سکتا، ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ کرشن چندر کا سایہ نہ ہوتا تو مین را کی زبان وہ نہ ہوتی جو ان کے مقالے کی ہے۔ کلکتہ اور بمبئی میں ادب SMUGGLE ہو کر آتا ہے۔

بیدی کے سلسلے میں وہاب اشرفی نے جس طرح EXPLOITATION لفظ کو EXPLOIT کیا ہے، وہ ان ہی جیسا ہنرمند آدمی کر سکتا تھا۔ اس طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میر نے ساری زندگی محض "غم" کو EXPLOIT کیا۔ البتہ یہ بات صحیح ہے کہ ہمیں انبار سے قدر و قیمت کا تعین نہیں کرنا چاہئے۔ وہاب اشرفی نے کہا کہ افسانہ شاعری سے قریب ہوتا جا رہا ہے تو بہتر ہے کہ وہ شاعری ہی بن جائے۔

جدیدیت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ تحریک نہیں ہے، جدیدیت کو ترقی پسندی کی توسیع سمجھئے۔ توسیع کہنا غلط ہے۔ غرض جدیدیت کیا ہے ایک انارکی ہے، جس کو جتنا زیادہ مہمل لکھنا آتا ہے وہ اپنے آپ کو اتنا ہی جدید منوانے پر مُصر ہے۔ معنی پر اصرار مت کیجئے، تو آخر کس چیز پر اصرار کریں۔

تم خوش رہو

میں نے چاہا کہ تم خوش رہو
میں نے یہ بھی کہا : لاؤ ، بوجھ آنسوؤں کا مجھے سونپ دو
اور ــــ آخر ہوا بھی یہی
تم نے وہ غم دئے ، وہ کچوکے لگائے کہ بوجھ آنسوؤں کا
سنبھالے سنبھلتا نہیں،
سادہ سے ایک جملے کا مفہوم اتنا بدل جائے گا
کب یہ سمجھا تھا میں !

اُٹھ گیا رشتۂ لفظ و معنیٰ سے میرا یقیں
پوچھتا ہوں یہ اک اک غزل سے، اک اک نظم سے
کیوں تمہیں خلق میں نے کیا ؟
کیا تھا آخر مرا مدعا ، مجھ پہ واضح کرو
کاش ! اک بار پھر یہ بتاؤ مجھے، ہے معانی کا الفاظ
سے ربط کیا؟

ورنہ حیرت بنا دے گی پتھر مجھے
جنبشِ لب ہو یا جنبشِ خامہ دشوار ہو جائے گی
دل کی آواز تلوار کی دھار ہو جائے گی
کون بتلائے یہ

کس زباں میں کروں پیار کی گفتگو ؟
کون بتلائے یہ
شعر کیسے کہوں ؟
کون بتلائے یہ
خط لکھوں کس طرح ؟
کون جانے کہ میں جو کہوں ، جو لکھوں
اُس کے مفہوم کو بے نیازی نہ آتی ہو الفاظ سے
کون ہو دادگر ، کون ہو نوحہ خواں
جان الفاظ میں ڈالتا ہوں، معانی کا مقتول ہوں
شعر کیسے کہوں ؟ بات کیسے کروں ؟ خط لکھوں کس طرح؟

کیسے مانگوں دعا یہ کہ تم خوش رہو
اس سے بڑھ کر کوئی اور غم ہوگا کیا !

[illegible]
اپنا [illegible]
پیدا کرے گی
ہوا، دھوپ، پانی
یہ سب اپنے [illegible]
جہاں کی [illegible]
بچھڑے ہوئے ہیں۔

——— نشتر خانقاہی ۔

اور کچھ کی پیڑھی، ہپی ازم، انگری ازم، انانیت، لا مقصدیت، لا معنویت، لا یعنیت، لا قانونیت لا قبولیت، لا، لا .... پھیل کر دنیا پر چھاتی جا رہی ہے

اسے میرے زخمی بدن کی ہوا کھینچتی ہے
مجھے اب تو ہونے کا احساس بھی کھا رہا ہے

——— ظہیر صدیقی ——— (مراجعت ۲)

یہاں خارج اور داخل کا انتشار کتنا شدید ہے۔ حالانکہ 'ہم' نے خدا کو جنم دیا۔ مسجد، مندر اور گرجا گھر بنائے بڑی بڑی کتابیں لکھیں۔ بڑے بڑے رفارمر، فلسفی، پیغمبر، صوفیائے کرام، رشی منی کے ساتھ ہمیشہ چلتے رہے۔ شیطان، راکھشس، فرعون، کنس اور راون کے کارناموں کو کچل کر رکھ دینے کی کوشش کی۔ قانون کو جھیلا، نت نئے ازموں کو پرکھا۔ لیکن مقصدیت لاحاصل رہی اور تلاش تشنہ ——— عقیدت، خلوص، نیکی، خوشی محبت، سکون کو اپنے عیوب کو ڈھکنے کا آلہ سمجھا:

مگر میں خوف کی زنجیر توڑنے کے لئے
[illegible] ڈھونڈتا رہتا ہوں ہر اُداسی میں

——— باقر مہدی ۔ (تمہارے نام میرا خط)

[illegible] وہی سب کچھ نہیں یہاں
[illegible] تو دیکھئے — سلطان اختر

ہمسایوں پر کھلے نہیں اندر کا ماجرا
ہر گھر کی کھڑکیوں پہ ہیں پردے پڑے تلے

——— ظہیر صدیقی ۔

ہوا کے دستِ مہرباں نے
کو بہ کو بکھیر کر
مجھے، اک انتشار کا دھواں بنا دیا

——— ساجدہ زیدی ۔ (اکائی)

خدا عقیدت خلوص نیکی
خوشی محبت سکون
سب مر چکے ہیں بھائی
چلو اب ان کو
ممی بنا کر
لذت کے اہرام میں سُلا دیں

——— علوی ——— (ممی بنا کر)

لیکن یہی شاعر 'آخری دن کی تلاش' میں اپنے وجود کو خدا کے وجود میں ضم کر دیتا ہے:

وہ دن کہاں ہے
وہ آخری دن
کہ جب خدا یہ تمام چیزیں سمیٹ لے گا
مجھے اسی دن کی جستجو ہے

کہ اب یہ چیزیں
بہت پرانی
بہت ہی فرسودہ ہو چکی ہیں

——— علوی ۔ (آخری دن کی تلاش)

مقصد کی اپنی کوئی شکل نہیں ہوتی۔ وقتی شکل و شباہت اُسے ہمیشہ سے تلاش بخشتی رہی ہے۔ تلاش فرد کی روح ہے۔ تلاش فرد کی حرکت۔ تلاش فرد کو جانور، پودے پہاڑ، ریگستان، سبزہ زار، سمندر، شہر، گاؤں

[illegible]، [illegible] - ان - اور ذات پات، مذہب وغیرہ کے یہاں [illegible] پیدا کرتی ہے۔ سبھی سے اس کا رشتہ ہے سبھی احساس کی جستجو کو پیدا کرتے ہیں۔ کسے چھوڑے کسے اختیار کرے۔ سبھی اپنے ہیں۔ ساری چیزیں اپنی ہیں۔

یہ ایک ابر کا ٹکڑا کہاں کہاں برسے
تمام دشت ہی پیاسا دکھائی دیتا ہے

——— شکیب جلالی

وہ جمالیاتی ہوں یا مادی۔ منفی ہوں یا مثبت۔ تلاش بہرحال تلاش ہے۔ دماغ "بیجیوں کا جہنم" (ظہیر صدیقی) اور رہات ایل۔ ایس۔ ڈی (عادل منصوری) کی عادی کیوں نہ بن جائے۔ پھر بھی یہی کہیں گے:

اور تم نے یہ تمام مدت
خود اپنے مفہوم کی تلاش میں سلگتے پگھلتے
گزاری ہے۔

——— اعجاز احمد۔ (فاصلوں کی بات)

میں اپنے آپ کو پہچان جب نہیں سکتا
تو کیا عجب ہے کہ وہ بھی بدل گیا ہوگا

——— پرکاش فکری

لے اندھیرے میں۔ اندھیرے سے مشتعل ہوتے ہوئے
میرے وجود
روشنی کی کھوج میں
مجھے سیاہ کھولتے سمندروں کی پناہ ملی

——— شاہد احمد شعیب۔ (دھند میں تصویریں)

اس بات پہ اب شک ہے مجھکو
کہ میں خود بھی
موجود ہوں یا موجود نہیں

——— صادق۔ (اس بات پہ اب)

فرد کا رشتہ جہاں انسانی جماعت سے ہے وہیں نباتاتی اور حیواناتی جماعت سے بھی ہے [illegible] اشیاء سے بھی وہ خود کو الگ نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے وجود کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن [illegible] سے زیادہ کائنات کی دوسری چیزیں منظور کرنے کو ہر وقت تیار رہتی ہیں۔ معروضی کائنات (کائنات انسان) فرد کے لئے زیادہ ہیں۔ فرد ان کے لئے کم ہے۔ فرد سماج کے لئے زیادہ ہے۔ سماج فرد کے لئے بالکل [illegible] ہے۔ ایسا کیوں؟ صرف اس لئے کہ ہم فرد ہیں سماج نہیں ہیں۔ اگر فرد سماج ہوتا تو ایسی بات نہ ہوتی۔ سماج تو محض فرضی لکیریں ہیں۔

چند لکیر
ٹیڑھی میڑھی۔ کہیں منحنی، کہیں قوس جیسی بکھائیں
جیسے ننھا سا کوئی
بیٹھ رہا ہو اقلیدس کو
دھرتی پر دہ کھینچ رہا ہو
آگے پیچھے دائیں بائیں
چند لکیریں ٹیڑھی میڑھی

——— شمس ——— (لکیروں کی دستاویز)

دراصل مجروح کرنے والی وہ غلط مروجہ اشیاء ہیں جو غلط مروجہ اشیاء ہیں جو غلط ہو کر بھی مقرر ہو گئی ہیں۔ چنانچہ ابتدا ہی سے کبھی فرد کو فرد منظور کرتا نہیں رہا ہے۔ منظور کرنے کی شرح میں فرق آ سکتا ہے لیکن کسی دور میں کسی Reasoning کے سامنے اس کی غیر موجودگی کو ثابت نہیں کیا جا سکتا ہے۔ فرد اپنے وجود کو دوسروں پر مسلط کرنے کا عادی ہے۔ ہر فرد اپنے علاوہ دوسرے تمام فرد کو مختلف اصول و ضوابط کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ مختلف قانون اور بندشیں متعین کرتا ہے مگر خود کو اپنی بنائی ہوئی بندشوں کے تحت تقریباً کبھی نہیں لاتا ہے۔

دھرتی کے [illegible] گریز کرتا ہے
بس اپنا [illegible] کو پانے کی تمنا رکھتا ہے
[illegible] کی [illegible] گزار دے گے
اب [illegible] اپنا نقش پا [illegible]

——— مظہر امام —

وہی مسئلہ ہے۔ فرد ہی حل ہے۔ فرد ہی با معنی ہے فرد ہی بے معنی۔ اس کا اپنا وجود ہے اور معروضی کائنات بھی نظام ہاضمہ، تنفس، حرکت، تولید، نشو و نما، حفاظت، حس، خوف، خواہش، تعمیر، تخریب، کوشش، محبت اور نفرت کے پیش نظر اپنا وجود رکھتے ہیں۔ ادراک تصور، تجزیہ، خیال، تعریف، تضحیک، تصدیق، ارادہ، فکر اور تجسس کے باعث فرد معروضی کائنات کا خدا بن بیٹھا ہے اور اپنے آپ کے لئے Term and Condition کو اعلیٰ اسلوب قرار دیتا ہے۔ جو اس کی فطرت کے ہمیشہ خلاف پڑتا رہا ہے۔ اسی لئے:

آدمی افسوس کا پتلا
ازل سے شرمسار
انگلیوں کے درمیان خاموش صدیوں کا سوال
سرسراتے خون کی مخملی تہوں میں سانپ بند
پھن اٹھاتی آگہی۔ خوف سے
منزدر" میں "—

——— وہاب دانش۔ (ابتدائے آخری)

بند شہروں میں اجنبی بے حس
شور کے آرپار خالی ہاتھ
ہاتھ میں دو جہان مگر خالی

——— — عادل منصوری

اس نے اصول اور پابندیوں پر اپنے سر رکھ دیئے۔ پھر بھی حیات تشنہ رہی۔ کیونکہ ہماری تلاش جاری ہے ہم اپنی تلاش پر قید و بند نہیں لگا سکتے ہیں۔ تلاش کا ایک رخ بالکل سپاٹ پڑا ہوا ہے۔ اس رخ کو اجاگر کرنا ہمارا فطری عمل ہے۔ ہم گیپ اور بیسج کی طرف اب راغب ہیں منفی قدروں کو دل و دماغ کے اندر جگہ دے رہے ہیں۔ وقار، بلندیاں، محبت، نیکی، سخاوت اور عزت کی نالیوں میں رینگتے ہوئے کیڑے مشاہدے کی پرچھائیاں بن سکتی ہیں۔

Negativity is the Source of
Positivity

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا

——— غالب —

ہم ماحول سے الگ نہیں ہو سکتے۔ ماحول سے دور نہیں جا سکتے۔ ماحول کیا ہے؟ ماحول کیا چاہتا ہے۔ ماحول کیا دیتا اور کیا لیتا ہے۔ کیا ماحول ہماری فطرت کے خلاف کوئی چیز دے گا تو ہم منظور کر لیں گے۔ ہرگز نہیں۔ یہیں پتا کہ فرد سب کچھ ہو جاتا ہے اور سماج ذہنی لکیر کے سوا کچھ نہیں رہتا۔

فرد کے سامنے کائنات بنیادی جز ہے۔ ماحول کائنات ہے۔ فرد کائنات کی ترتیبی یا غیر ترتیبی کے عمل سے ماحول بناتا اور بگاڑتا رہا ہے۔ یہاں فرد کا کائنات کی ترتیب کو ٹھیک کرنا بھی ماحول ہے اور اس کی ترتیب کو بگاڑنا بھی ماحول ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ موافق اور غیر موافق ماحول تو کیا کوئی ایسا حربہ یا اوزار ہے جس سے غیر موافق ماحول کو اس دنیا سے اٹھا کر کسی دوسری دنیا میں پھینک دیا جائے۔ غیر موافق ماحول سے جس قدر گریز کیا گیا وہ ردعمل کے طور پر مقدار میں بڑھتا ہی گیا۔

ہم سب گھرے ہوئے ہیں
بد روحوں کے بیچ
بتوں، پریتوں، جادوگروں اور
اوگھڑوں کے بیچ

کوئی راستہ ہی نہیں ـــــ صادق ۔ (چپ)

اب کوئی پیغمبر نہیں آئے
نازل نہ ہو ـــ کوئی کتاب
انسان کو کتاب کی ضرورت نہیں

ـــــ صادق ـــ

کیونکہ ہم نے پڑھے اور سنے ہوئے اصول اور پابندیوں کو توڑا لیکن جھیلی ہوئی زندگی اور اس سے وابستہ ماحول سے معتوب لوگوں کو گریز کروایا کچھ مغضوب حضرات تو امر ہو کر روانہ ہو گئے اور کچھ برتری کی تال پر ناچ رہے ہیں مگر ہمیشہ کی طرح آج بھی معتوب ہی رہے:

یہاں سے بھاگو
اگر یہاں تم رُکے رہے تو صلائے کوہ ندا کبھی نہ سن سکو گے
یہ ساحرانِ ندا کا جادو نگر ہے
جس میں ہزاروں لاکھوں ندا کے طالب پھنسے ہوئے ہیں
رُکا یہاں جو وہ کرسیوں میں اُلجھ گیا ہے
رُکا یہاں جو وہ کرسی میں دھنس گیا ہے

ـــ وحید اختر ـــ (کرسی نامہ)

ویسے منسوب معتوب بھی ہو سکتے ہیں اور معتوب مغضوب کی شکل بھی اختیار کر سکتے ہیں دونوں طبقے اپنے اپنے Species Characters کی نشو و نما کی بنیاد پر کھونے اور پانے کے احساس میں گم ہیں۔ غیر فطری فرمائشوں کے جال میں ہانپتے کانپتے رہتے ہیں کیونکہ باہر سے آتی ہوئی آواز جسم و جان کا حصہ بن گئی ہے۔ تم نفس کی پکار نہ سنو۔ جنسی بھوک کی آنچ میں جلتے رہو۔ جھوٹ نہ بولو۔ بے ایمانی نہ کرو۔ فتنہ نہ پھیلاؤ۔ یہ غلطی نہ کرو۔ وہ غلطی نہ کرو۔ جتنی بھی نہ کرنے کی بات ہے سبھی فطرت اور ماحول سے آنکھ مچولی کھیلتی رہتا اور لوگ ہر شے میں اپنی تلاش کی رسمساہٹ دیکھتے رہے:

سُرخ، نیلے، ہرے، کتھئی، زرد، کالے
سبھی رنگ۔ بے رنگ
سبھی۔ شرمساری کی چادر میں چھپتے رہے
میرا آئینہ تک رہے تھے
رسمساہٹ کے پیچھے
چھپا کون ہے؟

ـــــ مشتاق علی شاہد ـــ (محورِ کامل)

حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ ہم ہی ظالم ہم ہی مظلوم۔ ہم ہی سچے ہم ہی جھوٹے۔ ہم ہی مذہبی ہم ہی لا مذہبی۔ ہم ہی تعمیر ہم ہی تخریب۔ ہم ہی جنگ اور ہم ہی امن ہیں۔ یعنی زندگی 'نہیں اور ہاں' ـــ سیاہی اور سفیدی کا مرکب ہے۔ نہ سیاہی سے انکار کیا جا سکتا ہے نہ سفیدی کو ہی صرف گلے لگایا جا سکتا ہے دونوں عناصر کا شامل رہنا نہایت ضروری ہے۔ ہمیں صرف اپنے تئیں اپنے آپ کا Adjustment کرنا ہے۔ اس Term and Condition میں Adjustment ٹوٹ بھی سکتے ہیں۔ ایک کے باعث لاکھوں کی جانیں جا سکتی ہیں۔ عزت اور عظمت کی ناک ٹیڑھی بھی ہو سکتی ہے۔ اور محسوسات اپنی مختلف سمت بنا سکتے ہیں۔

سوچوں کی گرہ ماحول کے ہاتھوں ہی کھلتی ہے۔ ماحول ہی دراصل خالق بھی ہے اور تخلیق بھی کیونکہ ماحول کائنات ہے اور کائنات ہی کا ایک عنصر فرد بھی ہے۔ چنانچہ ماحول خود ماحول سے جو اثر لیتا ہے وہ ماحول کو لوٹا دیتا ہے۔ وہ اپنے شعور سے ایسے تخلیقی کارنامے ادا کرتا ہے جو اس کو مفروضی کائنات سے بلند کر دیتا ہے۔ اور مفروضی کائنات اپنے ہونے اور نہ ہونے کا عکس فرد کے عمل اور ردِ عمل کے اندر دیکھتی ہے:

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں ـــ غالب

مظفر حنفی

آٹھ رباعیاں

— ۱ —

تقدیر پہ الزام نہیں دھر سکتے
خاکے میں سیہ رنگ نہیں بھر سکتے
ہر لوح پہ تحریر ہے، جینا ہے حرام
آواز لگا دو کہ نہیں مر سکتے

— ۲ —

بادل تو جمائے تھے پہاڑوں پہ نگاہ
دریاؤں کو جانا تھا سمندر کی راہ
یوں حدتِ صحرا کو پسینے آئے
گرتے ہوئے شبنم نے کہا بسم اللہ

— ۳ —

موسم کے تقاضے پہ ذرا سوچو نا !
انجام ہے مطلع کا مکدر ہونا
کھانے کی کوئی چیز اگا لو پہلے
پھر شوق سے کھیتوں میں ستارے بونا

— ۴ —

کمرے میں سبک رنگ بکھر جائیں گے
بے ساز کے نغمات سنائی دیں گے
بستر پہ مرے آ کے تماشا دیکھو
چادر پہ کڑھے پھول مہک اٹھیں گے

— ۵ —

گر خود کو سنبھالوں نہ میں آنسو کی طرح
یہ فن بھی ہے تاثیر میں جادو کی طرح
دن رات گھمائے ہے مجھے صحرا صحرا
خوشبوئے سخن، نافۂ آہو کی طرح

— ۶ —

بھڑکی ہوئی اک مشعلِ غم رکھتا ہوں
شبنم کی طرح دیدۂ نم رکھتا ہوں
دکھتی ہوئی رگ اپنی چھپا لے دنیا
مجبور ہوں، کاغذ پہ قلم رکھتا ہوں

— ۷ —

شعلہ ہے، اسے چوم رہا ہوں پھر بھی
خالی ہے سبو، جھوم رہا ہوں پھر بھی
وہ مجھ سے گریزاں ہے ہوا کی مانند
پنکھے کی طرح گھوم رہا ہوں پھر بھی

— ۸ —

آفت ہے یہ الحاد مظفر صاحب
خود ساختہ بے داد مظفر صاحب
مشکل میں خدا کو یاد کرتے ہیں لوگ
ہم کس کو کریں یاد مظفر صاحب

وحشت کا تنقیدی شعور

پروفیسر عبدالرؤف

(۱)

مولانا شبلی نے شعر کی ماہیت سے بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ " شاعر کے لفظی معنی صاحبِ شعور کے ہیں "[۱]۔ اس لحاظ سے شاعر سے مراد وہ شخص ہے جو سماج کے دیگر افراد کے مقابلے میں زیادہ باشعور ہو۔ شاعر بینندہ قوم ہوتا ہے وہ سائٹی کے صرف ظاہری خد و خال کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نظر میں روح کی پہنائیوں تک پہنچتی ہیں چشم دل سے وہ ان چیزوں کو بھی دیکھ لیتا ہے جو انسانی ذہن کے کسی نہ دیکھے جانے والے گوشے میں پڑی ہوئی ہوتی ہیں ۔

اے روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی

کے مصداق اسے ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے جہاں دوسروں کا گزر نہیں ۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید ۔۔۔ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند ؟

سماج کے سب سے زیادہ باشعور فرد کی حیثیت سے شاعر ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے ، جو سماج کی اصلاح کرنے والوں سیاسی رہنماؤں ، فلسفیوں ، موسیقاروں ، مصوروں اور عوامی ذہن کی تشکیل کرنے والوں پر عائد ہوتی ہیں شاعر ضمیر کی حیثیت رکھتا ہے جب فرد گمراہ ہوتا ہے تو اسے ٹوکتا ہے وہ زندگی کی تنقید کرتا ہے اور کھرے کھوٹے کو پرکھنے کے بعد خاموش نہیں ہو بیٹھتا بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ حقائق کی تلخیوں کو کس طرح شیریں بنایا جائے وہ حال کی تفسیر لکھتا ہے اور مستقبل کی بشارت بھی دیتا ہے ۔

معنِ روح اللہ پاکست در اسم ۔۔۔ زحقِ القائے او با مریم جسم

۱۔ شعر العجم جلد اول صفحہ ۱۳

رہنمائی ڈالتے ہوئے ملا وجہی اپنی مثنوی "قطب مشتری" میں فرماتے ہیں ؎

کہتا ہوں[1] تجے پند کی ایک بات | کہ ہو فائدا اس تے بہات
جو بے ربط بولے توں بیتاں کہیں | بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس
سلامت نہیں جس کرے[2] بات میں | پڑیا جائے کیوں جز بے کرامات میں
جسے بات کے ربط کا فام[3] نیں | اسے فکر کرنے سوں کچھ کام نیں
اسی لفظ کوں شعر میں لیائیں توں[4] | کہ لیایا ہے استاد جس لفظ کوں
اگر فام ہے شعر کا تجکوں چند | چنے لفظ لیا ہور معنی بلند
اگر خوب محبوب جیوں سور[5] ہے | سنوارے تو نور' اعلیٰ نور ہے

اپنی حلاوت بیاں اور شیرینیٔ سخن کا ذکر کرتے ہوئے ولی فرماتے ہیں ؎

ولی شیریں زبانی کی نہیں ہے چاشنی سب کو

حلاوت فہم کو میرا سخن شہد و شکر دستا[6]

دوسرے مقام پر ایک متزاد میں فرماتے ہیں۔

فرہاد کی آتی ہے صدا روح صبا ہو

مجھ شعر کو سننے

مذکور ہے از بسکہ ولی میرے سخن میں

شیریں بچناں[7] کا

چونکہ میرے کلام میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کے بول میٹھے تھے لہٰذا فرہاد کی روح صبا بن کر میرے کلام کو سننے آتی ہے۔

شاعر کا کلام اس کی بقا کا ضامن ہوتا ہے سودا فرماتے ہیں ؎

اکثر نشاں بنے ہیں عالم میں نام خاطر | تونے سخن کو سودا اپنا نشاں بنایا

اور میر کیا کہتے ہیں ؎

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ | مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

شعر وسخن کی قدامت کے متعلق غالب کے اشعار انقلاب انگیز اور حکیمانہ ہیں ؎

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل

کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لئے

---

۱ کہتا ہوں ۲ طرح طرح ۳ جس کی ۴ کتاب ۵ فہم، سمجھ ۶ نہیں
۷ تو ۸ کو ۹ [illegible] ۱۰ سورج ۱۱ دکھائی دینا ۱۲ میٹھے بول بولنے والا

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ذکر عشق خوں ریز و دل گداز ہوتا ہے ؎

ہر بن مو سے دم ذکر نہ ٹپکے خوں ناب
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا (غالب)

شعر میں معنوی خوبیوں کے علاوہ لفظی خوبیوں کا ہونا بھی ضروری ہے ؎

نہیں گر سر و برگ ادراک معنی
تماشائے نیرنگ صورت سلامت

اسی عنوان کے تحت حالی کہتے ہیں ؎

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

(۲)

آئیے اب ہم معلوم کریں کہ وحشت نے اردو اور فارسی شاعری کی اس عظیم روایت کو کس طرح برتا اور فن شعر سے متعلق کیا کیا نکات واضح کئے۔ اختصار اور جامعیت کا شمار محاسن شاعری میں ہوتا ہے دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں غزلوں میں اختصار اور جامعیت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے کیونکہ غزل کا ہر شعر ان کے مختلف جذبات کا ایک مکمل نقش ایک مکمل نظام فکر ایک مکمل فلسفۂ حیات ہوتا ہے حضرت وحشت نے اپنے کلام میں شعوری طور پر اختصار برتا ہے اور مختلف اشعار میں اس کی افادیت پر روشنی بھی ڈالی ہے ملاحظہ فرمائیں ؎

وحشت خصوصیت جو تری ہے بہت اسے
ہاں ہاں غزل میں شان رہے اختصار کی

اختصار سے معنی میں تشنگی نہیں بلکہ لطف پیدا ہوتا ہے ؎

زنہار بارِ خاطرِ اہلِ سخن نہ ہو
وحشت غزل میں لطف رہے اختصار کا

طوالت سے شعر کے اثر پر حرف آتا ہے ؎

گراں ہوتا ہے طبع شعر کو طولِ سخن وحشت
اگر پُر لطف رکھنا ہے غزل کو مختصر کر دے

اہلِ نظر کو طول سخن کی نہیں بلکہ حسن مضمون کی طلب ہوتی ہے ؎

ہمیں طولِ سخن سے کام کیا وحشت غزل میں
کہ ہیں اہل نظر تو حسنِ مضموں دیکھنے والے

اشعار کے معنی مبہم نہ ہوں پیچیدگی اور تعقید لفظی سے معنی خبط ہو جاتے ہیں اور شعر کا لطف جاتا رہتا ہے ؎

پیچیدگی سے پاک رکھو اپنے کلام کو
وحشت سخن میں چاہیئے لطف زبان بھی

کلید عقدۂ خاطر نہیں مضمونِ پیچیدہ
سخن میں جب بناوٹ آ گئی وحشت سخن بگڑا

کلام میں لطف معنی کے علاوہ لطف بیان کا ہونا بھی ضروری ہے اگر شاعر کی تمام کاوشیں مضامین کی بندش تک محدود ہوں اور وہ فصاحت، بلاغت اور شاعری کے دیگر لوازمات کی طرف متوجہ نہ ہو تو اسے شعر کا عیب سمجھا جائے گا اچھے شعر کی تعریف یہ ہے کہ وہ معنی و بیان سے آراستہ ہو۔ چنانچہ حضرت وحشت نے اس کی طرف بھی اشارے کئے ہیں ؎

وحشت کمالِ شعر فصاحت کا نام ہے — مضمون کے خیال ہی سے [illegible]

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

وحشت مری نظر میں مکمل نہیں وہ شعر — جس میں کہ حسنِ معنی و لطفِ بیاں نہ ہو

حق تو یہ ہے کہ وحشت نے حسن و بیان کی تکمیل میں عمر صرف کر دی جس کا ایک گہرا اور پائدار نقش ان کے کلام میں نظر آتا ہے ؎

فروغِ طبع خدا داد اگرچہ تھا وحشت — ریاض کم نہ کیا ہم نے کسبِ فن کے لئے

کلام اور اندازِ بیان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

وحشت مری زباں کو تو اہلِ زباں سے پوچھ — ماہر زبان کے ہوں فقط اہلِ [illegible]

کیا ہے تتبعِ غالب جو میں نے کسبِ فن وحشت — سخنور سیکھتے ہیں آج اندازِ بیاں مجھ سے

کسبِ فن کے لئے وحشت نے جو ریاضت کی اس کی روشنی میں ان کا دعویٔ سخن محض تعلّی نہیں۔ بلکہ ایک حقیقت ہے جس کی شہادت ان کی غزلوں میں موجود ہے اور جس کا اعتراف عصرِ حاضر کے فن کاروں اور شاعروں نے بھی کیا ہے۔ وحشت کی شاعری کے اسی خاص پہلو (یعنی فصاحت اور بلاغت) کو مدِنظر رکھتے ہوئے پرویز شاہدی نے نہایت ہی پُردرد لہجے میں کہا ہے ؎

ماتمِ قوت نظمست بجز کلکِ فکر — ہم بلاغت محوِ خواب و ہم فصاحت محوِ خواب

[خانۂ فکر اس بات پر ماتم کر رہا ہے کہ اس میں قوتِ نظم یعنی شعر و شاعری کی طاقت باقی نہیں رہی کیونکہ وحشت کی موت کے بعد فصاحت و بلاغت کو گویا نیند آگئی ہے][1]

(۳)

اساتذہ کے کلام سے وحشت نے جس طرح استفادہ کیا اس کی مثال اس دور میں حسرت کے سوا کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں ملتی۔ اس لحاظ سے ان کا کلام نئی پود کے لئے روشنی کا ایک مینارہ ہے جو اسے گمراہی سے بچا سکتا ہے۔ وحشت نے اساتذہ کو جو دادِ سخن دی ہے خود ان ہی کی زبان سے سنئے ؎

سخن سے تیرے وحشت طرزِ غالب آشکارا ہے — کہیں رنگیں بیانی ہے کہیں نازک خیالی ہے

کلامِ میر پڑھ پڑھ کر ہوا ہوں نکتہ ور وحشت — تلمذ ہے اسی استاد سے طبعِ سخنداں کو

---

[1] پرویز شاہدی نے علامہ وحشت کے انتقال پر فارسی میں ایک نظم لکھی تھی جس کا ایک شعر اوپر درج کیا گیا ہے۔ پوری نظم راقم کے پاس محفوظ ہے۔

ہیں یوں معتقد داغ غزل میں وحشت — جس کی ہر بات ہم آہنگ اثر ہوتی ہے

میرزا غالب کی مدح میں انہوں نے جو نظمیں لکھی ہیں وہ ان کے تنقیدی شعور کا نہایت شگفتہ اور دلآویز نمونہ ہے۔

میر کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

وفا و مہر کا ایسا نہ ہوگا راز داں ہرگز — لکھے گا یوں نہ کوئی درد و غم کی داستاں ہرگز
نہ آئے گی یہ شائستگی کسی کی زباں ہرگز — میسر ہو نہیں سکتا یہ اندازِ بیاں ہرگز
جو اس کا رنگ ہے وہ کسب سے حاصل نہیں ہوگا
الم پرور وہ اس کا سا کسی کا دل نہیں ہوگا

نہ گزرا وادیٔ اُلفت کا ایسا رہنما کوئی — دلوں کے راز سے نکلا نہ اتنا آشنا کوئی
حریف اس کا بیانِ عشق میں وحشت نہ تھا کوئی — زمینِ ہند کیا، ایران میں بھی کب ہوا کوئی
ہوا تغیرِ رنگ اک ایک کی شیوہ بیانی کا
ہلالی کا ضمیری کا شفائی کا، فغانی کا

حضرت غالب کو وہ اس طرح دادِ سخن دیتے ہیں ؎

عبارت تیری کیا ہے سرمۂ تسخیر ہے گویا — کلام جانفزا اعجاز کی تقریر ہے گویا
سخن تیرا ہے کیا اک درد کی تصویر ہے گویا — جو تیرا نالہ ہے وہ نالے کی تاثیر ہے گویا
حکایت ہے تیرے لب پر غمِ جاں سوزِ ہجراں کی
اُڑائی تیرے خامے نے ادا دلہائے نالاں کی

نسیمِ صبح گاہی ہے کلامِ جاں فزا تیرا — دلوں کو جوش میں لاتا ہے رنگِ آشنا تیرا
بہارستانِ مضموں ہے خیالِ نکتہ زا تیرا — فروغِ طبع کی معراج ہے فکرِ رسا تیرا
تیرا دیوان غالب دفترِ نازک خیالی ہے
تیرا پایہ سخن دانانِ ہندوستاں میں عالی ہے

(۴)

ہماری طبع جب ہوتی ہے جدت آفریں وحشت — نیا اندازِ فنِ شعر میں ایجاد ہوتا ہے

وحشت فن میں نئے انداز، ایجاد اور جدت آفرینی کے مؤید تھے لیکن محض ہیئت پرستی کو جس کا شعریت اور معنویت سے کوئی تعلق نہ ہو غارتِ گرِ سخن سمجھتے تھے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

کئے کیا کیا تصرف شعر میں جدت پرستوں نے — ہے وحشت مدعا ان کا یہ فن برباد ہو جائے

ہے مجھے وحشت تصرف ہائے بیجا کا گلہ — [illegible]

غزل کا ایک مخصوص مزاج، ایک مخصوص لہجہ، ایک مخصوص انداز بیان ہوتا ہے جس [illegible] انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس فن میں [illegible] قدما کی تقلید کو زیادہ مناسب سمجھتے تھے۔ چنانچہ [illegible] و استقلال کا بھی اندازہ ہوتا ہے فرماتے ہیں ؎

غزل کا لطف ہے وابستۂ طرز کہن وحشت — خیال خاطر احباب [illegible]

کلام وحشت کی جاذبیت رنگینیٔ لفظوں کی حسین ترتیب، فکر و معنی کی شگفتگی اور تنقیدی شعور کی [illegible] کے دو اہم اسباب ہیں اول یہ کہ انہوں نے فارسی اور انگریزی ادبیات کا گہرا اور دقیق مطالعہ کیا تھا اور دوسرے [illegible] کے کلام کے مطالعہ اور اس سے اکتساب فیض کرنے میں عمر بسر کر دی صرف یہی نہیں کہ انہوں نے اپنی [illegible] اردو اور فارسی کی کلاسیکی شاعری تک محدود رکھیں بلکہ اپنے ہم عصر شعرا کے کلام کا بھی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرتے رہے اور انہیں داد دیتے رہے ؏   طبع وحشت نے اُٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام کا مطالعہ کلاسیکی شاعری کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ میرؔ نے اپنے بارے میں کہا تھا ؎

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے — درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

حضرت وحشت سے وابستہ رہنے والی ہستیوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ درد و غم کا کتنا حصہ انہیں نصیب ہوا تھا اور انہوں نے اس حصے سے کیا کام لیا۔

ہمارا دور نئی قدروں کو متعین کیے بغیر پرانی قدروں کو مسمار کرنے پر تلا ہوا ہے لہٰذا ہم کو یہ سوچنا ہے کہ کلام وحشت اور ان ہی کے صف کے دیگر اساتذہ کے کلام کی روشنی میں کس طرح ہم نئی سمتیں متعین کر سکتے ہیں۔ ●●

بقیہ: **فرد اور ماحول**

(مادی) حادثوں کے امکانات دریافت کر کے سکون حاصل کرتا ہے۔ لیکن جب وہ لوٹ کر اپنے اندر جاتا ہے تو خود کو کٹا پھٹا، ٹوٹا، جلا، تنہا اور بکھرا ہوا پاتا ہے۔ وہاں سے بھاگتا ہے تو ریزہ ریزہ ہوتے ہوئے خارج (سماج) میں خود کو تلاش کرتا ہے۔ لیکن وہاں اُسے آدرش تعصب نفرت، تشدد، زر پرستی، اقتدار پرستی، طاقت کا جنون دولت کی ہوس، شہرت کا بھوت اور محبت کا ڈھونگ کے سوا کچھ نہیں ملتا ہے۔

ہاتھ پھیلاتے کوڑھی فقیر کی ناف میں گیان کے آخری مرکز پر برابر کھڑے رہو۔ نیچے زمین موجود ہے برابر کھڑے رہو اوپر کیوں دیکھتے ہو آنکھیں بند کر لو۔ بس کھڑے رہو وقت کو بُرا مت کہو صبر سے کام لو اور کھڑے رہو۔ ناک میں انگلی کیوں ڈالتے ہو کہنی کے سیدھے کھڑے رہو

——— عادل منصوری ——— (اس طرف شاید ہی ہوں)

فرد کی ساری صورت حال کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ لیکن ان کے وجود کی بنیادی نفسیات کی واقفیت کی جا سکتی ہے۔ اور ان سے معنی اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ بدی اور شر کے مروجہ اصول کو توڑ کر ماحول اور فرد کے انتشار سے پیدا شدہ اصول کے تحت ہر فرد کے شعور کی داخلی حقیقت کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ ماحول کے ذریعہ ہی لگایا جا سکتا ہے جس میں کوئی فرد خود کو موجود پاتا ہے۔ ●

سلطان اختر

سہ سطری نظمیں

(۱)

دھوپ تازہ ہوا نکیلی ریت
سر پھری انگلیاں ہتھیلی ریت
پنڈلیوں پر جمی ہے گیلی ریت

(۲)

ہاتھ پر ہاتھ، ہاتھ پر چہرہ
عکس پر عکس، عکس پر کائی
رات لذت فروش تنہائی

(۳)

سلوٹوں میں نہاں کشمکش کے نشاں
نرم بستر پہ بکھری ہوئی سُرخیاں
صبح پڑھتی رہی رات کی داستاں

(۴)

شوق صحرا سفر صدا ساحل
نقش پر نقش ناگہاں نازل
راہ مسدود ماورا، منزل

(۵)

قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہے وجود
آگے پیچھے لہو کے فوارے !
بیچ میں ڈولتی ہے گہرائی

(۶)

آنکھ میں آنکھ، آنکھ میں شہوت
ہاتھ میں ہاتھ، ہاتھ میں لذت
جسم بے چین جسم میں لت پت

(۷)

نیلے پردے پہ جگمگاتے ہیں
جا بجا سرخ دھوپ کے ریزے
خواب ناخواب لخت لخت طلسم

(۸)

وصل کی لذتیں قرب کا ذائقہ
ہانپتا کانپتا خوف آگے بڑھا
بیچ میں فاصلوں کا لہو جم گیا

(۹)

ذائقوں کے لہو میں ڈوبے ہوئے
لذتوں کے بھرے بھرے تربوز
خواہشوں کی ہتھیلیاں روشن

(۱۰)

عکس پر عکس، عکس پر چہرے
چہرہ چہرہ سجے ہیں آئینے
آئینوں پر گناہ کے دھبے ●●

غزل

سلطان اختر

خوش ذائقہ بہت ہے مگر زہر ہی تو ہے
میرا وجود میرے لئے قہر ہی تو ہے

میں جس سے بھاگتا ہوں وہ پردیس تو نہیں
جو مجھ کو ڈھونڈتا ہے مرا شہر ہی تو ہے

لوگوں سے مِل کے بھول گئے اپنے آپ کو
اس گمرہی کا نام غمِ دہر ہی تو ہے

تبدیل ہو گئی جو ہوس کے غُبار میں
وہ خواہشوں کی سوکھی ہوئی نہر ہی تو ہے

سنجیدہ گفتگو سے لطیفے پہ آ گئے
بھٹکے ہوئے شعور کی یہ لہر ہی تو ہے

سینے میں لُو کا زور، بدن میں لہو کا شور
یہ زندگی بھی گرمی کی دوپہر ہی تو ہے

غالب کی شاعری میں پیکر تراشی

پیکر تراشی شاعری کے لئے کوئی نیا وصف یا کوئی نئی تر کیب نہیں۔ ابتدا سے شاعری میں پیکر تراشی کا عمل جاری ہے۔ ہر شاعر اپنے ذہن کی پرواز، نظر کی دوربینی، تجربے کی وسعت اور علم کی گہرائی کے مطابق پیکر تراشی کرتا آیا ہے۔ اردو شاعری کے بھی شعراء کے یہاں کم و بیش معمولی یا غیر معمولی پیکر تراشی کی مثالیں ملتی ہیں۔

ذہن میں جب خیالات کے بلبلے اٹھتے ہیں تو ان کی حیثیت سیال مادے کی سی ہوتی ہے۔ ان کی کوئی شکل نہیں ہوتی ظاہر ہے کہ یہ بے چہرگی اپنی صورت کی تلاش میں ہماری دیکھی اور محسوس کی ہوئی زندگی کے سانچے میں ڈھلنا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر اپنے خیالات کو تشبیہ و استعارے کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ شاعر خیالات کی ترسیل کے لئے سیدھی اور سپاٹ راہ کو اپنانے سے گریز کرتا ہے۔ اس کے الفاظ تہ دار اور کثیر الابعاد ہوتے ہیں۔ عام نقطۂ نگاہ سے دو مختلف چیزوں میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ لیکن شاعر تصور کی نظر سے یگانگت و ہم آہنگی کا کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈھ نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ جو اس کے اپنے تجربے کا پس منظر لئے ہوئے ہوتا ہے۔ شاعر کا تصور دو متضاد چیزوں میں قدرِ مشترک کا جواز تلاش کر لیتا ہے، اختلاف اور تضاد کی بحث شاعرانہ ماحول میں بے معنی ہو جاتی ہے۔ شاعری کی انفرادیت کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ نئی تشبیہیں اور استعارے وضع کرے۔ لہٰذا اس سے پہلے شاعر کی عظمت مسلم ہے۔ جس نے محبوب کے سیاہ بال کے لئے سنبل و مار سیاہ اور رسیلی آنکھوں کے لئے نرگس اور غزالی آنکھوں کی تشبیہیں وضع کیں۔ لیکن جب دوسرے شعرا ان الفاظ کو انہیں دو معنوں میں استعمال کرتے ہیں تو وہ نقال ہیں خالق نہیں۔ اس لئے کہ اس کی تقلید میں وہ تخلیقی کرب ناپید ہے۔ جس سے پہلا شاعر گزرا۔

بہر حال یہ بات واضح ہے کہ پیکر تراشی شاعرانہ تصور کو تجربات کے سانچے میں ڈھالنے کا عمل ہے، اور اہم شعری عمل۔ یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ دو اشیاء کے درمیان شاعرانہ ربط اور ہم آہنگی کا جواز بھی شاعرانہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ عام تجربے کی روشنی میں ایسے رشتے مشکوک نظر آئیں لیکن عام طور سے شاعر اس سے خود کو متعلق رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اور اس کا ذہن پیکر تراشی کے عمل میں بہت حد تک آزاد ہوتا ہے۔

پیکر ایک ہی معنی میں متواتر استعمال ہونے سے سال خوردہ بن جاتے ہیں۔ مثلاً اگر آج کا شاعر اپنے محبوب کو چاند سے یا اس کی نزاکت کو گلاب کی کلی سے تشبیہ دے تو پیکر کی قدامت سے قاری کو جھنجھلاہٹ محسوس ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اپنی بنائی ہوئی تشبیہیں، بنے بنائے استعارے اور پیکر، تجربے کی کم مائیگی اور شاعر کے ذہنی افلاس کا پتہ دیتے ہیں۔ ایسے شعرا کی ذہنی پرواز و تجربات زنگ آلودہ ہو چکے ہوتے ہیں اور نتیجے میں وہ اثرات مرتب نہیں ہوتے جن کا شاعر خواہاں ہوتا ہے۔ اس سے بحث کا ایک رخ یہ بھی نکلتا ہے کہ کیا ایسی تمام

بند کے ۔ [illegible] ہے، فتا سامانی
کی اور فریاد کی

غالب نے اردو شاعری کے سلسلہ ترقی میں جدت اور ندرت کی راہیں ہموار کیں ۔ اس نے اردو شاعری کو بے شمار نئے طرز کے نادر اور [illegible] پیکر بخشے ۔ اس کی ترکیبیں ، تشبیہیں اور استعارے دل میں کھب جانے والے ہیں ، اس نے روایت کے خزانے سے اپنے استفادہ نہیں لئے بلکہ اپنی تخلیقی قوت کا سہارا لے کر شاعری کے امکانات کی توسیع کی اور اس کی شکل پسندی [illegible] کے لئے سخت ہیجان کا بھی باعث بنی

لیکن آج کے نقاد غالب کی نئی امیجری کے دل سے معترف ہیں ۔ اور جیسے جیسے اس کے پیکروں کی وضاحت ہوتی جاتی ہے ۔ غالب کی شاعری کی قدر و منزلت اور عظمت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے :

غنچہ پھر لگا کھلنے ، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا ، گم کیا ہوا پایا

میر نے بھی کہا تھا ؎

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

لیکن غالب نے گل کی شگفتگی اور تازگی کو دیکھ کر گویا یہ محسوس کیا کہ اس کا کھویا ہوا دل شاخ گل پر کھل رہا ہے ۔

غالب کا ذہن متحرک ہے ۔ اس کے احساس کی ذکاوت تخیل کی پرواز اور گہری نکتہ رسی نے اس کی شاعری میں نہایت نرالے اور خوبصورت پیکر سازی کی راہ ہموار کر دی ہے ۔ جس سے غضب کی حرکت اور سیماب پائی آ گئی ہے ۔ اس کے یہاں سکون ، جمود اور انجماد کے بجائے حرکت و عمل ، جوش و ارتعاش اور ہنگامہ آرائی کا پیکر ابھرتا ہے ۔ مثال کے لئے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

دیکھو تو دل فریبی انداز نقش پا
موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

یہ پیکر سادہ و مفرد نہیں بلکہ رنگا رنگ اور تہ دار ہیں ۔ یہ بحث گزر چکی ہے کہ عظیم شعرا کے پیکر نئے اور جدید ہوتے ہیں ۔ وہ گھسی پٹی تشبیہوں کا سہارا نہیں لیتے ۔ غالب کے یہاں بھی اکتا دینے والی یکسانیت نہیں کیونکہ اس کے فن شاعری کی بنیاد جدت طرازی پر ہے ۔ وہ پیکر تراشی میں ہمیشہ جدت سے کام لیا کرتے ہیں ۔ جدید استعارات جدید تشبیہات ، تجربات کی وسعت سے کام لیتے ہیں ۔ اس کی انانیت اور انفرادیت پسندی ، عقل و فکر کی حسین آمیزش خوبصورت الفاظ اور حسین لب و لہجہ ذہانت و ذکاوت نے اس کی شاعری کو وہ عظمت بخشی ، جس کی دھوم آج ساری دنیا میں ہو رہی ہے ۔ اس کی شاعری میں تہ دار تصویریت کی چند مثالیں دیدنی ہیں :

سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

غالب کی پیکر تراشی گہرے مشاہدے اور وسیع تجربے کا نتیجہ ہے ۔ اس لئے اس کی حیثیت انفرادی ہوتی ہے وہ اپنے اثرات میں مسلم ، سادگی کے ساتھ پرکاری کا پیکر بے خودی کے باوجود ہشیاری کی تصویریت ، تغافل میں

ہونے کے بعد بھی جرأت آزما محبوب کا پیکر، بوئے گل، نالۂ دل، اور دودِ چراغِ محفل کے انتشار کا پیکر۔ یہ سب نئے نادر اور انوکھے شعری پیکر ہیں۔ ساتھ ہی دلکش اور حسین بھی۔

غالب کا محبوب تصوری دنیا کا فرشتہ نہیں۔ اس کی محبت ماورائی محبت ہے۔ خانقاہی اور صوفیانہ عشق کا وہ قائل نہیں، اس میں جنس کی جھلک ہے۔ پیراہن کی خوشبو ہے۔ چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو ہے۔ اس طرح غالب کا محبوب روایتی محبوب سے بہت دور ہے۔ وہ حسن و شباب کا ایک جیتا جاگتا مرقع ہے، اور انسانی اوصاف سے متصف ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

حسن کے بارے میں ایسا چونکا دینے والا تصور اردو شاعری میں کمیاب ہے۔

اردو کا عام روایتی عاشق ہر حال میں محبوب کا وفادار ہوتا ہے۔ اس کے یہاں ایک طرح کی افلاطونی سپردگی ہوتی ہے وہ محبوب کا تابعدار ہوتا ہے اور ہر طرح کا غم اٹھانے کے لئے ہمہ وقت تیار۔ ذلت تک اٹھانا اس کے فرض میں داخل ہو جاتا

ہو۔ غالب [illegible]

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے

یا پھر۔

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

عاشق کا یہ باغیانہ لہجہ [illegible] نظر نہیں آتا۔ یہ حریفانہ انداز اور یہ سرکشی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس نے جا بجا مجنوں و فرہاد کا مذاق اڑایا ہے یہاں تک کہ منصور کو بھی نہیں بخشا۔ ع

ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

اس قسم کے سبھی قدیم مسلمات کو غالب نے [illegible] دیکھا ہے اس پر یہ عیاں ہو چکا تھا کہ کوئی چیز مستقل نہیں۔ زندگی تغیر پذیر ہے۔ اس کو ثبات نہیں دوام نہیں ہے

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

تاہم اس کے یہاں جذبۂ عشق کی شدت اور خلوص کی کمی نہیں۔ ایک غیر معروف اور [illegible] فارسی غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔ اس میں شاعر محبوب کی جدائی میں درد و غم، کسک، حسرت، آرزو اور تمنا کا ایک زندہ پیکر بن کر ابھرا ہے۔ یہ شعر

...عانی کے احساسات [illegible] آبِ حیات و درد دل گداختی

شعر ہے —

بیا دو مطربان [illegible] دیدم بنگر
چو اشک از [illegible] مژگاں چکیدنم بنگر
ز من [illegible] کنارہ می کردی
بیا بہ خاک من و آرمیدنم بنگر

. . . .

نیاز مندئ حسرت کشاں نمی دانی
نگاہ من شود در دیدہ دیدنم بنگر

سماجی جبریت کا احساس غالب کے حساس ذہن کو بار بار کچوکے لگاتا رہتا ہے۔ وہ اندرونی کرب سے تڑپتا رہتا ہے۔ اس باطنی اضطراب کی پیکر تراشی جا بہ جا نظر آتی ہے۔ یہ داخلی الجھنیں اس کی تقدیر بن جاتی ہیں۔ ان سے چھٹکارہ اس کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے کہ یہ الجھنیں خارجی سے زیادہ داخلی نوعیت کی ہیں۔ یہ الجھنیں وسیع تر مفہوم میں روح کے ویرانوں میں روشنی اور تاریکی کی ازلی آویزش کی علامت بن جاتی ہیں۔

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

حرکت، قوت، نمو —— یہ بنیادی تصورات غالب کے یہاں مختلف رمزی اور علامتی پیکروں میں بار بار پیش ہوئے ہیں۔ چند پیکر درج ذیل ہیں۔ یہ پیکر اس کے تخلیقی شعور کا ایک [illegible] و لاینفک ہیں۔ ہر پیکر ایک ناقابلِ تسخیر جوشِ حیات اور جوشِ عشق سے لبریز ہے۔ ان پیکروں میں نہ جانے کتنے لاشعوری محشرستانوں کی گونج بھی ہوتی ہے۔ ذیل کے اشعار میں خوب صورت موثر اور جاندار پیکروں میں ان کی جلوہ گری دیکھئے:

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

خوشی کیا کھیت پہ میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

اکثر نقادوں نے پیکروں کو ان کے مزاج کے اعتبار سے مختلف خانوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح پیکر یا تو بصری ہوتے ہیں یا سمعی یا لمسی یا ذائقہ پر مبنی یا حرکی وغیرہ۔ لیکن پیکروں کا تجزیہ یہ بتائے گا کہ ایک پیکر میں کئی مزاج بیک وقت موجود ہو سکتے ہیں۔ لہذا پیکروں کی ایسی تقسیم کبھی کبھی گمراہ کن بھی ہو سکتی ہے۔ ذیل کی چند مثالیں دیکھئے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں [بقیہ ۵۵ پر]

حق اعظمی

زنشا جر بھو

شب کے دیول میں
عابد ستاروں
کی معصوم سی ڈنڈوت، سرنگوں
نیم عریاں سے اشجار کی شاخوں پر
میٹھی بولی میں
بھجکاگ نغمہ سرا
فہم سے بالاتر طوطیوں کی صدا
جا بہ جا
ہر طرف
رس بھرے
مدھ بھرے
مہوے بکھرے ہوئے
یگیہ پاٹھی بھی کھانڈو راگوں کی بسیار خوری میں مصروف ہیں
کیلوں کے تعصب سے چکنے کرے
ابھی
اِمسی، بنسی سے بھی جیسے بیزار ہیں
سخت سے سخت تر
سرد پستانوں میں
حدتیں موجزن
برص آلود
جسموں کی چہروں کی پہچان بتلاؤں کیا؟
پھر کبھی!!

عین رشید

دو کمزور نظمیں

— ۱ —

شام

ساری رات پولیس والے ہمارے پیچھے پیچھے دوڑتے رہے
اس لئے اس شام دریا کے کنارے جب سورج کا قتل ہوا
ہم تین احمقوں کے علاوہ وہاں کوئی نہ تھا
مگر کل شام
جب باہر شور و طوفان تھا
شراب خانے میں صرف ہم ہی نہ تھے
ایک کائنات تھی

●●

— ۲ —

رات (۲۴ دسمبر......)

راستے ہیں کہ خوابوں میں الجھے ہوئے
نیم خوابیدہ لیمپوں کے احمق ستوں
سیٹیاں بک ہو گئیں وسکیاں بک گئیں
سرد، تاریک، برفیلی راتوں میں بھی
چند معصوم راہی بھٹکتے رہے
ریڈیو کے کمرشیل سے آئی صدا
کوئی پیدا ہوا، کوئی پیدا ہوا
بھوکے کتے کو ایک سرد ہڈی ملی
اسپرین لا کے رکھ لو بڑا دن ہے کل

●●

ابراہیم یوسف

کیپٹن کی :

افرادِ تمثیل

کیپٹن : لڑائی میں زخمی ہوا تھا اور جس کی ایک ٹانگ کاٹ دی گئی ہے۔

بیوی : کیپٹن کی بیوی

لڑکی : کیپٹن کی لڑکی

نووارد :

دو ملٹری پولس کے جوان

منظر :

کیپٹن کے دیہاتی مکان کا کمرہ۔ جس میں جنوبی جانب ایک ڈائننگ ٹیبل رکھی ہے جس کے گرد قرینے سے چھ کرسیاں رکھی ہیں۔ میز کے وسط میں ایک شمعدان ہے جس میں موم بتیاں روشن ہیں۔ پشت کی دیوار پر ایک کلاک ہے، جس میں آٹھ بج کر پندرہ منٹ ہوئے ہیں۔ سخت سردی کا موسم ہے اس لئے رات کچھ زیادہ معلوم ہو رہی ہے۔ کلاک کے نیچے ایک دروازہ ہے جو دوسرے کمرے میں کھلتا ہے۔ جس پر ایک دبیز ہلکے گلابی رنگ کا پردہ پڑا ہے۔ اس دروازے کے مقابل جو دیوار ہے اس میں بھی ایک دروازہ ہے جو مکان سے باہر جانے کے لئے ہے۔ اس پر بھی پہلے دروازے کی طرح پردہ پڑا ہے۔

مغربی دیوار میں ایک کھڑکی ہے جو سردی کی وجہ سے اس وقت بند ہے اس پر بھی پردہ پڑا ہے۔ کھڑکی کے پاس ایک آرام کرسی رکھی ہے۔ اس کھڑکی کو

جب کھولا جاتا ہے اور آرام کرسی پر بیٹھنے والا باہر کا منظر دیکھ سکتا ہے۔ کرسی کے پاس ایک چھوٹی سی میز رکھی ہے جس پر چند کتابیں سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس رکھی ہے اور دیوار سے ایک بیساکھی ٹکی ہے۔ آرام کرسی پر کیپٹن آنکھیں بند کئے بیٹھا ہے پاس ایک انگیٹھی رکھی ہے جس میں انگارے دہک رہے ہیں۔ کیپٹن کے چہرے پر کون کے آثار ہیں۔ کیپٹن کی لڑکی جس کی عمر سترہ اٹھارہ سال ہے۔ ڈائننگ ٹیبل کے پاس کھڑی تولیے سے پلیٹیں پونچھ رہی ہے اور انہیں قرینہ سے میز پر جما رہی ہے۔ کبھی کبھی پلیٹوں کے ٹکرانے کی آواز آجاتی ہے۔ لڑکی کبھی کبھی نظریں اُٹھا کر کیپٹن کو دیکھ لیتی ہے اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد کیپٹن کی بیوی دروازے میں آکر

بیوی: بے بی۔ (لڑکی مڑ کر دیکھتی ہے) اپنے پاپا سے پوچھو کھانا میز پر لگا دیا جائے۔ (کمرے میں آجاتی ہے اور کیپٹن کو دیکھ کر) یہ لو۔ یہ تو ابھی سے سو گئے۔

کیپٹن: جی (آنکھیں کھول کر مسکرا کر بیوی کو دیکھتے ہوئے) یہ آپ نے کیسے معلوم کر لیا۔

بیوی: آپ اسی طرح آنکھیں بند کئے آرام کر رہے تھے کھانا لگایا جائے؟

کیپٹن: (کلاک کی طرف دیکھ کر) ساڑھے آٹھ بجنے والے ہیں۔ جی ہاں وقت تو ہو گیا ہے۔ (انگیٹھی پر ہاتھ سینکتے ہوئے) آج تو بہت سردی ہے۔

بیوی: جی ہاں اس سال کچھ غیر معمولی سردی ہے۔ (کیپٹن ہاتھ بڑھا کر بیساکھی اٹھاتا ہے) کھانا لگایا جائے۔

کیپٹن: ضرور۔ آپ کھانا لگائیے۔ میں ذرا ہاتھ ادھر تک جا رہا ہوں۔

(بیوی پھر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ لڑکی کیپٹن کی طرف آتے ہوئے)

لڑکی: ٹھہریئے پاپا۔ میں آرہی ہوں۔

(ہنس کر) تم کب تک سہارا دو گی بے بی۔ (دروازہ کے پاس پہنچ کر) اچھا تم کھانا لگاؤ میں ابھی آتا ہوں۔

[کیپٹن دوسرے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ لڑکی دو چار پلیٹیں پھر سلیقہ سے رکھتی ہے۔ پھر انگیٹھی کے پاس جا کر اسے اٹھا کر ڈائننگ ٹیبل کی ایک کرسی کے پاس لا کر رکھ دیتی ہے اور ٹیبل پر ایک تنقیدی نظر ڈالتی ہے اور دروازے کی طرف مڑتی ہے کہ دوسرے دستک۔ لڑکی مڑ کر دروازے کی طرف بڑھتی ہے کہ ایک شخص کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ داڑھی کئی دن سے نہیں بنی ہے میلے سے کپڑے پہنے ہے۔ چہرے پر گھبراہٹ کے علاوہ تھکاوٹ کے بھی آثار ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھوکا بھی ہے۔ لڑکی اسے دیکھ کر گھبرا کر)

لڑکی: کون ہو تم؟

نووارد: یہ کس کا مکان ہے

لڑکی: کیپٹن

نووارد: (بات کاٹ کر) فوجی کیپٹن۔

لڑکی: ہاں، مگر تم۔

(نووارد آگے بڑھ کر انگیٹھی کے پاس آتا ہے اور

([illegible])

نووارد : کیپٹن کہاں ہیں۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔

لڑکی : وہ اندر ہیں۔ مگر تم ؟

نووارد : میں ! میں ایک فوجی ہوں۔

لڑکی : لیکن فوجی کسی کے گھر میں بلا اجازت نہیں گھس آتے۔ تم پاپا کو جانتے ہو ؟

نووارد : نہیں۔

لڑکی : پھر تم نے گھر میں گھس آنے کی ہمت کیسے کی۔

نووارد : (لڑکی کو غور سے دیکھ کر) کبھی ایسی ہمت کرنا ہی پڑتی ہے۔

[للچائی ہوئی نظروں سے میز پر چنی ہوئی پلیٹوں کو دیکھتا ہے کہ دوسرے کمرے سے کیپٹن کی بیوی کی آواز]

بیوی کی آواز : کون ہے بے بی

لڑکی : جانے کون ہے ممی، کمرے میں گھس آیا ہے۔

بیوی کی آواز : کمرے میں گھس آیا ہے ! (کمرے میں آتی ہے اور نووارد کو دیکھ کر) کون ہو تم۔

نووارد : میں بے بی کے پاپا سے ملنا چاہتا ہوں۔

بیوی : تم نے باہر انتظار کیا ہوتا۔ یوں گھر میں چلے آنے کا کیا مقصد ہے۔

[نووارد بیوی کو غور سے دیکھتا ہے۔ کچھ دیر خاموش رہتا ہے پھر ایک کرسی پر بیٹھ کر ہاتھ سینکتے ہوئے]

نووارد : باہر سردی ہے اور مجھے جان کا بھی خطرہ تھا۔

بیوی : جان کا خطرہ ! — کیا تم —

نووارد : میں چور ڈاکو یا قاتل نہیں ہوں۔ مطمئن رہیے۔

بیوی : یوں گھر میں گھس آئے اور کہتے ہو چور ڈاکو نہیں ہوں۔

نووارد : کہا نہیں کہ جان کا خطرہ تھا۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر اطمینان سے ہاتھ سینکتا ہے۔ پھر بیوی کی طرف دیکھ کر)

[illegible]

بیوی : دیکھو [illegible] جنگی قیدی ہو ؟

نووارد : جی ہاں۔ میں [illegible] تھا۔ (اطمینان سے) جب [illegible] فوجی کا [illegible] ہے۔ (پھر ہاتھ سینکنے لگتا ہے۔ بیوی اس کے اطمینان پر حیرت سے دیکھتی رہتی [illegible] کچھ دیر بعد)

لڑکی : تم کسی فوجی کی تلاش میں [illegible] ؟

[نووارد خاموش رہتا ہے۔ بیوی اس کی [illegible] اکتا کر]

بیوی : تم چاہتے کیا ہو ؟

(نووارد اب بھی خاموش رہتا ہے۔ اسی لمحہ یہ ہے کہ کیپٹن بیساکھی کے سہارے کمرے میں آتا ہے [illegible] نووارد کو دیکھتا ہے۔ پھر بیوی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے)

بیوی : یہ اپنے آپ کو قیدیوں کے جنگی کیمپ سے بھاگا ہوا بتلا رہے ہیں۔

[نووارد مڑ کر پیچھے دیکھتا ہے اور کھڑا ہو جاتا ہے۔ کیپٹن آگے بڑھ کر نووارد کے پاس آ جاتا ہے۔ [illegible] سوالیہ نظروں سے نووارد کو دیکھنے لگتا ہے۔ نووارد [illegible] دیر کیپٹن کو دیکھتا رہتا ہے پھر آہستہ سے]

نووارد : ہاں۔ میں قیدیوں کے کیمپ سے بھاگا [illegible]

کیپٹن : تمہارا رینک ؟

نووارد : (کچھ دیر پس و پیش کے بعد) میجر۔

کیپٹن : (سر سے پیر تک نووارد کو دیکھ کر) میجر۔ کس [illegible] سے تعلق ہے۔

نووارد: [illegible]

(نووارد لڑکی کی طرف دیکھتا ہے)

کیپٹن: (بیوی کی طرف دیکھ کر) میرا گرم کوٹ لا کر انہیں دو۔ (بیوی [illegible] محسوس کرتی ہے) جاؤ۔

[بیوی دوسرے کمرے کی طرف جاتی ہے۔ نووارد تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک کر]

نووارد: میڈم۔ میں کسی قسم کے دھوکے کو پسند نہیں کروں گا۔ اور اسی لئے میں ایک فوجی کے گھر میں آیا ہوں۔

کیپٹن: اگر آپ اس اعتماد کے ساتھ آئے ہیں تو پھر شک کیوں کر رہے ہیں۔ (کرسی کی طرف اشارہ کر کے) آپ تشریف رکھئے۔ سردی زیادہ ہے۔ (بیوی کی طرف دیکھ کر) جاؤ۔ اوور کوٹ لے آؤ۔

[بیوی دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ نووارد کرسی پر بیٹھ کر ہاتھ سینکنے لگتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے پھر نووارد نظریں اُٹھا کر کیپٹن کو دیکھ کر]

نووارد: میں چار دن سے جنگلوں میں بھوکا سردی کھاتا پھر رہا ہوں۔ اُف کس قدر جان لیوا سردی ہے۔

[لڑکی نووارد کو دیکھتی ہے اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ نووارد گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کیپٹن لڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے]

کیپٹن: کیا بات ہے بے بی۔ (لڑکی روتی رہتی ہے کیپٹن لڑکی پاس آ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر) کیا بات ہے بے بی۔

لڑکی: (خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے) کچھ نہیں پاپا۔ کچھ نہیں۔

کیپٹن: پھر بھی۔

لڑکی: پاپا۔ پاپا۔ (اپنے آنسو پونچھتی ہے کچھ دیر خاموش رہتی ہے۔ پھر آہستہ سے) جب آپ دشمن کی قید میں تھے تو آپ نے بھی ایسی ہی تکلیفیں برداشت کی ہوں گی۔

کیپٹن: (قہقہہ مار کر) او ڈیئر۔ تم کس قدر معصوم ہو۔

لڑکی: دیکھئے نا۔ یہ چار دن سے بھوکے ہیں سردی سے بچنے کے لئے ان کے پاس کپڑے تک نہیں۔

نووارد: سچ سچ لڑکیاں بڑی جذباتی اور ہمدرد ہوتی ہیں (کیپٹن کی طرف دیکھ کر) آپ بھی جنگی قیدی رہ چکے ہیں۔؟

کیپٹن: جی ہاں۔ میں زخمی ہو کر دشمن کے ہاتھ پڑ گیا تھا مگر دشمن نے مجھے ناکارہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔

[بیوی ایک فوجی اوور کوٹ لے کر آتی ہے اور نووارد کی طرف بڑھا کر]

بیوی: یہ لیجئے۔

کیپٹن: (نووارد سے) آپ یہ کوٹ پہن لیجئے۔ شاید فٹ آ جائے گا۔

نووارد: (مسکرا کر) فوجیوں کو ہر کپڑا فٹ آ جاتا ہے۔ (کوٹ بیوی کے ہاتھ سے لے کر پہن لیتا ہے اور دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ چند سیکنڈ خاموش رہتا ہے جیسے کچھ سوچ رہا ہے۔ پھر مسکرا کر) کیا فوجیوں کی بیویاں اس قدر غیر ذمہ دار ہوتی ہیں۔ (عورت نووارد کو دیکھتی ہے۔ نووارد مسکرا کر ریوالور نکال کر) کیا یہ بھی آپ مجھے تحفے میں دے رہی ہیں؟ (بیوی اور لڑکی کے چہرے پر گھبراہٹ اور بے چینی کے آثار پیدا ہوتے ہیں مگر کیپٹن کا چہرہ پُرسکون رہتا ہے۔ نووارد کچھ دیر ریوالور کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہتا ہے پھر کیپٹن کی طرف دیکھ کر) یہ آپ کے ملک کی ساخت کا نہیں۔ شاید۔

[نو وارد پہلا سوچتا ہے پھر دوسرے کمرے
میں چلا جاتا ہے]

بیوی : (گھبرا کر) کہیں وہ پیچھے کے دروازے سے فرار نہ ہو جائے۔

کیپٹن : نہیں۔ وہ فرار نہیں ہو گا۔

بیوی : مگر ——

کیپٹن : مگر وگر کچھ نہیں (لڑکی کی طرف دیکھ کر) بے بی پولس کو اندر بلا لو۔

لڑکی : (دروازہ کھول کر) اندر آ جائیے۔

[ملٹری پولس کے لوگ اندر آتے ہیں وہ اسٹین گن سے مسلح ہیں۔ کیپٹن کو دیکھ کر فوجی سلام کرکے]

پہلا : کیپٹن۔ دشمن کا ایک میجر کیمپ سے بھاگ کر آپ کے گھر میں گھس آیا ہے۔

کیپٹن : میرے گھر میں!

پہلا : جی ہاں۔ لوگوں نے اسے پاس کے جنگلوں میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔

دوسرا : ابھی ایک گاؤں نے بتلایا کہ اس نے اسے آپ کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔

کیپٹن : ہو سکتا ہے تمہاری اطلاعات درست ہوں۔

دوسرا : ہمیں آپ کے مکان کی تلاشی لینا پڑے گی۔

کیپٹن : لیکن ــ

پہلا : دیکھئے کیپٹن۔ آپ دشمن کے فوجی کو اپنے گھر میں پناہ دینا پسند نہیں کریں گے۔

کیپٹن : ہاں۔ نہیں کروں گا۔

پہلا : ہمیں یقین ہے کہ وہ آپ کے گھر میں چھپا ہوا ہے

کیپٹن : چھپا ہو گا۔

[دوسرا دروازہ کی طرف بڑھتے ہوئے]

دوسرا : تو پھر ہمیں تلاشی کرنے دیجئے۔

کیپٹن : [illegible]
[illegible]

دوسرا : نہیں۔ ہم [illegible]
[illegible] سکے۔

[پھر آگے بڑھتا ہے کیپٹن تیزی سے [illegible] ہوا ریوالور اٹھا کر]

کیپٹن : ٹھہر جاؤ۔ (دوسرا ایک دم [illegible] اسٹین گن کیپٹن کی طرف [illegible] بیوی تیزی سے [illegible] کیپٹن کی طرف [illegible] کیپٹن نفرت سے) میں تمہارے ان [illegible] نہیں ڈرتا۔

[بیوی تیزی سے کیپٹن کے سامنے آکر]

بیوی : ڈیر۔ فار گاڈ سیک۔

کیپٹن : (بیوی کو دھکا دے کر الگ کرتے ہوئے) ہٹ جاؤ

پہلا : کیپٹن! تم دشمن کی مدد کرکے قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہو۔

کیپٹن : (بلند آواز سے) نہیں۔ نہ میں دشمن کی مدد کر رہا ہوں نہ قانون کی خلاف ورزی۔

[نو وارد اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے کمرے میں آتا ہے اور ملٹری پولس والوں سے]

نو وارد : میں اپنے آپ کو سرینڈر کر رہا ہوں۔

کیپٹن : (چیخ کر) ہرگز نہیں۔ تم میری ٹیبل پر بیٹھ چکے ہو جب تک کھانا نہیں کھا لو گے، خود کو سرینڈر نہیں کر سکتے۔

نو وارد : تھینک یو ویری مچ کیپٹن۔

کیپٹن : تھینکس فار واٹ؟

نو وارد : فار انیکشن اینڈ لو

[ہاتھ اونچا کئے نو وارد آگے بڑھتا ہے]

کیپٹن : (چلاکر) [illegible] ۔ تم یوں نہیں جا سکتے۔
ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔

نووارد : ہاں کیپٹن۔ میرا جو انجام ہوگا اسے تم نہیں روک سکتے۔ تمہاری محبت اور خلوص کو میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

کیپٹن : (ملیٹری پولس سے) تم لوگ باہر جاؤ۔

پہلا : افسوس کیپٹن۔ ہم آپ کا حکم نہیں مان سکتے۔
(نووارد کو اسٹین گن سے کور کرلیتا ہے)

کیپٹن : (غصہ سے) تو پھر میں تمہاری جان لے لوں گا یا اپنی دے دوں گا۔

لڑکی : پلیز پاپا۔

کیپٹن : (بلند آواز سے) تم خاموش رہو۔
[لڑکی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔ نووارد لڑکی کے پاس جاکر بزرگانہ محبت سے اس کے گال تھپ تھپاکر]

نووارد : نہیں بے بی۔ نہیں۔ روتے نہیں ہیں۔ (میز کے پاس جاکر اس میں سے ایک لقمہ منہ میں لےکر۔)
لو کیپٹن، میں نے تمہاری قسم پوری کر دی۔
[پھر دونوں ہاتھ اوپر کرکے دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔ ملیٹری پولس کے لوگ اسے اپنی اسٹین گنوں سے کور کرلیتے ہیں۔ چند سیکنڈ بعد ۔]

لڑکی : پلیز ٹھہر۔ (نووارد رک جاتا ہے اور لڑکی کو دیکھتا ہے۔ لڑکی اس کے پاس جاتی ہے۔ پہلے کمرے میں ادھر ادھر دیکھتی ہے جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔ پھر اپنے بالوں میں سے ایک ہیر پن نکال کر)
یہ میرا تحفہ تمہارے لئے ہے۔ جب تم اپنے وطن واپس جاؤ تو اس لڑکی کو یاد رکھنا جو اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا کھانا تمہیں نہیں کھلا سکی۔

[میجر اس کے ہاتھ سے پن لےکر محبت سے اس کے گال تھپ تھپاتا ہے]

نووارد : تمہارے محبت اور خلوص سے دیے ہوئے اس تحفے کو میں وار ٹرافی سمجھ کر ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا۔

[اپنے دونوں ہاتھ اوپر کرکے کمرے سے نکل جاتا ہے۔ ملیٹری پولس والے بھی اس کے ساتھ باہر چلے جاتے ہیں۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ لڑکی آنکھوں میں آنسو بھرکر]

لڑکی : پاپا۔ وہ میرا تحفہ اسے لے جانے دیں گے؟ اسے مار تو نہیں ڈالیں گے۔

[کیپٹن خاموشی سے خلا میں گھورتا رہتا ہے اور پھر ریوالور ایک کرسی پر پھینک دیتا ہے۔]

(پردہ)

بقیہ: کہانیاں گوتم کے شہر میں

متعلق سوچیں، جدیدیت ترقی پسندی کی توسیع ہے۔

جدید افسانے سے مایوسی ۔ اس کا زبردست دفاع ۔
بائیں NEW LEFT MOVEMENT کی ۔
ایک درمیانی رویہ، ایک مصالحانہ کوشش۔
اور یہ کہانیاں جواب گوتم کے شہر سے نکل کر شہر شہر، قریے قریے گھومتی پھریں گی۔
کوئی پیپل کا سایہ، کوئی ٹھنڈی چھاؤں۔

"کیا یہ تازہ لاش ہے؟"

"دیکھنے میں تو تازہ معلوم ہوتی ہے۔"

"تازہ اور گرم۔ ویسے میں نے چھو کر نہیں دیکھا۔"

"تم کون ہو؟" جس سے یہ سوال کیا گیا تھا وہ بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

پولس کا آدمی ٹیلیفون بوتھ کے اندر چلا گیا۔

عورت نے ہونٹ کاٹتے ہوئے مجھے دیکھا۔ میں بھی کھسک گیا۔ بالکل اس کے پاس۔ گرمی گوشت کو پگھلا رہی تھی۔ ہڈی کو بھی۔ اُس کے بالائی لب پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ سینٹ کی بو مٹ رہی تھی۔ پسینے کی خوشبو تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"لو۔ بڑی بھیانک ہے۔"

"ٹھنڈی لو۔"

میں ہنسا۔ وہ بھی ہنس دی۔

بھیڑ میں کسی نے کہا۔ "اب پولس والے آئیں گے اور لاش کو وان میں اُٹھا لے جائیں گے۔"

"ہاں ہاں۔ اس کا پوسٹ مارٹم ہوگا۔"

"جانے اندر سے کیا نکلے گا؟" ایک شخص نے سٹے باز کے لہجے میں کہا۔

"باہر بھی موت۔ اندر بھی موت۔" سب نے نظر اُٹھا کر داتا کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں غلیظ سے چپچپا رہی تھیں۔

پھر کئی بسیں آگے پیچھے آئیں اور چڑھائی پر رینگتی چلی گئیں۔ مسافر بسوں کے دروازے میں لٹک رہے تھے۔ اور اُن کے لباس جھنڈوں کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔ ہوا میں اُڑتی ہوئی آنکھیں زہریلے اور کڑوے دھوئیں کے اس پار بھیڑ کی طرف دیکھ رہی تھیں جو چیونٹیوں کی فوج کی طرح حرکت میں تھی۔ جو کبھی پھیل جاتی تھی، کبھی سکڑ جاتی تھی۔

میں نے عورت کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھنا چاہا

وہ [illegible] لاش [illegible]

[illegible] لاش [illegible]

ہو گئی اور [illegible]

اس کے چہرے پر [illegible]

"[illegible] لاش بہت [illegible]

اچھا ہے۔" [illegible]

[illegible] والے کا چہرہ زرد تھا۔ [illegible]

سفید ہو رہے تھے۔ آنکھیں [illegible]

لاٹ شاٹ۔ [illegible] ٹوم [illegible] گھڑاپ۔ [illegible]

پھر ایک بار۔ پھر [illegible] شاٹ۔ [illegible]

اس کا چہرہ زرد تھا۔ وہ بلند [illegible] گیٹ [illegible] دیکھ رہا تھا جہاں ایک بہت بڑا گیٹ [illegible] کی چھت [illegible] تھا۔ گیرہ میں کا سر غائب تھا۔ اور وہ [illegible] کی طرح [illegible] کے نیچے جھکا ہوا تھا۔ وہاں بھی بہت بھیڑ تھی۔ بندوق کے دغنے کی آواز آئی۔ [illegible] گیٹ پر گرا۔ گیٹ کے اُس طرف سے ایک عورت کی چیخ سنائی دی۔ شہسوار نے [illegible] کر عورت کو [illegible] پر بٹھایا۔ گرد اُڑی۔ گھوڑا غائب۔ عورت غائب۔ یکایک ارکسٹرا کا نغمہ پھوٹا۔ بھیڑ تالیاں بجانے لگی۔

ایک بھیڑ اُس طرف تھی۔ ٹیلے پر۔ ایک بھیڑ اس طرف تھی جہاں لاش پڑی ہوئی تھی۔ جہاں لوگوں کو پولیس کا انتظار تھا۔ یکایک شور اُٹھا۔ "زندہ ہے۔ لاش زندہ ہے۔"

سب لاش پر جھک گئے۔ ایک ہاتھ نے جھپٹ کر اس کی ٹائی کھول دی۔ دوسرے نے کالر کھول دیے۔ کسی نے لپک کر اس کا کوٹ نوچا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی قمیص تار تار ہو گئی۔ اندر ایک بہت میلا بنیان لاش کے سخت سینے پر [illegible] کی طرح منڈھا ہوا تھا۔

"اس کی تلاوت [illegible]" عورت نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔

[illegible] ہو گئی ۔ لوگ بھاگنے
[illegible] سر جھکائے ، بس
[illegible] پریشان خروسا ہو رہی تھی ۔
[illegible] آگے نکل گئیں۔
[illegible] گواہی کے لئے لے جائیں گے۔
[illegible]
[illegible] کر کہاں جاؤ گے؟ قانون کے
ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔

میں پھر [illegible] سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جتنا چھپتا
تھا اتنا ہی دکھائی دیتا تھا۔

عورت کے چہرے پر رنگوں کے دھبے ابھر آئے۔ وہ
بار بار ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ ہونٹ کے کنارے پر لہو کی ایک
بوند کبھی جل اٹھتی تھی، کبھی بجھ جاتی تھی۔

ایک شخص کے گلے کی رگیں پھول رہی تھیں۔ اس کے
ہونٹ سلے ہوئے تھے۔ ہونٹوں کے کناروں پر رال سوکھ گئی تھی
آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ پلٹ پلٹ کر لاش کو دیکھ
رہا تھا جس کو پولیس والے اٹھا کر وان کی طرف لے جا رہے تھے
اس کے ہونٹ سلے ہوئے تھے لیکن وہ چیخ چیخ کر عورت سے
کچھ کہہ رہا تھا۔ عورت سہمی ہوئی تھی۔ اور اس کا منہ میرے منہ
کے اتنا قریب آ گیا تھا کہ میں اور زیادہ احتیاط سے کام نہیں
لے سکتا تھا۔ سب قہقہے لگا رہے تھے۔ اور ہم دونوں کو دیکھ رہے
تھے۔ میں بہت خوف زدہ تھا۔ وہ لوگ مجھے اٹھا کر وان کی
طرف لے جا رہے تھے اور میں پولیس والوں کے جوتوں کی چاپ
سن رہا تھا۔

"یہ ہر شخص ہے۔" عورت نے کہا۔

"یہ کوئی نہیں۔" میں نے یوں ہی جواب دیا۔

وہ جاپانی چھتری کو اور زیادہ تیزی سے نچانے لگی۔
میرے گلے میں آواز روٹی کے سوکھے ٹکڑے کی طرح پھنسی
دی تھی ۔

تم مجھے نہیں پہچانتیں۔ کوئی مجھے نہیں پہچانتا۔ کوئی
ٹائی لے گیا، کوئی قمیض۔ لیکن بنیان کو کوئی ہاتھ نہیں لگاتا
مجھے کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔ بھیڑ چھٹ رہی ہے۔ وان جا چکی ہے
لوگ ٹیکسی اور اسکوٹر کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ دھوپ اور
تیز ہو گئی ہے۔ سورج اور نیچے آ گیا ہے۔ درخت جل رہے
ہیں۔ کولتار پگھل رہا ہے۔ اس کے ہونٹ سلے ہوئے ہیں
وہ رو رہا ہے وہ سب جانتا ہے۔ تمہارے جسم میں بڑی لرزش
ہے۔ تمہارا جسم ٹھنڈا ہے۔ پسینہ خشک ہو چکا ہے۔ تمہاری
عینک میں اب کسی لاش کا عکس نہیں ہے۔ سیاہ شیشے چمک
رہے ہیں۔ آنکھیں چھپی ہوئی ہیں مگر تم مجھے دیکھ رہی ہو۔ مجھے
دیکھ رہی ہو مگر پہچانتیں نہیں۔ اب میں وہاں ہوں جہاں تک
تمہاری نظر نہیں پہنچ سکتی۔ وہ لوگ سفید ماسک منہ پر باندھے
مجھ پر جھکے ہوئے ہیں۔ میری بے خون رگیں چھپٹ چھپٹ کاٹی
جا رہی ہیں۔ چھلی کی ڈوروں کی طرح۔ سینہ چاک، پیٹ چاک
پورا جسم چاک چاک۔ دل کی حرکت بند ہو گئی۔ موت کتنا
بڑا انکشاف ہے۔ کوئی میرا چہرہ نہیں دیکھتا۔ سب میرے
شاندار لباس سے مرعوب ہیں۔ بنیان سے گھبرائے ہوئے۔
شرمندہ۔ سحر! تم کیوں شرماؤ۔ میں یہ سب اپنے آپ سے کہہ
رہا ہوں۔ ایسا ہے نہیں۔ ان کے لئے میں ایک ایسا سامان
ہوں جس کو چیرا پھاڑا جا سکتا ہے اور جس پر رپورٹ لکھی جا سکتی
ہے۔ ایک پیلے فارم پر چھپے ہوئے سوالوں کے مطابق۔ نام
پیدائش کا سال، پیشہ، جینے کا پیشہ، مرنے کا پیشہ۔
جینے والے کا ایک سوال۔ مرنے والے کا ایک جواب۔
میں اس سوال نامے سے پہلے شروع ہوا۔ اور اس سے آگے
جاؤں گا۔ اس سے کسی کو مطلب نہیں۔ اور تم مجھے پہچاننے سے
انکار کر رہی ہو۔ اس کی بھی ایک کہانی ہے۔
کتنے سال ہو گئے۔ میں کسی نہ کسی بس میں تمہارے ساتھ

[illegible] میں جھک کے
[illegible] آنکھیں بہت خوب صورت تھیں۔
[illegible] بھی بھلی
[illegible]
"میں سب کچھ [illegible] ہوں۔"
"کیا؟"
"بے مزہ [illegible]"
میں نے بات بدلنے کے لئے پوچھا۔
"کہو تمہارا دھندا کیسا چل رہا ہے؟"
"برا — بہت برا" اس نے ہونٹ چاٹتے ہوئے کہا
"میں نے بہت دنوں سے تمہارا اشتہار نہیں دیکھا۔"
"نئے چہرے والے ماڈل آگئے ہیں بازار میں۔"
"وہ تو آتے رہتے ہیں۔"
"ہاں وہ تو آتے رہتے ہیں۔" اس کی آواز کا حزن اس کے چہرے پر پھیل گیا۔

مجھے مردہ گھر میں چھوڑ کر وہ لوگ چلے گئے۔

میں نے عورت کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "تمہارا ہاتھ بہت گرم ہے۔"
"موت بہت گرم ہوتی ہے۔"
میرے چہرے کے عکس سے اس کی عینک کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

میں نے اس کے ہاتھ کو زور سے دبایا۔ اس نے میری دوسری [illegible] سر میرے شانے پر رکھ دیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں [illegible] بس کا گیئر بدلا۔ بڑے زور سے جھٹکا لگا۔ سارے مسافر گڈمڈ ہو گئے۔ عورت کی نظر میرے کھلے ہوئے گریبان کے اندر [illegible] چلی گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا میں نے بھی گریبان کے اندر دیکھا۔ بنیان بہت میلا تھا۔ عورت کا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

میں نے عینک ہٹالی۔ اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔
"تم بھی ویسے ہی ہو۔"

مردہ گھر میں سناٹا ہے۔ میں سفید چادروں سے ڈھکی ہوئی لاشوں کی قطاریں دیکھ رہا ہوں اور انتظار کر رہا ہوں۔ دروازہ کھلے گا۔ کوئی آئے گا۔ مجھے پہچانے گا یہی پہچان میری رہائی ہوگی۔

صدیاں گزر گئی ہیں۔ نہ دروازہ کھلا ہے۔ نہ کوئی آیا ہے۔ نہ خوشبو۔ نہ روشنی۔ اس میلے بنیان کے سوا میرے پاس کچھ نہیں۔

●●

آزاد گلاٹی

جلتی بجھتی یادوں کے، کچھ الاؤ پلکوں پر، رات بھر سلگنے دو
ٹوٹے پھوٹے خوابوں کے بکھرے دھندلکے میں دل کو کچھ بہلنے دو

صبح جانے کیا لائے، گیت سب اُجڑ جائیں پھول سب بکھر جائیں
آج شب کے ہونٹوں پر، پھول کی طرح کھلتے گیت کو مچلنے دو

صبح جیسے چہرے پر اس کے ہونٹ کی کلیاں گال کے گلاب اس کے
یاد آ رہے ہیں تو چند ساعتیں اپنے ذہن کو مہکنے دو

زندگی کا صحرا بھی آگ کا سمندر ہے اور ہم سفینے ہیں
جب یہی مقدر ہے، اور اسے تپکنے دو، اور اسے دہکنے دو

چلتے پھرتے راہوں پر آج بیتے لمحوں کا اک شجر ملا ہے تو
اس کی چھاؤں میں بیٹھو، دوپہر سلگتی ہے، اس پہ شام ڈھلنے دو

●●

غزل

گھروں میں رہتے ہوئے بھی ہیں ہم ان گھروں میں نہیں
صدف کوئی بھی سلگتے سمندروں میں نہیں

یہ کس کا شاپ لگا ہے مری نگاہوں کو
تمہارا عکس بھی ماضی کے منظروں میں نہیں

عجیب بات ہے، گھائل ہیں چوٹ کھا کر ہم
لہو کا لمس مگر پھینکے پتھروں میں نہیں

ہیں چلتے پھرتے ہوئے، جیتے جاگتے لاشے
حیات نام کی شے کوئی پیکروں میں نہیں

جو مل سکے، اسے پانے کی کس کو خواہش ہے
طلب تو اس کی ہے جو شے مقدروں میں نہیں

●●

گوریلا فائٹ

صبح کے دس بجے ہیں ــــ بیکار نوجوان ہوٹلوں میں گپیں مارتے ہیں۔

" یار! دلیپ دکھائی نہیں دیتا۔؟ "

" ارے وہ اپنے کمرے میں بیٹھا اپنے کارناموں کا رعب گانٹھ رہا ہوگا۔ "

شام کے چار بجے ــــ ملازمت پیشہ لوگ گھروں کو لوٹتے ہیں۔

" یہ دلیپ نظر نہیں آتا۔؟ "

" وہ۔۔؟ کالج کے گیٹ پر کھڑا لڑکیوں کو گھور رہا ہوگا۔ "

شام کے سات بجے ہیں ــــ شوقین لوگ ریستورانوں میں کافی پیتے ہیں۔

" دلیپ کدھر ہے بھئی۔؟ "

" سڑکوں پر جھک مار رہا ہوگا۔ "

رات کے نو بجے ہیں ــــ رشتہ داروں کے یہاں دعوتیں ہوتی ہیں۔

" دلیپ نہیں آیا۔؟ "

" اچھا ہی ہوا ــــ یہاں شریف لوگ بیٹھے ہیں۔ "

رات کے گیارہ بجے ہیں ــــ آسودہ لوگ بستروں پر آرام کرتے ہیں۔

" دلیپ ابھی تک گھر نہیں لوٹا۔ "

" کر رہا ہوگا آوارہ گردی کہیں، اس کا کیا ہے۔؟ "

خنجر ــــ تلوار ــــ گولیاں ــــ بم ــــــ دھماکے دھماکے !!

جنگ جنگ۔ ہر جگہ جنگ! ہوٹلوں میں، سڑکوں پر کالج کے گیٹ پر، رشتہ داروں کی دعوتوں میں، دوستوں کے ڈرائینگ روم میں۔ گھر میں، باہر میں، بھیڑ میں تنہائی میں بس جنگ ہی جنگ۔ گولیوں کی سنسناہٹ اور بموں کے دھماکے۔ آخر وہ تنہا کہاں کہاں مورچہ سنبھالے۔ جسم میں دوڑتا ہوا سرد خون اور ایک کھولتا ہوا ذہن لے کر وہ کس کس سے جنگ کرے؟ اٹھائیس سال کی عمر، چھ فٹ کا قد اور کالج کی تعلیم میں بھلا حملے کی جرأت کہاں تھی، شب خون مارنے کا دم خم کہاں تھا۔؟؟ وہ تو ایک دن سبھوں کے پرخچے اڑا دے گا۔ چاقو سے چیر ڈالے گا، پستول سے گولی مار دے گا اپنے پنجوں سے ان کا گلا دبا دے گا۔ ان لوگوں نے آخر اسے سمجھا کیا ہے۔؟ ذلیل! کمینے! کتے!

اس کی چست موٹے کپڑوں کی پتلون اور تنگ قمیض سے اس کا جسم باہر نکل پڑنے کے لئے تڑپ رہا ہوگا، مگر اس کا جسم باہر نکل آیا بھی تو کیا ہوگا؟ یہاں تو سبھی ننگے ہیں۔

[illegible] اپنے پورٹریٹ کے پاس کھڑا بڑی دیر سے اسے [illegible]

[illegible] پتلون کی جیب میں [illegible]

[illegible] تھیں اور اس کے [illegible]

[illegible] رہی تھی۔ اچانک اس نے دیکھا فریم [illegible]

[illegible] پورٹریٹ کی پلکیں جھپکنے لگیں۔

[illegible] اتنا پسند تھا کہ وہ ساکت [illegible]

[illegible] دیکھ کر وہ [illegible]

[illegible] نہیں ملا پا رہا [illegible]

[illegible] جنبش ہوئی اور وہ مسکرا پڑا [illegible]

[illegible] میں تیل [illegible]

[illegible] آواز بھی [illegible]

[illegible] کی آواز نکل [illegible]

[illegible] صاحب! اچھے تو ہیں؟ ذرا

میری طرف تو دیکھئے!۔ ادھر۔ ادھر۔" دلیپ کے ذہن میں جلتی ہوئی بھٹی میں ایک زور کا دھماکا ہوا اور اس کے وجود میں زلزلہ آ گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے جیب سے پستول نکال لیا اور لگاتار کی چھ گولیاں اپنے پورٹریٹ پر داغ دیں، آخری گولی لگتے ہی فریم دیوار سے گر کر فرش پر اوندھی ہو گئی جب تک اس کے گھر والے یا باہر والے اکٹھا ہوتے وہ جھپٹ کر باہر نکلا، پستول سامنے والے نالے میں پھینک دیا اور بچے بچے ڈگ بھرتا ہوا ایک طرف چل دیا۔ ●●

بقیہ: غالب کی شاعری میں..

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کہ تم مرے لئے ہوتے

پہلے شعر میں تقریر کی لذت سے ذائقے کا ایک پہلو ابھرتا ہے لیکن لفظ تقریر بذاتِ خود ایک حرکی پیکر بنا رہا ہے۔ دوسرے شعر میں بوسہ گل، سمعی پیکر ہے۔ لیکن نالۂ دل کا ٹکڑا ایک حرکی کیفیت رکھتا ہے۔ دودِ چراغ محفل، بصری بھی ہے اور حرکی بھی۔ پریشاں حال کا پیکر بھی بصری پہلو لئے ہوئے ہے۔ گویا ایک شعر میں مختلف قسم کے امیج گڈمڈ ہو گئے ہیں۔

تیسرے شعر میں سبزہ کا اگنا اور بہار کا آنا بصری پیکر ہے۔ چوتھے شعر میں پری وش کا ذکر بصری پیکر بناتا ہے۔ اور ذکر حرکی اور رازداں کا رقیب بن جانا سمعی پیکر بناتا ہے۔ پانچویں اور چھٹے شعر میں محبوب جو بے پناہ حسین وجمیل ہے یہاں ایک نکتہ یہ بھی نکلتا ہے کہ غالب کے یہاں پیکروں کی تعمیر میں حواس خمسہ کے تمام عوامل کو بروئے کار لانے کی شعوری کوشش ملتی ہے۔ اس طرح غالب کی امیجری کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ مختلف النوع احساسات و جذبات کو مجرد پیکر میں تبدیل کر دینے کے فن پر غالب کچھ ایسے قادر تھے کہ یہ وصف اردو شعراء میں کم کو نصیب ہوا ہے۔●

اندھا سفر

سچ تو صرف یہ ہے کہ میں جب اُس گولائی کے پاس پہنچا جس کے چاروں طرف سے راستے نکلتے ہیں تو مجھے بہت سی تصویریں نظر آئیں۔ بہت سے چہروں کی، رنگوں کی، آوازوں کی اور نہ جانے کس کس کی لیکن ان میں سے ایک بھی چہرا، ایک بھی رنگ، ایک بھی آواز میری پہچانی ہوئی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے میرے شناسا انہی راستوں میں کسی راستے پر آگے نکل گئے ہوں یا پھر وہ بہت پیچھے رہ گئے ہوں اور اب تک یہاں نہ پہنچ پائے ہوں مگر اس کا ذکر فضول ہے کیونکہ میں نہ تو آگے چلے جانے والوں کو دیکھا تھا اور نہ بعد میں آنے والوں کو اب تک دیکھ سکا ہوں۔ اور جو آنکھوں کے سامنے ہے اس میں میرا کوئی نہیں ہے۔ سبھی اجنبی، سبھی ناآشنا۔

پھر بھی میں کسی اپنے کی تلاش شروع کرتا ہوں۔

یہ چہرا ——— وہ چہرا
یہ رنگ ——— وہ رنگ
یہ آواز ——— وہ آواز

کون سا چہرا میرا ہمدم ہے — گول یا کتابی یا .....
کون سا رنگ میرا دوست ہے — سیاہ یا سرخ یا ......
کون سی آواز میری مونس ہے — اونچی یا مدھم یا ....

پہچان کوئی نہیں اور بصارت اجنبیت کے پتھر سے ٹکرا ٹکرا کر چکنا چور ہو رہی ہے۔ جانے اب ایسا کیوں لگتا ہے پہلے تو ایسا نہیں تھا۔

پہلے تو میں نے جس چہرے کو دیکھا وہ مجھے اپنا سا معلوم ہوا۔

جو رنگ سامنے بکھرا وہ آنکھوں میں کھب گیا۔

جو آواز کانوں کے پردے پر تھرتھرائی میری رفیق بن گئی

رفتہ رفتہ میں نے بہت سارے چہروں کو اپنا ہمدم بنا لیا۔ ڈھیر سے رنگ میرے ساتھی بن گئے۔ بے شمار آوازیں میری ہم ساز بن گئیں۔ لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے ورنہ اس سے قبل تو میں تن تنہا ہی سفر پہ نکل کھڑا ہوا تھا۔ کوئی بھی میرا ہمسفر نہ تھا۔ نہ کوئی چہرا، نہ کوئی رنگ نہ کوئی آواز صرف ایک چہرا تھا صرف ایک رنگ اور صرف ایک آواز۔ اور وہ میں تھا۔

سنسان راستے کے تنہا سفر میں میں نے کتنی منزلیں طے کی تھیں اور کتنی منزلیں ابھی اور باقی تھیں یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ میں بہت دیر تک اور بہت دور تک چلتا رہا تھا کہ میرے پاؤں دُکھنے لگے۔ پھر شانے — پھر سر۔ یہاں تک کہ رینگنے کی سکت بھی مجھ سے جاتی رہی۔ واپسی بھی میرے بس میں نہ تھی۔ سو میں نے وہیں پر پڑاؤ ڈال دیا۔

تب کہیں سے ایک چہرا میری آنکھوں کے دائرے میں آگیا پھر ایک رنگ میرے گرد لہرایا۔ پھر ایک آواز کانوں کے پردے پر تھرتھرائی۔

خوف اور حیرت کا لمحہ ٹوٹا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ سب بھی اپنے اپنے سفر میں تھے اور ان میں سے کسی کو نہ تو راستے کی جانکاری تھی اور نہ وہ منزل کو پہچانتے تھے۔

غزلیں

میں سوچتا ہوں سمندر وہ تیر آیا ہے
کہ کتنا بدلا ہوا اس کا اب کے چہرہ ہے
اور اس کے بعد جو لہجہ بدلنے لگتا ہے
وہ آئینے کے گھر کی بتی بجھا ہی دیتا ہے
اس ایک شخص کا آنکھوں میں عکس گہرا ہے
جو آ رہا ہے، بس آیا، بس آنے والا ہے
ہر ایک بار ندامت میں غرق ہو کر بھی
وہ ایک لمحۂ یکجائی کو ترستا ہے
مجھے تو جان کے انجان بن ہی جانا تھا
کہ اس سے میرا اسی طرح کا ہی رشتا ہے
میں چاہتا تو بہت ہوں کہ اپنے پاس رہوں
مگر وہ جاتے ہوئے مجھ کو روک لیتا ہے
تمام راہیں اسی سمت کو چلیں آخر
کہ اگلا وقت اسی طور آنے والا ہے
ہزار بار یہ سوچیں کہ اب نہ ہو ایسا
ہر ایک بار مگر ایسا ہو ہی جاتا ہے
وہ ایک دن مجھے پہچان لے گا یونہی نہیں
یہ معجزہ بھی کسی روز ہونے والا ہے

●●

وہ روز روز نئی صورتوں میں آتا ہے
کہ جس سے میرا بہت ہی پرانا رشتا ہے
اسی بہانے وہاں روز آتا جاتا ہے
کبھی قلم کبھی رومال چھوڑ آتا ہے
بہت اداس ہوئے ہم نے جب بھی سوچا ہے
وہ بے وفا ہے اسے اب سے بھول جانا ہے
ذرا سی بات پہ سوچیں تو سوچتے جائیں
ہمارے ساتھ اسی بات کا بکھیڑا ہے
ہوا کے دوش پہ چلتے رہیں چلیں جب تک
کہ ایک روز فضا میں بکھر ہی جانا ہے
چلو، ہم آخری بار آج اس سے مل آئیں
سنا ہے شہر سے وہ آج جانے والا ہے
پرانے پرچوں میں تصویر دیکھ کر اپنی
وہ سوچتا ہے کہ کتنا بدلتا جاتا ہے
ذرا سی دیر کو مل لیں اداس ہو جائیں
ہم اپنے گھر میں رہیں اس سے یہ تو اچھا ہے
وہ لفظ لفظ کی صورت جمع ہوا ہے ابھی
کوئی تو پڑھ لے اسے، وہ بکھرتا جاتا ہے

●●

[illegible] نظریں شہر کی جانب
گھوم [illegible] ... دور دور تک اندھیرا
... [illegible] اور جہاں سے شہر کی سرحدیں شروع
ہوتی ہیں وہاں [illegible] روشنیاں جیسے آسمانوں میں
[illegible] ہیں۔

"اے [illegible]!" میرے سینے میں گھٹتی ہوئی ایک آہ
بے قرار ہو کر نکل پڑی۔

پھر اپنے آپ پر غصہ بھی آیا۔ یہ کوئی تک ہے؟ ارے
شمیم [illegible] تھا، یہ کیا ضروری ہے کہ جب کوئی بلائے
تو ہم [illegible] ہیں! مزے سے گھر پہ لحاف میں
اپنی بیوی کی زلفوں میں منہ چھپائے سو رہا تھا۔ نہ جانے
اب یہاں سے لوٹ بھی سکوں گا یا نہیں، مجھے تو یہ سب کچھ
آسیبی معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ آسیب وا سیب
جہالت کی باتیں ہیں لیکن اس قدر جلد آپ فیصلہ نہ دیجئے،
دراصل آپ پہلے یہ تو جان لیجئے کہ یہ شمیم کون ہے؟ آپ
پوچھیں گے ناکہ "اچھا بتاؤ۔"

تو میں آپ کو بتاؤں کہ یہاں راوی خوشی مقدر رکھتا
ہے، میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ شمیم ہے — کون ہے؟
کیوں ہے؟ کب سے ہے؟ کہاں ہے؟ کیا ہے؟ (یا
کیسی ہے؟) [illegible] کے بارے میں آپ کو کچھ بھی نہیں بتا سکتا
[illegible] یوں سمجھ کر یہ سب کچھ صدیوں سے چل رہا ہے، میرے
باپ نے مرتے سمے مجھے سرگوشیوں میں بتایا "حسین!" میری
پہلی زندگی اسی آسیب کی نذر ہو گئی!"

اور شاید میرے باپ کو ان کے باپ نے مرتے سمے
سرگوشیوں میں یہی بات بتائی ہوگی اور شاید میں بھی مرتے
سمے اپنے بیٹے سے یہی کہوں گا لیکن یہاں میں یہ بات بھی واضح
[illegible] کہ میرے باپ نے مجھے مرتے سمے یہ بتایا یا
[illegible] ان کے باپ نے مرتے سمے انہیں بتایا یا نہیں، یا
میں اپنے بیٹے کو مرتے سمے یہ بتاؤں گا یا نہیں، اس سلسلے میں
میں کوئی دو ٹوک بات نہیں کہہ سکتا، بس مجھے کچھ ایسا
محسوس ہوتا ہے کہ مرتے سمے میرے باپ نے مجھ سے یہ کہا ہوگا
اور یہ بھی میں نے محسوس ہی کیا کہ ان کے باپ نے بھی مرتے
سمے یہ سب کچھ کہا ہوگا۔

بات جو بھی ہو لیکن میری آدھی عمر زہر کے اس سمندر کو
گھونٹ گھونٹ پینے میں دفن ہو گئی، ہر مہینے کی ستائیس تاریخ
مجھ پہ آفت اور بلاؤں کا نزول لاتی ہے، شام کو ہرکارہ آ کر
پیغام پہنچا جاتا ہے اور میں انکار کرنے کے باوجود بارہ بجے
رات میں نکل پڑتا ہوں اور قبرستان میں ٹھوکریں کھاتا ہوا جب
پورب کی جانب نظریں دوڑاتا ہوں تو شہر کی جگمگاتی روشنیاں
نظر آتی ہیں اور میرا خیال ان کوچوں کو جاتا ہے جہاں کچھ لوگ
اپنی محبوب کی زلفوں میں منہ چھپائے غم جہاں سے بے نیاز
ہوں گے اور کچھ لوگ شب بیداری کی نعمت سے اپنے سراغانہ
دل میں نور کی جلوہ ریزیاں محسوس کر رہے ہوں گے اور کچھ
لوگ میخانوں میں کسی کی آنکھوں کے نام پیمانوں سے پیمانے
ٹکراتے ہوں گے اور کچھ لوگ دروازوں پہ کھڑے سوچتے
ہوں گے۔" اندر کس منہ سے جاؤں، بچے جب پوچھیں گے
ابا کھانا لائے تو کیا جواب دوں گا؟"

یہ شہر! میرا شہر! جہلم! جو فیروز شاہ کا مولد
و مدفن ہے اور میرے مجاہد اور جنگ آزادی میں انگریزوں
سے ٹکر لینے والے بزرگوں کی قیام گاہ جہاں ہر قدم پہ مزارات
ملتے ہیں اور ہر گلی میں مندر، اس شہر میں بہت سی داستانیں
دفن ہیں، کل اور آج کی داستانیں!

داستانیں! جو زندگی سے الگ ہیں!!

داستانیں! جو زندگی سے منسلک ہیں!!!

شاید کل میں بھی اسی طرح داستانِ پارینہ کا ایک ورق
بن جاؤں گا لیکن یہ زہر جو میری زندگی میں سرایت کر گیا ہے۔

وجی کا عادا کیسے ہوگا ؟

میں گھبرا کر پچھم کی طرف گردن موڑتا ہوں تو پہاڑوں کا ایک وسیع و عریض سلسلہ سیاہ فام دیووں کی طرح کھڑا ہے، پہاڑ، جن سے گزر کر ڈاکو، فاتح، لٹیرے، مجاہد اور اولیاء کرام آتے رہے ہیں، یہ پہاڑ جو دن میں زندگی کی رعنائیاں بکھیرتے ہیں اور تفریح کا خوب صورت ذریعہ بنتے ہیں، یہی پہاڑ رات آتے ہی اتنے بھیانک بن جائیں گے میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

اور اب ایک جانب جنگلوں کی بھیانک رہگذر ہے جہاں خوفناک جانور ڈکارتے ہیں، ہرنیاں کلیلیں بھرتی ہیں، اور خرگوش یوں دوڑتے ہیں جیسے وہ کنواری جو بڑی بوڑھیوں کے کہنے پر دھرتی کے سینے پہ ہولے ہولے اس ڈر سے تلوے رکھتی ہے کہ دھرتی کنواریوں کے بوجھ سے ہلنے نہ لگے اور دوسری جانب گرینڈ ٹرنک (جی۔ ٹی) روڈ، ریلوے لائن اور پھر اس سے آگے بڑھ کر دھرتی کے سینے کو چیرتی ہوئی سون ندی جو آنکھوں سے اوجھل ہو کر بھی اوجھل نہیں ہے، اور انہیں سب کے بیچ کہیں شمیم کا پڑاؤ جس کا تعین کبھی ممکن نہیں کہ رات کے سناٹے میں گرینڈ ٹرنک روڈ پہ چلتی ہوئی موٹروں اور ریلوے لائن پہ دندناتی ہوئی ریل گاڑیوں کی روشنیوں کی طرح کبھی پل بھر کو، کبھی ایک گھنٹے کے لئے، اور کبھی مسلسل کئی دن یہ پڑاؤ روشن رہتا ہے اور پھر دھندلا کہر کا ایک حصہ بن کر آنکھوں کی حیرانی کا باعث بن جاتا ہے۔

تو یہ حیرانی جو میرا مقدر ہے اسے لے کر میں کہاں جاؤں کہ قبرستانوں کی سیر میرے وجود کا ایک اہم حصہ بن گئی ہے اور میں اپنے اس اوٹ انگ کو اپنے ساتھ لئے قبرستان سے آگے نکل جانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ غالباً شمیم کا پڑاؤ انہی سرحدوں کے آس پاس یا شاید اس سے آگے ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ میں یونہی قبرستان میں کھیتوں کی کیاریوں کی طرح

قبروں کے [illegible] رہا ہوں اور اس نے [illegible] میرے یہاں پہنچ سکے ہیں۔

میں آہستہ [illegible] ستارے کی روشنی [illegible] ہوتا ہے کہ گزری [illegible] ہوئے احساس ہوتا ہے کہ آج [illegible] ہے اور آسمان پر فرشتوں کا لشکر نظر آتا ہے [illegible] کھڑا ہے اور ایک زرق برق سواری [illegible] سے قریب ہوتی جا رہی ہے۔

پھر اچانک ایک عجیب تماشا کا نام نظر آتا ہے۔ ٹکڑے ٹکڑے۔۔۔۔۔ سب کچھ دیکھ دیکھ کر، میں چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ بالکل اسی طرح قائم رہے لیکن یہ مجبوری ہے کہ اب کچھ دیکھی ان دیکھی ہو کر فضاؤں میں بکھر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آج ستائیس تاریخ ہے، لمحہ ایک لمحے کے لئے ٹھہر جائے مگر شاید یہ ممکن نہیں، شاید یہ بہتر نہیں، شاید لمحہ لمحہ نہیں، شاید میں میں نہیں، شاید تم تم نہیں۔

نفی اور اثبات کا سارا مسئلہ تو اسی غار میں پڑا سسکتا رہے پھر بھی میں جن قبروں کے درمیان سے گزر رہا ہوں اُن کی پُراسراریت سے میرے [illegible] کانپ کانپ جاتے ہیں، اُن شمعوں کی طرح جو دور و نزدیک کہیں کہیں قبروں پر روشن ہیں اور جن کی لویں سردی سے کانپ کانپ کر [illegible] اور پھر اپنے وجود کی بقا کے لئے ہوا [illegible] ہیں سے [illegible]، وہاں اور کا [illegible] کہیں شروع رات میں پڑھی گئی آیتوں کی [illegible] میں سوچ رہا ہوں کہ ستائیس تاریخ کی [illegible] سائل [illegible] جاتے ہیں، [illegible] ہو جاتا ہوں [illegible] رات [illegible] ؟

[illegible] ۔ میں ایک ایسے کمرے میں قید ہوں [illegible] اور کھڑکی ۔ یہ بلیک ہال جو صدیوں [illegible] ہوئے ہے ، یہ اگر ٹوٹ نہ سکا تو کیا [illegible] ؟

[illegible] یہ حصار جس میں میں قید ہوں یہ بلند [illegible] ان بلندیوں میں گھرا قبروں کے بیچ ٹہل رہا ہوں ۔

پھر [illegible] منظر بدل جاتا ہے ، مجھے ایسا احساس ہوتا ہے جیسے میں کسی بستی میں چل رہا ہوں ، چھوٹے چھوٹے کھپریل مکانات ، نیچی نیچی اولتیاں جن سے گزر کر پانی آسانی سے زمین کی جانب ٹھر رہا ہے ، میں اولتیوں کا سہارا لیتا ہوا (کسی) گھر کی جانب بڑھ رہا ہوں کہ بارش کا موسم آ گیا ہے ، ندی نالے لبریز ہو گئے ہیں ۔ اور پھر دیہات کی دھرتی جس کے سینے میں اگر گرمی میں ذرا دراڑ جاتی ہے تو پھر برسات یوں پچارہ گری کرتی ہے جیسے کبھی شیشے میں بال تھا ہی نہیں ۔ اتنی غلاظت کہ پیر گھٹنوں تک غلاظت میں اٹے ہوئے ہیں ، گھن بھی آ رہی ہے لیکن کر بھی کیا سکتا ہوں کہ اب تو اس بستی میں آ کر پھنس ہی گیا ہوں اور اب کے ہی کیا ہر مرتبہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ پیر گھٹنوں تک غلاظت میں اٹ جاتے ہیں اور میں مجبوراً آگے بڑھتا رہتا ہوں کہ اس سے کچھ ہی فاصلے پر تو وہ مکان ہے جس کی ایک سمت کھلی ہوئی ہے اور تین جانب قدآدم دیواریں اٹھ چکی ہیں ، اسی احاطے میں اونچی ہوتی ہوئی وہ کوٹھری ہے جو صرف مٹی سے تیار کی جا رہی ہے ، گھر کے سبھی لوگ مکان کی تعمیر میں معروف ہیں ، بوڑھے بابا جو بانس سے بنائے ہوئے تختوں پر کھڑے ہوئے ردّے پر رکھ رہے ہیں ، وہ نوجوان بھائی جو مٹی سان کر گارا بنا رہا ہے ، وہ لڑکی جو ٹوکری میں سانی ہوئی مٹیاں لے جا رہی ہے اور وہ ماں جو اس لڑکی کے سر تک [illegible] جانے میں اس کی مدد کرتی ہے ۔

مجھے اتنا یاد ہے کہ وہاں میں نے بھی کچھ کام کیا لیکن کیا کام کیا اس کی کچھ واضح یادیں میرے ذہن میں محفوظ نہیں ہیں البتہ کچھ دھندلے دھندلے نقوش جو میرے ذہن کے پردوں پر ابھرتے ہیں وہ کچھ یوں ہیں کہ پڑوس سے پانی ٹھر ٹھر کر اس دیوار پر گر رہا ہے اور مٹی کا جتنا ردّا اس پر رکھا جا رہا ہے سب یکے بعد دیگرے گل گل کر پھر زمین پر ڈھیر ہوتا جاتا ہے ۔

پھر اس کے بعد مناظر بہت تیزی سے تبدیل ہونے لگتے ہیں ، ایک منظر اس بحث سے متعلق سامنے آتا ہے کہ شیم کے پڑاؤ تک میں پہنچ سکا یا نہیں اور اگر پہنچا تو ان میں شیم کون تھی ، ایک خیال ہے کہ بوڑھے بابا شیم ہیں ، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ لڑکی شیم ہے ، چند حضرات کی رائے ہے کہ وہ نوجوان بھائی شیم ہے اور ایک مکتبۂ فکر اس ماں کو شیم قرار دیتا ہے جو ٹوکری اٹھانے والی کی مدد کر رہی تھی ۔

ذاتی طور پر میں اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا ہوں بہر حال ان ہی میں سے کوئی شیم ہوگی ، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سب شیم ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں شیم تک پہنچ ہی نہ سکا ہوں ۔

پھر ایک منظر گرمیوں کی شب کا ہے ، ریل کی پٹریوں پر اس لڑکی کی لاش پڑی ہے ، گردن ایک جانب ، دھڑ دوسری جانب ، قطرہ قطرہ رِستا لہو اور مُردہ آنکھوں میں اس گھر کی تصویر جس کی دیواروں پر پڑوسی کی اولتی سے ٹھرتے ہوئے پانی نے فنا کے نقوش ثبت کر دیئے ہیں ۔ اور پھر زمین کی گردش کی طرح وہی چاند کی ستائیسویں تاریخ ، وہی قبرستان اور وہی چلتا ہوا ، ٹہلتا ہوا ، بھاگتا ہوا اور قبروں کو روندتا ہوا میں اور میرے ارد گرد لامتناہی قبروں کا سلسلہ ، اور ان قبروں سے پرے پورب میں جگمگاتی روشنیاں ، پچھم میں پہاڑوں کا سیاہ فام دیو ، دکھن میں جنگلوں کی بھیانک رہگزر ، اور اُتر میں ریلوے لائن پر چھٹپٹاتی ہوئی لڑکی ، اور لڑکی کی مُردہ آنکھوں میں ایک تصویر ...... اور رات کا سمے ...... [بقیہ صـ۲۷ـ پر]

اور [illegible] آنے لگے۔ تیز رفتار [illegible] مضطرب ہو گیا۔ پھر دوریوں کا احساس [illegible] زیادہ نہ ہوتا تو کم ہمتی کی آخر [illegible] احساس کہ حقیقت تھا درحقیقت [illegible] پھر کبھی نہ اٹھا سکا۔ اور وہ اسی [illegible] اجنتا پر پتھر مارتی رہی۔ میں نے اس [illegible] اور اس کی آتی جاتی سانسوں کی آوازیں [illegible] میں "عادی لمحوں کی زد میں تھا تو [illegible] داستان کوئی نئی بھی نہیں۔

[illegible] عادی جو سیاہ چادر میں بند ہاتھوں کا مقدر تھا [illegible] کہ سیاہ چادر کی نیم روشن درازوں سے آوازیں آتی ہیں کہ مجھے احساس کو مت زائل ہونے دو کہ ابھی [illegible] ہو۔ دریاؤں کی روانی پر مت غور کرو کہ انہیں تو بہر حال رواں رہنا ہی ہے۔ تو میں نے خود کو ان چار الفاظ کی حصار بندیوں میں قید کر لیا کہ جب مجھے پڑھنا آیا تھا تو انہیں پڑھا تھا اور جب مجھے ہوش آیا تھا تو انہیں سنا تھا اور جب مجھے سمجھ آیا تھا تو انہیں سمجھا تھا۔ اور ابھی جبکہ میں الفاظ کی حصار بندیوں میں تھا بیوی نے بار بار اصرار کیا کہ چلو چائے پی لو بہت تھکے تھکے دکھائی دیتے ہو۔

چائے پی کر جب بستر پر لیٹا تو بیوی کو بہت قریب پایا بات کرنے کی کوشش میں اُسے اور قریب کر لیا۔ پھر بے شمار باتیں۔ باتیں جو زندگی کی طرح مبہم اور غیر واضح تھیں۔ رات کے دو بج گئے۔ میرا جسم اسی طرح سرد تھا گویا صدیوں سے برف میں رکھا ہوا ہو۔ پھر ایسا ہوا کہ جیسے کسی میکانکی عمل سے میرے ہاتھ بیوی کے نرم گرم جسم پر پھیلنے اور سکڑنے لگے۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ میں لطافتوں کے احساس سے گلے مل جاؤں [illegible] ہاتھوں کا مقدر .... جو سیاہ چادر کے اسیر ہے .... ان کی نیم روشن درازیں ...... اور گم ہوتی ہوئی آوازیں ...... !

کل کی باتوں پر غور کرتا ہوں تو آج کی معلوم پڑتی ہیں اور آج کی باتیں ــ؟ جیسے ابھی ابھی کوئی کچھ کہہ گیا ہو جیسے ابھی ابھی کوئی کچھ کہنے والا ہو۔ اس نے نرم پیالی سے جو امرت پلائی تھی اس کا ذائقہ ابھی تک باقی ہے مگر دماغ وہی سوچ رہا ہے جو حاوی لمحوں کا کرم ہے۔

لمحوں ہی نے مجھے وہاں لا کھڑا کیا ہے جہاں سے تنگ سرحدوں کی غیر مرئی دھاریاں کھنچ دی گئی ہیں۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں تو لگتا ہے دور دور تک سرحدوں کی دھاریں پھیلی ہیں۔ میں اپنے آپ میں مگن ہر آنے جانے والے سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہوں۔ ان سے پھر ملنے کی درخواست کرتا ہوں۔ اُن کی آنکھوں کے نور کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہوں ...... پھر پھیلتا ہوں ... پھیلتا جاتا ہوں .... شادابیوں کے بیچ مسکراتے ہوئے اپنے ساتھ ساتھ سب کا استقبال کرتا ہوں۔ دور دور تک پھیلی ہوئی سرحدوں کے اندر مکانوں کی تعمیرات کے لئے زمین دان کر دیتا ہوں۔ اور پھر سرحد تک پہنچتا ہوں سرحد کے باہر قدم رکھنا چاہتا ہوں۔ آہٹوں کے رخنہ سے نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ بیوی تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں میں چائے کی پیالی لئے کھڑی ہے۔

اپنی سرحدوں پر نظر ڈالتا ہوں۔ دم گھٹنے لگتا ہے جاگتے ہی سرحدوں کی وسعت تنگ راستوں میں کیسے گم ہو گئی اتنے سارے لوگ ہیں کہ دم گھٹنے لگا ہے سبھوں کی طرف خونخوار نظروں سے دیکھتا ہوں۔ اتنی کم جگہ اور اتنے سارے لوگ

" ارے ارے ہٹو ..... نہیں تو سب کو مار ڈالوں گا۔

بھیڑ اتنی بڑھتی ہے کہ کچلنے لگتا ہوں۔ سرحدوں سے باہر آنا چاہتا ہوں مگر سرحدوں پر جیسے برقی لہر دوڑ رہی ہو۔ ڈی۔ سی کرنٹ کے جھٹکے سے گرتا ہوں [بقیہ صفحہ ۷۲ پر]

غزلیں

عشرت علوی

کچھ اور تنگ صداؤں کا دائرہ کر دو
تمام عمر میں بھٹکوں وہ سلسلہ کر دو

ہم اپنے آپ سے روٹھے ہیں کتنا جان سکیں
ہمارے سامنے اک بار آئینہ کر دو

عذابِ جاں ہے یہ زنجیرِ دست و پا، یعنی
حصارِ جسم سے کوئی مجھے رہا کر دو

پھر ایک ضرب لگا دو گزشتہ یادوں کی
پرانے زخم کو اِک بار پھر ہرا کر دو

سکوتِ شہر کے ہونٹوں کا بند ٹوٹ چکا
ہر ایک سنگِ شکستہ کو اب صدا کر دو

میں اپنے آپ سے خائف تھا کچھ نہ کر پایا
تم اپنے آپ کو اب مجھ میں مبتلا کر دو

تمہارے شہر میں جب کوئی باخلوص نہیں
تو یہ کرو کہ مجھے سنگِ آشنا کر دو

محسن تابش

میں جس کو بھولنا چاہوں وہ [illegible]
تمام عمر یہی حادثہ رلائے گا

سکوتِ شہرِ تمنا کو توڑ جائے گا
تمام رات وہ دروازہ کھٹکھٹائے گا

قبائے تشنہ لبی میرے پاس رہنے دے
ترا خلوص مرے ہونٹ کو جلائے گا

سسکتی چیختی آوازِ پا تو آئے گی
مگر ہے آرزو جس کی وہ اب آئے گا

بھٹکتے خوابوں کی ناکامیاں مجھے دے دو
مرا وجود تماشوں میں کٹ جائے گا

وہ خود کو ڈھونڈنے نکلے گا میں تماشائی
تو سب سے پہلے مرے ہی قریب آئے گا

انور [illegible]

بھیگی شام کی راکھ

شہر پر بادلوں نے ہجوم کر دیا تھا لیکن برس نہیں رہے تھے۔ گھنٹہ بھر سے کام پہ جانے والے سینکڑوں [illegible] ریلوں اور بسوں کی کھڑکیوں سے یہ ڈراما دیکھ رہے تھے۔ برسات میں اکثر دو دن ایسے ہوتے ہیں جب مسلسل بارش سے شہر کا تمام کاروباری نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اکثر اوقات کمپنیاں وقت سے پہلے بند کر دی جاتی ہیں۔ اس کے باوجود ٹریفک میں رکاوٹ کی وجہ سے مضافات سے آئے ہوئے ہزاروں لوگ رات کے دس یا گیارہ بجنے سے پہلے گھر نہیں پہنچ پاتے۔

بادلوں کے ہجوم نے بڑھتے بڑھتے پورے شہر کو ڈھانپ لیا۔ کچھ دیر نیم تاریکی اور امس کی کیفیت رہی اس کے بعد پانی برسنا شروع ہوا تو لگاتار کئی گھنٹے ایک سی رفتار سے برستا رہا
رخسانہ گھر سے چلی تھی تو اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ آفس تو وہ بارش شروع ہونے سے پہلے پہنچ گئی لیکن پانی برسنے کے بعد جب موسم میں خنکی آئی تو اس کے سر کے درد میں اضافہ ہو گیا۔ آتے ہی اس نے کافی پی تھی۔ گھنٹہ بھر بعد اس نے پھر کافی لی اور اسپرین بھی لیکن افاقہ نہ ہوا۔ کام بھی زیادہ تھا۔ ٹائپنگ کرتے کرتے اس کی انگلیاں دکھنے لگیں لیکن ٹرے میں رکھی فائلوں کا ڈھیر ویسا ہی رہا۔ ٹرے کی طرف دیکھتے ہوئے اسے الجھن ہونے لگی۔ ایک خط ٹائپ کر کے رکھتی اور ٹرے کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ بڑھا کر دوسری فائل اٹھا لیتی۔ کبھی کبھی وہ کنکھیوں سے وہاں بیٹھی اوشا اور روزی کی طرف دیکھتی تو وہ بھی مشین پر جھکی نظر آتیں۔ ان کے چہرے بھی اترے ہوئے تھے۔ دن ایسا تھا کہ شاید ہی کسی کا کام کرنے کو جی چاہے لیکن کام کئے بنا چارہ نہ تھا اور کام اس قدر تھا!

کسی کی موجودگی کے احساس سے اس نے سر اٹھایا تو اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ کا سینیر کلرک اسے خشم آلود نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ رخسانہ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"اس اسٹیٹمنٹ میں ٹائپنگ کی چار غلطیاں ہیں۔"
سینیر کلرک نے کہا۔

'آئی ایم سوری'

آج ہر ایک کا موڈ خراب تھا۔

اس نے ٹائپ رائٹر پر چڑھا کاغذ اتار کر اسٹیٹمنٹ کی غلطیاں ٹھیک کیں۔ سینیر کلرک کے جانے کے بعد وہ ٹائپ رائٹر پر کاغذ چڑھا رہی تھی کہ چپراسی نے اطلاع دی کہ اس کا ٹیلیفون آیا ہے۔

ایک اور مصیبت! اس نے سوچا۔ ٹیلی فون آفس سپرنٹنڈنٹ مسٹر آئر کی میز پر تھا۔ یہ بات انھیں سخت ناپسند تھی کہ آفس کے اوقات میں اسٹاف کے لئے باہر سے ٹیلی فون آئے۔ ویسے بھی ان کا خیال تھا آفس کے سب لوگ، وقت ضائع کرتے ہیں۔
اٹھا دباتی ٹیلی فون تک پہنچی۔ مسٹر آئر کی طرف اس نے کنکھیوں سے بھی نہیں دیکھا۔ اسے معلوم تھا وہ برا سا منہ بنائے اسے دیکھ رہا ہوگا۔

'ہلو، رخسانہ اسپیکنگ۔'

'رخسانہ، میں ہاشم بول رہا ہوں،'

[illegible] سے خالی بسیں شوں شوں ہوتی گئیں
[illegible] ایک سوا میں نمبر بس جانے کے لئے
[illegible]۔ بس کنڈکٹر نے اور لوگوں کو
[illegible] آگے بڑھنے کی کوشش کی
[illegible] کر دیا۔ وہ ناچار پھر قطار میں جا کر کھڑی
ہو گئی۔

[illegible] بعد دوسری بس آئی۔ رخسانہ اس میں بھی
سوار نہ ہو سکی۔ اسے بے حد جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی لیکن ریلیں
قریب قریب بند تھیں۔ ٹیکسیاں کم ملتی تھیں اور ہر شخص
بس ہی کی طرف آ رہا تھا اور پانی مسلسل برس رہا تھا۔
[illegible] بعد بس آئی۔ منٹوں میں یہ بس بھی بھر گئی۔
رخسانہ [illegible] میں بھی نہ چڑھ پائی۔ لیکن وہ بس کے قریب آ کر
کھڑی ہو گئی۔ اس نے سوچا پتہ نہیں دوسری بس کب آئے۔
کنڈکٹر [illegible] ٹکٹ کاٹنے میں مصروف ہوا۔ ایک
[illegible] بس [illegible]۔ رخسانہ ہمت کر کے بس کا ڈنڈا
پکڑ کر چڑھ گئی۔ کنڈکٹر نے آنکھوں کے گوشوں سے دیکھا مگر
لیکن خوش قسمتی سے نظر انداز کر گیا۔
[illegible] بسیں بڑی سست رفتاری سے
چل رہی تھیں۔ ٹریفک بھی زبردست تھا۔ گاڑی چرچ گیٹ
اسٹیشن کے پاس سے گزری تو اس نے دیکھا لوگ سڑکوں پر
کھڑے ہیں اور اسٹیشن سے اناؤنسمنٹ ہو رہا ہے کہ پٹریوں
پر پانی آ جانے کی وجہ سے تقریباً دو گھنٹے ریلوں کی آمد و رفت
بند ہو گی۔ اسے اطمینان سا ہوا کہ وہ کسی طرح بس میں تو سوار
ہو گئی۔

کنڈکٹر نے بیچ میں کہیں بھی گاڑی نہیں روکی۔ چرنی
[illegible] ٹکٹ کاٹتے ہوئے اس کے قریب آیا۔
"کہاں جانا ہے آپ کو؟" کنڈکٹر نے اس سے
[illegible] پوچھا۔

"انڈھیری" اس نے کہا اور اسے خیال آیا کہ اسے تو
ناناچوک اترنا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کنڈکٹر سے ناناچوک
کا ٹکٹ کاٹنے کو کہے لیکن تب تک کنڈکٹر اس کے ہاتھ میں
ٹکٹ تھما کر دوسری طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

اس نے سوچا وہ ناناچوک ہی اترے گی۔ اس کے
والدین متفکر ہوں گے۔ اس کی بہن نگہت پتہ نہیں اسکول
سے لوٹی یا نہیں۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا۔ اس وقت اس کے
گھر پر کیا ہو رہا ہوگا۔ اس کی ماں چائے بنا رہی ہوگی۔ اسے
ہر ایک گھنٹے سے چائے پینے کی عادت ہے۔ اس کا باپ جو
ریٹائرڈ گزیٹیڈ آفیسر ہے۔ تیسری بار اخبار ختم کر کے جاسوسی ناول
پڑھ رہا ہوگا۔ ماں چائے پی کر پڑوس میں سروج کی ماں سے
گپ شپ لڑانے چلی جائے گی۔ نگی اسکول سے لوٹ کر چائے
بنائے گی اور صوفے پر دراز ہو کر دودھ بھارتی سنتی رہے گی
کتنے مطمئن اور پرسکون ہوں گے سب۔ اور وہ اس کھچا کھچ
بھری بس میں ایک ہاتھ میں پرس لئے دوسرے ہاتھ سے ڈنڈا
پکڑے لوگوں میں دبی دبائی کھڑی ہے اسے اتنی بھی مہلت نہیں
کہ ساری جو کندھے سے ڈھلکی جا رہی ہے درست کر لے۔

اس نے جھک کر دیکھنا چاہا بس کہاں سے گزر رہی ہے
بس فریچ برج سے گزر رہی تھی۔ قریب ہی بھگت اسٹورس کی
بتیاں چمک رہی تھیں۔ ہاشم سے اسی اسٹورس میں پہلی بار مڈبھیڑ
ہوئی تھی۔ بھگت اسٹورس کی مدھم تیز روشنیوں، کپڑے کے
تھانوں سے گرتے رنگوں کے آبشاروں اور ہاتھوں میں سرسراتے
ملائم نرم کپڑوں سے پیدا شدہ خواب ناک ماحول میں ہاشم کے
بے ترتیب بالوں اور لمبی قلموں، سنہری فریم کی عینک، ہلکی
نارنجی چیک کی قمیض اور سویڈ کی گہری چاکلیٹی بیل باٹم پتلون
نے مل جل کر اس پر ایسا گہرا تاثر قائم کیا تھا کہ آج بھی وہ اس پر
قابو پانے سے قاصر تھی۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر وہ سروج
کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

[illegible] نے ہاشم سے تعلقات ختم کرنے کا
[illegible] اور اہٹ ہٹ کی کشمکش میں پھنس کر
رہ گئی۔ [illegible] فون کرتا۔ خوب صورت جملے تراشتا
[illegible] وہ اس قسم کی زندگی سے اس قدر مانوس
ہو چکی [illegible] ہوتے بھی وہ ہاشم کی طرف جھک جاتی۔

[illegible] احساس ہوا بس رکی ہوئی ہے۔ اس نے
دیکھا [illegible] بس گلی میں پھنسی ہوئی ہے۔ بس کے آگے
ایک ٹیکسی [illegible] تھی۔ کنڈکٹر اتر کر ڈرائیور سے ٹیکسی پیچھے
ہٹانے کے لئے کہہ رہا تھا لیکن ٹیکسی ڈرائیور مان نہیں رہا تھا۔
بس کی سواریاں بڑے اطمینان سے دونوں کی بحث سن رہی
تھیں۔ بس ڈرائیور بھی اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھے دلچسپی سے
انہیں دیکھ رہا تھا۔ ایک اور ٹیکسی گزر رہی تھی۔ اس کا ڈرائیور
بھی اپنی گاڑی قریب لے آیا اور کنڈکٹر اور ٹیکسی ڈرائیور کی بحث
بڑی توجہ سے سننے لگا۔ رخسانہ نے گھڑی دیکھی۔ سات بجنے
میں چند ہی منٹ باقی تھے۔ البتہ اندھیرا چھا جانے سے لگتا تھا
آٹھ ساڑھے آٹھ بج رہے ہوں۔ کچھ دیر بعد کنڈکٹر عاجز آکر
بس میں لوٹ آیا تو سواریوں نے شور مچانا شروع کیا۔ آخر ٹیکسی
ڈرائیور نے گاڑی پیچھے ہٹائی اور بس آگے بڑھی۔

پتہ نہیں اس وقت بس کہاں سے گزر رہی ہے۔ رخسانہ
نے سوچا۔ شاید شاہراہ پر پانی بھر چکا ہے۔ اور ڈرائیور گلیوں
سے بس نکال رہا ہے۔ کیا ہاشم گھر پر ہوگا؟ ہاشم کے کمرے کی چابی
تو اس کے پاس تھی۔ ہاشم کئی بار اسے بلا کر خود بڑی دیر سے آیا
تھا اور وہ کمرے کے باہر کھڑے رہ کر یا بلڈنگ سے اتر کر انتظار
کیا کرتی تھی۔ تب اس نے بڑی خفت محسوس کی تھی۔ لوگ کیا سوچتے
ہوں گے! ہاشم نے اسے کمرے کی چابی اس کے کہنے پر اسے
دے رکھی تھی۔ اس کا کمرہ بند کرنے پر باہر سے خود بخود بند
ہو جاتا تھا اور باہر سے صرف چابی سے کھولا جا سکتا تھا۔
[illegible] پر رخسانہ اتری اور تیز برسات میں بھیگتی ہوئی
بڑھی۔ چھتری بس برائے نام حفاظت کر رہی تھی۔ دن بھر کی
کیفیت اور فسکر نے اس کے اعصاب کو مضمحل کر دیا تھا۔ سر کے
درد اور زکام سے بھی وہ پریشان تھی۔ روڈ پر جو چند لوگ
اس کے ساتھ اترے تھے وہ گلیوں میں کھو گئے۔ ہر طرف اندھیرا تھا
دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ راستے سنسان تھے۔ ایک سنسان
گلی میں گھستے ہوئے اسے کچھ خوف سا محسوس ہوا۔ دو تین
عمارتیں چھوڑ کر ایک سہ منزلہ عمارت کی پہلی منزل کے آخری کمرے
کی طرف اس نے دیکھا۔ کمرہ میں روشنی نہیں تھی۔ اس کا مطلب
تھا ہاشم گھر پر نہیں۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ آہستہ آہستہ
سیڑھیاں چڑھتی وہ ہاشم کے کمرے کے باہر آکر رک گئی۔
پرس سے چابی نکال کر دروازہ کھولا۔ دروازہ بغیر آواز کے
کھلا۔ وہ اندر داخل ہوئی اور آہستگی سے دروازہ بند کر دیا
اس نے بتی نہیں جلائی۔ اسے اندھیرا ہی اچھا لگ رہا تھا۔ کون
سی چیز کہاں ہے اسے معلوم تھا۔ دروازہ سے کچھ دور گودریج کا
کپ بورڈ۔ کچھ خالی جگہ۔ تپائی۔ پلنگ۔ کچن کا دروازہ
اور باتھ روم۔ کپ بورڈ کے سامنے صوفہ ہے۔ آنکھیں اندھیرے
سے مانوس ہوئیں تو وہ صوفہ کی طرف بڑھی لیکن اندھیرے میں
ایک دھبہ سا حرکت کرتا محسوس ہوا۔ پیچھے ہٹ کر اس نے دروازہ
کے پاس لگا بٹن دبایا۔ پل میں روشنی ہوئی۔ اس کا بدن ایک
لحظہ کو سنسنایا اور پھر دن بھر کی تکان کا احساس جوڑ جوڑ سے
بولنے لگا۔ اس نے بڑھ کر خود کو صوفے پر گرا دیا۔

ہاشم بھی ایک لمحے کے لئے اسے دیکھ کر سکتے میں رہ گیا
روشنی کے ساتھ ہی چونک کر جوڑے کا گودریج کے کپ بورڈ کے
پیچھے چلا گیا تھا اس نے جلدی جلدی پتلون پہنی اور خفت سے
بالوں میں انگلیاں پھیرتا، جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا
دروازہ بند ہونے کی آواز سے ہاشم چونکا۔ اس نے ابھی تک
کپڑے نہیں پہنے تھے۔ وہ بھی بنیان اور پتلون اٹھا کر کپ بورڈ کے
پیچھے چلا گیا۔ کپڑے پہن کر وہ پلنگ پر ہی بیٹھ گیا اور سگریٹ

سسکنے لگا۔

"میں بھول ہی گیا تھا کہ میں نے تمہیں ٹیلی فون کیا ہے۔"

اُس نے سگریٹ سلگاتے سلگاتے رُک کر کہا۔ ساتھ ہی اس کے منہ سے شراب کا بھبکا باہر آیا اور کمرے میں بکھر گیا۔

خسانہ نے ہاشم کی بات نہیں سنی۔ اُس نے شراب کی بو بھی نہیں محسوس کی۔ اُس نے ہاشم کو اُٹھ کر باہر جاتے بھی نہیں دیکھا اُس نے آنکھیں بند کرلیں جیسے ہر چیز بھول جانا چاہتی ہو۔ ہر طرف اندھیرا تھا اور سناٹا۔ اس سناٹے میں اُسے صرف اپنے دل کی دھڑکن سنائی دیتی رہی۔ آہستہ آہستہ، ایک سی رفتار سے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی بند ہوگئی اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

رات کے تقریباً دو بجے اس کی آنکھ کھلی۔ بتی اسی طرح جل رہی تھی۔ بستر پر بچھی چادر ویسی ہی جگہ جگہ سے مسکی ہوئی تھی ہاشم کمرے میں نہیں تھا۔ باہر بارش تھم گئی تھی۔ اس کے سر میں درد نہیں تھا۔ سردی کا احساس بھی دب گیا تھا اور دل میں اتھاہ سکون جیسے برسوں تھپیڑے کھانے کے بعد کوئی کشتی ساحل پر آ لگی ہو۔ اُسے نہ جانے کیوں یقین سا ہوگیا کہ اب ہاشم اس سے کبھی نہیں ملے گا۔ اگرچہ ہاشم کے سامنے اب بھی وہ بے بس تھی لیکن اب اُسے اطمینان تھا کہ ہاشم اس کی زندگی سے نکل چکا ہے۔

وہ اُٹھی۔ کپڑے ٹھیک کئے۔ اس کی نظر چابی پر پڑی جو صوفے سے پھسل کر فرش پر گر پڑی تھی۔ اس نے چابی کو پیر سے ٹھوکر لگائی۔ چابی پلنگ کے پائے سے ٹکرا کر تپائی کے نیچے چلی گئی۔ اُس نے پرس سے آئینہ نکال کر بال ٹھیک کئے۔ بتی بجھائی اور پرس جھلاتی سبک قدموں سے سیڑھیاں اُترنے لگی

●●

بقیہ: طے کی گئی سرحدوں کی کہانی

پھر ایک آہٹ پر نظریں ہٹاتا ہوں۔ سامنے بیوی ہاتھوں میں چائے کی گرم پیالی لئے کھڑی ہے۔

ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ کانپتی ہوئی انگلیوں میں پھنسی ہوئی چائے کی پیالی لرزتی رہتی ہے۔ ایک چسکی لیتا ہوں۔ پھر کئی چسکیاں۔ لیکن زبان سوکھ چکی ہے۔ ذائقے بجھ چکے ہیں آتی جاتی سانسوں پر نقاہت کا عالم طاری ہے۔ ایسے عالم میں اب آخری سانس کا مقدر کون جانے۔ ؟

اچانک ساری چائے زمین پر گر جاتی ہے۔ پیالی بھی گر کر چکنا چور ہو جاتی ہے ———— بیوی پیالی کے ٹکڑے کھڑکی کے باہر پھینک رہی ہے ——

میں نے دیکھا باہر فضا ویسی ہی تھی۔ سرخ اور گرد آلود۔

●●

بقیہ: قصّہ دُھند میں ....

اور گھٹا ٹوپ اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے ....
دور تا حدِّ نظر نہ کوئی نقش۔ نہ کوئی چاپ
نہ کوئی آواز ......"

کتنا اندھیرا ہے .....!
کتنا اتھاہ اور گہرا اندھیرا ہے !!
میں ڈوب جاؤں گا ...... !!!
میں ڈوب جاؤں گا ...... !!!!

●●

اپنی تخلیق کی پشت پر اپنا پتہ صاف صاف تحریر کریں۔

— ادارہ —

R.N.I Regd No 4253/64
P.T. Regd No. 153
PHONE NO { OFF 662 / RES. 33
THE A...
Editor. KALAM HAIDRI

BAIRAGI, GAYA

Phone : 443

Printed by : HIND LITHO PRESS. Mcleodganj, Gaya.

No. 65-85 1975